دلچسپ اورسنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
سلمان سلیم
ماھنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
اکتوبر 2022
قیمت 150 روپے
بانی
معراج رسول
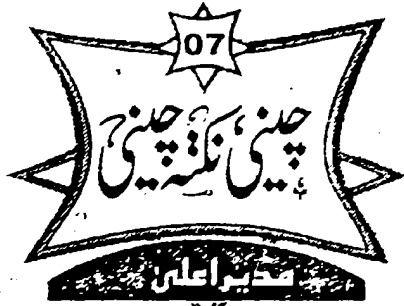
07
چینی نکتہ چینی
مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

12
فتح یاب
یعقوب بھٹی
حسن و عشق کی منزلیں اور انتقام کی آگ میں
جلتے شعلہ خواروں کی سنسنی خیز داستان حیرت

47
صبر آزما
فاطمہ حسام
ہمارے ارد گرد چلتے پھرتے
چہروں میں گم کچھ اجنبی چہرے

57
بے سمت
عکس فاطمہ
اسیری سے آزادی کی جانب
گامزن ایک پروفیسر کی سرشاری

67
مخبر
اے آر راجپوت
اپنی بھرپور توانائی صرف کر دینے
والے وفا پیشہ کی جانفشانی

76
دہر
حسام بٹ
عروس البلاد کراچی سے شہر ظلمات "نی یوم" تک
دراز ایک سنسنی خیز اور تحیر آمیز ناقابل فراموش سلسلہ

105
محاذ
عمران قریشی
ایک ہی تیر سے دو مختلف
محاذوں پر پسپا ہو جانے والا ستم گزیدہ

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر
سلمان سلیم

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 52 • شمارہ 10 • اکتوبر 2022 • زرِ سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 150 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

ختم نبوت ﷺ زندہ باد | عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد | پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

سلمان سلیم

عزیزانِ من......السلامُ علیکم!

2022ء کی سیڑھیوں کے آخری قدمچے باقی ہیں...... ماہ اکتوبر کا شمارہ جلد آپ کے ہاتھوں کی زینت بن جائے گا......

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اس ماہ ہمارے پیارے پیغمبر نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے......آپ سب قارئین کو جشنِ عید میلادالنبیؐ کی بابرکت ساعتیں نصیب ہوں۔اب سے چودہ سو سال پہلے دنیا اپنے تاریک ترین دور سے گزر رہی تھی۔کسی خطۂ زمین پر رشد و ہدایت کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا۔پوری دنیا گمراہی کے اندھیروں میں ڈوب چکی تھی۔شرک و بُت پرستی عروج پر تھی۔مذہب کے علمبردار اور بتوں کے پجاری بداخلاقیوں کے پیکر بنے ہوئے تھے۔ذات، پات، چھوت چھات نے انسانوں کو کئی خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔انہی اندھیروں میں روشنی کی کرن نمودار ہوئی۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری کائنات کے لیے مبعوث فرمائے گئے۔شرفِ نبوت سے نوازے گئے۔ان کا کاروانِ رسالت دنیا کی ساری برائیوں سے پاک اور تمام خوبیوں سے مرصع زندگی کے ہر شعبے میں اپنی مثال قائم کرتا چلا گیا۔عقائد و افکار میں نمایاں تبدیلی آئی۔سوچ کے دھارے بدلتے چلے گئے۔عبادات کے طور طریقے تو بالکل ہی بدل چکے تھے۔بتوں کو سجدہ کرنے اور ہر در پر جھکنے والا سر اب صرف اللہ کے سامنے جھکتا ہے۔خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ان کی زندگی کا محور و مرکز بن گئی۔اللہ تعالیٰ کے آخری رسولؐ اور ساری انسانیت کے دردمند رہنما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے...... شاید ہی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت پر لکھا گیا ہو۔ہمارے قلم، ہمارے الفاظ ان جیسی عظیم ہستی پر لکھنے سے قاصر ہیں۔ذکرِ سرکارِ دوجہاں کے سبب فضا معطر ہے......ایسی فضائے معطر کے ساتھ اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں جہاں آپ کے محبت نامے اپنی خوشبو بکھیر رہے ہیں۔

پشاور سے **ایمان علی** کی بیتی باتیں...... محبت کی سوغاتیں''جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز سے میرا رشتہ کوئی کل کی بات نہیں ہے لیکن سوچنے بیٹھوں تو کل کی ہی بات لگتی ہے۔ان دنوں پبلک میں سوشل میڈیا کی وبا نہیں پھیلی تھی۔ریڈنگ کا شوق واقعی دل سے نبھایا جاتا تھا۔ان دنوں ڈائجسٹ کی قیمت پندرہ روپے ہوتی تھی لیکن مجھے پچیس روپے خرچنے پڑتے۔چھوٹا بھائی کہا کرتا تھا کہ پانچ روپے آنے کا کرایہ لوں گا اور پانچ روپے جانے کا۔بڑا ہی معصوم اور پُرخلوص دور تھا وہ۔اسی لیے تو اس زمانے کی محبتیں بھی بڑی سچی اور کھری ہوتی تھیں۔جاسوسی سے محبت انہی دنوں کی بات ہے......اس محبت کی انگلی پکڑے میں نے ان رسالوں کا ہر دور دیکھا ہے اور غدا جانتا ہے کہ میری محبت کبھی کم نہیں ہوئی۔مجھے ان لوگوں پر حیرانی ہوتی ہے جو ذرا سی قیمت بڑھنے، صفحات کم ہونے یا کوئی کہانی پسند نہ آنے پر ڈائجسٹ سے قطع تعلقی پر اتر آتے ہیں۔مجھے اس بات پر حیرانی ہوتی ہے کہ یہ کیسی محبت ہے جو ذرا سی مشکل آنے پر ساتھ چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔بھئی! محبت تو محبت ہوتی ہے۔اس میں شرطوں کا کیا کام؟ محبت کا اصل امتحان تو ہوتا ہی تب ہے جب آپ کا محبوب کسی مشکل کا شکار ہو اور آپ اس مشکل میں مکمل وفا نبھائیں۔(آپ کی بات پر ایک شعر یونہی یاد آ گیا۔

دل میں درد آنکھوں میں نمی بن جائیے
اس طرح ملیے کہ جزوِ زندگی بن جائیے

خیر یہ میری ذاتی سوچ ہے۔ضروری نہیں ہر قاری اس سے متفق ہو۔ہر کسی کا محبت کا اپنا انداز ہے۔اگر ان کی محبت سوشل میڈیا کی چکاچوند کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے تو یہ ان کی قسمت۔خیر چھوڑیں ان باتوں کو۔اب کچھ ڈائجسٹ کی بات کر لیں۔اس بار ڈائجسٹ ریکارڈ تاخیر سے ملا اور یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ پہلی دفعہ یہ تاخیر بُری بھی نہیں لگی۔ملک گیر سیلابی صورتِ حال نے سب

پنہ ہی تاپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ پروردگار بس ہمارے ملک پر رحم فرمائے اور حالات میں بہتری فرمائے۔ ٹائٹل نے اس بار بہت ہی کنفیوز کیا اوہ میرا مطلب ہے کنفیوژ کیا۔ ٹائٹل گرل کی پیشانی اور بالوں کی لٹیں مغل صاحب کی ہیروئن تاجور کی یاد دلا گئی۔ لیکن یہ کیا؟ اس کے سر پر دوپٹا ہے یا سڑک اوڑھی ہوئی ہے۔ بالکل سمجھ نہیں آئی۔ اس سے نظر ہٹائی تو ٹائٹل گرل کے واحد دانت نے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ اس ہنسی اور کنفیوژن میں باقی ٹائٹل نظر انداز کر دیا اور چٹپٹی نکتہ چینی کا سرسری سا مطالعہ کیا۔ سبھی نے خوب لکھا لیکن ماورا عالمگیر اور بینا راجپوت سب پر بازی لے گئیں۔ اس کے بعد امجد رئیس کی خونی محافظ پڑھی۔ امجد رئیس کے بارے میں ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے۔ جو نام ہے اعتماد کا۔ ایک اور شاندار اور یادگار تحریر۔ فاطمہ حسام بھی گزشتہ کچھ عرصے سے مختصر لیکن اچھی تحریریں لا رہی ہیں۔ عکس فاطمہ کی بیانِ حلفی ان کی سابقہ تحریروں سے مختلف اور بہت اچھی تحریر تھی۔ سیر ناراض اس بار خلافِ معمول مقامی کرداروں پر مشتمل کہانی لائیں۔ ظافر کا کردار اور انجام دونوں ہی بہت پسند آئے۔ حسام بٹ نے پہلی بار 'وقت' لکھ کر اپنی صلاحیتوں کا قائل کیا تھا۔ دہر کا آغاز بھی اچھا ہے۔ امید ہے سپرہٹ ناول ثابت ہوگا۔ اناڑی اور انجمن اوریج لگیں۔ روبینہ رشید کی شعلہ زن کا ہر ماہ ہی انتظار رہتا ہے۔ شہ مات میں کچھ بھی سسپنس نہیں تھا۔ سب کچھ آغاز سے ہی کلیئر تھا۔ سرورق کے رنگوں میں موت کے بعد...... پسند آئی۔ اسما قادری کی تحریر کا ہر بار ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

نامعلوم مقام سے صائمہ حیدر لکھتی ہیں ''اس دفعہ شمارہ خاصی تاخیر سے ملا۔ فاطمہ صاحبہ کی کہانی اچھی لگی، آخر میں بزرگ ہی ویلن نکلے لیکن پھر بھی برا نہیں لگا، اخلاقیات کے اتنے پابند انسان کو تو چھوٹا موٹا جرم معاف ہونا چاہیے۔ بیانِ حلفی میں منظر نگاری بہت عمدہ تھی۔ ایک دم دل چاہا کہ وہ گھر دیکھوں جہاں یہ واقعات پیش آئے۔ گرمی اور حبس hilltop پر مکان، سمندر یہاں تک کے طوفانی ہواؤں کا تذکرہ بھی اچھا لگا۔ ضمیر صاحب کی باتیں کچھ اول جلول تھیں پر چلیں انہوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا، قاتل کی خودکشی کروا دی۔ کارگزار کے بارے میں کیا عرض کروں، کاش سب پولیس والے اور شہری اتنے ذمے دار بن جائیں تو ہمارے ملک کی آدھی سے زیادہ مشکلات حل ہو جائیں۔ دہر میں بھی آرگن اسمگلنگ کو موضوع بنایا گیا ہے جو کہ کافی ہاٹ ٹوپک ہے مگر کہانی پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ سب کردار مسلسل اور غیر ضروری گفتگو کرنے کے عادی ہیں جیسے کہ سال پہلے فلموں کے سین ہوتے تھے عدالت میں، پولیس اسٹیشن میں یہاں تک کہ مرتے ہوئے بھی تقریر چلتی رہتی تھی...... اس شمارے میں خلیل جبار اور اے آر راجپوت کی کہانیاں حقیقت سے قریب تر لگیں کیونکہ یہ واقعی جاسوسی کہانیاں تھیں، ایکشن تھرلر نہیں...... ایکشن تھرل سے یاد آیا کہ خونی محافظ اچھی لگی، بہت تیز رفتار تھی۔ تیاگ میں پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ کانچی کوئی روح ہوگی۔ اندازے کے غلط ہونے پر خوشی ہوئی لیکن اس کے انجام پر دکھ ہوا۔ جانشین میں دادا کے اپنے پیشے پر اتنے غرور نے بہت متاثر کیا۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو پوتے پر کتنا فخر کرتے۔ زہرا بتول کی کہانی کا انجام خاصا غیر متوقع تھا۔ میلے ہاتھ مزے دار لگی۔ بھٹی صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے ہٹ کر لکھا۔ آخری تحریر شمارے میں سب سے اچھی لگی۔ ہانیہ کے لیے دل دکھی تھا لیکن شکر ہے آخر میں اس کے لیے بہتری کی امید نظر آئی۔''

اسلام آباد سے بقلم بینا راجپوت کے معاملات ''اس مہینے شمارہ طویل ترین انتظار کے بعد موصول ہوا۔ ستمبر کا بائیسواں دن اختتام کے قریب تھا اور مجھ میں اب مزید انتظار کی سکت بھی نہیں بچی تھی جب ڈاک بابو نے ڈائجسٹ میرے حوالے کیا۔ اس بار تو ڈائجسٹ کے لیے میری تڑپ و بے قراری نے راجپوت صاحب کو بھی رقابت کا شکار کر دیا۔ کہنے لگے بیگم کبھی ہمارا تو اس شدت سے انتظار نہ کیا۔ (سوائے معذرت کے کیا کہہ سکتے ہیں حالات نے ہاتھ باندھ دیے تھے) خیر...... سرورق سوشل میڈیا کی مہربانی سے کئی دن پہلے کا دیکھ رکھا تھا اور سچ کہوں تو بے حد عجیب لگا تھا۔ حسینہ کے نیم والبوں سے جھانکتی زبان نے سرورق کا بیڑا غرق کر دیا۔ اگر نیچے والے حصے کو ڈھانپ دیں تو نیلی آنکھوں والی حسینہ اپنی چنری درست کرتے ہوئے کافی پُرکشش لگ رہی تھی (شکر ہے کچھ تو قابلِ قبول تھا) اور دونوں لڑتے بھڑتے بھائی صاحب بھی قابلِ قبول تھے۔ مجموعی طور پر سرورق گزارے لائق تھا۔ نکتہ چینی کی محفل اپنی آب و تاب کے ساتھ دمک رہی تھی۔ پرانے ناموں کے ساتھ کچھ نئے نام بھی شاملِ محفل رہے، سب کے لیے نیک تمنائیں۔ سب کے تبصروں میں ایک پوائنٹ مشترک تھا کہ اگست کا شمارہ زبردست لگا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اتنا اچھا مواد پڑھنے کو ملا۔ اس کے لیے ادارے اور مدیران کی محنت قابلِ تحسین ہے۔ (نوازش) فہرست میں اسما قادری کا نام دیکھ کر سب سے پہلے آخری رنگ موت کے بعد پڑھی۔ اسماجی نے بلاشبہ ایک گنجلک موضوع چنا اور عمدگی سے نبھایا بھی۔ کہانی میں شروع سے آخر تک تجسس برقرار رہا، عمدہ کاوش۔ ہر عمل کا شعوری یا لاشعوری ردِعمل ہماری نفسیات پر ہوتا ہے۔ خاص طور پر بچے بہت حساس ہوتے ہیں، وہ رویوں اور لہجوں کے معمولی بدلاؤ کو بھی محسوس کر لیتے ہیں اور اس کی تلخی کو لاشعوری طور پر اپنے

دماغ میں اسٹور کرتے جاتے ہیں۔ پھر جب شعور کی عمر کو پہنچتے ہیں تو بعض اوقات دوسروں کے لیے خطرناک ہوجاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی بدقسمتی کہہ لیں کہ ہم نفسیاتی بیماریوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں اہمیت دیتے ہیں۔ یہی منصور احمد کے ساتھ ہوا، وہ بچپن میں یتیم ہوگیا۔ پھر ماں کی دوسری شادی اور خودکشی نے اسے نفسیاتی گرہوں کا شکار کر کے قاتل بنادیا۔ اس کہانی کے دوسرے پہلو میں بیواؤں کی شادی کے نکتے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ حقیقت ہے اس بات سے قطع نظر کہ ہمارا مذہب اس مدعے پر کیا کہتا ہے، ہمارے معاشرے میں بیوہ کی دوسری شادی کو بے حد بُرا سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر اگر کوئی کنوارہ لڑکا اس سے شادی کرلے۔ دیگر کئی معاملات کی طرح اس میں بھی ہمیں اپنی سوچ بدلنے کی شدید ضرورت ہے۔ ورنہ معاشرتی پستی وتباہی کی طرف تو ہم پہلے ہی تیزی سے گامزن ہیں۔ (سوچنے کا کام تو ہمیں کرنا نہیں ہے) عبدالرب بھٹی صاحب کی میلے ہاتھ بھی اچھی اور پُرتجسّس تھی۔ شروع میں نگینہ مجرم لگ رہی تھی مگر وہ بے چاری تو وکٹم نکلی۔ دل مراد جیسے لوگ آستین کے سانپ اور احسان فراموش ہوتے ہیں۔ جتنا مرضی دودھ پلا لو ڈسنا اُن کی فطرت ہے۔ زہرا بتول کی شہ مات ایک اور حساس موضوع پر مختصر سی کہانی پسند آئی۔ ہمارا معاشرہ مردوں کے زیرتسلط ہے اور عورت اپنے جائز حق کے حصول کے لیے بھی پابند ہے۔ مرد اپنی ذات میں موجود کمی یا خرابی کو قبول نہیں کرتے اور صرف اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے اپنی بیوی کی کردارکشی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ لیلیٰ صدیقی نے جرأت دکھاتے ہوئے اپنے نام نہاد شوہر سے خلع کا مطالبہ کردیا۔ اگر واصف کریم اپنے عیب کو کھلے دل سے قبول کر کے اس کو طلاق دے دیتا تو اس کی ازدواجی نااہلی کا بھرم رہ جاتا۔ جمال دستی کی جانشین کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ گو کہانی اچھی لکھی ہوئی تھی مگر مرکزی خیال عجیب لگا۔ ایک جیب کترا اپنی وراثت میں ایک دستانہ نما نقلی ہاتھ بنا کر دے جاتا ہے۔ اس کی وصیت کے مطابق وہ چاہتا ہے کہ اس کا پوتا دنیا کا سب سے بڑا چور بنے اور کبھی فنگر پرنٹس کی وجہ سے پکڑا نہ جائے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ فنگر پرنٹس کے لیے اتنے تردّد کی کیا ضرورت تھی جبکہ اس مقصد کے لیے ایک عام سرجیکل دستانوں کی جوڑی کافی ہوتی۔ عمران قریشی کی تیاگ سر کے اوپر سے گزر گئی۔ کہانی کے اغراض ومقاصد کی بالکل سمجھ نہیں آئی۔ اے آر راجپوت کی اُلجھن مزیدار تھی۔ بعض معزز ومہذب لوگ واقعی چوری کرنے کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا یہ راز کبھی ظاہر ہو۔ ڈاکٹر منصور کے ہاتھوں نائلہ کے بھائی کامران کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ خلیل جبار کی اناڑی اچھی تھی۔ سجاد جیسے پست کردار دوستوں سے بہتر ہے کہ انسان اکیلا ہی رہ لے۔ سلمان اپنے اناڑی پن کی وجہ سے سجاد کے قتل کے جرم میں پکڑا گیا۔ فاطمہ حسام کی سرغنہ کافی دلچسپ تھی۔ پا اور اس کا اڈاپٹڈ شادی شدہ جوڑا گروسری اسٹور میں کامیاب ڈکیتی کے بعد اُڑن چھو ہوگیا اور لیدر کی جیکٹ والا نوجوان دیکھتا رہ گیا۔ عکس فاطمہ کی بیانِ حلفی اچھی کہانی تھی۔ ضمیر کی آواز انسان کو ایسے ہی بے چین رکھتی ہے اور کبھی کبھی بیانِ حلفی دینے پر مجبور کردیتی ہے۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے مگر جتنا پڑھا عمدہ تھا۔'' (بہت شکریہ کہ اتنی مختصر مدت میں بھی آپ نے ہمیں خط لکھا)

کراچی سے محمد اقبال کے خیالات ''ستمبر کے جاسوسی نے ستائے جانے کے سارے ریکارڈ توڑ دیے، ستمگر بھی کیا ستم کرتے ہوں گے جو جاسوسی والے اپنے قارئین سے کررہے ہیں۔ انتہا کردی آپ لوگوں نے تو...... (ہم نے نہیں بارشوں اور اس کے ثمرات نے) بہرحال ٹائٹل پر حسینہ کا گھونگٹ نکالنا پوز دیکھ کر ایسا لگا جیسے یہ بھی وفاقی اور صوبائی حکومتی ذمّے داروں کی طرح منہ چھپانے کی کوشش کررہی ہے، آرٹسٹ صاحب نے حسینہ کے ہونٹوں سے ذرا سی زبان نکال کر سارا پوز خراب کردیا ہے۔ ساتھ ہی دو سوٹڈ بوٹڈ نوجوان آنے والی امداد کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش میں برسرِپیکار ہیں۔ فہرست مناسب تھی۔ رواں سال بارشوں اور اس کے بعد سیلاب کی تباہ کاریوں نے پورے ملک کا دیوالیا نکال دیا ہے۔ یہ تو قدرتی آفات تھیں لیکن اس کے بعد جو ہمارے ملک کے کرتا دھرتا ... اور ان کے گماشتے کررہے ہیں الامان الحفیظ۔ ٹی وی چینلز اور سوشل میڈیا بھرا پڑا ہے ان کی نااہلی اور نالائقی سے۔ اور رہی سہی کسر آپ نے اداریے میں پوری کردی۔ ہمارے دل کے سارے پھپھولے پھوڑ دیے۔ ہمارے کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔ اللہ سے ہدایت کی دعا ہی مانگ سکتے ہیں۔ محفل میں ملتان سے انوشے ملک کرسیِ صدارت پر براجمان ہیں۔ ماشاء اللہ سے میڈیکل کی طالبہ ہونے کے باوجود پیارے جاسوسی کے لیے وقت نکال لیتی ہیں ویلڈن۔ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، بات فیورٹ رائٹرز کی نہیں، جن رائٹرز کو میں پسند کرتا ہوں اور بھی بہت سے قارئین انہیں پسند کرتے ہیں وجہ یہی ہے کہ ان کی کہانیوں میں ایک تسلسل ہوتا ہے جو آپ کو کہانی سے باہر نہیں آنے دیتا۔ ہر رائٹر ان باتوں کا خیال نہیں رکھتا۔ اس کی مثال اسی شمارے میں جمال دستی کی جانشین ہے، ایک جیب کترا اپنی وراثت میں ایک دستانہ نما نقلی ہاتھ بنا کر دے جاتا ہے۔ اس کی خواہش دیکھیں کہ اس کا پوتا دنیا کا سب سے بڑا چور بنے اور کبھی فنگر پرنٹس کی وجہ سے پکڑا نہ جائے، کتنی بکواس بات ہے یہ۔ (آپ کی نظر میں ہے نا)

نامعلوم مقام سے صائمہ حیدر اور بورے والا سے راحت قمر اپنے اپنے مختصر خط کے ساتھ حاضر ہوئیں، خوش آمدید، درخواست یہ ہے

کہ مستقل آیا کریں۔ دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ امجد رئیس کی خونی محافظ سے ڈائجسٹ کا مطالعہ شروع کیا۔ اب کیا تعریف کروں، بہترین مزہ آ گیا جناب۔ دوسرے نمبر پر روبینہ رشید کی شعلہ زن پڑھی، واہ سائیں واہ مزہ آ گیا۔ اب لگتا ہے کہ مرکزی کردار یعنی سارہ بھرپور ایکشن میں نظر آئے گی جو پچھلی قسطوں میں کہیں کھو گئی تھی، ساتھ میں ڈاکٹر علی کے مزے دار جملوں کا بھی انتظار ہے۔ تیسرے نمبر پر اسما قادری کی موت کے بعد شروع کی۔ بہترین انداز میں بہت حساس موضوع پر ایک خاص ترتیب سے عمدہ کہانی مرتب کی۔ کہانی کے مرکزی کردار یعنی منصور احمد کی ماں نے دوسری شادی ہی تو کی تھی جس کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ جھوٹی خاندانی اقدار کی آڑ میں اپنی انا کی تسکین کے لیے خاندان کے بزرگ عورت کی دوسری شادی کو نہ تو خود قبول کرتے ہیں اور نہ ہی آس پاس کے لوگوں کو قبول کرنے دیتے ہیں جس کا خمیازہ منصور احمد جیسے بچے بھگتتے ہیں۔ (کسی نہ کسی کو تو بدلنا ہوگا پہلا قدم ہی آگے کے راستے ہموار کرتا ہے) رشتے داروں کے رویّے نے اس کی شخصیت پر کتنا منفی اثر ڈالا کہ اس نے اپنی ساری زندگی کی محنت اپنے ہاتھوں برباد کر لی۔ ویلڈن اسما قادری صاحبہ۔ حسام بٹ کی سلسلے وار دوہرے نے بھی آہستہ آہستہ اپنے قدم جمانے شروع کر دیے ہیں۔ کہانی کے ہیرو یعنی جاسم کے ایکشن مزہ دے رہے ہیں۔ کال اور اس کی ٹیم جاسم کے ساتھ مل کر خوب رنگ جما رہی ہے۔ عبدالرب بھٹی میلے ہاتھ کے ساتھ حاضر تھے عمدہ کہانی ترتیب دی، ویلڈن جناب۔ زہرا بتول حساس موضوع کے ساتھ شہ مات لے حاضر تھیں، لیلیٰ صدیقی کی ہمت کو داد ہے، اچھی تحریر تھی۔ اے آر راجپوت کی الجھن پڑھنے میں مزہ آیا۔ عمران قریشی کی تیاگ، خلیل جبار کی اناڑی، فاطمہ حسام کی سرغنہ، عکس فاطمہ کی بیانِ حلفی اچھی کہانیاں تھیں۔"

کوٹری سے حمیرا رفیق "سرورق پر حسینہ کا گول مٹول خوب صورت چہرہ اچھا لگا لیکن اُن کے ہونٹ اس انداز میں کھلے ہوئے تھے جیسے وہ بھی کچھ کہنا چاہ رہی ہوں۔ (جیسے کہ آپ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں) فہرست اچھی لگی۔ اداریہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہمارے ہی جذبات کی ترجمانی کی جا رہی ہو۔ اس سال بارشوں نے ملک میں جو تباہی مچائی ہے۔ اس سے پورا ملک ہی متاثر ہوا، اور مرے پر سو دُرّے یہ ہوئے کہ سیلاب نے تو ملک کا بیڑا ہی غرق کر دیا۔ جہاں دیکھو تباہی مچی ہوئی ہے۔ بارشوں کے بعد سیلاب نے کھیت کھلیان تو اجاڑے ہی ہیں۔ ان میں کام کرنے والے کسانوں، محنت کشوں کا ہر دوسرا خاندان جانی و مالی نقصان سے متاثر ہوا، بدحالی کا شکار ہوا، اللہ پاک سے دعا ہے کہ اپنی رحمت سے ان کی پریشانیوں کا سدِّباب فرمائے، آمین۔ جاسوسی ڈائجسٹ بہت مشکلوں سے ہم تک پہنچا۔ اس کی وجہ یقیناً زمینی راستوں کی بندش ہی ہو سکتی ہے، بہرحال بھائی نے اپنے کسی دوست سے کراچی سے منگوا کر اپنی جیب خرچی کا انتظام کر ہی لیا۔ اسما قادری جاسوسی ڈائجسٹ کی زینت بنیں اور ہم ان کی کہانی کو نظر انداز کر جائیں، یہ ہو نہیں سکتا۔ ہمارے معاشرے کے حساس ترین موضوع پر بہترین کہانی ترتیب دی۔ بے جا گھمنڈ، انانیت انسانیت کا نقصان ہی کرتی ہے جیسا کہ اس کہانی میں منصور احمد کے ساتھ ہوا، ایک معصوم بچہ جسے کسی چیز کے اچھے بُرے کا معلوم نہیں ہوتا، وہ تو بس معصوم ہوتا ہے، خاندان کے بزرگوں کی انانیت کی وجہ سے اس کی شخصیت کتنی متاثر ہوئی اور اس کا انجام بالآخر کیا ہوا۔ وقت کی کمی کے باعث چھوٹی کہانیاں ہی پڑھ سکی ہوں۔ عبدالرب بھٹی کی میلے ہاتھ اچھی لگی۔ زہرا بتول کی شہ مات عمدہ تحریر تھی۔ جمال دستی کی جانشین سر پر سے گزر گئی، کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ عمران قریشی کی تیاگ ایوریج تھی۔ اس کی کوفت اے آر راجپوت کی الجھن نے دور کی۔ شاندار کہانی تحریر کی راجپوت صاحب نے۔ خلیل جبار کی اناڑی بھی اچھی تحریر تھی۔ فاطمہ حسام کی سرغنہ نے بھی متاثر کیا۔ عکس فاطمہ کی بیانِ حلفی اچھی کہانی تھی۔ سلسلے وار کہانیوں پر آئندہ ماہ تبصرہ کروں گی۔" (منتظر رہیں گے)

کراچی سے ارسلان بدر اس طرح گویا ہیں۔ "اس سے پہلے متعدد بار خطوط کی محفل میں شامل ہونے کی کوشش کی اور اپنا قیمتی تبصرہ بھیجا مگر معلوم نہیں کس بنا پر شائع نہیں ہوا۔ (بہت زیادہ قیمتی چیزوں کو ہم اٹھا کے رکھ لیتے ہیں) کہانی کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ معیاری نہیں تو شائع نہ ہو سکی لیکن کہانیوں پر تبصرہ تو شائع ہو سکتا ہے۔ (یقیناً) بہرحال پھر اس امید کے ساتھ تبصرہ بھیج رہا ہوں کہ شاید اس بار شرف باریابی حاصل ہو جائے۔ (انشاء اللہ) پچھلے ماہ ملک میں جو سیلابی صورت حال رہی اس کے اثرات اب تک نظر آ رہے ہیں۔ ہمارے اربابِ اختیار کو بس صرف اپنی سیاست نظر آ رہی ہے، اس سے باہر وہ نہ تو کچھ کر رہے ہیں اور نہ ہی کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ سیلاب زدگان کی مشکلات کا انہیں احساس ہی نہیں۔ مشکل کی اس گھڑی میں بس کچھ فلاحی تنظیمیں اپنے محدود وسائل کے ساتھ سیلاب زدگان کی دادرسی کے لیے سرگرم نظر آ رہی ہیں۔ اللہ پاک بے کسوں اور مجبوروں پر رحم فرمائے اور ان کی مشکلات کو ختم کرے، آمین۔ ماہ ستمبر کا جاسوسی ڈائجسٹ اس بار بہت لیٹ ملا۔ اس کی وجہ شاید سیلاب کے باعث ذرائع آمد و رفت کا محدود ہو جانا ہو۔ (یہی وجہ ہے) خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ پرچہ بہت اچھا رہا۔ سب سے پہلے اپنا پسندیدہ ناول شعلہ زن پڑھا۔ ہر بار پچھلی قسط سے زیادہ سسپنس سے بھرپور واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ویلڈن

ردبینہ رشید۔ حسام بٹ کی نئی سلسلے وار کہانی دہرا ابھی اپنا رنگ نہیں جما سکی۔ آئندہ کی اقساط میں کہانی بہتر ہونے کی امید ہے۔ دولت کمانے کا ہنر جاننا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی اتنا آسان ہے۔ اگر یہ ہنر بچپن سے ہی آپ کے پاس ہے تو بس پھر کیا ہی بات ہے۔ (واہ کیا بات ہے) جمال دستی کی کہانی جانشین میں یہ سب پڑھنے کو ملا۔ اچھی کہانی تھی، پسند آئی۔ عکس فاطمہ کی بیان حلفی نے متاثر کیا۔ کہانی کا پلاٹ مضبوط تھا اور واقعات کے تسلسل نے کہانی کو چار چاند لگا دیے۔ بہترین زندگی کی خواہش میں سب کچھ تیاگ دینے والی کی حسرتِ ناتمام عمران قریشی کی تیاگ میں پڑھی۔ بہترین کہانی رہی۔ عمران قریشی کی اچھوتے موضوع پر تحریر کردہ کہانیاں مجھے بہت پسند ہیں، ویلڈن۔ فاطمہ حسام کی سرغنہ میں ایک تجربے کار بوڑھے کا احوال پڑھنے کو ملا۔ کہانی بس سو سو تھی۔ خلیل جبار کی اناڑی کچھ خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ شاطر محبوب کی چالبازی زہرا بتول کی شہ مات میں پڑھی۔ اچھی کہانی تھی۔ عبدالرب بھٹی کے قلم سے تحریر کردہ میلے ہاتھ سسپنس سے بھرپور واقعات پر مبنی عمدہ کہانی ثابت ہوئی۔ پسند آئی۔ اسما قادری کی موت کے بعد بھی عمدہ تحریر تھی۔ مجموعی طور پر ماہ ستمبر کا شمارہ کہانیوں کے انتخاب کے لحاظ سے بہترین رہا۔'' (پسندیدگی کا بے حد شکریہ......اب آتے رہیے گا......)

راولپنڈی سے نگاہِ حسیب کے اعتراضات ''پچھلے کئی ماہ سے چند ذاتی وجوہات کے باعث ڈائجسٹ سے کچھ دوری رہی، اس ماہ ڈائجسٹ لینے کا ارادہ کیا تو تاخیر ہی سے سہی مگر مل گیا۔ سرورق کی فربہی مائل حسینہ کچھ مصنوعی سی نظر آئیں، خاص طور پر ہونٹوں اور انگلیوں کی بناوٹ نے عجیب سا تاثر دیا۔ چینی نکتہ چینی میں حسب سابق پرانے تبصرہ نگار اپنے بھرپور اظہارِ خیال کے ساتھ براجمان نظر آئے۔ آنکھوں کے درد اور پانی بہنے کی شکایت کے سبب مکمل شمارہ تو نہ پڑھا جا سکا مگر جو چند تحاریر پڑھیں، ان پر میری ناقص رائے حاضر ہے۔ فاطمہ حسام کی سرغنہ مختصر مگر دلچسپ تحریر رہی۔ مختصر تحاریر کا اختتام چونکا دینے والا ہو تو پڑھنے والا بے اختیار داد دیتا ہے۔ عکس فاطمہ کی بیان حلفی ایک منفرد انداز میں لکھی گئی تحریر رہی مگر اس کا انجام ابتدا میں ہی کسی حد تک قاری پر واضح ہو چکا تھا اس لیے کچھ خاص تاثر قائم نہیں ہو سکا۔ سیر ینا راض کی کارگزار جاسوسی کی مد میں ایک اچھا اضافہ تھی، اگرچہ ظافر نے اپنے فطری سراغ رسانی کے جذبے کے تحت ساری کارروائی کی مگر بہر حال یہ ایک بے حد خطرناک اقدام تھا۔ کسی بھی اجنبی شخص کے لیے کوئی اس طرح اپنی جان مصیبت میں نہیں ڈالتا مگر خیر یہ تو ایک تحریر تھی اور کافی اچھی لکھی گئی تحریر تھی۔ سیر ینا راض کافی اچھا لکھتی ہیں۔ خلیل جبار کی اناڑی دلچسپ تحریر رہی۔ قتل کی انوکھی واردات جس کے قاتل کی تلاش میں کوئی خاص مشکل اگرچہ ... درپیش نہیں آئی۔ ویسے مجھے شروع سے ہی قاتل پر شبہ ہو گیا تھا، (آپ کے پاس نگاہِ حسیب ہے۔ کچھ کیسے چھپا رہ سکتا ہے) اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص بالکل بے قصور نظر آ رہا ہوتا ہے آخر میں وہی ساری کارروائی کا ذمے دار ٹھہرتا ہے۔ بہت اچھی کوشش تھی۔ اے آر راجپوت کی الجھن پڑھ کر میں تو تا حال الجھن میں ہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ چوری کی پُراسرار واردات کو قتل سے ملحق کر دینے اور بے حد ڈرامائی سچویشن بنا دینے کے باوجود اختتام کا کیا مقصد تھا؟ صرف قاتل کا نام بتا دینا تو کافی نہ تھا، اس پُراسرار چور اور قاتل کے عزائم و مقاصد پر بھی کچھ نظر کی جاتی تو تحریر میں جان آ جاتی۔ (متوجہ ہوں راجپوت صاحب!) جمال دستی کی جانشین پڑھ کر جہاں دادا کی انوکھی اور چونکا دینے والی وصیت کا ادراک ہوا وہیں تحریر کا آخری جملہ پڑھ کر محض ایک ہی فقرہ زبان سے ادا ہوا یعنی کہ بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ...... مختصر مگر دلچسپ تحریر رہی، بہت خوب۔ سرورق کی پہلی تحریر، جناب عبدالرب بھٹی صاحب کی میلے ہاتھ پڑھنا شروع کی تو ابتدا میں اس کی پُراسراریت نے دلچسپی کو ابھارا۔ جہاں بار بار قتل کی مختلف وارداتوں میں نگینہ پر شک کا دائرہ تنگ محسوس ہونے لگا وہیں اصل قاتل کی طرف دھیان بھی نہ گیا۔ جب دونوں بہن بھائیوں کی بحث ہو رہی تھی اس وقت بھی یہی اندازہ ہوا کہ وہ دونوں کسی سازش میں ملوث ہیں مگر حقیقت جان کر کافی حیرت ہوئی۔ سرورق کی دوسری تحریر اسما قادری صاحبہ کی موت کے بعد...... پورے شمارے کی جان محسوس ہوئی۔ مصنفہ کے جاندار اور رواں اندازِ تحریر کے ساتھ ساتھ تحریر کا پلاٹ بھی دلچسپ رہا۔ کہانی کے ایک اہم کردار کی ابتدا ہی میں موت اور پھر اس کے قتل کی تحقیقات کے سلسلے میں جس طرح ایک ذہنی مسائل سے دوچار شخص کی کہانی منظرِ عام پر لائی گئی، وہ پڑھے جانے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب ماضی کے جھروکوں سے چند مناظر دکھائے گئے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ کہانی اتنی سادہ نہیں جتنی نظر آ رہی ہے بلکہ قتل کے محرکات کچھ اور ہیں۔ ایک بہت ہی جاندار انداز میں منفرد سی تحریر پڑھنے کو ملی تو بہت اچھا تاثر قائم ہوا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آمین۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔
ندیم بلوچ، کراچی۔ شہباز اقبال، کراچی۔ محمد سمیع خان، کراچی۔

فتح یاب

یعقوب بھٹی

جاسوسی کی روایت..... اولین صفحات کی شاندار سوغات

دورِ جدید ہو یا دورِ جاہلیت مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کی سازشیں آج بھی اسی طرح جاری و ساری ہیں... وہ مکمل یگانگت اور سفاکیت کے ساتھ اہلِ اسلام کے خاتمے کے لیے صف آرا ہیں... گھر کو گھر کے چراغ سے بھسم ہونے کا سلسلہ کسی روایت کے مانند ہمارا پیچھا کرتا چلا آرہا ہے... اسلام کے خلاف عیسائیوں اور یہودیوں کی سازشوں کے جال وقت کے ساتھ باریک سے باریک تر تار سے بُنے جارہے ہیں... ان کی دماغی صلاحیتیں ہماری نسل کو نیست و نابود کرنے کا ہدف بڑی تیزی سے عبور کررہی ہیں... سر سے پائوں تک موت کو اوڑھے ایسے ہی گمنام شہزادوں کی بے نام وفائیں... محبت یا نفرت کے جذبوں سے ہٹ کر جنون ان کا زادِ راہ بن چکا تھا۔ آخری فتح کا وقت قریب تھا... فتح یا شکست اس کا فیصلہ مقدر کے ہاتھوں میں تھا...

حسن و عشق کی منزلیں اور انتقام کی آگ میں جلتے شعلہ خواروں کی سنسنی خیز داستان حیرت

اینی شاویز کی آنکھ کھلی تو اس نے دوبارہ سے آنکھیں موندلیں۔ گزری شب اس کے لیے کسی حسین خواب کے مانند تھی۔ اسے ڈر لگا کہ آنکھیں کھولتے ہی خواب ٹوٹ جائے گا۔

چند لمحے وہ خاموش لیٹی رہی۔ خود کو یقین دلانا مشکل ہورہا تھا کہ یہ خواب نہیں ہے۔ ڈرتے، ڈرتے اس نے نہایت آہستگی سے الپس کو چھوا۔ وہ بھی بستر پر اس کے ساتھ تھا۔

اینی نے مکمل آنکھیں کھول دیں۔ بیڈروم کی بڑی سی کھڑکی کے آگے دبیز پردہ پھیلا ہوا تھا مگر اس کے عقب میں روشنی سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ سورج خاصی بلندی پر آچکا ہے۔ بیڈروم میں روشنی کے انعکاس کے سبب سب کچھ واضح نظر آرہا تھا۔

الپس کی نیند میں خلل نہ ڈالنے کی کوشش کے ساتھ وہ بے حد آہستگی سے کہنیوں کے بل اٹھی تو چادر کے سرکنے کے سبب اس کے کندھے عریاں ہوگئے۔ اس نے چادر کندھوں تک کھینچتے ہوئے کہنی تکیے پر ٹکائی اور اپنا رخ الپس کی طرف کرلیا۔

نصف سینے تک چادر اوڑھے وہ چت لیٹا تھا۔ اینی، اسے دیکھے گئی۔ بے حد سیاہ اور چمک دار بالوں کا ایک گچھا اس کی سرخ و سفید پیشانی پر پڑا جیسے بوسہ لے رہا تھا۔ تیکھی کھڑی ناک، گھنی بھوؤں کے نیچے ساحر آنکھیں جو اس وقت بند تھیں۔ مضبوط ٹھوڑی، سرخ ہونٹ اور پُرگوشت کشادہ شانے......وہ واقعی کسی یونانی دیوتا کے مانند مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ اسی سبب تو اینی نے اسے ''الپس'' کا نام دیا تھا۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' اچانک بند آنکھوں کے ساتھ الپس کی توانا آواز ابھری۔

اینی نے چونک کر اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ''تم جاگ رہے تھے؟'' اس کی مخصوص مہک کے سبب اینی کی

آواز خوابناک سی ہوگئی تھی اور اس کی استخوانی انگلیاں الپس کے سینے کے بالوں میں سرسرانے لگیں۔

''ہاں...... میرے سوال کا تم نے جواب نہیں دیا۔''

الپس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔

اینی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''خود کو یقین دلا رہی تھی کہ یہ خواب نہیں ہے۔''

الپس نے آنکھیں کھولتے ہوئے دھیرے سے اُس کے رخسار پر چپت لگائی۔ ''شاید تم بھول گئی ہو کہ مجھے قنوطیت سے نفرت ہے۔ بارہ گھنٹوں میں دوسری دفعہ تم نے وعدہ خلافی کی ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں اس طرح تم مجھے کھو دو گی۔''

اینی نے ڈوبتے دل کے ساتھ اس سے جلدی سے معذرت کی اور یقین دلایا کہ وہ آئندہ اس طرح کی گفتگو نہیں کرے گی۔

الپس نے اس کے روکھے اور اُجڑے ہوئے گھونسلے کے مانند بالوں کو چوما۔ ''میں آخری دفعہ یقین کر رہا ہوں۔'' اگلے لمحے اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''میں فریش ہو کر تمہارے لیے ناشتا بناتا ہوں۔''

اینی نے کہا۔ ''تم فریش ہو جاؤ لیکن ناشتا میں بناؤں گی۔''

الپس اٹھتا ہوا پھر لیٹ گیا۔ ''ٹھیک ہے تو پھر فریش بھی پہلے تم ہو جاؤ۔''

اینی نے نیچے پڑا نائٹ گاؤن پہنا اور بستر چھوڑ دیا۔

یہ ایک کمرے کا مختصر سا فلیٹ تھا جو اینی کی ملکیت تھی۔ الپس پہلی دفعہ یہاں آیا تھا۔ اس نے تنقیدی نظروں سے اکلوتے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز سے بے ترتیبی نمایاں تھی۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹے اور راکھ سے اوپر تک بھری ہوئی تھی۔ استعمال شدہ کھانے کے برتن، میلے کپڑے اور انواع و اقسام کے شاپنگ بیگ آرام دہ فرشی بستر کے گرد بکھرے ہوئے تھے۔ اس ساری بے ترتیبی کے درمیان ایک بے حد قیمتی اور جدید ترین لیپ ٹاپ جگمگا رہا تھا۔ لیپ ٹاپ دیکھ کر الپس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوگئی۔

ویڈیو گیم ایرینا میں ہونے والی پہلی ملاقات ہی ویک اینڈ پر الپس کو اینی کے بستر پر لے آئی تھی۔

واش روم سے نکلتے ہی اینی نے سگریٹ سلگا لی اور کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا۔ پورا کمرا روشنی سے بھر گیا۔

الپس نے چادر لپیٹے ہوئے بستر چھوڑ دیا۔

اینی نے جلدی جلدی کش لیتے ہوئے ڈھونڈ کر اپنا چشمہ لگایا اور بولی۔ ''کیا بناؤں تمہارے لیے؟''

''جو جی چاہے بنا لو، جیسے مجھے اپنا دیوانہ بنا لیا ہے۔'' یہ کہہ کر الپس واش روم میں گھس گیا۔

کچن کی جانب بڑھتے اُس کے قدم رک گئے۔ اینی کا رخ دیوار میں نصب قدِ آدم آئینے کی جانب ہو گیا۔ اس نے اس سے پہلے بھی گھنٹوں خود کو لباس اور بے لباس...... آئینے میں دیکھا تھا۔ آئینے نے ہمیشہ یہی کہا تھا کہ وہ کسی بھی پہلو سے خوب صورت یا پُرکشش نہیں ہے۔ چھ فٹ کے قریب قد، ڈھانچے نما جسم، ڈھلکے کندھے، واجبی سے نقوش اور اُجڑے گھونسلے کے مانند مختصر بال۔ وہ یونیورسٹی کی طالبہ تھی مگر صنفِ مخالف والا خانہ خالی تھا۔ اس کی زندگی میں بمشکل چند ہی مرد آئے تھے۔ باپ کی عمر کا ٹیچر، نائٹ واچ مین وغیرہ۔

اینی گہرا سانس لیتے ہوئے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ یا تو آئینہ جھوٹا تھا یا پھر الپس...... دل نے فوراً سرزنش کی۔ الپس کی وارفتگی اور گرمجوشی یاد آئی۔ وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اینی جیسے ہواؤں میں رقص کرتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

ناشتے کے بعد الپس نے کہا۔ ''میرا ارادہ آج داؤدی ٹیلوں کی سیر کا ہے۔ سنا ہے غرقد کی شجرکاری کے بعد ان بے آب و گیاہ ٹیلوں کی شکل ہی بدل گئی ہے۔''

اینی نے کہا۔ ''ٹھیک سنا ہے تم نے مگر اس طرف جانے والا راستہ غیر ہموار ہے۔ رینٹ پر فور وہیل گاڑی لینی پڑے گی۔''

الپس نے بے پروائی سے کہا۔ ''تو کیا ہوا...... میں دنیا کی سیر کرنے کے لیے نکلا ہوں۔ میری جیب میں خاصے پیسے ہیں۔''

اینی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے صرف تمہیں آگاہ کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

اینی اٹھلائی۔ ''ویک اینڈ ہے۔ لازمی بات ہے میں ساتھ چلوں گی تمہارے۔''

اینی نے رینٹ پر گاڑیاں سپلائی کرنے والی ایک ایجنسی کو فون کر دیا۔ فور وہیل گاڑی کے آنے تک وہ دونوں جا کر ہوٹل سے الپس کا سامان لے آئے تھے۔ یہ اُن کے درمیان رات ہی طے ہو گیا تھا کہ جب تک الپس تل ابیب میں ہے، اس کا قیام اینی کے فلیٹ پر ہی ہوگا۔

ایک سپر اسٹور سے انہوں نے کچھ پھل اور جوسز وغیرہ

بھی خرید لیے تھے۔ ہر جگہ اینی اور ایلس کو دیکھ کر چہروں پر ذو معنی مسکراہٹیں دوڑ جاتی تھیں۔ خواتین اشاروں سے ایک، دوسرے کو اس بے جوڑ ''جوڑی'' کی طرف متوجہ کرتی تھیں۔

اس بات کو محسوس کر کے اینی شدید احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی تھی۔ اس پر قنوطیت کا حملہ ہوتا مگر ایلس کی ناراضگی کے خوف سے وہ اپنی کیفیت پر خود اعتمادی کا دکھاوے کا پردہ ڈال دیتی تھی۔

البتہ ایلس معنی خیز مسکراہٹوں اور اشاروں کو قطعی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ الٹا ان لمحوں میں وہ...... اینی کو اور زیادہ قریب کر لیتا تھا۔

اینی کو بھی اس وقت بہت اچھا لگتا تھا جب لڑکیاں ایلس کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتیں اور اینی کو حسد و رشک سے دیکھتی تھیں۔

فور وہیل گاڑی آ چکی تھی۔ اس کی چھت کو فولڈ کیا جا سکتا تھا۔ خوشگوار موسم کے سبب ایلس نے چھت کو فولڈ کر دیا۔ راستے میں ایک فلاور شاپ سے ایلس نے اینی کے لیے پھول خریدے۔ ٹیولپ برڈ نامی یہ پھول فلسطین کے ایک مخصوص علاقے میں پیدا ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ دنیا میں کہیں نہیں پائے جاتے تھے اور خاصے مہنگے تھے۔ اینی ننھے ننھے پرندوں کی شکل والے ان بے حد سرخ پھولوں کو پا کر بے حد خوش ہو گئی تھی۔

اینی نے محسوس کیا کہ ان پھولوں سے اُمڈتی خوشبو بے حد مسحور کن تھی۔ اس خوشبو نے وجود میں سوئی نہ جانے کون سی خفتہ حِسوں کو جگا دیا تھا کہ اینی خود کو بے حد چست اور توانا سی محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ کچھ تو خاص تھا ان پھولوں میں' دنیا ایسے تو ان کی دیوانی نہیں تھی۔

نصف گھنٹے سے کچھ زائد وقت میں وہ داؤدی ٹیلوں تک پہنچ گئے۔ یہ اونچے، نیچے ٹیلے خاصے وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ کبھی بے آب و گیاہ ہوتے تھے مگر آبپاشی کے جدید ترین طریقوں سے غرقد کی شجرکاری کے سبب ان کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ پورا علاقہ سرسبز ہو گیا تھا۔

اس علاقے میں ابھی سیاحت کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔ بہت سی عمارتیں ابھی تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھیں اس لیے اس طرف کا رخ کرنے والے سیاح کھانے، پینے کی اشیا بھی ساتھ لے کر ہی آتے تھے۔

پارکنگ کے لیے مخصوص جگہ پر گاڑی کھڑی کر کے ایلس نے بڑی سی باسکٹ اٹھالی جس میں کھانے، پینے کی اشیا کے علاوہ نیچے بچھانے کے لیے پلاسٹک کی چٹائی وغیرہ تھی۔

اینی کے ہاتھوں میں ٹیولپ برڈ تھے جنہیں وہ بار بار سونگھ رہی تھی اور اس کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ ان دونوں کے علاوہ اور بھی بہت سے سیاح آئے ہوئے تھے۔

وہ دونوں کافی دیر گھومتے رہے۔ اونچے، نیچے ٹیلوں پر اترنا اور چڑھنا ایک تھکا دینے والا مگر ایڈونچر پسندوں کے لیے دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس دوران انہوں نے محفوظ کیے گئے آثارِ قدیمہ بھی دیکھے۔ دو گھنٹوں میں ہی اینی تھک گئی۔ اس کے قدم سست ہو گئے۔ اس دوران اس نے محسوس کیا کہ ایلس ابھی تک چاق و چوبند تھا۔ تھکن جیسے اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ ایلس توانائی سے بھرپور مرد ہے۔

ایلس نے محسوس کر لیا کہ اینی تھک چکی ہے مگر اس کی تلاش جاری رہی۔ اینی تھکن کو چھپائے اس کا ساتھ دیتی رہی۔ آخر ایلس کو ایک خاص جگہ نظر آ گئی۔ یہ ایک کسی قدیم مٹی کی عمارت کا کھنڈر تھا جس کی کئی دیواریں ابھی سلامت تھیں۔ سلامت دیواروں میں لاتعداد سوراخ نظر آ رہے تھے۔

ایلس نے اینی کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔ ''تمہاری تھکن اب چھپائے نہیں چھپ رہی۔''

اینی نے اس کے کندھے پر سر گرایا، یہ گویا ان الفاظ کی تصدیق تھی۔

ایلس نے فوراً باسکٹ میں سے پلاسٹک کی چٹائی نکال کر ایک ہموار جگہ پر بچھائی۔ اینی فوراً ہی ڈھیر ہو گئی۔ ایلس نے باسکٹ میں سے اینی کا پسندیدہ انرجی ڈرنک نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور اپنے لیے پانی کی بوتل نکال لی۔

اینی نے دو گھونٹ لے کر ایلس کی اجازت سے سگریٹ سلگا لی۔ ایلس نے محض دو گھونٹ لے کر بوتل بند کر دی۔ اینی نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نہ جانے کون سی مٹی سے بنے ہوئے ہو۔''

ایلس نے سامنے قدیمی مٹی کے ڈھیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس مٹی سے بنا ہوں۔''

اینی، اس کی آنکھوں میں ہی دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے اس کی آنکھیں اور لہجہ ہم آہنگ ہو کر ایسا روپ دھار گیا تھا کہ اینی کے وجود میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اسے ایلس سے بے حد خوف محسوس ہوا مگر اگلے ہی لمحے ایلس اپنے پرانے روپ میں واپس آ گیا تھا۔ اس نے اینی کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچا تو اینی نے سگریٹ دور پھینک دی۔

''سارے انسان مٹی سے ہی بنے ہیں۔''
اس کی قربت نے اینی کے دماغ کی سلیٹ پر نمودار ہونے والی آڑھی ترچھی لکیریں پل بھر میں مٹا دیں۔ الپس نے اس کے کان کے قریب مخمور سرگوشی کی۔
''تم تھک گئی ہو، تمہارا مساج کر دیتا ہوں۔''
آس پاس کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اینی اس کے قریب سمٹ آئی۔ ''اس کی ضرورت نہیں مگر مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔ سامنے سوراخ دیکھ رہے ہو، یہاں سانپ ہو سکتے ہیں اور دنیا کا زہریلا ترین نیلا کوبرا بھی اس جگہ پر پایا جاتا ہے۔''
الپس نے اس کی پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ''میری موجودگی میں تمہیں کسی سانپ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
اینی کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔
الپس نے احتیاط کے ساتھ ٹیولپ برڈ کے پھول اٹھائے اور انہیں تھوڑی دور ایک پتھریلی جگہ پر اچھال دیا۔
رات کی مصروفیات اور ٹیلوں کی تھکا دینے والی سیاحت کے سبب اینی نیند کی آغوش کی جانب بڑھ رہی تھی۔ الپس کی قربت نے اس سفر کی رفتار مزید تیز کر دی۔
تھوڑی ہی دیر میں اینی دھیمے دھیمے خراٹے لے رہی تھی۔
الپس کی نظریں گرد و پیش کے ساتھ ساتھ ٹیولپ برڈ پر تھیں۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ہوا کا رخ موافق تھا۔ تھوڑی دیر میں کچی دیوار کے قریب ایک برق رفتار نیلے رنگ کی دھاری سی نظر آئی جو پل بھر میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ الپس نے آدھے لیٹر کی پانی کی بوتل کو ڈھکنے کی طرف سے پکڑ لیا۔
چند پل مزید گزرے تو نیلے رنگ کی دو برق رفتار لکیریں ٹیولپ برڈ کے قریب نظر آئیں۔ ان میں سے ایک لکیر قدرے باریک اور دوسری خاصی موٹی تھی۔ یہ دنیا کے زہریلے ترین نیلے کوبرا کا جوڑا تھا جسے ٹیولپ برڈ کی مہک وہاں کھینچ لائی تھی۔
یہ جوڑا ان پھولوں کے گرد لپٹ کر اٹھکیلیاں کرنے لگا۔
موقع میسر آتے ہی پانی کی بوتل الپس کے ہاتھ سے گولی کے مانند نکلی۔ نشانہ بے خطا تھا۔ پانی سے بھری بوتل برق کی رفتار سے نر کوبرا کے سر سے ٹکرائی۔ بوتل اور پتھریلی سطح کے درمیان اس کا سر پچک کر رہ گیا۔ مادہ پل بھر میں وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔ مضروب نر وہیں پٹخنیاں لے رہا تھا۔
الپس نے اینی پر نظر ڈالی۔ بوتل، پتھریلی جگہ سے ٹکرانے کی آواز نے اس کی نیند میں ذرا بھی خلل نہیں ڈالا تھا۔
الپس نے اٹھ کر جیبی چاقو کی مدد سے نیلے کوبرے کا سر سمیت نصف فٹ کا حصہ محفوظ کر لیا اور باقی ماندہ جسم کو ایک گڑھے میں پھینک دیا۔

☆☆☆

واپس آنے کے بعد الپس ایک کتاب لینے کے لیے باہر نکل گیا۔ چوراہے سے اس نے ٹیکسی لی اور پندرہ منٹ کے سفر کے بعد اسمال انڈسٹری ایریا میں آ گیا۔ ایک ویران سڑک پر چلتے ہوئے اسے مطلوبہ کوڑے کا ڈرم نظر آیا جس پر پندرہ نمبر لکھا ہوا تھا۔ مطلوبہ تاریخ اور ٹائم ہو گیا تھا۔
قریب سے گزرتے ہوئے الپس نے ڈرم میں نظر ڈالی۔ ایک پرانا سا خاکی لفافہ اوپر ہی اوپر پڑا ہوا تھا۔ الپس آگے نکلتا چلا گیا۔ سو قدموں بعد وہ واپسی کے لیے مڑا۔ گرد و پیش پر اس کی گہری نظر تھی۔ ڈرم کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ چھوٹا سا خاکی لفافہ اس کی جیب میں منتقل ہو گیا تھا۔
قریب ہی ایک پبلک ٹوائلٹ میں گھس کر اس نے لفافہ کھول لیا۔ لفافے میں مخصوص زبان میں تحریر ایک کاغذ اور ایک پاسپورٹ سائز تصویر تھی۔ تصویر ایک پچکے ہوئے گالوں والے نوجوان کی تھی۔ کاغذ کے مندرجات پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے تصویر اور کاغذ کو لائٹر جلا کر آگ دکھائی اور پھر راکھ کو فلیش میں بہا کر باہر نکل آیا۔
راستے میں رک کر اس نے سینما سے دو ٹکٹوں کی ایڈوانس بکنگ کروائی اور واپس لوٹ آیا۔
اینی رات کے لیے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ الپس نے اسے منع کر دیا اور بتایا کہ مطلوبہ کتاب تو نہیں ملی تھی مگر وہ ہالی ووڈ کی نئی رومانوی فلم کی دو عدد ٹکٹیں لے آیا تھا۔ یہ سن کر اینی بے حد خوش ہو گئی تھی۔ رات کے کھانے کا پروگرام بھی باہر ہی کا بن گیا۔

☆☆☆

الگور کا تعلق اسرائیل کی اسپیشل سروسز کے ایک بے حد خاص یونٹ سے تھا۔ وہ دو دن پہلے ہی تل ابیب آیا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ تل ابیب میں یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ دو دن سے وہ مسلسل ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور مسرت کے ایک

ایک پل کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔

الگور کی اگلے دن واپسی تھی۔ ایک یادگار شام کے لیے اس نے اپنی گرل فرینڈ لورین کے ساتھ سینما میں ایک فلم دیکھنے کا پروگرام پہلے ہی سے ترتیب دے دیا تھا۔ اس رومانوی فلم کی ریلیز سے پہلے ہی دھوم مچی ہوئی تھی۔

نیم تاریک ہال میں لورین کی خوشبودار قربت میں بیٹھ کر فلم دیکھنے کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔ فلم دیکھنے کے بعد الگور اور لورین ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ الگور جینز اور ٹی شرٹ میں تھا۔ اچانک ہی الگور کے حلق سے تیز سسکاری کی آواز نکلی۔ بازو کے اوپری حصے پر تیز چبھن کے ساتھ جلن کا احساس ہوا۔ الگور نے بے اختیار بازو پر ہاتھ مارا۔ کوئی چیز اس کے ہاتھ سے لگ کر نیچے گر گئی۔ الگور کے دماغ میں خطرے کا بے حد تیز الارم بجا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ اسے نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ٹکرا کر نیچے گرنے والی سوئی تھی جو یقیناً زہریلی تھی۔ جلن کا احساس پل بھر میں ہزاروں گنا بڑھ گیا۔ الگور کو محسوس ہوا اس کا سارا جسم جیسے فولاد پگھلانے والی بھٹی میں گر گیا ہے۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا مگر حلق خشک تر ہو چکا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور تڑپنے لگا۔ لورین نے بے اختیار اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر الگور کے منہ اور ناک سے خون نکلتا دیکھ کر وہ چیخنے لگی۔ لوگ تیزی سے ان کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔

الگور ماہیِ بے آب کے مانند تڑپ رہا تھا۔ اذیت کا احساس اتنا شدید تھا کہ الگور کو اپنا ایک ایک ریشہ پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ریسکیو کی ایمبولینس آنے تک الگور نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی تھی۔ اردگرد موجود لوگ اس کی بے پناہ اذیت کو بے حد بے بسی کے ساتھ محسوس کرتے رہے تھے۔

لورین اپنے محبوب کے قریب بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

☆☆☆

موساد کے داخلی سلامتی کے ڈیسک آفس میں سوگ کا سا سماں تھا۔ ڈیسک انچارج کرنل بالڈون تھا۔ وہ آفس میں سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے اس کے دو نائبین بھی گم صم سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کا نام لائیڈ تھا۔ تمتماتے چہرے پر بھوری مونچھیں اسے خاصا رعب دار بنا رہی تھیں۔ دوسری نائب ایک سنہری بالوں والی حسینہ شیزل تھی۔

شیزل نے بالوں کو مٹھی میں بھینچتے ہوئے کہا۔ ''کون ہے جو ہمارے دفاعی حصار کو توڑ کر اندر گھس آیا ہے۔ سبکی کا احساس مجھے اندر سے کاٹ رہا ہے۔ ہیڈ کوارٹر بے حد برہم ہے۔''

لائیڈ نے بات آگے بڑھائی۔ ''الگور کے قاتل کو تختہ دار پر کھینچنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے حصار پر بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ ہمارا ایلیٹ کلاس کا کمانڈو مارا گیا ہے اور وہ بھی اپنے گھر میں۔''

کرنل بالڈون نے ایک نیا نقطہ اٹھایا۔ ''ممکن ہے جو ہم سوچ رہے ہیں، معاملہ اس سے بالکل مختلف ہو۔ کوئی ذاتی دشمنی بھی تو ہو سکتی ہے...... کوئی رقابت وغیرہ۔ الگور تل ابیب ملنے بھی تو گرل فرینڈ کو گیا تھا۔''

لائیڈ بولا۔ ''تمہارا پیش کردہ خیال خاصا جاندار ہے۔ الگور کا تعلق جس خاص ترین گروپ سے تھا، ان کی شناخت انتہائی خفیہ رکھی گئی ہے۔ کسی دشمن ایجنسی کا اس معلومات کو چرانا تقریباً ناممکن ہے۔'' اس کا لہجہ حتمی ہوا۔ ''ہمیں اسی رخ پر ہی کام کرنا چاہیے۔''

شیزل نے اختلاف کیا۔ ''کیوں بھول رہے ہو کہ الگور کو انتہائی ماہرانہ اور جچے تلے انداز میں نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ کسی پیشہ ور کا کام ہے۔''

کرنل بالڈون مسکرایا۔ ''کیا پیشہ ور لوگوں کے ساتھ ذاتی معاملے نہیں ہوتے۔ الگور کے لیے سینے میں نفرت کا طوفان لے کر آنے والا اس کا کوئی قریبی ساتھی بھی تو ہو سکتا ہے۔''

شیزل نے ہونٹ بھینچ لیے۔ لمحے بھر بعد وہ بولی۔ ''میرے پاس کوئی دلیل یا معمولی سا کلیو بھی نہیں ہے مگر میرا وجدان کہتا ہے الگور وطن پر ہی قربان ہوا ہے۔ اسے کسی دشمن ملک کے ایجنٹ نے نشانہ بنایا ہے۔''

شیزل کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ پھر کرنل بالڈون بولا۔ ''ہم اس رخ کو بھی نظرانداز کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ دونوں رخ پر بیک وقت کام کرتے ہیں۔ لائیڈ ذاتی دشمنی کے رخ کو دیکھے گا اور تم کسی دشمن ایجنٹ کی کارستانی کے خیال کو دیکھ لو۔''

دونوں میں سے کسی نے کرنل بالڈون سے اختلاف نہیں کیا۔

کرنل بالڈون نے موبائل اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کرائم سین یونٹ کی مکمل رپورٹ آ گئی ہے۔ کانفرنس روم میں چل کر اسے دیکھتے ہیں۔ کسی ماہر کی ضرورت پڑی تو لنڈا، اسے آن لائن لے لے گی۔''

وہ تینوں اٹھ کر کانفرنس روم میں آ گئے۔ یہاں متعدد آپریٹر اپنے کام میں مصروف تھے۔ وسیع ہال کے ایک کونے

میں انہوں نے نشستیں سنبھال لیں۔ شیشے کی دیوار کے دوسری جانب کمپیوٹر سیکشن تھا جہاں درجن بھر سے زائد افراد مصروف نظر آرہے تھے۔

ان کے سامنے بڑی سی اسکرین پر کرائم سین کی رپورٹ چلنے لگی۔ انہوں نے ائرفون کانوں میں ٹھونس لیے۔ رپورٹ کے دوران شیزل اور لائیڈ نوٹس لیتے رہے تھے۔ میڈیکل رپورٹ بھی کرائم سین کی رپورٹ کے ساتھ منسلک کردی گئی تھی۔

سینما میں متعدد سیکیورٹی کیمرے موجود تھے۔ الگور کے آخری پل بھی ریکارڈ ہو گئے تھے۔ مختلف کیمروں کی درجنوں فوٹیج تھیں جو ان کی خصوصی توجہ کا مرکز تھیں۔ یقیناً الگور کا قاتل بھی ان فوٹیج میں کہیں موجود تھا۔ وہ لوگ اسے ڈھونڈنا چاہ رہے تھے مگر وہ سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھا۔

شیزل کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اسی رفتار سے وہ نوٹس بھی لے رہی تھی۔ اس نے ڈیمانڈ میں ان فوٹیج کی کاپی بھی لکھ لی۔ میڈیکل رپورٹ کے بعد وہ زہریلی سوئی بھی اسکرین پر دکھائی گئی جس کے ذریعے الگور کے جسم میں زہر داخل ہوا تھا۔ یہ سوئی بھی کرائم سین والوں نے ڈھونڈ... نکالی تھی۔

سوئی کا بھی فرانزک ہوا تھا۔ اس کی رپورٹ بھی سامنے آگئی تھی۔ سوئی کئی افراد کے جوتوں کے نیچے آئی تھی اس پر اگر انگلیوں کے نشانات تھے بھی تو ضائع ہو گئے تھے۔

اسکرین آف ہوگئی تو لائیڈ نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''میرے خیال میں قاتل کو پکڑنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ قتل کے وقت وہ...... الگور کے قریب ہی تھا۔ زہریلی سوئی کی رپورٹ سے ظاہر ہے، اسے زیادہ فاصلے سے فائر نہیں کیا گیا اس سوئی پر کوئی بارودی مواد نہیں ملا۔ اس کا مطلب ہوئی کسی خودساختہ ڈیوائس سے ربڑ کے ذریعے فائر کی گئی ہے جس لمحے الگور کو سوئی لگی تھی اس لمحے کو لے کر ہم بیس فٹ کا دائرہ بنائیں تو قاتل اس دائرے میں ہی ہوگا۔''

اس کے خاموش ہونے پر شیزل نے بھی اس خیال کی تائید کی۔ وہ بھی اسی رخ پر سوچ رہی تھی۔ اسی سبب اس نے ڈیمانڈ میں فوٹیج کا نوٹ لکھا تھا۔

کرنل بالڈون نے فوراً اپنی سیکریٹری لنڈا کے ذریعے ایک ماہر کو اس خاص لمحے کا دائرہ بنانے کے لیے کہا۔ اس لمحے الگور کے گرد بیس فٹ میں جتنے بھی افراد تھے، ان کی الگ الگ فوٹیج بنانے کے لیے کہا۔

کرنل بالڈون کے فون رکھتے ہی شیزل نے کہا۔ ''اب ہمیں اس زہر کی طرف آنا چاہیے جو الگور کے جسم میں اتارا گیا ہے۔ قاتل نے وہ زہر کہاں سے حاصل کیا؟ ہمارے ملک میں اس طرح کے جان لیوا زہر کا حصول آسان نہیں ہے۔ قاتل اگر باہر سے اپنے ساتھ یہ زہر لے کر آیا ہے تو یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔''

کرنل بالڈون بولا۔ ''رپورٹ میں ٹیکنیکل زبان استعمال ہوئی ہے جسے میں بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا۔ زہروں کے ماہر کو بریفنگ کے لیے آن لائن لیتے ہیں۔''

لائیڈ نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی اس زہر کو لے کر خاصا حیران ہوں۔ میں نے آج تک کسی ایسے زہر کے بارے میں نہیں سنا جو اتنی جلدی کسی کی جان لے لے اور وہ بھی اتنی کم مقدار میں...... ریسکیو ٹیم کو الگور تک پہنچنے میں بمشکل دس منٹ لگے تھے مگر اس سے پہلے ہی وہ دم توڑ چکا تھا۔''

تھوڑی دیر بعد زہروں کا ایک ماہر زہر کی رپورٹ کی روشنی میں انہیں اسکرین پر نمودار ہوکر بریفنگ دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ نیلے کوبرا سے حاصل کیا گیا زہر ہے۔ اس زہر کی تباہ کن صلاحیت یہ بھی کہ اسے عام ملنے والی دوائی پائیڈرین کے ساتھ ایک خاص تناسب سے ملایا جائے تو اس کا اثر سوگنا بڑھ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی معمولی سی مقدار بھی ایک صحت مند انسان کو منٹوں میں موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہے۔ یہ زہر انسان کے پٹھوں پر حملہ آور ہوتا تھا اور انہیں توڑ پھوڑ دیتا۔ دل کے پٹھے بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ انسان بے حد تکلیف کے عالم میں تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے۔''

شیزل نے ماہر سے پوچھا۔ ''الگور والے کیس میں کیا پائیڈرین کے ساتھ کس زہر استعمال ہوا ہے؟''

''بالکل...... میں سو فیصد یقین کے ساتھ اس بات کی تصدیق کرسکتا ہوں۔''

لائیڈ نے کہا۔ ''نیلا کوبرا میں نے پہلی دفعہ سنا ہے۔ کچھ اس کے بارے میں بتاؤ۔''

ماہر نے کہا۔ ''یہ کوبرا کی معدوم ہوتی قسم ہے۔ یہ دنیا میں چند ہی جگہوں پر پایا جاتا ہے۔ اتفاق سے یہ ہمارے ملک میں بھی پایا جاتا ہے۔''

یہ جان کر وہ تینوں چونک گئے۔ کرنل بالڈون نے بے صبری سے پوچھا۔

''ہمارے ملک میں کہاں پایا جاتا ہے؟''

ماہر نے کہا۔ ''مل ایب کے پاس داؤدی ٹیلے کبھی ان کا مسکن ہوتے تھے مگر وہاں تجر کاری کے بعد یہ تیزی سے ختم ہو گئے ہیں۔ اگر کہیں ملے بھی تو وہیں ملیں گے۔''

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تینوں کے ذہن میں بیک وقت آیا تھا کہ عین ممکن ہے قاتل نے نیلے کوبرا کا زہر براہِ راست نیلے کوبرے سے ہی حاصل کیا ہو اور پائیڈین تو عام دستیاب تھی۔

کرنل بالڈون کے ذہن میں ایک خدشے نے سر اٹھایا تو اس نے ماہر سے پوچھا۔ ''اس زہر کا تریاق کون سا ہے؟''

ماہر نے جواب دیا۔ ''نیلے کوبرے کے زہر کا تریاق ہے مگر جب یہ زہر خاص تناسب کے بعد پائیڈین سے ملتا ہے تو ناقابلِ شکست ہو جاتا ہے۔ فی الوقت بدلی ہوئی ہیئت کا کوئی تریاق دریافت نہیں ہوا ہے۔''

چند اور سوالوں کے بعد ماہر کو رخصت کر دیا گیا۔

اسی دوران میں لنڈا نے ایک اور رپورٹ پیش کر دی تھی جو سامنے اسکرین پر نمایاں ہو گئی۔

الگور کے قتل سے پہلے اور بعد میں اس سارے علاقے میں ہونے والی کالز کا ریکارڈ تھا۔ ماہرین کی ایک ٹیم نے برق رفتاری سے ان کالز کا تجزیہ کیا تھا۔ ان کی رپورٹ مایوس کن تھی۔ اس عرصے میں کوئی ایک بھی ایسی کال نہیں تھی جو شکوک کے زمرے میں آتی۔

کرنل بالڈون میز پر انگلیاں چلاتے ہوئے پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے قاتل ہم سے ایک قدم آگے ہی ہے۔ اس نے الگور پر بہت مضبوط ہاتھ ڈالا ہے۔ ایسے زہر سے وار جس کا کوئی توڑ نہیں۔ زہر بھی ایسے طریقے سے حاصل کیا گیا ہے جس کی کھوج میں ابھی سے آگے بند گلی نظر آ رہی ہے اور یقیناً وہ اکیلا ہی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ہوتا تو وہ ضرور پہلے یا بعد میں اسے کال کرتا۔ ہمارے ماہرین ڈھکی چھپی گفتگو کو بھی لازمی بھانپ لیتے۔ میرا خیال ہے وہ، ہمارے طریقہ کار سے بخوبی واقف ہے۔''

لائیڈ بولا۔ ''فکر نہ کرو، وہ اپنی تمام تر مہارت کے ساتھ جلد ہی سامنے آنے والا ہے۔ فوبیج سے ضرور کوئی نہ کوئی کلیدی کلیو ملے گا۔''

کرنل بالڈون نے کرسی کی بیک سے پشت لگائی۔ ''تم دونوں اب کیا کرنا چاہ رہے ہو؟''

آنکھوں ہی آنکھوں میں شیزل سے پہلے بولنے کی اجازت لے کر لائیڈ نے کہا۔ ''فوبیج سے اگر کچھ نہیں ملتا تو میں یروشلم جاؤں گا۔ الگور کی خانگی اور پیشہ ورانہ زندگی کی چھان بین کروں گا اور مجھے یقین ہے الگور کے قاتل کو گھسیٹ کر لے آؤں گا۔'' دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بالڈون...... شیزل کی طرف متوجہ ہوا۔ شیزل بولی۔

''فوبیج کے بعد میں داؤدی ٹیلوں کا رخ کروں گی اس کے علاوہ الگور کے حالیہ مشن کی روشنی میں دشمن ملک کا تعین کروں گی۔ ضرور آگے بڑھنے کا کوئی راستہ مل جائے گا۔''

لائیڈ کی آنکھوں میں تمسخر چمکا۔ ''تمہاری وجدانی طاقت نہ جانے کیوں اس طرف ہی سارا زور لگا رہی ہے۔ الگور سے متعلق معلومات لیک ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمارے پورے سسٹم پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔ پوری دنیا میں دشمنوں سے برسرِپیکار ہمارے سیکرٹ ایجنٹس سے دشمنوں کے لیے کڑکتی بجلی جیسے ہمارے ایلیٹ کمانڈوز کی سلامتی داؤ پر لگ جائے گی۔''

شیزل کی خوب صورت پیشانی پر بل پڑ گیا۔ ''تو کیا ہم لوگ اس پہلو سے نظریں چرا کر الگور کے قاتل کو صرف اپنی صفوں میں تلاش کرتے رہیں۔''

لائیڈ کو یہ انداز برا لگا۔ اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا تو بالڈون نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''آپس میں لڑنے سے بہتر ہے اس بارے میں ہیڈ کوارٹر سے رائے لے لیتے ہیں کہ کہیں الگور سے متعلق معلومات چوری تو نہیں ہوئیں اور ساتھ ہی اس کی فائل بھی منگوا لیتے ہیں۔''

چائے کے وقفے کے دوران ہیڈ کوارٹر سے مطلوبہ معلومات آگئیں۔ یہ معلومات خاصی چونکا دینے والی تھیں۔ معلومات چوری تو نہیں ہوئی تھیں مگر ایک ماہ پہلے اس کی کوشش ضرور کی گئی تھی اور اس کوشش کو لے کر ''موساد'' ہیکرز کے ایک تین رکنی روسی گروپ کے تعاقب میں تھی۔

الگور کی فائل خاصی حساس تھی۔ اس کا تعلق ایلیٹ کلاس کے کمانڈوز سے تھا۔ الگور سمیت ایک چار رکنی گروپ نے حال ہی میں ایران کے اندر گھس کر ایک ایرانی ایٹمی سائنس داں کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔

شیزل نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''کرنل! فوراً ہیڈ کوارٹر کو کہو ایران میں کارروائی کرنے والے باقی تینوں کمانڈوز کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرے اور ان تینوں کو بھی فوراً چوکنا کرنے کا انتظام کرو۔''

بالڈون کے ساتھ ساتھ لائیڈ کا چہرہ بھی ایک لمحے کے لیے دھواں ہو گیا۔ بالڈون نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

ڈال رکھے ہوں۔ وہ تیزی سے ایسے افراد کو علیحدہ کرنے لگے۔ جلد ہی وہ چھ افراد کو مشکوک فہرست میں ڈال چکے تھے۔

شیزل نے ایک ''بے جوڑ'' جوڑے کو نوٹ کیا۔ مرد مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور لڑکی ایسی تھی کہ کوئی مرد اس پر دوسری نظر ڈالنا بھی گوارانہ کرے۔

جس وقت الگور گرا تھا...... یہ جوڑا اس سے تقریباً آٹھ فٹ عقب میں تھا۔ درمیان میں اور بھی کوئی نہیں تھا۔ یہ جوڑا مشکوک ٹھہرا مگر شیزل نے کئی دفعہ اس فوٹیج کو دیکھا تھا۔ لڑکی کے دونوں ہاتھ ٹوٹی شاخوں کے مانند پہلوؤں میں گرے ہوئے تھے۔ خوبرو مرد کا ایک ہاتھ لڑکی کی کمر میں تھا اور دوسرا پہلو میں جھول رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس جوڑے کے ہاتھوں کے زاویے ایسے تھے کہ وہ الگور کو نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔

شیزل نے اس فوٹیج کو مشکوک افراد کی لسٹ میں نہیں ڈالا البتہ وہ بے جوڑ...... جوڑا اس کے دماغ میں ضرور رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی مشکوک افراد کی شناخت ہوگئی تھی اور انہیں پوچھ گچھ کے لیے حراست میں لے لیا گیا تھا۔

لائیڈ مشکوک افراد کا معاملہ اپنے دو ماتحتوں کے حوالے کر کے خود یروشلم کے لیے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

اینی شادیز رات گئے واپس آئی تو خاصی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایلس نے اسے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''اسائمنٹ مکمل ہوگیا؟''

''ہاں، ہوگیا۔'' اینی نے نگاہیں چرائیں۔

''کچھ کھاؤ گی؟ میں نے پیزا منگوایا تھا۔''

''تم نے کھالیا؟'' اینی نے الٹا سوال کیا۔

''ہاں، مگر تمہارے ساتھ کھانے کے لیے تھوڑی سی بھوک بچالی تھی۔''

اینی مسکرائی۔ ''کھانا تو میں نے بھی کھالیا تھا مگر تمہاری طرح تھوڑی سی بھوک بچالی تھی۔''

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

ایلس پیزا گرم کر کے لے آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پیزا کھلایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بستر میں تھے۔ ایلس نے محسوس کیا کہ اینی آج مزید جاگنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ صبح اسے یونیورسٹی بھی جانا تھا۔ اسے گڈ نائٹ کہہ کر ایلس نے لائٹ بجھادی۔ تھوڑی دیر میں اینی گہری نیند میں ڈوب گئی مگر ایلس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

پندرہ نمبر کوڑے دان سے ایلس کو لفافہ مل گیا تھا۔ اس دفعہ لفافے میں اینی شادیز کے متعلق بھی خاصی اہم معلومات تھیں۔ ایلس نے اینی کو آگاہ کیا کہ وہ ''ڈیڈ سی'' کی سیاحت کے لیے جانا چاہتا ہے اور دو، تین دن میں واپس آجائے گا۔

اینی کے لیے اس کی عارضی جدائی سوہانِ روح تھی مگر وہ ایلس کو روک بھی نہیں سکتی تھی بلکہ چند دن کے لیے ایلس کا چلے جانا ہی بہتر تھا۔ وہ ایک خاص کام میں مصروف تھی۔ ایلس کی غیر حاضری کے سبب وہ اس خاص کام کو اطمینان سے انجام دے سکتی تھی۔ اس خاص کام کی تکمیل کے بعد اس کے ہاتھ الہ دین کا وہ چراغ آجاتا جس کے بعد ہر خواہش پوری کی جاسکتی تھی۔

اینی نے آنکھیں موند لیں۔ ایلس کے ساتھ پوری دنیا کی سپر لگژری سیاحت، اب ان کی زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا۔ اس حوالے سے وہ، ایلس کو سرپرائز دینا چاہتی تھی۔

ایلس جیریکو جانے والی ٹرین میں اپنی آرام دہ نشست پر آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔ آس پاس خواتین کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی جن میں سے بیشتر کی نگاہوں کا مرکز وہی تھا۔

ایلس کے دماغ کے گھوڑے مختلف سمتوں میں سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ اس کی بچھائی بساط پر ہر مہرہ بہترین پوزیشن میں تھا۔ مخالف مہروں کی اگلی چالوں تک بھی اس کی گہری نظر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جلد ہی موساد کے ''ریڈار'' پر آنے والا ہے۔

☆☆☆

موشے دانیال ہنگامہ پسند اور محفلوں کا دلدادہ نوجوان تھا۔ وہ بھی الگور کی ٹیم کا ممبر تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ الگور کس انجام کو پہنچ چکا ہے۔ رازداری کی محکمانہ پالیسی کے تحت ایک ٹیم کے طور پر کام کرنے والے بھی ایک، دوسرے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے۔ ایک، دوسرے کے ساتھ ذاتی معلومات کے تبادلے پر بے حد سختی تھی۔

دانیال کا رہائشی اپارٹمنٹ ساحلی علاقے میں تھا، جہاں وہ باپ اور بڑی بہن کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ وہ جب بھی گھر پر ہوتا تھا تو صبح اور شام کو بحیرہ احمر کے ساحل پر طویل دوڑ لگانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کبھی کبھار باپ اور بہن بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے مگر زیادہ دیر اس کا ساتھ نہیں دے پاتے تھے۔

ساحل پر لگے ایک فیسٹیول کو آج تیسرا دن تھا۔ دیگر

تفریحات کے ساتھ ساتھ ساحلی کھیلوں کا بھی بھرپور انتظام تھا۔ انہی میں سے ایک ساحلی ریسلنگ بھی تھی۔ پیشہ ور اور شوقیہ کھلاڑی اکثر ہی زور آزمائی کرتے نظر آتے تھے۔

دانیال فنِ حرب و ضرب کا بے مثال کھلاڑی تھا۔ اس کھیل میں اس کی دلچسپی فطری تھی۔ شام کو وہ روزانہ ہی وہاں کچھ دیر کے لیے رکتا تھا۔

دانیال آج بھی وہاں رک گیا تھا۔ موسم معتدل تھا۔ ساحلی ہوا خوشگواریت کا احساس لیے ہوئے تھی۔ مصنوعی روشنیوں نے ماحول کو جگمگا رکھا تھا۔ دو فائٹر اس وقت بھی ریت پر زور آزمائی میں مصروف تھے۔ تماش بین بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ یہ سب زندہ دل لوگ تھے اور فائٹرز کو دل کھول کر داد دے رہے تھے۔

دانیال بھی اس ہجوم میں شامل ہو گیا اور دلچسپی سے فائٹ دیکھنے لگا۔ دُبلا پتلا اور لمبا سا لڑکا اپنے بٹے کٹے حریف پر بھاری پڑ رہا تھا۔

ہجوم میں سے کچھ افراد لڑنے والوں پر شرطیں بھی لگا رہے تھے۔ یہ خون کو گرما دینے والا ماحول تھا۔ دانیال مکمل طور سے اس ماحول کا شکار ہو گیا۔

فائٹ ختم ہو چکی تھی۔ دُبلے پتلے لڑکے نے اپنے حریف کو چت کر دیا تھا۔ اس لڑکے پر شرطیں لگانے والے خوشی سے جھوم رہے تھے۔ ساؤنڈ سسٹم سے موسیقی کی تیز دُھنیں ماحول کو اور گرما رہی تھیں۔

تماش بینوں میں سے ایک چھوٹی سی نیکر اور بلاؤز میں ملبوس لڑکی نے رِنگ میں داخل ہو کر دُبلے پتلے فائٹر کو چوم لیا تھا۔ غالباً لڑکی اس کی گرل فرینڈ تھی۔ اس کی اس حرکت پر تماشائیوں نے خوب تالیاں بجائی تھیں۔

اسی وقت نیکر اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک بے حد خوبرو نوجوان نے دانیال کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”میرا نام الپس ہے اور میں دو دلوں سے جسمانی مقابلوں کے اس کھیل میں تمہاری دلچسپی دیکھ رہا ہوں۔“

دانیال نے اس کا بڑھا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ایک مضبوط ہاتھ تھا۔ ”میں دانیال ہوں۔ میرے لیے یہ کھیل واقعی دلچسپی کا باعث ہے۔“

”تم سے مل کر اچھا لگا۔ ہمارے درمیان ایک قدرِ مشترک ہے۔“

دانیال نے اسے بغور دیکھا۔ ”میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا۔“ اپنی تربیت کے زیرِ اثر وہ لاشعوری طور پر اپنے اردگرد موجود لوگوں کو نظر میں رکھتا تھا۔

الپس کے دانت چمکے۔ ”کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے تو تمہیں دوڑتا بھی دیکھا ہے۔ تمہارا اسٹیمنا قابلِ رشک ہے۔“

”شکریہ۔“ دانیال الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ خوبرو نوجوان پہلے اس کی نظروں میں کیوں نہیں آیا تھا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ گفتگو کا سلسلہ اس نے آگے بڑھایا۔

”تم کہیں باہر سے آئے ہو؟ تمہارا نام کچھ عجیب سا ہے۔“

”میں سیلانی ہوں۔ ویسے عجیب ہونے کے باوجود لوگ اکثر میرے نام کو پسند کرتے ہیں۔“

”ہاں، صوتی تاثر تو اس کا اچھا ہے۔“ دانیال نے اعتراف کیا۔ اس دوران اس نے محسوس کیا کہ الپس کی آنکھیں بے تاثر سی ہیں۔ انہیں اگر باقی چہرے سے علیحدہ کر کے دیکھا جاتا تو ان سلیٹی آنکھوں میں عجیب ہی پتھریلی سختی تھی۔

الپس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم خاصے مضبوط اور توانائی سے بھرپور ہو۔ میں رِنگ میں اترنے کے لیے تمہیں چیلنج کرتا ہوں۔“

خون نے دانیال کی کنپٹیوں پر جوش مارا۔ اس نے چونک کر ان بے تاثر آنکھوں میں دیکھا۔ ”کیا یہ کسی قسم کا کوئی مذاق ہے؟“

”ہرگز نہیں، ہم دونوں ہی اس کھیل میں دلچسپی رکھتے ہیں تو ایک دوستانہ مقابلے میں کیا حرج ہے؟“

دانیال بھی ترنگ میں آ گیا۔ چیلنج کرنے کے سبب اس کے خون میں گرمی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے ہامی بھر لی۔ مدِمقابل جسمانی طور پر تو خاصا مضبوط لگ رہا تھا مگر وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ جسے اس نے چیلنج کیا ہے، وہ اسرائیل کے ایلیٹ کمانڈوز میں سے بھی چنیدہ تھا۔

بہرحال دانیال نے ہاتھ ہلکا ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ان دونوں نے منتظمین کے پاس جا کر اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے نہ صرف بخوشی اس دوستانہ مقابلے کی اجازت دے دی بلکہ اسے باقاعدہ اناؤنس بھی کر دیا۔

یہ اعلان سنتے ہی وہاں موجود تماشائیوں نے تالیاں بجا کر اور پُرمسرت آوازوں کے ساتھ اپنے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ ریفری پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ان دونوں کو جوتے اتار دینے کے لیے کہا۔ دونوں نے جوتے اتار دیے تو ریفری نے روایتی طور پر ان کے جسموں پر ہاتھ پھیر کر تسلی کر لی کہ ان دونوں نے کسی قسم کا ہتھیار تو چھپا نہیں رکھا تھا۔

چند لمحوں بعد موٹے دانیال اور الپس ٹھنڈی ساحلی

ریت پر ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

دانیال نے نظروں سے اس سیلانی کو تولا جو ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں کھڑا تھا۔ دانیال کو خود پر یقین تھا۔ اس نے مدِمقابل کو چت کرنے کے لیے تیس سیکنڈ کا وقت طے کیا تھا۔

ریفری کے اشارے کے بعد باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا۔

قدم جما کر دانیال نے اشارہ کیا۔ ''آؤ، اپنی صلاحیت ثابت کرو۔''

''میری خواہش تھی حملے میں پہل تم کرو۔'' الیس کا جواب آیا۔

دانیال نے ہونٹ بھینچتے ہوئے پہل کی۔ اس کی ٹانگ برق کے مانند الیس کے سینے کی طرف اٹھی تھی۔ پلک جھپکتے اس نے جھکائی دی اور ہوا میں ہی ٹانگ کو گھما کر ''سوئپ'' کیا۔

مدِمقابل کا چاروں خانے چت ہو جانا یقینی تھا مگر دانیال کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ الیس نے نہ صرف داؤ کو بھانپ لیا تھا بلکہ ہوا میں اچھل کر خود کو سوئپ سے بھی بچا لیا تھا اور اس کے سر کے اوپر سے نکل گیا تھا۔

الیس کو نگاہوں سے اوجھل ہوتا دیکھ کر دانیال تیزی سے مڑا مگر تاخیر ہو گئی تھی۔ الیس کا پاؤں اس کے سینے سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا گیا۔ شاندار داؤ، توڑ اور جوابی وار نے شائقین کو مبہوت کر دیا تھا۔ ریفری بھی شاک میں آ گیا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ بڑے کھلاڑیوں کا کھیل ہے۔

شائقین نے ہوش میں آ کر تالیاں بجانی شروع کر دی تھیں۔ ساتھ ہی شرطیں لگانے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

دانیال کا چہرہ سبکی کے احساس سے سرخ ہو گیا۔ اس دفعہ اس نے سنبھل کر حملہ کیا۔ الیس اس کے ہاتھوں کی برق رفتار ضربات کو کامیابی سے بلاک کر رہا تھا۔ اسی موقع پر دانیال کی ٹانگ حرکت میں آئی۔ اس دفعہ الیس خود کو بچا نہیں پایا تھا۔ گھٹنے کے عقب میں لگنے والی ضرب نے اسے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اگلے ہی پل دانیال نے کندھے کی ضرب سے اسے گرا دیا۔

حساب برابر ہو گیا تھا۔ تماشائیوں نے شور بلند کیا۔ یہ شور دیگر افراد کو بھی متوجہ کر رہا تھا۔

اگلے چند منٹ ایک، دوسرے کو پچھاڑنے کے لیے ان دونوں کے درمیان شدید کشمکش ہوئی۔ طے شدہ طریقہ کار کے مطابق جو دوسرے کی پشت نیچے لگانے میں کامیاب ہو جاتا، وہی فاتح ٹھہرتا۔

الیس سے لڑتے ہوئے دانیال کو داتوں پسینا آ گیا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ مدِمقابل کوئی عام شخص نہیں ہے۔ اس کے حوالے سے دانیال کو زبردست کھوج لگ چکی تھی مگر فی الوقت اسے اپنی عزت بچانے کی فکر ہو رہی تھی۔

دس منٹ کی شدید جدوجہد کے بعد بھی کوئی مقابل کی پشت زمین سے لگانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ریفری نے درمیان میں آ کر پہلے راؤنڈ کے خاتمے کا اعلان کیا۔ وہ دونوں علیحدہ ہو گئے۔

تماشائیوں میں سے فوراً ہی کچھ دونوں کے حامی نکل آئے تھے جو خود بخود ہی ان کی ٹیم بن گئے۔ ان کے لیے تولیے اور پانی وغیرہ آ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا راؤنڈ شروع ہو گیا۔ اب دو راؤنڈ پانچ، پانچ منٹ کے ہونے تھے۔ ان میں بھی فیصلہ نہ ہوتا تو پھر مقابلہ برابر قرار دے دیا جاتا۔

دوسرے راؤنڈ کے شروع میں ہی الیس، دانیال کے داؤ میں آ گیا۔ دانیال نے اسے عقب سے جکڑ لیا تھا۔ الیس گھٹنوں کے بل گر گیا تھا۔ اس کے بعد دانیال نے اسے ریت میں رگید کر رکھ دیا تھا مگر تمام تر کوشش کے باوجود بھی اسے پشت کے بل گرانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

دانیال کے حامیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ فتح نزدیک تھی۔ وہ ایک آواز ہو کر دانیال کی ہمت بڑھا رہے تھے۔

دانیال کا اسٹیمنا کمال کا تھا۔ اسے حریف کی سخت جانی کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اب حریف کو تھکانے کی کوشش میں تھا مگر حریف بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ریت میں رگیدے جانے کے باوجود اس میں تھکن کے معمولی سے بھی آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ راؤنڈ کے اختتام کے قریب دانیال نے جھنجلا کر الیس کی گردن کے نیچے گھٹنے کی ضرب لگائی۔ یہ ضرب اچھے، بھلے بندے کو ہلا دینے کے لیے کافی تھی۔ ایک لمحے کے لیے الیس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

اس فاؤل پلے پر الیس کے حامیوں نے شور مچا دیا۔ دانیال نے الیس کو پلٹنے کی کوشش کی مگر آخری لمحے میں الیس سنبھل گیا۔ ساتھ ہی راؤنڈ ختم ہو گیا۔

انہیں علیحدہ کرتے ہوئے ریفری نے فاؤل پلے پر دانیال کو سخت تنبیہ کی۔

الیس نے گردن کو سہلاتے ہوئے ناراض نظروں

سے دانیال کو دیکھا تو دانیال نے معذرت کر لی۔
تولیے سے ریت وغیرہ جھاڑ کر الپس نے پانی کے دو گھونٹ لیے۔ دانیال نے چور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے تنفس کی رفتار نارمل تھی۔ دانیال کو احساس ہوا کہ اسے صحیح معنوں میں مدِمقابل آج پہلی دفعہ ملا تھا۔
تیسرا راؤنڈ شروع ہوا تو الپس عقاب کے مانند جھپٹا۔ اس کی ضربات نے دانیال کو بوکھلا دیا مگر اس کا دفاع ناقابلِ تسخیر رہا۔ ان ضربات کو اس نے کامیابی سے بلاک کیا تھا۔
وقت تیزی سے بیت رہا تھا۔ تماشائیوں میں قدرے مایوسی نمایاں تھی۔ اس فائٹ کا اختتام برابری کی طرف جا رہا تھا۔
دانیال پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی تھی۔ وہ ہر صورت مدِمقابل کو چت کرنا چاہتا تھا۔ راؤنڈ کے آخری منٹ میں اس نے دفاع چھوڑ کر مکمل جارحانہ انداز اپنا لیا۔ وہ مسلسل الپس کی گردن کی تاک میں تھا۔ گردن کو جکڑ کر وہ آسانی کے ساتھ الپس کو گرا سکتا تھا۔ الپس نے جیسے ہی اس بات کو محسوس کیا، اس نے فوراً ہی جال بُن دیا۔ جھنجلاہٹ کے سبب دانیال کے سوچنے کی صلاحیت محدود ہو گئی تھی۔
پیٹ میں ایک ضرب کھانے کے بعد جیسے ہی الپس جھکا...... اس کی گردن ''ننگی'' ہو گئی۔ دانیال نے برق کے مانند تڑپ کر جھپٹ بھری۔ گردن کو جکڑنے سے پہلے ہی وہ...... الپس کے جال میں پھنس چکا تھا۔ اپنے دماغ کو نظرانداز کرنا اسے مہنگا پڑا تھا۔ جھکے جھکے الپس نے پینترا بدلا تھا۔ اپنی جھونک میں جیسے ہی دانیال اس کی رینج میں آیا...... الپس لٹو کے مانند گھوما۔ دانیال کو کمر سے تھام کر اس نے ہوا میں گھمایا اور اگلے ہی پل دانیال ریت پر چاروں خانے چت پڑا ہوا تھا۔
دانیال نے صرف زمین و آسمان کو اپنی جگہ بدلتے محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد اسے محسوس ہوا کہ انہونی ہو گئی ہے۔ وہ مدِمقابل کی عیاری کا مقابلہ نہیں کر سکا تھا۔ تذلیل اور خجالت کے شدید احساس نے اسے سن کر دیا۔ وہ اپنی جگہ پڑا رہ گیا تھا۔ پلک جھپکتے ہی تبدیل ہو جانے والی اس صورت حال نے تماشائیوں کو بھی حیران کر دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے قیامت کا شور بلند ہوا۔ الپس کے حامیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ جیتنے والے باقاعدہ ناچ رہے تھے۔
الپس نے دانیال کی طرف ہاتھ بڑھایا تو دانیال نگاہیں چُراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ تماشائیوں نے اس دفعہ ان دونوں کے لیے تالیاں بجائی تھیں۔
اسی وقت منتظمین میں سے ایک بڑھی ہوئی توند والا شخص ان دونوں کے قریب آیا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے ان سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ''تم دونوں تو منتخب فائٹر ہو مگر تمہیں کبھی کسی رِنگ وغیرہ میں دیکھا نہیں ہے۔ کہاں سے کھیلتے ہو لڑکو؟''
الپس بولا۔ ''اس نوجوان کا تو پتا نہیں مگر میں آج پہلی دفعہ کسی اکھاڑے میں اترا ہوں۔''
توند والا فرمائشی ہنسی ہنسا۔ ''مذاق اچھا کر لیتے ہو...... خیر اس بات کو چھوڑو۔ میری تم دونوں کے لیے آفر ہے۔ میرے ساتھ آ جاؤ اچھے خاصے پیسے کما لو گے۔''
الپس کے ساتھ ساتھ دانیال نے بھی اس کی پیشکش کو نرمی کے ساتھ رد کر دیا۔ وہ انہیں حیرت سے دیکھتا ہوا لوٹ گیا۔ اس کے بعد تماشائیوں نے ان دونوں کو گھیر لیا۔ ان سے بمشکل جان چھڑوا کر دونوں اکٹھے ہی وہاں سے نکلے۔
دونوں کے درمیان تناؤ آمیز خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو الپس نے توڑا۔
''لگتا ہے اس دوستانہ مقابلے کو لے کر تم خائف ہو۔ میں کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں تم نے شروع سے آخر تک اپنی برتری قائم رکھی تھی۔''
دانیال نے کھوکھلی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''ہاں مگر فاتح تم رہے ہو۔''
''یہ محض اتفاقاً ہوا ہے۔''
''مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو، تم خود کو چھپا رہے ہو۔ مجھے یقین ہے تم کوئی بہت خاص الخاص شے ہو۔''
اس دفعہ الپس ہنسا۔ ''تمہارے اس گمان نے میرا سینہ چوڑا کر دیا ہے۔ میرے بارے میں مزید کچھ خیال آرائی کرو تو مجھے اچھا لگے گا۔''
باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں فیسٹیول سے باہر نکل آئے تھے اور ساحل کے ایک ویران حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں ملگجا سا اندھیرا تھا۔
''تم اپنے بارے میں خود ہی بتا دو تو زیادہ مناسب ہے۔ میں شدید تجسس کا شکار ہو گیا ہوں کہ تم نے بطور خاص مجھے مقابلے کی دعوت کیوں دی؟''
الپس کے لہجے نے رنگ بدلا۔ ''تم خود کو ناقابلِ تسخیر جو سمجھ بیٹھے تھے۔''
دانیال اس طرح اُچھلا جیسے اسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ خطرے کا الارم بجا مگر سنبھلنے سے پہلے اسے بازو پر تیز چبھن کا

احساس ہوا۔ وہ برق رفتاری سے الپس پر جھپٹا مگر چہرے پر لگنے والی زوردار ضرب کے سبب الٹ کر گرا۔ دوبارہ سے اٹھنے کا یارا نہیں تھا۔ پورا وجود جیسے فولاد پگھلانے والی بھٹی میں جا گرا تھا۔

الپس اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''تمہیں یاد تو ہوگا تم نے ایران میں بڑھک ماری تھی کہ ایرانی ماؤں نے ایسے بیٹے پیدا کرنے چھوڑ دیے ہیں جو مجھ جیسے اسرائیلی کا سامنا کر سکیں۔ دیکھ لو، تمہیں چت کرنے کے بعد میں نے جہنم واصل کیا ہے۔''

دانیال سن تو رہا تھا مگر جواب دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ شدید ترین اذیت اسے توڑے ڈال رہی تھی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تو منہ سے خون اُبل پڑا۔

الپس اسے چھوڑ کر اٹھ گیا۔ ساحلی سڑک پر ایک بند اسٹیشن ویگن اس کی منتظر تھی۔ ویگن میں ہی اس نے اپنا حلیہ بدلنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

الکور کے بعد دانیال کا ٹارگٹ بننا معمولی بات نہیں تھی۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر میں زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ بیرونِ ملک کارروائیاں کرنے والا خاص گروپ اب خفیہ نہیں رہا۔ اس سے متعلق خفیہ معلومات لیک ہو گئی ہیں۔

سیکیورٹی پلان، کوڈز، رہائش گاہیں، سبھی کچھ تبدیل کیا جا رہا تھا۔

داخلی سلامتی کا ذمّے دار ڈیسک چونکہ پہلے ہی اس پر کام کر رہا تھا اس لیے تمام تر ذمّے داری اسے سونپ دی گئی تھی۔

کرنل بالڈون نے لائیڈ کو واپس بلا لیا تھا۔ شیزل کی تھیوری درست ثابت ہوئی تھی۔

ڈیسک آفس میں رات کے آخری پہر بھی کام ہو رہا تھا۔ لائیڈ ایک خصوصی ہیلی کاپٹر کے ذریعے تھوڑی دیر پہلے ہی پہنچا تھا۔ برق رفتاری سے ہونے والے کام کے سبب دانیال سے متعلق مفصل رپورٹ بن چکی تھی۔

تینوں کرتا دھرتا ایک دفعہ پھر کانفرنس روم میں تھے۔ کرنل بالڈون اپنی کرسی کے عقب میں کرسی پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ شیزل اور لائیڈ سُتے چہروں کے ساتھ اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بالڈون بولا۔

''دانیال کی جان ہماری کوتاہی کے سبب ضائع ہوئی ہے۔ اپنے سسٹم پر حد سے زیادہ اعتماد کے سبب ایسا ہوا ہے۔

اگر شیزل کی تھیوری کو فالو کرتے تو نہ صرف آج دانیال زندہ ہوتا بلکہ قاتل بھی ہماری گرفت میں ہوتا۔ خیر جو ہوا برا ہوا ہے۔ ہمیں اب آگے دیکھنا ہے۔"

لائیڈ بولا۔ "معذرت کے ساتھ دخل اندازی کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ الگور اور دانیال کی ٹیم کے باقی دو ارکان کو منظر سے غائب نہ کیا جائے۔ قاتل ضرور انہیں بھی نشانہ بنانے کی کوشش کرے گا اور اسے ہم اپنے جال میں پھنسا لیں گے۔ ان دونوں ارکان کے گرد ہمیں دائرہ بنا لینا چاہیے۔"

شیزل نے بھی اس کی تائید کی۔ کرنل نے بھی تعریفی نظروں سے لائیڈ کی طرف دیکھا اور پھر فون پر مصروف ہو گیا۔ یہ معاملہ کیونکہ ہیڈ کوارٹر کا تھا اس لیے وہیں سے اسے ہینڈل کیا جاسکتا تھا۔

ادھر سے فارغ ہو کر وہ تینوں دانیال والی رپورٹ کی طرف آئے۔ رپورٹ میں دانیال کی مصروفیات کی پوری رپورٹ تھی۔ الپس کے ساتھ ہونے والے مقابلے کی ویڈیو یوٹیوب پر اپ لوڈ ہو چکی تھی۔ یہ ویڈیو بھی رپورٹ کا حصہ تھی۔ وہ حیرت سے یہ مقابلہ دیکھ رہے تھے۔

دانیال کے مدمقابل کو دیکھ کر شیزل بری طرح سے چونک گئی۔ یہ تو وہی نوجوان تھا جو الگور کے قریب بھی اپنی ساتھی لڑکی کے ساتھ موجود تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے واضح نتیجہ اخذ کر لیا۔

اس نوجوان کی تصویروں کے پرنٹ نکل کر آگئے۔ شیزل نے ان پر انگلی سے ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ "میں سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ قاتل یہی ہے۔"

لائیڈ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "الگور کے آخری لمحات دیکھتے ہوئے یہ ہماری نظروں میں تو آیا تھا کیا وجہ تھی کہ ہم اسے پک نہیں کر سکے تھے۔"

شیزل نے اس کا جواب دیا۔ "ہماری تمام تر توجہ الگور کے گرد موجود افراد کے ہاتھوں پر تھی۔ اس نے الگور کو نشانہ بنانے کے لیے ہاتھ استعمال نہیں کیے اس لیے یہ مشکوک نہیں ٹھہرا تھا۔"

"اس نے کھوکھلے جوتے سے زہریلی سوئی ماری ہے۔" لائیڈ نے خیال آرائی کی۔

کرنل بالڈون نے کہا۔ "کھوکھلے جوتے سے درست ترین نشانہ لگانا معمولی بات نہیں ہے، قاتل بہت بڑا کھلاڑی ہے۔"

شیزل نے کہا۔ "اس کی مہارت اور عیاری پر تو دو رائے ہے ہی نہیں...... دیکھ لو اس نے کس طرح ہمارے چنیدہ کمانڈوز کو جسمانی مقابلے میں پچھاڑ کر اپنا نشانہ بنایا ہے۔"

کرنل بالڈون کی پیشانی پر مکڑی نے جیسے جالا سا بُن دیا۔ "مجھے تو یہ قاتل پاگل بھی لگتا ہے۔ دانیال کے ساتھ اسے جسمانی مقابلے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ، دانیال کو خاموشی کے ساتھ بھی نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس طرح تو اس نے خود کو عیاں کر دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے جسمانی مقابلے کی کوئی بہت خاص وجہ تھی۔ میں خاصی اُلجھن کا شکار ہوں۔"

شیزل نے کہا۔ "تمہارے آنے سے پہلے میں نے دانیال کی فائل دیکھی ہے۔ وہ خاصا بڑبولا تھا۔ مجھے لگتا ہے یہ جسمانی مقابلہ اس کے بڑبولے پن کا نتیجہ تھا۔ ان لوگوں نے بیرونِ ملک صرف ایران میں کارروائی کی ہے۔ یقینی طور پر ایران نے اپنے ایٹمی سائنس داں کے قاتلوں کے خلاف اس کھلاڑی کو میدان میں اتارا ہے۔"

کرنل بالڈون بولا۔ "پھر تو وہ اکیلا ہو ہی نہیں سکتا۔"

شیزل لحظہ بھر کے لیے گہری سوچ میں غرق ہو گئی پھر بولی۔ "یقیناً وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ پوری ٹیم ہے اور مقامی سہولت کار بھی ہیں۔ تم نے اسے پاگل کہا تھا مگر لگتا ہے وہ ہمیں پاگل اور بے وقوف سمجھ رہا ہے۔ وہ، ہم سے کئی قدم آگے ہے اور ہمارے طریقہ کار کو بھی بخوبی سمجھتا ہے۔ اس نے بھرپور تسلی کے بعد دانیال پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس نے تسلی کر لی تھی کہ دانیال انڈر کور نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ، دانیال کے قریب بھی نہ پھٹکتا یا پھر اس کا طریقہ کار مختلف ہوتا۔"

لائیڈ کو اپنے نیٹ ورک کی مضبوطی پر ضرورت سے زیادہ یقین تھا، بولا۔ "ایسے کیسے ہو سکتا ہے ایک ٹیم ہمارے ملک میں در آئے اور ہماری قومی سلامتی کے درپے ہو اور ہمارے اداروں کو خبر ہی نہ ہو۔ وہ لوگ رابطے کا کوئی ذریعہ تو استعمال کرتے ہوں گے۔ کمیونی کیشن میں ایک بھی مشکوک لفظ ہمارے جاسوسی کے جدید ترین سوفٹ ویئر کو متحرک کر دیتا ہے پھر ایران دشمن ملک ہے وہاں بھی جاسوسوں کی پوری فوج ہے۔ یہاں بھی مقامی مخبر اور ایجنٹ ہر شعبے میں موجود ہیں۔ یہ لوگ کیسے چھپے رہ سکتے ہیں؟"

کرنل بالڈون بھی اس سے متفق نظر آنے لگا تھا۔

اپنی تھیوری کی کامیابی کے بعد شیزل کا اعتماد بڑھ گیا تھا۔ وہ زیادہ حقیقت پسندی سے سوچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''وہ بھرپور تیاری سے آئے ہیں۔ یقیناً انہوں نے ہمارے طریقہ کار کو سمجھنے میں وقت لگایا ہے۔ ممکنہ طور پر وہ ''اشاراتی زبان'' استعمال کر رہے ہیں۔ مقامی سہولت کار ورک پرمٹ پر اسرائیل میں آنے والے فلسطینی بھی ہو سکتے ہیں اور پیسوں کے بدلے کوئی اسرائیلی بھی خود کو بیچ سکتا ہے۔''

اسی وقت ٹیبل پر رکھا فون بجا۔ یہ خاص لائن تھی۔ کرنل بالڈون نے چونک کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے وہ کچھ سنتا رہا پھر فون رکھتے ہوئے بولا۔

''قاتل سے متعلق مکمل رپورٹ آگئی ہے۔ الگور کے قتل کے وقت جو لڑکی اس کے ساتھ تھی، اس کی بھی شناخت ہوگئی ہے۔ وہ مقامی ہے۔'' تھوڑی دیر بعد اسکرین پر الپس سے متعلق رپورٹ چل رہی تھی۔

ارجنٹائن سے بطور سیاح اسرائیل میں داخل ہونے والے کا نام ہوگو سلاز تھا۔ وہ پیدائشی یہودی تھا۔ اس کی شناختی و سفری دستاویزات اصل اور مکمل درست تھیں۔

اس کے بعد دیگر دستیاب مصروفیات کی تفصیل تھی مگر کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی۔

ایک مختصر نوٹ تھا کہ ارجنٹائن میں موساد کا فارن ڈیسک متحرک ہوگیا تھا۔

رپورٹ کے ختم ہوتے ہی بالڈون نے کہا۔ ''اس مقامی لڑکی اپنی شاذیہ کو اٹھا لیتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی کلیو مل جائے ورنہ جیریکو سے تو وہ قاتل گدھے کے سینگوں کے مانند غائب ہو چکا ہے۔''

لائیڈ نے اختلاف کیا۔ ''لڑکی کو اٹھانے سے بہتر ہے اسے نگرانی کے جال میں رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے قاتل ایک محفوظ پناہ گاہ کی طرف واپس لوٹے۔''

شیزل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار ہے اور لڑکی بالکل گئی گزری ہے۔ اس نے صرف لڑکی کو استعمال کیا ہے۔ وقت ضائع کرنے کے بجائے لڑکی کو اٹھا لینا بہتر ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی کلیو مل جائے۔''

لائیڈ نے کندھے اُچکا دیے۔ ''ٹھیک ہے۔''

بالڈون نے لائیڈ کو ٹاسک دیا۔ ''تم مقامی مخبروں کو متحرک کرو، غداروں کو ڈھونڈ نکالو، میں اور شیزل قاتل کو دیکھتے ہیں۔ مقامی سہولت کاروں تک تم پہنچ گئے تو قاتل تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔''

لائیڈ نے اثبات میں سر ہلایا تو کرنل بالڈون، شیزل کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ قاتل کا اگلا قدم

کیا ہوسکتا ہے؟'' لاشعوری طور پر بالڈون، شیزل کی برتر ذہنی صلاحیت کو تسلیم کر چکا تھا۔

شیزل بولی۔ ''میرے ذہن میں مسلسل یہ بات کھٹک رہی ہے۔ اس کا ٹارگٹ ہمارا خاص گروپ ہے تو اس کا اگلا قدم کیا ہوسکتا ہے۔ دانیال کو کھلے عام نشانہ بنانے کے بعد وہ پوری طرح سے عیاں ہو چکا ہے۔ عیاں ہونے کے بعد تو باقی ماندہ گروپ کو نشانہ بنانا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ وہ جانتا ہے اس کے شکار کی بھرپور تیاری کی جا چکی ہوگی۔ خود کو عیاں کرنے کا اس کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟'' شیزل آنکھیں موند کر دماغ کے گھوڑے مختلف سمتوں میں دوڑانے لگی۔

لائیڈ بولا۔ ''ممکن ہے وہ ہمیں ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا رہا ہو۔ اس کا اصل مشن اور ٹارگٹ کچھ اور ہو۔''

شیزل کے ساتھ ساتھ بالڈون بھی چونک گیا۔

شیزل نے پُرجوش انداز میں پاس بیٹھے لائیڈ کی ٹانگ پر ہاتھ مارا۔ ''تم گہرائی سے سیپ نکال لائے ہو۔ وہ کم بخت ہمیں اپنے پیچھے لگا کر اُلجھا رہا ہے۔ یقیناً اس کی ٹیم کسی اور ٹارگٹ پر کام کر رہی ہے۔ ہمیں ہر صورت اسے روکنا ہوگا۔''

لائیڈ کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔

بالڈون بولا۔ ''روکیں گے تو تب ہی نا جب ہمیں ان کے ٹارگٹ کا اندازہ ہوگا۔''

تعریف نے لائیڈ کا دماغ کھول دیا تھا۔ ''ایرانیوں کے دماغ پر صرف بدلہ سوار ہے۔ ان کا ٹارگٹ یقینی طور پر ہمارا کوئی اہم ایٹمی سائنس داں ہی ہوسکتا ہے۔ کام کی ابتدا وہ لوگ ہمارے ان کمانڈوز کو نشانہ بنا کر کر چکے ہیں جنھوں نے ان کے سائنس داں کو ٹارگٹ کرنے کے مشن میں براہِ راست حصہ لیا تھا۔''

یہ تھیوری بالڈون کے ساتھ ساتھ شیزل کے بھی دل کو لگی۔ بالڈون نے کھلے دل سے کہا۔

''ویل ڈن لائیڈ! مجھے فخر ہے کہ تم میرے نائب ہو۔''

لائیڈ کے چہرے کی چمک اور بڑھ گئی۔

شیزل بولی۔ ''ہمیں کسی ناقابلِ تلافی نقصان سے پہلے ان چوہوں کو بِل سے نکالنا ہوگا اور ایٹمی اثاثوں سے وابستہ اہم ترین سائنس دانوں کی سیکیورٹی پر خاص توجہ دینی ہوگی۔''

بالڈون بولا۔ ''میں آج ہی سفارشات ہیڈ کوارٹر بھیج دیتا ہوں...... مگر ہمیں کام کا آغاز کہاں سے کرنا ہوگا؟'' اس سوال پر ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی پھر شیزل بولی۔

''سب سے پہلے تو ہمیں جاننا ہے کہ قاتل ہے کون؟ ایران سمیت تقریباً دنیا کے بھی بہترین سیکرٹ ایجنٹس کا ڈیٹا ہمارے پاس ہے۔ اس کی شناخت ہوتے ہی ہم اس کے طریقہ کار کے بارے میں جان پائیں گے اور پھر اس کے مطابق اس کے خلاف لائحہ عمل طے کریں گے۔''

بالڈون کے چہرے پر تحسین نظر آئی۔ ''گڈ! دستیاب تصویروں اور فنگر پرنٹس سے اس کی اصلیت کھوجی جاسکتی ہے۔''

شیزل نے مزید کہا۔ ''اس کے بعد ہمیں...... قاتل کو ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ اسے مزید کسی کارروائی سے بھی روکنا ہے۔''

لائیڈ نے گرہ لگائی۔ ''اور مقامی سہولت کاروں کو بھی دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بنا دینا ہے۔''

بالڈون نے کہا۔ ''تو ٹھیک ہے...... کام شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ایبی شاویز کو اٹھانے کے لیے ٹیم روانہ کرتا ہوں۔''

☆☆☆

ایبی شاویز پر جھنجلاہٹ سوار تھی۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ ایک بہت بڑی رکاوٹ سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور اس رکاوٹ کو عبور کرنے کا بھی کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ آج بھی اپنی پارٹنر پامی مورگن کے ساتھ گھنٹوں کی لاحاصل محنت کے بعد اپارٹمنٹ میں واپس آئی تھی۔

ایلس کی کمی بھی اسے کھل رہی تھی۔ ایلس کے پاس موبائل فون نہیں تھا ورنہ وہ اس سے کم از کم بات ہی کر لیتی۔ موبائل کنکشن کے لیے اسرائیلی حکومت کی پالیسی خاصی سخت تھی۔ سیاحوں کو اس کے لیے باقاعدہ وزارتِ داخلہ سے این او سی لینا پڑتی تھی۔

ایبی کے ایک، دو دفعہ کہنے کے باوجود ایلس نے موبائل فون کی سم کے حصول میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی تھی۔ اس کی البتہ درجنوں تصویریں ایبی کے موبائل فون میں محفوظ تھیں۔ خود کو بہلانے اور جھنجلاہٹ دور کرنے کے لیے ایبی ان تصویروں سے دل بہلانے لگی۔

اسے اپارٹمنٹ میں آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ ایلس کو آنکھوں میں سجائے، تکیے کو بانہوں میں بھینچے ہوئے ایبی، ایلس کے تصور میں گم تھی کہ بیرونی گھنٹی گنگنائی۔

ایبی نے حیرت سے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف

بڑھی۔ دروازے کے پاس نصب چھوٹی سی اسکرین پر اس نے باہر کا منظر دیکھا۔ انتہائی ایمرجنسی میں کام کرنے والے محکمے کے مخصوص زرد رنگ کی حفاظتی وردیوں میں ملبوس چار افراد کے علاوہ بلڈنگ کا رات کا انچارج باہر کھڑے ہوئے تھے۔

اینی رات کے انچارج سے بخوبی واقف تھی۔ اس نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ اس کو دیکھتے ہی رات کے انچارج نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''تکلیف کی معذرت چاہتا ہوں۔ بلڈنگ میں گیس لیک کی شکایت ملی ہے۔ تمہارے اپارٹمنٹ کو بھی چیک کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ۔''

سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے اینی ایک طرف ہٹ گئی۔ ''آجاؤ، لیکن میں نے کسی قسم کی گیس کی بُو محسوس نہیں کی۔''

ایک زرد وردی والا بولا۔ ''ابھی چیک کر لیتے ہیں مس۔''

زرد وردیوں والے چاروں افراد کمرے میں پھیل گئے۔

اینی رات کے انچارج کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''گیس لیک سے کسی نقصان......'' اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا تھا۔ عقب سے اس کی گردن کے قریب ایک سرنج کی سوئی اتر گئی تھی۔

اینی کے حلق سے تیز سسکاری خارج ہوئی۔ سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی اور اس کا جسم تیزی سے مفلوج ہونے لگا۔

ایک زرد پوش نے اسے گرنے سے پہلے سنبھال لیا۔ لمحوں میں اینی تاریکیوں میں ڈوب گئی۔

اینی کو آرام سے بیڈ پر لٹا کر زرد پوشوں کی ٹیم جدید آلات کی مدد سے فنگر پرنٹس وغیرہ لینے میں مصروف ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں وہ فنگر پرنٹس کے ساتھ ساتھ بالوں کے بھی کچھ نمونے لینے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے بعد انہوں نے اینی کو ایک لفافے میں اس طرح پیک کیا کہ بادیُ النظر میں وہ سامان کے ڈھیر کے مانند نظر آنے لگی۔ ایک زرد پوش نے اسے کندھے پر ڈال لیا۔

باہر راہداری میں رات کے اس پہر انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ رات کے انچارج کی رہنمائی میں وہ کارگو لفٹ کی طرف بڑھے۔ کچھ لمحوں بعد لفٹ انہیں لے کر بلڈنگ کی عقبی پارکنگ کی طرف جا رہی تھی۔ رات کا انچارج پسنجر لفٹ کی طرف گیا تھا۔

عقبی پارکنگ کی بیشتر روشنیاں گُل تھیں۔ ایک زرد رنگ کی مکمل بند گاڑی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ ٹیم کے ارکان کو آتا دیکھ کر زرد رنگ کی گاڑی میں موجود ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

جیسے ہی وہ چاروں زرد پوش اینی کو لے کر گاڑی کے قریب پہنچے فضا میں ''ٹھک ٹھک'' کی مخصوص قسم کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ڈرائیور سمیت زرد پوشوں کی کھوپڑیاں صاف اُڑ گئیں۔ اینی بھی نیچے گر گئی تھی۔ وہ پانچوں لمحوں میں دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ پختہ فرش ان کے خون سے رنگین ہو گیا تھا۔

فوراً ہی تاریک گوشوں سے تین افراد برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید ترین ساخت کے سائلینسر لگے ہتھیار تھے۔ انہوں نے اینی کو اٹھایا اور ایک بڑی گاڑی میں ڈال دیا۔ وہ تینوں گاڑی میں سوار ہوئے اور گاڑی تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اینی کا لیپ ٹاپ اور موبائل فون بھی انہوں نے ایک زرد پوش کے بیگ سے نکال لیا تھا۔ موساد کی ٹیم لاشوں کی صورت عقبی پارکنگ میں پڑی تھی۔ ان سے تھوڑی دور بلڈنگ کے سیکیورٹی روم میں موجود تین افراد کا عملہ بھی بندھا ہوا تھا اور بلڈنگ کے تمام سیکیورٹی کیمرے بھی اینی کو لے جانے والوں نے بند کر دیے تھے۔

اینی کی بے حسی کم ہو رہی تھی اور دماغ پر چھائے تاریکی کے بادل چھٹ رہے تھے۔ کوئی مسلسل اسے جھنجوڑتے ہوئے آوازیں دے رہا تھا۔ اینی کو یہ آواز مانوس سی محسوس ہو رہی تھی۔

چکراتے ہوئے سر کے ساتھ اُس نے آنکھیں کھولیں تو اس نے پامی مورگن کو خود پر جھکے پایا۔ پامی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پامی کو دیکھ کر اینی کو شاک سا لگا۔ بدترین اندیشے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اینی نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر بُری طرح سے چکرانے لگا۔ وہ دوبارہ سے تکیے پر گر گئی۔ ذہن بدترین اندیشوں کی تصدیق کر رہا تھا۔ آخرکار وہ دونوں شکنجے میں آ ہی گئی تھیں۔ ان سے برتر دماغ ان تک پہنچ ہی گئے تھے۔ زرد پوشوں کی ٹیم کے ساتھ بلڈنگ کے رات کے انچارج کا آنا اس کے دماغ میں موجود تھا۔

اسے یقین ہو گیا کہ وہ دونوں اسرائیل کی تحویل میں ہیں۔

پامی نے اس کے سر کے نیچے ہاتھ دے کر اسے اٹھایا اور پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ پانی کے چند گھونٹ حلق سے اترے تو اینی کے حواس قدرے بحال ہوئے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کمرا تھا۔

سوائے ایک فولادی دروازے اور واش روم کے وہ ہر سمت سے بند تھا۔ وسیع بیڈ پر پامی، اس کے قریب بیٹھی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ پامی کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ وہ بولی۔ ''آخرکار ہم پکڑے گئے۔ ہمارے سب خواب ادھورے رہ گئے۔ اب ساری زندگی جیل میں گزرے گی یا پھر ایجنسیوں کے قید خانوں میں۔'' وہ باقاعدہ رونے لگی۔

اینی نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ساتھ لگایا۔ ''اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنے ملک یا کسی ملکی ادارے کے خلاف کام نہیں کیا۔ ہمارے ساتھ ضرور نرمی کا سلوک ہوگا۔''

پامی کی مایوسی کم نہیں ہوئی۔ وہ تلخی سے بولی۔ ''یہی نرمی ہوگی۔ سونے کے پنجرے میں قید کر دیا جائے گا اور ساری زندگی اداروں کے لیے کام کرنا ہوگا۔ ایسی نرمی سے مجھے مرجانا قبول ہے۔ بندشوں میں، میں گھٹ کر مرجاؤں گی۔''

اینی نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ''خود کو سنبھالو! اتنی جلدی فیصلے نہ کرو، تمہیں کس طرح اٹھایا گیا ہے؟''

اینی نے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ وہ، اینی سے تین سال چھوٹی تھی اور اینی اس کے لیے چھوٹی بہنوں جیسی محبت محسوس کرتی تھی۔

''تمہارے جانے کے بعد میں ٹینشن ختم کرنے کے لیے تھوڑی دیر واک کے لیے نکل گئی تھی۔ واپس آئی تو میرے اپارٹمنٹ میں کوئی پہلے سے موجود تھا۔ میں اندر داخل ہوئی تو کسی نے میری ناک پر رومال رکھ دیا۔ زود اثر دوائی کے سبب میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگئی تھی۔''

اینی نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''ہمیں تقریباً ایک ساتھ ہی اٹھایا گیا ہے۔ طریقہ کار پھر کیوں مختلف تھا۔ مجھے تو باقاعدہ کسی ادارے نے بلڈنگ انتظامیہ کی مدد سے اٹھایا ہے۔ خیر جو بھی ہے، سامنے آ ہی جائے گا۔'' آخر میں اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ فولادی دروازہ کھل گیا۔ ایک بے حد سیاہ بالوں اور تانبے جیسی رنگت کا مالک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ناشتے کے لوازمات سے سجی ٹرے تھی۔ دروازہ عقب میں بند ہوگیا۔ دونوں لڑکیاں خوف زدہ نظروں سے نوجوان کو دیکھنے لگیں جس کے ہونٹوں پر بظاہر بڑی دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

اینی نے اندازہ لگایا کہ نوجوان عرب النسل تھا۔

نوجوان نے ٹرے سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے نرم انداز میں کہا۔ ''میں ''اسپائیڈر گرلز'' کو خوش آمدید کہتا ہوں۔'' اس فقرے کے بعد یہ گنجائش بالکل ہی ختم ہوگئی تھی کہ ان کی شناخت ہونے میں کوئی کسر رہ گئی ہے۔

اینی نے سنبھل کر پوچھا۔ ''تمہارا تعلق کس ایجنسی سے ہے اور تم، ہمیں عجیب نام سے کیوں مخاطب کر رہے ہو؟''

نوجوان مسکرایا۔ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اینی نے محسوس کیا کہ نوجوان کی آنکھوں میں جیسے اداسی منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ آنکھیں اس کے ساتھ نہیں مسکرائی تھیں، نوجوان بولا۔

''انجان بننے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ میں کسی قسم کی سختی نہیں چاہتا۔''

پامی نے گود سے سر اٹھاتے ہوئے تلخ انداز میں کہا۔ ''ہمیں اغوا کرنے سے بڑھ کر بھی کوئی سختی ہو سکتی ہے؟''

نوجوان بولا۔ ''میری پوری بات سن لو، اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ تم میرا شمار محسنوں میں کرنے لگو گی مگر پہلے ناشتا کرلو۔''

اینی نے کہا۔ ''ناشتے کو چھوڑو! پہلے بات کر لیتے ہیں۔''

نوجوان آمادہ نظر آنے لگا، وہ بولا۔ ''دنیا کی کئی ایجنسیوں کی طرح موساد بھی تمہارے تعاقب میں تھی۔''

اینی نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی۔ ''کیا مطلب! تمہارا تعلق موساد سے نہیں ہے؟''

نوجوان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، بلکہ میں نے تم دونوں کو موساد کے جبڑوں سے چھڑایا ہے۔''

وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔

نوجوان چند لمحے انہیں دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میں شروع سے تمہیں بتاتا ہوں۔ سب سے پہلے تو اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام نجیب مالکی ہے۔ میرے بارے میں اتنا جاننا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ میں گزشتہ اٹھارہ ماہ سے تمہارے تعاقب میں ہوں۔ یاد ہوگا ایران کی پارلیمنٹ کی ویب سائٹ کو ''ہیک'' کرنے کے بعد تم لوگوں نے بطور چیلنج اپنے ''نقش پا'' اس چیلنج کے ساتھ چھوڑے تھے کہ ہمیں ڈھونڈ کر دکھاؤ۔''

اینی اور پامی دوبارہ سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

نجیب نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''تمہیں یقین تھا کہ کم از کم ایران میں تو کوئی اتنی صلاحیت نہیں رکھتا کہ تمہیں

ڈھونڈ سکے مگر یہ تمہاری غلط فہمی اور حد سے بڑھی خود اعتمادی تھی۔ اسی لغزشِ پا کے سبب آج تم، میرے سامنے ہو۔ اب اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ اسی وقت موساد نے بھی تمہیں کھوج لیا اور مجھے اس کے بھیانک جبڑوں سے تمہیں نکالنا پڑا۔"

اب کھلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اینی بولی۔ "تم یہ زحمت نہ ہی کرتے تو اچھا تھا۔ ہم نے کبھی اسرائیلی مفادات کو زک نہیں پہنچائی۔ ہمیں "موساد" کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

نجیب بولا۔ "بے شک تم نے براہِ راست کوئی زک نہیں پہنچائی مگر جس ہیکرز گروپ سے تم علیحدہ ہوئی ہو، انہوں نے تمہاری مدد سے اسرائیلی فضائی دفاعی نظام "تھاڈ" اور گولان کی پہاڑیوں کے دفاعی نقشے چرائے ہیں اور انہیں بلیک مارکیٹ میں بیچ دیا ہے۔ الیکٹرک چیئر تم سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔"

اس دفعہ "اسپائیڈر گرلز" کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

نجیب نے مزید کہا۔ "اس کے علاوہ تم اسرائیل کے مربی اور سب سے بڑے فطری اتحادی امریکا کو تو بھول ہی گئی ہو۔ تمہارے بیچے ہوئے ڈیزائن ہی تھے جنہوں نے چائنا کے "ڈرون" پروگرام کی خاصی مدد کی ہے۔ وہ ڈیزائن تم نے چرائے تھے۔ سی آئی اے آج بھی تمہارے تعاقب میں ہے۔"

وہ خاموش ہوا تو اینی نے مردہ سی آواز میں کہا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟"

نجیب کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ بولا۔ "فی الحال تو چاہتا ہوں تم دونوں اطمینان سے ناشتا کرلو، باقی باتیں بعد میں کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ فولادی دروازہ بند ہوگیا تھا۔

☆☆☆

پانچ ایجنٹس کی ہلاکت نے موساد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ موساد کے لیے یہ بات بے حد شرمندگی اور سبکی کا باعث تھی کہ تل ابیب جسے موساد کا گھر کہا جاتا تھا، وہاں کوئی ایسا گروپ موجود تھا جس نے نہ صرف اینی کو موساد کی گرفت سے نکال لیا تھا بلکہ اس کے پانچ ایجنٹس کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔

موساد پوری طاقت سے کھڑی ہوگئی تھی۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مجرم جانتے تھے کہ موساد...... اینی کو اٹھانے والی ہے۔ وہ پہلے ہی سے گھات لگائے ہوئے تھے۔

یہاں دو سوال بڑی اُلجھن پیدا کر رہے تھے۔

پہلا سوال یہ تھا کہ مجرم اپنے طور پر بھی تو اینی کو اٹھا سکتے تھے پھر انہوں نے موساد کے اٹھانے کا انتظار کرتے ہوئے گھات کیوں لگائی۔ حالات و واقعات سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اتفاق نہیں ہوا تھا کہ جس وقت مجرم اینی کو اٹھانے کے لیے گئے...... موساد ٹھیک اسی وقت اینی کو اٹھا چکی تھی۔ کیونکہ موساد کی ٹیم کے حرکت میں آتے ہی مجرموں نے بلڈنگ کے سیکیورٹی روم کو قابو میں کرلیا تھا۔

دوسرا سوال...... اینی کی اہمیت کے متعلق تھا۔ اینی کیا اہمیت و اہلیت رکھتی تھی جس کے سبب اسے موساد کے شکنجے سے نکالا گیا تھا۔

شیزل کا کہنا تھا کہ یہ الیس نامی قاتل کی بچھائی بساط تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی موساد اس کی مرضی کی چالیں چلنے پر مجبور تھی اور ہر چال پر اس کی نظر ہوتی تھی۔ شیزل نے کہا تھا۔

"یہ کوئی گریٹ گیم ہے جو دھند میں چھپا ہوا ہے۔ اس کا توڑ نہ کیا گیا تو ناقابلِ تلافی نقصان ہوسکتا ہے۔" موساد کے بہترین دماغ سر جوڑے اس گریٹ گیم کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تحقیقاتی ٹیمیں بھی مصروفِ عمل تھیں۔ جو ٹیم اینی پر کام کر رہی تھی، اس نے جلد ہی پتا چلا لیا کہ اینی کی ایک خاص اور واحد فی میل دوست پامی بھی اسی رات سے غائب تھی جب اینی کو موساد کے شکنجے سے نکالا گیا تھا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد صورتِ حال مزید گمبھیر ہوگئی تھی۔

دوسری ٹیم بھی محنت کر رہی تھی۔ سیکیورٹی کیمروں کے آف ہونے کے بعد چوراہے کا ایک کیمرا ان کا مددگار ثابت ہوا تھا۔ موساد کی ٹیم کی ہلاکت کے فوراً بعد ایک گاڑی اینی والی بلڈنگ سے نکلی تھی۔ شبہ تھا کہ اسی گاڑی میں قاتل اینی کو لے کر نکلے ہیں۔ مختلف کیمروں سے اس گاڑی کو مانیٹر کیا گیا تھا۔ آخری دفعہ وہ گاڑی ہائی وے کے قریب ایک سروس اسٹیشن کے کیمروں میں نظر آئی تھی۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس گاڑی کو تلاش کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جاری تھی۔

شیزل، لائیڈ اور کرنل ہالنڈون...... الیس کی تلاش میں تھے مگر اسے تو جیسے آسمان نے اُچک لیا تھا مگر وہ تینوں جانتے تھے وہ اپنی کچھار میں شکار پر جھپٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ جھپٹنے سے پہلے اسے دبوچ لیں۔ الیس کی دستیاب تصویریں اور معلومات موساد کے ہر ایجنٹ اور مخبر

کے موبائل فون میں پہنچ چکی تھیں۔

☆☆☆

نجیب مالکی اور الیس آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔
الیس ایک ادھیڑ عمر یہودی ربی کے روپ میں تھا۔ اس کا بہروپ اتنا مکمل تھا کہ کوئی بھی اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ اسی بہروپ میں اس نے جیریکو سے تل ابیب کا سفر کیا تھا۔
الیس کی آواز ابھری۔ ”کیا رہا نجیب؟“ اسے تل ابیب پہنچے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔
نجیب نے جواب دیا۔ ”سب کچھ منصوبے کے عین مطابق ہی ہوا ہے۔ ذاکر بھی کل خیریت سے پہنچ گیا ہے۔ دونوں لڑکیوں پر تھوڑا سا کام کرنا باقی ہے اور اس کے بعد تین مارچ کا صرف انتظار ہوگا۔“ آخری فقرہ کہتے ہوئے نجیب کی آنکھوں میں تجمد اداسی کے عقب سے لحظے بھر کے لیے آگ سی نمودار ہوئی تھی۔
اسی دوران ایک نوجوان لڑکی ٹرے میں چائے کے دو کپ اور دیگر لوازمات لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بڑے تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ الیس سے علیک سلیک کی۔ الیس نے بھی اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔
لڑکی کے واپس جاتے ہی گفتگو کا سلسلہ دوبارہ سے شروع ہو گیا.... اور چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ بھی انصاف ہونے لگا۔
الیس نے پوچھا۔ ”دوسری طرف کی کیا خبریں ہیں؟“
”بظاہر باقی دونوں درندے اپنے معمولات میں لگے ہوئے ہیں مگر تین کلومیٹر کے دائرے میں ان کے گرد دو حفاظتی حصار ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی جس میں نگرانی کے ہیلی کاپٹر اور ”شکاری ڈرون“ بھی شامل ہیں اور پچاس کے لگ بھگ ایجنٹ آپ کے ”انتظار“ میں ہیں۔“
چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے نجیب کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔
الیس مطمئن نظر آنے لگا۔ توقع کے عین مطابق ”موساد“ کی تمام تر توجہ اس کی من چاہی جانب ہی مبذول تھی۔ اس نے کیک کا ٹکڑا حلق سے اتارتے ہوئے چائے کا گھونٹ لیا۔
نجیب بولا۔ ”ان دونوں درندوں کا شکار تو اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ، الیس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ سامنے بیٹھا شخص ناممکن کو ممکن میں بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
الیس نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں...... میرے بعد کوئی اور آجائے گا۔ ان کی رگوں میں اتارنے کے لیے زہر وافر مقدار میں ہے۔“
نجیب نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ ”ایک سوال کر سکتا ہوں؟“
الیس نے کپ کے اوپر سے آنکھ اٹھائی۔ ”جب سے ہمارا ساتھ ہوا ہے...... پہلی دفعہ ہی تم سوال کرنا چاہ رہے ہو؟“
اس کے انداز نے نجیب کو گڑبڑا دیا۔ ”وہ، بس کوئی خاص بات تو نہیں تھی مگر دل میں آگیا تو سوچا پوچھ لوں۔“
الیس نے مختصراً کہا۔ ”دل میں آگیا ہے تو پوچھ لو۔“
الفاظ جوڑ کر نجیب بولا۔ ”دونوں درندوں کو آپ نے ایک خاص قسم کے زہر سے ہی جہنم واصل کیوں کیا؟ ہم، آپ کو بہترین اور خاموش ہتھیار فراہم کرنے کے پابند تھے اور ہم نے انتظام بھی کر رکھا تھا۔ بس یہی بات دل میں چبھ رہی تھی۔“
الیس کے ہونٹوں پر اُس کی مخصوص مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہ ایسی مسکراہٹ تھی جسے کوئی معنی نہیں پہنایا جا سکتا تھا۔ اس کے دہن سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔
”درندوں نے ہمارے عظیم سائنس داں محترم قاسم مشہدی کو جن خاص قسم کی گولیوں سے نشانہ بنایا تھا۔ وہ جسم کے اندر جا کر پھٹتی تھیں اور ان گولیوں کا نشانہ بننے والا موت سے پہلے بے حد اذیت برداشت کرتا تھا۔“
نجیب کو زہر کے استعمال کی سمجھ آنا شروع ہو گئی تھی۔
الیس نے مزید کہا۔ ”یہ زہر ان گولیوں سے بھی زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ تشدد پسند ذہنی مریضوں کو انہی کے سکوں میں جواب دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مقصد بھی تھا۔“
نجیب نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
”موساد کو بھٹکانا مقصود تھا۔ انہیں باور کرانا تھا کہ میں تنہا ہوں اور کسی جدید ہتھیار تک میری رسائی نہیں ہے اس لیے ایک جنگل میں ”بھٹکے“ کمانڈو کے مانند میں نے دستیاب وسائل سے جان لیوا ہتھیار بنا لیا ہے۔“
نجیب کے چہرے پر تحسین نظر آئی پھر اچانک ایک اور خیال نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ اس نے دبی آواز میں کہا۔
”آپ کی بالادست صلاحیت ہی نے تو مجھے زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلنے پر آمادہ کیا ہے۔ خدانخواستہ ہم ناکام

رہے تو امید کی جو آخری شمع ہے، وہ بھی بجھ جائے گی۔ لاکھوں فلسطینیوں کی سینہ کوبی مجھے قبر میں بھی چین نہیں لینے دے گی۔“

”ناکامی کا خوف ہی تو ناکامی کا پہلا زینہ ہے۔ تم کامیابی کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ ہمارا لگایا زخم تا قیامت بھرنے والا نہیں ہے۔ اسرائیل ہمیشہ اس زخم کو چاٹتا رہے گا۔ تمہارے ساتھ ہمارے زخموں پر بھی مرہم رکھا جائے گا۔ تم ان لاکھوں یتیم بچوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے جن کی زندگیوں میں 5.2 ارب ڈالرز رنگ بھر دیں گے۔“

نجیب کی اداس آنکھیں خواب کی تکمیل کے رنگوں سے بھرنے لگیں۔

آخر میں الپس کا لہجہ روکھا اور چہرہ ہر رنگ سے عاری ہو گیا۔ ”ویسے آج اور ابھی تمہارے پاس واپسی کا راستہ کھلا ہے۔ اس کے بعد یہ راستہ بند ملے گا۔ تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے پانچ منٹ ہیں۔“ کپ رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

نجیب بوکھلا کر بولا۔ ”آپ غلط سمجھے...... میں نے صرف ایک وسوسے کا اظہار کیا تھا۔ میں اور میرے بیس جاں نثار اپنی کشتیاں جلا کر اور وسائل پھونک کر آئے ہیں۔ ہم واپس جانے کے لیے نہیں آئے۔ ہم اسرائیل کو ”یادگار“ سبق دے کر ہی رہیں گے۔“ اس کی آواز آخر میں جذبات کی شدت سے لرز اٹھی تھی۔

”ٹھیک ہے مگر آئندہ وسوسوں کو زبان نہ دینا۔“

”معافی چاہتا ہوں، آئندہ احتیاط کروں گا۔“ نجیب نے حقیقی شرمندگی سے کہا۔

الپس نے سر کو اثباتی جنبش دے کر کہا۔ ”میں تھوڑی دیر آرام کر لوں۔ تم لڑکیوں پر کام کر لو۔“

پندرہ منٹ بعد نجیب دوبارہ سے اینی والے کمرے میں تھا۔ پہلے کے مقابلے میں دونوں لڑکیاں خاصی سنبھلی ہوئی تھیں۔ اینی نے اپنا سوال دہرایا۔

”تم ہم سے کیا چاہتے ہو اور ہمارے تعاقب میں کیوں تھے؟“

نجیب نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تم دونوں کی مدد سے مکاؤ کے ڈان اور کوکین کے سب سے بڑے ڈیلر آنجہانی فینگ ہن کی سوئس بینک میں پڑی 5.2 ارب ڈالرز کی لاوارث رقم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ برسوں سے یہ رقم لاوارث پڑی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ تمہاری نہ صرف اس رقم پر نظر ہے بلکہ تم اس کے حصول کے لیے ہاتھ، پاؤں بھی مار رہی ہو۔“

پامی نے کچھ کہنا چاہا تو نجیب نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ”پہلے میری بات سن لو۔“

پامی نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

نجیب نے لحظہ بھر اس کے تاثرات کا جائزہ لیا اور بات کو آگے بڑھایا۔ ”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اصلیت چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تمہارا ایک سابقہ ساتھی پہلے سے ہمارے ساتھ ہے۔ تم دونوں سے بڑھ کر نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔“

اینی بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔ ”کون ہے وہ؟“

نجیب مسکرایا۔ ”تم کھل گئی ہو...... یہ اچھی بات ہے۔ اس کا اصل نام تو ذاکر ہے مگر تم دونوں اسے ”بلیک سافٹ“ کے نام سے جانتی ہو۔ تم تک پہنچنے میں اس کی خاص مدد شامل تھی۔

اسپائیڈر گرلز نے بیک وقت طویل سانس لیا۔ بلیک سافٹ ایک متاثر کن ہیکر تھا۔

نجیب نے مزید کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم تینوں مل کر اس ناممکن کو ممکن کر سکتے ہو۔“

اینی نے کہا۔ ”اگر ہم اس کام سے انکار کر دیں تو ہمارے لیے کیا آپشن رہ جائے گا؟“

نجیب کی اداس آنکھوں میں ابھرنے والے تاثرات نے انہیں ڈرا دیا۔

”انکار کا آپشن نہیں ہے۔ تمہیں پاؤں کی طرف سے آہستہ آہستہ کاٹ کر بھی اس کام پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تمہاری کارکردگی کو مانیٹر کرنے کے لیے بلیک سافٹ ہمارے پاس ہے۔“

نجیب نے ڈرامائی وقفہ دیا تو دونوں لڑکیاں ایک، دوسرے سے چپکی کانپ رہی تھیں۔ سامنے بیٹھے شخص کا لہجہ گواہ تھا کہ جو وہ کہہ رہا ہے، اس پر یقین عمل ہوگا۔

نجیب نے لمحاتی وقفے کے بعد کہا۔ ”اس کے علاوہ جلد ہی ایک شخص کو یہاں پہنچایا جانے والا ہے، جسے پور پور کٹتا اور اپنے ہی خون میں نہاتا شاید تم نہ دیکھ سکو۔“ اس کی نگاہوں کا مرکز اینی تھی۔

اینی کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ اندیشوں کو بمشکل دباتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”کک...... کون شخص ہے وہ؟“

نجیب مسکرایا۔ ”نام تو اس کا کچھ اور ہے مگر پیار سے تم

اسے الیس کہتی ہو۔ ڈیڈی سے نکال لاچکے ہیں اُسے۔''

اینی کی آنکھوں سے جیسے آبشار پھوٹ پڑا۔ ''خدا کے لیے اسے کچھ نہ کہنا، تم جیسا چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔''

پامی نے روتی ہوئی اینی کو بانہوں میں لے لیا۔ وہ اینی کی مخلص دوست اور ساتھی تھی۔ اینی کے آنسو اس کی آنکھوں میں بھی چمکنے لگے تھے۔ وہ...... الیس اور اینی کی پریم کہانی سے نہ صرف آگاہ تھی بلکہ اینی کی زندگی میں آنے والی بہار سے بے حد خوش بھی تھی۔

نجیب نے نرم انداز میں کہا۔ ''بخدا میں ایسا نہیں چاہتا، تمہارے ساتھ بااعتماد ساتھی کے مانند کام کرنا چاہتا ہوں۔ رقم میں سے ایک ارب ڈالرز تمہارے ہوں گے۔ جنہیں تم من چاہے اکاؤنٹ میں بے شک پہلے ہی منتقل کر لینا۔ اس کے بعد تم دونوں کے ساتھ الیس کو بھی دنیا کے جس ملک میں چاہوگی بحفاظت پہنچادیا جائے گا۔''

اینی مسلسل روئے جارہی تھی۔ نجیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اسے سمجھاؤ، ذہن پر بوجھ نہ لے۔ تمہارے کہنے پر ہی میں نے انتہائی اقدام کا بتایا ہے۔''

نجیب دروازے کے قریب پہنچا تو پامی کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ ''میرے اپارٹمنٹ میں ہمارا پورا سسٹم لگا ہوا ہے یا تو ہمیں وہاں جانا ہوگا یا پھر وہ سسٹم یہاں چاہیے۔''

نجیب نے سر گھمایا۔ ''سسٹم تمہارے ساتھ ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔''

اینی نے رُندھی آواز میں کہا۔ ''اور الیس......''

''وہ بھی چند گھنٹوں میں تمہارے پاس ہوگا۔''

☆☆☆

شیزل کا دماغ تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اس کے سامنے تصویر کے کئی ٹکڑے تھے جنہیں وہ اپنی جگہ پر بٹھانے کی تگ ودو میں مصروف تھی۔ انتہائی خوبرو الیس نامی قاتل ایک کم صورت لڑکی کا یقیناً جذباتی استحصال کرتے ہوئے اسے سہولت کار کے طور پر استعمال کر رہا تھا مگر اس لڑکی کو موساد کے شکنجے سے انتہائی منظم طریقے سے نکالنے کی وجہ کیا ہوسکتی تھی۔ اگر اینی نامی وہ لڑکی کسی خاص راز سے آگاہ تھی تو محض ایک گولی سے اسے خاموش کروایا جاسکتا تھا۔

پامی کی پُراسرار گمشدگی بھی معما بنی ہوئی تھی۔ یقیناً پامی اور اینی کے درمیان کوئی کڑی تو ضرور تھی جو گمشدہ تھی۔ کچھ لوگ اس کڑی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہائی وے کے آس پاس وسیع پیمانے پر سرچ آپریشن کا آغاز ہو گیا تھا۔ شیزل نے جو اندازہ لگایا تھا، اس کے مطابق ایرانیوں کا انتہائی تربیت یافتہ اور منظم گروہ اسرائیل میں در آیا تھا۔ ایران کے اسرائیل مخالف عسکری گروہوں سے رابطے اور اعانت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ایرانی گروپ کو ایسے ہی کسی عسکری گروپ کی مدد حاصل تھی جو پہلے سے اسرائیل میں موجود تھا۔ ممکنہ طور پر ایسا کوئی فلسطینی عسکریت پسند گروپ ہی ہوسکتا تھا۔ دونوں گروپ مل کر یقینی طور پر اسرائیل کے مفادات کے خلاف کوئی بڑی کارروائی کے چکر میں تھے۔ ممکنہ طور پر یہ کارروائی کیا ہوسکتی تھی؟

شیزل نے اس پر خاصا سر کھپایا تھا۔ ایرانی بدلے کی آگ میں جل رہے تھے۔ اپنے ایٹمی سائنس داں کے قتل میں ملوث چار کمانڈوز کو الیس نے اپنا شکار بنالیا تھا۔ بظاہر بڑی کارروائی یہی لگ رہی تھی مگر دانیال کو جس انداز میں الیس نے اپنا نشانہ بنایا تھا، وہ انداز کسی اور ہی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

شیزل کا خیال تھا کہ الیس...... موساد کو اپنے تعاقب میں اُلجھا رہا ہے اور اس کے گروپ کے دیگر ارکان کسی اور ٹارگٹ کے چکر میں ہیں۔ یہ مفروضہ سبھی کے دل کو لگا تھا۔ دوسرا ٹارگٹ کیا ہوسکتا تھا؟ اس پر سر کھپانے کے بعد سبھی شیزل کے اس خیال سے متفق تھے کہ ایرانی ایٹمی سائنس داں کے بدلے ایٹمی سائنس داں کو ہی نشانہ بنانے کے چکر میں ہیں۔ اس کے بعد ایٹمی سائنس دانوں کی فول پروف سیکیورٹی کے پلان کو یکسر نئے سرے سے ترتیب دیا جارہا تھا۔

ایرانی ٹاپ ایجنٹس کی کھوج کے ساتھ ساتھ فلسطینی عسکریت پسند گروپس کی بھی جانچ پڑتال جاری تھی، مخبر ہر طرف خبروں کے حصول کے لیے سرگرم تھے۔

تصویر کا رخ واضح ہورہا تھا مگر اینی شادیز اور پامی والے ٹکڑے کسی خانے میں فٹ نہیں بیٹھ رہے تھے۔ شیزل کا ذہن گھن چکر بنا ہوا تھا۔

اسی وقت ایک مخبر کی جانب سے اہم ترین خبر آگئی۔ یہ مخبر ایک فلسطینی سوپر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہائی وے کے ساتھ ایک نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں شبہ ہے کہ اس نے ''حماس'' سے ناراض ہوکر علیحدہ ہوجانے والے ''الاقصیٰ بریگیڈ'' کے اہم ترین رکن نجیب مالکی کو دیکھا ہے۔

الاقصیٰ بریگیڈ...... موساد کے ریڈار پر تھی۔ فلسطینی حریت پسند کھلے جاچکے تھے۔ ایران کی مدد سے کھڑی یہ واحد

تنظیم تھی جو بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ موساد کو ہر صورت فلسطینیوں کی اس ''آخری امید'' کو بھی ختم کر دینے کے احکامات تھے۔

اینی شاویز کے اغوا کار ہائی وے کے پاس ہی آخری دفعہ دیکھے گئے تھے۔ اس تناظر میں یہ خبر بہت اہم تھی۔ موساد نے بڑی تیزی کے ساتھ اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں جال پھیلانا شروع کر دیا۔

شیزل کی تھیوری درست ثابت ہو رہی تھی۔ ایران اور فلسطینی مل کر کام کر رہے تھے۔ اسی وقت ہیڈ کوارٹر سے بھی خبر آ گئی کہ ایران کی خفیہ ایجنسی کا ٹاپ ایجنٹ میجر کمال منظر سے غائب تھا۔ میجر کمال کا قد و قامت اور شکل و صورت الپس سے خاصی مشابہت رکھتی تھی۔ قوی امکان تھا کہ الپس کے روپ میں میجر کمال ہی ہے۔

موساد کے ہیڈ کوارٹر نے فوراً ہی ایک شاطرانہ منصوبہ ترتیب دے دیا۔ مبینہ میجر کمال کو زندہ گرفتار کرنے کے احکامات آ گئے تھے۔ تاکہ اسے دنیا کے سامنے پیش کر کے ایران کے خلاف بھرپور کارروائی کی راہ ہموار کی جاسکے۔

☆☆☆

اینی شاویز کتنی دیر الپس کے گلے سے لگ کر روتی رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ الپس کو ٹٹول بھی رہے تھے۔ اس نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟''

الپس نے اسے بے تحاشا چوما۔ ''بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہاری فکر نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔''

اینی زبردستی مسکرائی۔ ''دیکھ رہے ہو...... میں بھی ٹھیک ٹھاک ہوں۔''

قریب کھڑی پامی انہیں یک جان دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

جذبات کا ریلا گزر گیا تو اینی نے الپس کا پامی سے تعارف کروایا۔ پامی، اسے غائبانہ طور پر جانتی تھی۔ اس نے الپس کی درجنوں تصویریں دیکھ رکھی تھیں۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے الپس سے ہاتھ ملایا۔

اینی نے ساری صورت حال الپس کے گوش گزار کر دی اور کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں کہ میں نے یہ بات تم سے چھپائی کہ میں ہیکر ہوں۔ دراصل میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔''

الپس نے عام سے انداز میں کہا۔ ''یہ کوئی خاص بات نہیں ہے مگر سرپرائز والی بات بہت خاص ہے۔ سرپرائز کیا تھا؟''

اینی نے سر جھکا لیا۔ ''دراصل جس کام کے لیے نجیب کہہ رہا ہے، میں اور پامی کافی عرصے سے اس پر کام کر رہے ہیں۔ وہ لاوارث دولت ہے۔ کامیابی ہر دفعہ مٹھی سے پھسل جاتی ہے۔ میں، تمہیں سپر لگژری زندگی کا تحفہ اور سرپرائز دینا چاہتی تھی، ہم پوری دنیا کی سیاحت پر نکلتے۔'' اس کی آنکھوں سے مستی آمیز خواب جھانکنے لگے۔

الپس نے اسے بانہوں کے گھیرے میں دوبارہ سے لے لیا۔ ''تو اب کیا ہوا؟ ہم اب بھی سیاحت پر چلیں گے۔ میرے پاس زیادہ تو نہیں مگر اتنی دولت ضرور ہے کہ تم نے جو خواب آنکھوں میں سجایا ہے، اسے پورا کر سکوں...... تم ان لوگوں کو انکار کر دو بلکہ میں خود بات کرتا ہوں۔ تمہاری مرضی کے بغیر یہ کیسے زبردستی کر سکتے ہیں۔'' اینی کو چھوڑ کر وہ فولادی دروازہ پیٹنے لگ گیا۔

اینی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے روکا اور الپس کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا تو الپس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں اینی، اسے ''رام'' کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ نجیب وغیرہ کے ساتھ مل کر کام کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اگلے دو دنوں تک اینی، پامی اور ذاکر مل کر سر کھپاتے رہے اور پھر ہاتھ کھڑے کر دیے۔ نجیب کا سامنا ہوا تو اینی نے کہا۔ ''اس دولت کے حصول کے لیے ہمیں سپر کمپیوٹر چاہیے۔ ظاہر ہے اس کا انتظام نہیں ہو سکتا۔'' اس کے انداز میں مایوسی ہی مایوسی تھی۔

نجیب مسکرایا۔ ذاکر اس حوالے سے پہلے بھی اپنے خدشے کا اظہار کر چکا تھا اور اب تو یہ بات یقینی ہو چکی تھی۔ اس نے پوچھا۔

''تمہیں جس قسم کا کمپیوٹر درکار ہے، وہ اسرائیل میں کہاں دستیاب ہے؟''

''ایک وزارتِ دفاع کے ہیڈ کوارٹر میں ہے اور دوسرا سینٹرل ریزرو بینک آف اسرائیل میں ہے۔''

نجیب نے رمزیہ انداز میں پوچھا۔ ''اگر ان دونوں میں سے کوئی کمپیوٹر میسر آ جائے تو؟''

اینی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''پھر دنیا کا کوئی کام بھی ناممکن نہیں رہے گا۔''

تھوڑی دیر بعد الپس اور نجیب ایک بالکونی میں کھڑے تھے۔ سامنے ہی سینٹرل ریزرو بینک آف اسرائیل کی فلک بوس عمارت نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

موساد کے ایجنٹ آخر کار اس روسی ہیکرز گروپ تک پہنچ ہی گئے تھے جو اسرائیلی حساس معلومات کے درپے تھا۔ انہیں اب بے حد خفیہ طریقے سے روس سے کروشیا منتقل کیا جارہا تھا۔ جہاں سے انہیں اسرائیل لانے کے لیے ایک خصوصی طیارہ پہنچ چکا تھا۔

ان ہیکرز سے سنسنی خیز انکشافات کی توقع تھی۔

دوسری طرف تل ابیب میں ہائی وے کے ساتھ والی ہاؤسنگ سوسائٹی میں مختلف بہروپ میں موساد کے دو درجن سے زائد ایجنٹ متحرک تھے۔ جاسوسی کے جدید ترین آلات کی مدد سے ایک، ایک گھر اور فارم ہاؤس کو جانچا جارہا تھا مگر نجیب مالکی کا کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا۔

پھر پہلی کامیابی ملی۔ ایک گھر خالی پڑا تھا جو ایک اسرائیلی تاجر کا تھا۔ تاجر کئی ماہ سے بیرونِ ملک گیا ہوا تھا۔ اس گھر کی جانچ کرتے ہوئے بالوں کے کچھ نمونے ملے تھے۔ الپس کے بالوں کا نمونہ موساد کے پاس تھا۔ یہ نمونہ اینی کے اپارٹمنٹ سے ملا تھا۔ دونوں نمونوں کا موازنہ ہوا تو یہ آپس میں میچ کر گیا۔

موساد کو الاقصیٰ بریگیڈ اور الپس کے گٹھ جوڑ کا یقین ہو گیا۔

تاجر کے منیجر نے تشدد کی چکی میں پس کر زبان کھول دی تھی۔ اس نے یہ گھر منہ مانگے معاوضے پر کرائے داری کے قانون کی مکمل خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک بڑی بیکری کے فلسطینی مالک کو کرائے پر دیا تھا۔

مقامی سہولت کاروں کا سرا موساد کے ہاتھ میں آخر آ ہی گیا تھا۔

الپس کی احتیاط پسندی نجیب مالکی کے کام آ گئی تھی۔ جس نے پہلے ہی زبانی ہدایت کر دی تھی کہ اینی وغیرہ کے ہاتھ آنے کے بعد ٹھکانا تبدیل کر لیا جائے۔

موساد کو یقین تھا کہ وہ جلد ہی نجیب اور الپس کو ڈھونڈ نکالے گی۔

دوسری طرف میجر کمال کی کھوج بھی جاری تھی۔

☆☆☆

الپس اور نجیب اپنے منصوبے کو حتمی شکل دے رہے تھے۔ نجیب بولا۔ ''میرے ساتھی حرکت میں آنے کے لیے بے چین ہیں۔''

''ان کی بے چینی دور ہونے میں گھنٹے ہی تو رہ گئے ہیں۔ تم ایک دفعہ سارا پلان دہرا دو! جو تم نے اپنے ساتھیوں کو ذہن نشین کروا دیا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کوئی سقم رہ تو نہیں گیا۔

نجیب گہرا سانس لے کر شروع ہو گیا۔

''مجھ سمیت ہم بارہ افراد ہیں جو چار چار کے گروپوں میں تقسیم ہیں۔ ہمارے پاس وافر مقدار میں دستی بم اور جدید رائفلیں بھرپور ایمونیشن کے ساتھ موجود ہیں۔ تین شاندار قسم کی گاڑیوں میں یہ سارا اسلحہ اور افراد مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ آپ کے اشارے پر ہم حرکت میں آئیں گے۔ ایک گاڑی میں اینی، پامی اور ذاکر کو لے جایا جائے گا۔''

ساری تفصیل جاننے کے بعد الپس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''یہ بات اپنے ساتھیوں کو ایک دفعہ پھر ذہن نشین کروا دینا کہ ہمارے درمیان کوئی مواصلاتی رابطہ نہیں ہوگا۔ جو جہاں ہے ڈٹا رہے۔ ہم نے خون کے آخری قطرے تک اسرائیلیوں کو بینک کی عمارت میں داخل ہونے سے روکنا ہے۔ تمہارے ساتھیوں کو صرف یہی ٹاسک دیا جارہا ہے۔ باقی سب نقاب میں رہیں گے اور گیس ماسک سے کسی پل غافل نہیں ہوں گے۔''

نجیب کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ''آپ بے فکر رہیں۔''

☆☆☆

موساد کے ہیڈ کوارٹر میں جشن کا سماں تھا۔ انہیں ایک ایسی کامیابی ملی تھی جس کے لیے وہ برسوں سے سرگرداں تھے۔ کل تین مارچ کا دن تھا۔ الاقصیٰ بریگیڈ کے بانی کی برسی کا دن۔ برسی کے موقع پر الاقصیٰ بریگیڈ کی قیادت یکجا ہو رہی تھی۔ جگہ کا تعین ہو گیا تھا۔ حتمی وقت طے ہونا باقی تھا۔

موساد تک یہ خبر پہنچ گئی تھی۔ الاقصیٰ بریگیڈ کی پوری قیادت کو اُڑانے کا شاندار موقع میسر آنے والا تھا۔ یہ خبر شیزل تک پہنچی... تو اس کے ہونٹوں پر فتح مندانہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

الپس اور نجیب کے لیے ایک بھرپور شاک ظہور میں آنے والا تھا۔ ان کی پشت پر موجود حمایتی کسی بھی وقت لقمۂ اجل بننے والے تھے۔

☆☆☆

تین مارچ دوپہر کے تین بجے تین مضبوط باڈی کی مختلف میک اور ماڈلز کی گاڑیاں مختلف سمتوں سے سینٹرل ریزرو بینک کی جانب روانہ ہوگئیں۔ ایک گاڑی میں اینی اور پامی کے ساتھ نجیب، لیلیٰ اور ایک نوجوان باسط تھا۔

اینی اور پامی کو بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا گیا تھا۔ وہ دونوں گاڑی کے عقبی اور محفوظ ترین حصے میں تھیں۔

ڈرائیونگ سیٹ پر باسط تھا۔ اس کے ساتھ لیلیٰ بیٹھی ہوئی تھی۔ عقبی نشست پر نجیب براجمان تھا۔ وہ تینوں مخصوص لباس میں تھے۔ ان کے وزنی بیگ ان کے قدموں میں پڑے تھے۔ رائفلیں بھی بیگز کے قریب کپڑوں کے نیچے پوشیدہ تھیں۔ وہ راستے میں آنے والی کسی بھی رکاوٹ سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔

دوسری گاڑی میں الپس کے ساتھ ذاکر تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نجیب کا ایک ساتھی تھا۔ الپس نے حلیے میں معمولی تبدیلی کرلی تھی۔ نجیب کے دو اور ساتھی بھی عقبی نشستوں پر تھے۔ تیسری گاڑی میں بھی نجیب کے ساتھی تھے۔

ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھے ذاکر کی انگلیاں گود میں رکھے جدید ترین لیپ ٹاپ پر تیزی سے رواں تھیں۔ فضا میں جیسے سنسنی کی نادیدہ لہریں ابھی سے کروٹ لینے لگ گئی تھیں۔

لیلیٰ، باسط اور نجیب کی ذمے داری بینک کے کنٹرول روم تک پہنچنا تھا۔ کنٹرول روم کے فولادی دروازے کے عقب میں وہ کئی گھنٹوں کے لیے محفوظ رہ کر اپنا کام کرسکتے تھے۔ بعد میں ذاکر کو بھی ان لوگوں کے ساتھ مل جانا تھا۔

الپس کو دو لڑکوں کے ساتھ سب سے اہم ذمے داری نبھانی تھی۔ کنٹرول روم سے ملحق پاور روم کا کنٹرول اس کے ذمے تھا۔ برقی رو معطل ہونے کی صورت میں یہاں جدید ترین اسٹینڈ بائی جنریٹر تھے جنہیں رواں رکھنا بے حد ضروری تھا۔

انٹرنیٹ سروس کی معطلی کی انہیں فکر نہیں تھی۔ سپر کمپیوٹر براہِ راست سٹیلائٹ انٹرنیٹ سے منسلک تھا۔

نجیب کے دیگر ساتھیوں کی ذمے داری سیکیورٹی فورسز کو بینک کی عمارت کے اندر داخل ہونے سے روکنا تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بطور ڈھال بینک کے عملے کو بھی یرغمال بنانا تھا۔ یہ عام بینک تو تھا نہیں اس لیے یہاں عام افراد کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔

سب سے اہم کردار ذاکر کا تھا جس نے بینک کے تمام سیکیورٹی سسٹم کو ہیک کرلیا تھا۔ ایک بٹن دباتے ہی بینک کا تمام کنٹرول اس کے ہاتھ میں چلا جاتا۔ ہنگامہ تیزی کا آغاز ہوگیا۔ بینک کے داخلی راستے پر تعینات سیکیورٹی والوں نے تیزی سے اپنی طرف آتی جیپ کو دیکھ کر ہتھیار سیدھے کرلیے۔

عقب میں موجود ذاکر نے یہ دیکھتے ہی بٹن دبایا۔ خود کار فولادی گیٹ خود بخود ہی کھلنے لگا۔ یہ دیکھ کر سیکیورٹی والوں میں کھلبلی مچ گئی۔

نجیب نے دستی بم کھڑکی سے سیکیورٹی والوں کی طرف اُچھال دیا۔ ساعت شکن دھماکے کے ساتھ ہی پہلی جیپ بینک میں داخل ہوگئی۔ باقی دونوں جیپیں بھی اس کے پیچھے تھیں۔

دو چیک پوسٹوں سے گاڑیوں پر فائرنگ ہوئی جس کا مؤثر جواب فوراً ہی دیا گیا۔

ذاکر کی انگلیاں تیزی سے حرکت میں آئیں۔ بینک کی مرکزی عمارت کا فولادی دروازہ کھل گیا۔ تینوں جیپیں سیڑھیوں پر اچھلتی، کودتی باری باری اس فولادی دروازے سے گزر کر بینک کے مرکزی ہال میں پہنچ گئیں۔ فولادی دروازہ عقب میں بند ہوگیا تھا۔

☆☆☆

روسی ہیکرز نے زبان کھول دی تھی۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر میں کلیدی سیٹ پر بیٹھی ایک ادھیڑ عمر عورت نے ہیکرز میں سے ایک کی میل ہیڈ کوارٹر کے کمپیوٹر پر کھول لی تھی۔ اس غلطی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے روسی ہیکرز ”نقب“ لگانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

انہوں نے اعتراف کیا کہ تھرڈ مین کے توسط سے انہوں نے ہی ”ایلیٹ کمانڈوز“ کی شناخت ایران کو فروخت کی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ وزارتِ دفاع کی عمارت کی سیکیورٹی سمیت متعدد عمارات کے دفاعی نظام کی حساس معلومات اور کوڈز بھی انہوں نے ایرانیوں کو بیچے تھے۔

یہ ایک زلزلہ تھا جس نے موساد کے ہیڈ کوارٹر سے لے کر وزیراعظم ہاؤس تک کو ہلا دیا تھا۔

بات سے بات نکلتی رہی۔ بار بار ”اسپائیڈر گرلز“ کا نام سامنے آرہا تھا...... جو بھی اس گروپ کے ساتھ مل کر کام کرتی رہی تھیں۔ یہ دونوں لڑکیاں اسرائیلی تھیں۔ اس سے زیادہ روسی ہیکرز ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

موساد کا سائبر ونگ برق رفتاری سے اسپائیڈر گرلز کی کھوج میں لگ گیا۔

شیزل، لائیڈ اور کرنل بالڈون کے درمیان دھواں دھار گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔

لائیڈ بولا۔ ”یقینی طور پر ایرانی اور فلسطینی دہشت گرد مل کر کسی بڑے ٹارگٹ کو ہٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ممکنہ طور پر یہ ٹارگٹ وزارتِ دفاع کی عمارت ہوسکتی ہے۔ بڑی عیاری

سے انہوں نے ہمیں ایلیٹ کمانڈوز کی حفاظت میں اُلجھا کر اپنی راہ ہموار کرلی ہوگی۔ نیا سسٹم اور کوڈز وغیرہ کی تبدیلی کے لیے کافی وقت چاہیے۔ وہ نہ جانے کتنا آگے بڑھ چکے ہیں۔''

بالڈون بولا۔ ''وزارتِ دفاع کے علاوہ کوئی اور ٹارگٹ بھی ہوسکتا ہے...... کوئی ''سوفٹ ٹارگٹ''......'' اس پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ وزارتِ دفاع تو ان کے لیے موت کا پھندا ثابت ہوسکتی ہے۔''

لائیڈ نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''جن عمارتوں کی حساس معلومات لیک ہوئی ہے، ان میں سب سے سوفٹ ٹارگٹ تو مرکزی ریزرو بینک ہی ہے۔ بینک میں ان دہشت گردوں کی کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ وہ جانتے ہیں نہتے لوگوں کو ٹارگٹ کیا گیا تو ہمارا سخت ترین ردِعمل سامنے آئے گا۔''

شیزل گہری سوچ میں غرق تھی۔ وہ باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ''ایرانیوں کا بدلہ لینے کی خاطر ہمارے کمانڈوز کو نشانہ بنانا اور ان کے فطری اتحادی فلسطینی دہشت گردوں کا ان کی ہر ممکن مدد کرنا بھی سمجھ میں آرہا ہے۔ ہمیں ایک محاذ پر الجھا کر دوسری طرف وار کرنا بھی کہانی میں اپنی جگہ پر درست بیٹھ رہا ہے...... کہیں فٹ نہیں ہو رہیں تو اینی شاویز اور اس کی دوست پامی۔ پامی پراسرار طور پر غائب ہے۔ اینی کو ہماری تحویل سے اُچک لیا گیا ہے۔ اس کا ضرور کوئی خاص الخاص مقصد ہے۔ الپس نامی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اگر وہی میجر کمال ہے تو میجر کمال کی فائل بھی اسے غیر معمولی ہی بتاتی ہے۔ ہمیں اس خاص مقصد تک پہنچنا ہے، نہیں تو کوئی بڑا نقصان ہوجائے گا۔''

بالڈون اور لائیڈ کو سوچنے کے لیے نئی راہیں مل گئیں۔ شیزل کا اٹھایا نقطہ واقعی پریشان کن تھا۔

لائیڈ بولا۔ ''الپس نے اس لڑکی اینی شاویز کو غالباً پہلے سے ہی اپنی محبت کے جال میں پھنسا رکھا تھا۔ تم نے دیکھا تو ہے وہ کتنی غیر پُرکشش لڑکی ہے۔ ایک خوبرو مرد کی بھرپور توجہ اس کی عقل پر پردہ ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ اس نے کسی خاص مقصد کے لیے ہی اسے پھنسایا تھا۔ رہائش وغیرہ کے لیے تو اسے مقامی سہولت کار میسر تھے ہی۔ ایک عام سی اسٹوڈنٹ لڑکی اس کے لیے اتنی خاص کیسے ہوسکتی ہے؟''

اینی اور پامی کے تحقیقات کاروں نے بتایا تھا کہ وہ دونوں الگ تھلگ اور قدرے عجیب سی تھیں۔ دونوں ہی کمپیوٹر سائنس کی طالبات تھیں اور غیر معمولی طالبات تھیں۔

یہ سوچتے ہوئے شیزل کے دماغ میں پھلجھڑی سی چھوٹی۔ اس نے ہیجانی انداز میں کہا۔

''فرض کرو، وہ دونوں لڑکیاں ''اسپائیڈر گرلز'' نامی غیر معمولی ہیکرز تھیں تو ان کی کیا اہمیت بنتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے شیزل ہیجان کے سبب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے الفاظ پر اسے ایمان کی حد تک یقین آگیا تھا۔ وہ حلق کے بل چیخی۔

''ان لوگوں کا ٹارگٹ سینٹرل ریزرو بینک ہے۔ سُپر کمپیوٹر دو غیر معمولی ہیکرز کے ہاتھ آگیا تو سمجھ سکتے ہو وہ کیا قیامت برپا کرسکتی ہیں۔''

لائیڈ اور بالڈون کے چہرے دھواں ہو گئے۔ اسی وقت خاص فون کی گھنٹی بجی۔ بالڈون نے چونک کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے کچھ سنتے ہی اُس کا چہرہ زرد ہوگیا اور آنکھیں شیزل پر جم گئیں۔

فون رکھ کر اس نے کھینچ کر اپنی ٹائی ڈھیلی کی۔

لائیڈ نے بے چین ہوکر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ''دہشت گردوں نے سینٹرل ریزرو بینک میں گھس کر عملے کے درجنوں افراد کو یرغمال بنالیا ہے۔''

شیزل نے وحشت کے عالم میں اپنے سنہرے بال نوچ ڈالے۔ ساری کہانی اُسے سمجھ آگئی تھی۔

☆☆☆

سریع الحرکت کارروائی نے ابتدائی برتری دلا دی تھی۔ صورت حال مکمل طور سے الپس کے کنٹرول میں تھی۔ بینک کے دو سینئر عہدیداران کے فنگر پرنٹس اور آنکھوں کو شناخت کر کے کھلنے والا کنٹرول روم کا فولادی دروازہ ذاکر کے ایک اشارے پر کھل گیا تھا۔ کنٹرول روم دیکھ کر لگتا تھا جیسے ناسا کی کوئی لیبارٹری ہو۔

ذاکر تیزی سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا تھا۔ لیلیٰ اور نجیب...... اینی اور پامی کو ہوش میں لانے میں لگ گئے تھے۔ ذاکر نے بینک کی درجنوں منزلوں پر مشتمل بلڈنگ کے سارے دروازے اور لفٹس لاک کر دی تھیں۔ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف بینک کی عمارت میں دو ہیوی مشین گنز اور ایک ملٹی پل راکٹ لانچر کا کنٹرول اب ذاکر کے پاس تھا۔ کئی اسکرینوں پر وہ عمارت کے اندر اور باہر کے مناظر دیکھ سکتا تھا۔

سبھی افراد نے اپنے چہرے نقابوں میں ڈھانپ رکھے تھے۔ نجیب کے ساتھیوں نے بینک میں موجود ملازمین

کے ہاتھ پشت پر باندھ کر انہیں مرکزی ہال میں ایک جگہ بٹھا دیا تھا۔ ان یرغمالیوں کے چہروں پر ابھی سے موت کا خوف زردی بن کر اتر آیا تھا۔

دونڑ کے ان یرغمالیوں کے پاس تھے۔ باقیوں نے مختلف جگہوں پر کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ الیس نے اپنے زیر کمان دونوں لڑکوں کو بہترین جگہ پر پوسٹ کر دیا تھا۔ وہ خود پاور روم کے اندر تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی درجنوں گاڑیاں بینک کے فولادی گیٹ کے سامنے جمع ہو گئیں۔ نجیب کی آنکھوں میں دیوانگی کی چمک اُبھری۔ اس نے ذاکر سے کہا۔

''ان لوگوں کو ذرا ٹریلر دکھاؤ۔''

ذاکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک گول ہینڈل کو اس نے دائیں، بائیں گھماتے ہوئے سرخ رنگ کا بٹن دبایا۔ ہیوی مشین گنز ساعت شکن گھن گرج کے ساتھ سامنے موجود گاڑیوں پر آہن و آگ برسانے لگیں۔ باہر قیامت کا منظر تھا۔ فلسطینیوں کے کسی ممکنہ حملے کے خوف سے جو سسٹم خفیہ طور پر نصب کیا گیا تھا وہ آج اسرائیلیوں پر ہی قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔

فائرنگ کی زوردار آواز سے یرغمالیوں میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ کئی خواتین رونے اور چلّانے لگ گئیں۔ ان پر تعینات لڑکوں نے ڈرا دھمکا کر انہیں خاموش کر دیا تھا۔

ذاکر نے ایک اور بٹن کو چھیڑا۔ خیرہ کن روشنی اور زوردار دھماکوں نے فولادی گیٹ کے قریب دو گاڑیوں کے چیتھڑے اُڑا دیے۔ کئی زخمیوں اور چند لاشوں کے ساتھ تھوڑی ہی دیر میں سبھی گاڑیاں وہاں سے غائب ہو چکی تھیں۔ تباہ ہونے والی دونوں گاڑیوں کے جلتے ہوئے ٹکڑے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔

نجیب کی اداس آنکھوں میں یہ منظر دیکھ کر نشہ سا اتر آیا تھا۔ غاصب درندوں کی پسپائی سینے میں جلتی آگ کے لیے اکسیر ثابت ہوئی تھی۔ ناک میں ٹپکائی جانے والی دوا کے سبب اینی اور پامی کو جلد ہی ہوش آ گیا۔ بدلا ہوا منظر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت سمٹ آئی تھی۔ پامی نے پھٹی پھٹی سی آواز میں پوچھا۔

''ہم کہاں ہیں؟''

نجیب نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''سینٹرل ریزرو بینک آف اسرائیل کے کنٹرول روم میں۔''

اینی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ اپنے ساتھ ہمیں بھی مرواؤ گے۔''

''جب تک زندہ ہوں، تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

نجیب کا مضبوط تر لہجہ اس کے ارادوں کا گواہ تھا۔ ''یہاں سے نکلنے کا فول پروف منصوبہ ہے۔ تم بے فکر ہو کر کام پر لگ جاؤ، ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔''

اینی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''الیس کہاں ہے؟''

''وہ بھی یہیں پر ہے۔''

''میں پہلے اُس سے ملنا چاہوں گی۔''

نجیب پر طیش آمیز جھنجلاہٹ حملہ آور ہوئی۔ اس نے بمشکل خود کو کنٹرول میں رکھا اور کنٹرول روم سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد الیس اپنے اصل حلیے میں کنٹرول روم میں تھا۔ نجیب نے اس کی کنپٹی کے ساتھ رائفل کی نال لگا رکھی تھی۔

الیس نے کچھ دیر اینی کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کیں تو اینی کو کچھ ڈھارس بندھی۔ الیس بولا۔

''تم بے فکر ہو کر اپنے کام کی طرف دھیان دو، میں نے ان لوگوں کا پلان سنا ہے۔ یہ واقعی ہمیں یہاں سے بحفاظت نکال لے جائیں گے۔''

اینی نے قریب آ کر الیس کا ہاتھ چوما اور پھر سپر کمپیوٹر کے سامنے ایک گدیلی نشست سنبھال لی۔ پومی اس کے برابر میں آ بیٹھی۔ اگلے چند منٹوں میں وہ اپنے کام میں مصروف ہو چکی تھیں۔

نجیب، الیس کو چھوڑ کر واپس کنٹرول روم میں آ گیا۔ اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اینی کے سامنے رکھا۔

''یہ چوبیس مختلف آف شور کمپنیوں کے اکاؤنٹس ہیں۔ ہمارے حصے کے پیسے ان اکاؤنٹس میں منتقل کر دو۔ اپنے حصے کا ایک ارب ڈالر تم اپنی مرضی کے اکاؤنٹس میں منتقل کرنے کے لیے آزاد ہو۔''

اسپائیڈر گرلز میں سے کسی نے بھی نظر اٹھا کر اس پرچی کی طرف نہیں دیکھا۔ ان کی نظریں تیزی سے بدلتے اسکرینوں کے مناظر پر تھیں اور انگلیاں برق رفتاری سے حرکت کر رہی تھیں۔

☆☆☆

پورے اسرائیل میں غیر اعلانیہ سیکیورٹی ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی۔ انٹرنیٹ سے منسلک تمام ایٹمی اور ہائی ٹیک ہتھیاروں کو ڈی فیوز کیا جا رہا تھا۔ اس وقت سے کوئی بھی دشمن ملک فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ تینوں افواج کو ہائی الرٹ کر دیا گیا تھا۔ موساد کا چیف یروشلم سے تل ابیب کے لیے پرواز کر

چکا تھا۔ فی الحال کمان کرنل بالڈون کے پاس تھی۔ ہاٹ لائن پر وزیراعظم آفس مسلسل بالڈون سے رابطے میں تھا۔ وزیراعظم ہاؤس میں ہنگامی اجلاس جاری تھا۔

داخلی سلامتی کے ڈیسک آفس میں لائیڈ، کرنل بالڈون سے کہہ رہا تھا۔

''اس سے پہلے کہ سُپر کمپیوٹر کی مدد سے وہ ہم پر کوئی قیامت ڈھائیں یا پھر کوئی عظیم مالی زک پہنچائیں۔ ہمیں بمباری کر کے مرکزی بینک کی پوری عمارت کو ملیامیٹ کر دینا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ سرد اور چہرہ سپاٹ ہو گیا تھا۔

شیزل نے فوراً اختلاف کیا۔ ''ہوش کے ناخن لو، ہمارے درجنوں افراد کو انہوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ جن لوگوں کے دیے ٹیکس سے ہمیں تنخواہ ملتی ہے، تم انہیں مارنے کی بات کر رہے ہو؟''

لائیڈ کے تاثرات میں فرق نہیں آیا۔ ''عظیم تر اسرائیل کے مفاد میں، میں تو اپنے موقف پر قائم ہوں۔''

بالڈون بولا۔ ''اتنے سخت گیر موقف کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے ہاتھ سُپر کمپیوٹر آیا ہے جو بے شک خاص الخاص ہے مگر ایٹم بم تو نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم حفاظتی انتظامات کر رہے ہیں۔ تم کوئی قابلِ عمل پلان دو، ہنگامی اجلاس کے بعد مجھے وہ وزیراعظم کے سامنے رکھنا ہے۔''

لائیڈ نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

شیزل بولی۔ ''سب سے پہلے تو مرکزی بینک کے سیکیورٹی سسٹم کو جام یا پھر دہشت گردوں سے واپس چھیننے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے پورے سائبر ونگ کو استعمال کرتے ہیں۔'' اچانک ہی ایک خیال آنے پر وہ چونکی اور چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔

''لوہے کو لوہے سے کاٹتے ہیں۔ روسی ہیکرز ہمارے پاس ہیں۔ انہیں ''زندگی'' اور مراعات کا جھانسا دے کر سائبر ونگ کے ساتھ کام پر مجبور کرتے ہیں۔ بینک کی عمارت کا بلیو پرنٹ منگوا لو، سیکیورٹی سسٹم جام ہو گیا تو اندر گھسنے کا کوئی راستہ مل جائے گا۔ میں ٹیم کے ساتھ خود اندر جاؤں گی۔''

کرنل بالڈون کے چہرے پر زندگی کی قدرے رمق نظر آئی۔ ''گڈ! وزیراعظم کے لیے میرے پاس کم از کم کوئی منصوبہ تو اب ہے۔''

اسی وقت اسکرین پر ایک رپورٹ نمایاں ہو گئی۔ بینک پر حملے کے فوراً بعد شیزل نے لائیڈ سے چند سفارشات مرتب کی تھیں۔ یہ اُن کا جواب تھا۔

بینک کو بجلی سپلائی معطل کرنے سے متعلق جواب آیا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بینک کے اسٹینڈ بائی پاور فل جنریٹرز دو دن تک بلاتعطل پاور سپلائی بحال رکھ سکتے تھے۔

انٹرنیٹ سروس معطل کرنے سے متعلق جواب آیا تھا کہ اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بینک کو انٹرنیٹ سروس براہِ راست مصنوعی سیارے سے مل رہی تھی اور اس مصنوعی سیارے کو بھی بینک کے سُپر کمپیوٹر سے ہی کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔

شیزل نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ الپس کا ہوم ورک مکمل تھا۔ اس کی صلاحیتوں نے شیزل کو متاثر کیا تھا۔ اس کا سامنا کرنے کی خواہش شدت سے سر ابھار رہی تھی۔

شیزل بولی۔ ''ہمارا ٹارگٹ بینک میں گھس کر پاور روم کو اُڑانا ہے۔ تم لوگ کام پر لگ جاؤ، میں چھاپا مار ٹیم کو تیار کرتی ہوں۔ تین گاڑیوں میں دہشت گرد کتنے بندے لے گئے ہوں گے۔ ان کی تعداد دس سے پندرہ کے درمیان ہو گی۔ انہیں قابو کرنا کوئی بہت مشکل نہیں ہو گا۔ وہاں ہمارے لیے کوئی مشکل کھڑی کر سکتا ہے تو وہ صرف الپس نامی قاتل ہے۔''

☆☆☆

کنٹرول روم میں ایک فون کی گھنٹی بجی تو نجیب نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک کرخت مردانہ آواز سنائی دی۔

''میں تل ابیب کا پولیس چیف جیفری کوپر ہوں۔ تم لوگ کون ہو اور اس بزدلانہ کارروائی کا مقصد کیا ہے؟''

نجیب مالکی نے کہا۔ ''ہمارا تعلق فلسطینی حریت پسند تنظیم الاقصیٰ بریگیڈ سے ہے۔''

جیفری کوپر نے فوراً ہی طنزیہ انداز میں کہا۔ ''نہتوں کو یرغمال بنا کر کس منہ سے تم خود کو حریت پسند کہہ رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔''

نجیب زہریلے انداز میں بولا۔ ''نہتے فلسطینیوں کا قتلِ عام کرنے والوں اور ننھے ننھے بچوں پر گولیاں برسانے والوں کے منہ سے اتنی اعلیٰ و ارفع باتیں سن کر تمہارا منہ گدھے کی لید سے بھرنے کو چاہ رہا ہے۔''

''بکواس نہ کرو۔'' جیفری کوپر بھنا کر گرجا۔

نجیب نے کہا۔ ''تمہاری بکواس نے دماغ گھما دیا ہے۔ تمہیں کچھ لاشوں کا تحفہ دینا پڑے گا۔''

جیفری کوپر فوراً ڈھیلا پڑ گیا۔ ''دماغ کو ٹھنڈا رکھو! یرغمالی محفوظ رہیں گے تو بات چیت کا دروازہ بھی کھلا رہے

گا۔''

''بات کرنی ہے تو اپنے وزیرِ داخلہ کو بلاؤ، تم جیسے بے اختیار گدھوں سے بات کر کے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اسی وقت ذاکر کی متوحش آواز ابھری۔ ''مجھ پر حملہ ہوا ہے۔ سیکیورٹی سسٹم واپس لینے کی کوشش کی جارہی ہے۔''

یہ متوقع تھا۔ نجیب نے اسے ڈٹا رہنے کے لیے کہا اور یہ خبر الپس کو دینے کے لیے باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے اسپائیڈر گرلز پر نظر ڈالی تھی جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

وزیرِاعظم ہاؤس میں ہونے والے اجلاس میں دہشت گردوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس حوالے سے اسرائیل کی پالیسی بے حد واضح تھی۔ بہت پہلے ہی یہ پالیسی وضع ہو چکی تھی کہ ایسے کسی واقعے کی صورت میں دہشت گردوں کے سامنے نہیں جھکا جائے گا۔

کرنل بالڈون نے جب اپنا منصوبہ وزیرِاعظم کے سامنے رکھا تو اس نے اس منصوبے کو پسندیدگی کی سند عطا کر دی۔ یرغمالیوں کی زندگیوں کا رسک تو لینا ہی تھا۔

البتہ وزیرِاعظم نے ہدایت کی تھی کہ دہشت گردوں کے ساتھ مذاکرات کا کھیل ضرور کھیلا جائے اور انہیں اُلجھا کر ان پر حملہ کر دیا جائے۔ دوسری طرف سائبر ونگ کی ٹیم...... روسی ہیکرز کے ساتھ مل کر بینک کے سیکیورٹی سسٹم کو جام کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

شیزل نے اپنی ٹیم منتخب کر لی تھی۔ اس سمیت چھ افراد تھے جو ہر قسم کے کیل کانٹے سے لیس تھے۔

بینک کی عمارت کے بلیو پرنٹ پر کافی غور و خوض کے بعد شیزل نے منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ عمارت کی چھت سے ایک ہوا کی نکاسی کا دیوہیکل پائپ پوری بلڈنگ کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس پائپ کے ذریعے اندر داخل ہونے کا فیصلہ ہوا۔ اب دیر تھی تو صرف سیکیورٹی سسٹم کو واپس لینے یا پھر جام کرنے کی۔

اسی طرح کی کارروائیوں کے لیے خصوصی طور پر ڈیزائن کیا گیا ہیلی کاپٹر اور ٹیم مکمل طور سے تیار تھے۔ ان کا ہدف پاور روم کو اُڑانا تھا۔ پاور روم کے تباہ ہوتے ہی بینک کو گرڈ سے ملنے والی برقی رو کی فراہمی بھی روک دی جاتی۔

☆☆☆

ذاکر کے چہرے پر وحشت نمایاں تھی۔ اس پر کئی سمتوں سے حملہ ہو رہا تھا۔ اس موقع پر اسے اینی اور پامی کی مدد کی ضرورت تھی مگر وہ اپنے کام میں مصروف تھیں اور انہیں جیسے خود کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

رفتہ رفتہ کنٹرول ذاکر کے ہاتھ سے نکلنے لگا۔ پہلے کچھ اسکرینیں آف ہوئیں جن پر بلڈنگ کے مختلف حصے نظر آرہے تھے۔ اس نے چلّا کر کہا۔

''جو کرنا ہے جلدی کرو، کنٹرول میرے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔''

اینی اور پامی کی انگلیاں اور تیزی سے چلنے لگیں۔ دونوں کے چہروں پر پُرمسرت ہیجانی کیفیت نمایاں تھی۔ وہ کامیابی کے بے حد قریب پہنچ گئی تھیں۔

نجیب تیزی سے ذاکر کی طرف آیا۔ اس وقت تک باقی ماندہ اسکرینیں بھی آف ہو گئی تھیں۔ باقی کوئی سسٹم بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

ذاکر نے جھنجلا کر میز پر ہاتھ مارا۔

نجیب بولا۔ ''کوئی بات نہیں ہم ان لوگوں کو دیکھ لیں گے۔ تم دوسرے کام کی طرف اب آجاؤ۔''

ذاکر اپنی سیٹ چھوڑ کر اینی وغیرہ کے قریب بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی آنکھوں میں بھی چمک آگئی۔ منزل چند قدم کے فاصلے پر تھی۔

تھوڑی دیر بعد پامی کی پرمسرت قلقاری گونجی۔ ''ہم نے کر دکھایا۔ رقم منتقل ہونا شروع ہو گئی ہے۔''

نجیب کے چہرے پُرمسرت کا آبشار ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ وہ بھی قریب جھک آیا۔

ایک ڈرگ مافیا کے ڈان کی ساری زندگی کی حرام کی کمائی جو اس کی اچانک موت کے بعد ایک سوئس بینک میں برسوں سے لاوارث پڑی تھی، تیزی کے ساتھ مختلف اکاؤنٹس میں ٹرانسفر ہو رہی تھی۔

اینی اور پامی نے بھی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ اپنے حصے کے ڈالرز انہوں نے بھی منتقل کرنا شروع کر دیے۔

نجیب نے باہر آکر اپنے ساتھیوں اور الپس کو یہ بڑی خوش خبری سنائی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہاں جشن کا سا سماں برپا ہو گیا۔

اس کے بعد نجیب نے جب الپس کو بتایا کہ بینک کا سیکیورٹی کا نظام ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو الپس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''وہ اب بینک کی عمارت میں گھس گئے۔ ذاکر سے پوچھ کر بتاؤ کہ سیکیورٹی سسٹم جام ہوا ہے یا دشمنوں کے

کنٹرول میں ہے؟''

نجیب کنٹرول روم میں واپس آیا تو اسے دیکھتے ہی اینی بولی۔

''اب یہاں سے نکلنے کی کرو، پلان کیا ہے؟''

نجیب نے تیزی سے کہا۔ ''بتاتا ہوں۔''

ذاکر سے مکالمے کے بعد وہ دوبارہ الپس کے پاس آیا۔

''آخری لمحوں میں ذاکر سے جو ہوسکا، اس نے کردیا ہے۔ سسٹم جام ہے، ہمارے ساتھ دشمنوں کے کام کا بھی نہیں رہا ہے۔''

الپس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم خدا کا نام لے کر آخری مرحلہ شروع کرو، باہر کا سب میں دیکھ لوں گا۔''

آخری مرحلے کا سوچ کر نجیب کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے تھے۔

الپس نے بے عیب پلان بنایا تھا اور اس پر کامیابی سے عمل پیرا بھی تھا۔ وہ مرکزی بینک کی عمارت سے بخوبی واقف تھا۔ ایسے میں وہ عمارت میں داخلے کے سب سے خفیہ اور آسان ذریعے کو کیسے نظرانداز کرسکتا تھا۔ اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا، ایک میز پر کھڑے ہو کر اس جالی کے ساتھ لگایا جہاں سے عمارت کی ہوا باہر نکل رہی تھی۔ کاغذ فوراً ہی ہوا کے دباؤ سے جالی کے ساتھ چپک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ایگزاسٹ والا دیوہیکل پنکھا مسلسل گردش میں تھا۔

مطمئن ہو کر الپس لڑکوں کی پوزیشنیں مزید مستحکم کرنے لگا۔

اندر کنٹرول روم میں نجیب کا ''ایگزٹ پلان'' سنتے ہی اینی اور پامی نے سر تھام لیا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''تم نے خود ہی تو کہا تھا...... سُپر کمپیوٹر تک رسائی ہوتے ہی کوئی کام ناممکن نہیں رہے گا۔'' نجیب نے اطمینان سے جواب دیا۔

پامی بولی۔ ''سیٹلائٹ سے کنٹرول کیے جانے والے شکاری ڈرون کو ہیک کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔''

نجیب کے اطمینان میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ ''تم نے جو کر دکھایا ہے، وہ بھی تو تقریباً ناممکن تھا۔''

اینی اور پامی آپس میں تھوڑی دیر بحث کرتی رہیں۔ ذاکر اور نجیب خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے تھے۔ بحث کے اختتام پر پامی...... نجیب سے مخاطب ہوئی۔

''یہ کئی گھنٹوں کا کام ہے۔ اس کے بعد بھی کامیابی کے چانسز پچیس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ تمہارا ساتھی ہماری فیلڈ کا ہے بے شک اس سے رائے لے لو۔''

نجیب بولا۔ ''اس کی رائے لے چکا ہوں۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ یہ تین مہینے سے محنت کر رہا ہے۔ بنیادی کام ہو چکا ہے۔ باقی تم تینوں مل کر یہ کام آسانی سے کرلوگے۔''

اسپائیڈرز گرلز نے چونک کر ذاکر کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر بڑی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔

اینی کو یہ پلان خاصا کمزور لگ رہا تھا۔ اس کے پاس ابھی کئی اعتراضات تھے۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شکاری ڈرون فضا میں موجود بھی ہو اور وہ بنکر شکن میزائل سے بھی لیس ہو؟''

اس دفعہ نجیب نے قدرے سخت انداز میں کہا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ ہم لوگ کافی عرصے سے اس مشن پر کام کر رہے ہیں۔ ہر پہلو ہماری نظر میں ہے۔ تھوڑی دیر بعد اوزانگ کے ائربیس سے ایک شکاری ڈرون اُڑان بھرنے والا ہے۔ وہ ایک خاص مشن پر ہے اور مطلوبہ میزائل سے بھی لیس ہوگا۔''

اس دفعہ پامی نے اعتراض اٹھایا۔ ''تم نے بے شک ایک شاندار منصوبہ بنایا اور اس پر عمل کیا ہے مگر مجھے ایگزٹ پلان میں خاصی خامیاں نظر آ رہی ہیں۔ بنکر شکن میزائل سے بینک کے عقبی حصے کو تمہارا اُڑانے کا پلان ہے۔ جس کے بعد ہم ساتھ والی بلڈنگ میں داخل ہوں گے اور پھر وہاں سے سیوریج کے غیر استعمال شدہ پائپ کے راستے نکل جائیں گے۔ جہاں تمہاری ٹیم کے باقی ارکان ہمیں حفاظت سے نکال لے جائیں گے مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ بنکر شکن میزائل کے حملے کے بعد عمارت ہی بیٹھ جائے اور ہم زندہ ہی دفن ہو جائیں۔''

نجیب نے کہا۔ ''بالکل ہوسکتا ہے مگر اتنا رسک تو بنتا ہے۔'' ساتھ ہی اس نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''شاباش اب جلدی سے کام پر لگ جاؤ۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔''

اینی نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''تمہارے ایگزٹ پلان میں خودکشی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شکاری ڈرون ہیک ہوتے ہی اسے مار گرایا جائے گا۔''

''تم مایوسی کا شکار ہو رہی ہو۔ کسی کے کچھ سوچنے سے پہلے ہی ڈرون اپنا کام کر دکھائے گا۔ تم ان اربوں ڈالرز کے بارے میں سوچو جو ہماری زندگیاں بدلنے جا رہے ہیں۔ مایوسی تمہارے کام پر نظرانداز ہوگی۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی ایبی اور پامی ...... ذاکر کے ساتھ مل کر کام پر لگ گئیں۔

ذاکر نے اپنی رائفل کا میگزین تبدیل کیا۔ یہ خاص گولیوں والا میگزین تھا۔ یہ میگزین تبدیل کرتے ہوئے اس کی انگلیوں میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ ایلس کے اعتماد کے سہارے وہ زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلنے جا رہا تھا۔

باہر آ کر اس نے رائفل کی نال ایک کھڑکی سے باہر نکالی اور ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کے دھماکوں کے ساتھ فضا میں سرخ رنگ بکھر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک خاص پیغام بھی چلا گیا تھا۔

نجیب کے دل کی دھڑکن ابھی سے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

خاصی بلندی سے ایک بے آواز ہیلی کاپٹر سے شیزل سمیت اس کی ٹیم مرکزی بینک کی چھت پر اتر گئی تھی۔ یہ لوگ سرمئی رنگ کی مخصوص وردیوں میں تھے۔

اترتے ہی انہوں نے چھت پر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لی تھیں۔ ایک کمانڈو نے بڑی چابکدستی کے ساتھ ہوا۔ کی نکاسی والے پائپ کے دہانے پر نصب برق کی طرح گھومتے پنکھے کی تار کاٹ کر بجلی کی فراہمی معطل کر دی۔ آہستہ ہوتے ہوتے پنکھا رک گیا۔ پروں کے درمیان اتنی جگہ تھی کہ آرام سے گزرا جا سکتا تھا۔

پنکھا بند ہوتے ہی کاغذ نیچے آ گرا تھا۔ ایلس کی نظریں اسی کاغذ پر تھیں۔ ایک جگہ سے جالی کھول کر وہ اپنا کام پہلے ہی کر چکا تھا۔ اچانک ایک خیال نے شیزل کے قدم روک لیے۔ ایلس جیسا شخص اس پائپ کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔

پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے ایڈوانس پارٹی کے طور پر ایک کمانڈو کو آگے جانے کے لیے کہا۔ وہ لوگ ایک نیٹ ورک کے ذریعے آپس میں رابطے میں تھے اور ہیڈ کوارٹر سے بھی ان کا رابطہ تھا۔

کمانڈو کے ہیلمٹ پر نصب کیمرا ہیڈ کوارٹر کو براہِ راست مناظر دکھا رہا تھا۔

شیزل لفٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔ تھوڑی سی کوشش سے لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔ فولادی رسوں اور شافٹوں کے درمیان تقریباً بیس میٹر نیچے لفٹ نظر آ رہی تھی۔

شیزل نے ہیڈ کوارٹر سے کہا۔ ''داخلی دروازے پر دباؤ ڈالو۔''

☆☆☆

ایلس نے تمام لڑکوں کو الرٹ کر دیا کہ چھاپا مار دستہ عمارت میں داخل ہو گیا ہے۔ سبھی نے محفوظ ترین جگہوں پر پوزیشن لے لی۔

اسی وقت کئی گاڑیاں بینک کے بیرونی فولادی گیٹ کے قریب دوبارہ پہنچ گئیں۔ فولادی گیٹ کو کھولنے کی کوشش شروع ہو گئی۔

کنٹرول روم میں فون بجا تو نجیب نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے اسرائیل کا وزیر داخلہ شاول ویز تھا۔ ابتدائی بات چیت کے بعد نجیب نے مطالبات کی فہرست شاول کے سامنے رکھ دی اور دھمکی دی کہ مطالبات پورے نہ ہوئے تو یرغمالیوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ مطالبات میں ''محفوظ راستے'' کے علاوہ الاقصیٰ بریگیڈ کے دو لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ بھی تھا۔

دونوں فریق ایک، دوسرے کو بے وقوف بنانے کے خواہش مند تھے۔ دونوں کو ہی محض وقت چاہیے تھا۔ شاول نے غور کرنے کے لیے وقت مانگا جو نجیب نے بخوشی دے دیا۔

ایلس نے اپنے بیگ میں سے ایک کی پیڈ جیسا آلہ نکال لیا تھا۔ ایک ہینڈل اور چند بٹنوں کے ساتھ اس پر تین ضرب تین کی چھوٹی سی اسکرین بھی تھی۔ اس وقت یہ اسکرین روشن تھی۔ ایک بم بردار چھوٹی ریموٹ کنٹرول گاڑی ہوا کی نکاسی والے پائپ میں اوپر کی طرف رواں دواں تھی۔ اس پر لگا کیمرا اندھیرے میں دکھانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

ایلس اس گاڑی کو آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی کیمرے کی زد میں پیٹ کے بل رینگتا کمانڈو آ گیا۔ اس کی آنکھوں پر بھی اندھیرے میں دیکھنے والا مخصوص چشمہ تھا۔

گاڑی کو دیکھ کر کمانڈو چونکا تھا۔

ایلس کا چہرہ جیسے پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے ہینڈل پر زور دیا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھی اور لمحوں میں کمانڈو کے قریب پہنچ گئی۔ ایلس نے ایک بٹن دبایا۔ اوپر کہیں زوردار دھماکا ہوا۔ دھماکے کی آواز سے یرغمالیوں میں خوف و ہراس دوڑ گیا۔

ایلس نے اپنے لڑکوں کو مخصوص اشارے سے بتایا کہ یہ دھماکا اس کی طرف سے تھا۔ اسی وقت نجیب نے بھی کنٹرول روم سے باہر جھانکا۔ مخصوص اشارہ اس نے بھی دیکھ لیا۔

ایلس نے قریب جا کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

کنٹرول روم میں واپس جاتے ہی نجیب نے اسی نمبر

پر کال کی جہاں سے شاول کی کال آئی تھی۔ شاول کی آواز سنتے ہی اس نے زہریلے انداز میں کہا۔

''اپنی فطری مکاری سے تم باز نہیں آئے نا، تمہیں سبق سکھانا ضروری ہوگیا ہے۔''

شاول بوکھلا گیا۔ ہیڈ کوارٹر نے براہِ راست اپنے کمانڈو کے چیتھڑے اڑتے دیکھے تھے۔ شاول بھی وہیں پر تھا۔ اس نے نجیب کو رام کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ عمارت میں موجود کسی سیکیورٹی والے کا انفرادی اقدام تھا۔ اسے لے کر وہ مشتعل نہ ہو۔''

نجیب بھی کسی نہتے سویلین کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اس لنگڑی لولی تاویل کو قبول کر کے آخری وارننگ دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

شیزل شاک کی سی کیفیت میں تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے بچا لیا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر دل ہی دل میں الپس کی برتر صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ اس کا ہوم ورک شاندار تھا۔ کوئی پہلو اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ اس کے باوجود شیزل کو کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔

وہ اور اس کے باقی ماندہ ساتھی بڑی خاموشی سے آہنی رسیوں سے لٹک کر لفٹ تک پہنچ گئے تھے۔ لفٹ کے اوپر اور نیچے ایمرجنسی دروازے تھے۔ ان سے گزر کر نیچے کا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔

شیزل کو امید ہو چلی تھی کہ وہ خاموشی کے ساتھ نیچے ان منزلوں تک پہنچ جائیں گے جہاں دہشت گرد قابض تھے۔

نیچے کے سفر میں بازو شل ہونے لگتے تو وہ فولادی شافٹوں پر تھوڑی دیر قدم جما کر بازوؤں کو آرام دے لیتے تھے۔ کئی منزلوں پر انہوں نے بے حد باریک تار سے منسلک کیمرے معمولی درزوں سے گزار کر دوسری طرف کا جائزہ بھی لیا تھا۔ ہر جگہ خاموشی تھی۔ دہشت گرد تعداد میں اتنے نہیں تھے کہ پوری بلڈنگ کی نگرانی کر سکتے۔

ایک دفعہ تو شیزل کے جی میں آئی کہ لفٹ کا دروازہ کھول کر کسی فلور پر اترا جائے اور پھر سیڑھیوں کے راستے آہستہ آہستہ مکمل احتیاط سے نیچے اترا جائے۔

پھر خود ہی اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ دہشت گردوں کے سروں پر اچانک ہی پہنچنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

موساد کے چیف کا پورا وجود سنسنا اٹھا تھا۔ خاص الخاص مخبر نے ٹائم بتا دیا تھا کہ الاقصیٰ بریگیڈ کے سرکردہ افراد کب اکٹھے ہو رہے تھے۔ زیادہ ٹائم نہیں تھا۔ گزشتہ کئی سال کی محنت رنگ لانے والی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا شکار تھا جسے وہ چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے اپنے سسٹم کو متحرک کیا تو رکاوٹ سامنے آگئی۔ دہشت گردوں کے سپر کمپیوٹر تک رسائی کے بعد ہائی ٹیک ہتھیاروں کو فوری طور پر جام کر دیا گیا تھا۔ چیف کو ''ہیل فائر'' میزائل سے لیس شکاری ڈرون کی اشد ضرورت تھی۔

چیف نے براہ راست وزیراعظم سے بات کی اور اسے قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک شکاری ڈرون...... الاقصیٰ بریگیڈ کے سرکردہ افراد پر قیامت کی آگ برسانے کے لیے ہوا میں بلند ہو چکا تھا۔

چیف بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

☆☆☆

ڈرون کو فضا میں دیکھ کر ایلی حیران رہ گئی۔ اُس نے ناقابلِ یقین نظروں سے نجیب کی طرف دیکھا جس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی۔

ذاکر چلّایا۔ ''ہمارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔''

تینوں مانے ہوئے ہیکر زمل کر شکاری ڈرون کو اپنے کنٹرول میں کرنے کے لیے جت گئے۔

دوسری طرف شیزل اور اس کی ٹیم نے گراؤنڈ اور فرسٹ فلور کو نشان زدہ کر لیا۔ دہشت گرد ان ہی دو فلور پر موجود تھے اور بہترین پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے۔

شیزل کی ٹیم کے پاس سریع الاثر بے ہوشی کی گیس کے سلنڈر بھی تھے، انہوں نے آکسیجن ماسک لگا کر دونوں منزلوں پر تیزی کے ساتھ یہ گیس چھوڑ دی۔

تھوڑی دیر بعد شیزل کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ دہشت گردوں کے چہروں پر بھی آکسیجن ماسک نظر آنے لگے۔ ساتھ ہی گڑبڑ کا اندازہ ہوتے ہی انہوں نے گیس کے ماخذ کی جانب شدید فائرنگ شروع کر دی۔

شیزل کی ٹیم کو سیکنڈ فلور پر بھاگ کر پوزیشنیں سنبھالنی پڑیں۔ لفٹ والا خلا موت کا کنواں ثابت ہو سکتا تھا۔

اب چھپنے کا فائدہ نہیں تھا۔ یرغمالیوں کی زندگیاں داؤ پر لگ گئی تھیں۔

شیزل نے بیرونی مدد مانگ لی۔ فوراً ہی بکتر بند گاڑیاں بینک کی بلڈنگ پر چڑھ دوڑیں۔ زوردار فائرنگ اور دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ یرغمالی ایک ہی جگہ بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔

شیزل کی ٹیم نے شدید حملہ کر کے دہشت گردوں کو گراؤنڈ فلور پر دھکیل دیا تھا۔ ہر طرف موت کے شعلے رقصاں تھے۔

ایک بکتر بند گاڑی فولادی دروازے کے پاس ایک کھڑکی کو توڑنے کی کوشش میں وہاں پھنس گئی تھی۔ وہیں سے اس کے بھاری فائر نے الپس کے لڑکوں میں سراسیمگی دوڑا دی تھی۔

اس بکتر بند کی فائرنگ سے کئی یرغمالی ہلاک ہو گئے تھے۔

بکتر بند کی فائرنگ کا رخ اب پاور روم کی طرف ہو گیا تھا۔

الپس کے خون میں انگارے سے دوڑنے لگے تھے۔

اس نے اپنے ساتھ موجود لڑکوں کو فولادی دروازہ بند کر کے اندر ہی ڈٹے رہنے کے لیے کہا اور پھر خود سینے کے بل رینگتا ہوا پاور روم سے باہر نکل آیا۔

نجیب کے ساتھی پوری جواں مردی سے دوطرفہ حملے کو روکے ہوئے تھے۔ برستی گولیوں میں الپس بکتر بند کی طرف بڑھا۔ ایک مقام پر وہ اوپر سے ہونے والی براہِ راست فائرنگ کی زد میں آسکتا تھا۔ اس نے زقند بھری اور برستی گولیوں کی باڑ کے نیچے سے پھسلتا چلا گیا۔ اسی پوزیشن میں اس نے دو دستی بم بیک وقت اچھالے اور بکتر بند کے گرد ہونے والی ہلچل دم توڑ گئی۔ وہاں سے کچھ وردی پوش اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

فضا میں ہر طرف بارودی دھواں پھیل گیا تھا۔ زخمیوں کی آہ و بکا بھی جاری تھی۔ انسانی گوشت کے لوتھڑے بھی کئی جگہ پر پڑے ہوئے تھے۔

الپس نے محسوس کیا کہ اس کے کئی ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ مزاحمت کمزور پڑ گئی تھی اور ابھی تک کنٹرول روم کے بند فولادی دروازے کے عقب سے کوئی خوش خبری برآمد نہیں ہوئی تھی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ پاور روم پر فائرنگ کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ فائرنگ کے اینگل مسلسل بڑھتے جا رہے تھے۔ بازی کسی بھی لمحے پلٹ سکتی تھی۔ کنٹرول روم کو پاور سپلائی معطل ہوتے ہی سب کچھ ختم ہو جاتا۔

لمحے بھر میں یہ سب الپس کے دماغ میں آگ بھر گیا۔ قدموں پر آتے ہی وہ فضا میں اُچھلا۔ اگلے ہی لمحے وہ بکتر بند کے اوپر تھا۔

مشین گن پر تعینات گنر کو اس نے نہایت قریب سے گولی ماری اور اُسے کھینچ کر ایک طرف ہٹا رہا تھا کہ بکتر بند کا فولادی ڈھکن کھلا اور ایک سر برآمد ہوا۔ اسے پاؤں سے نیچے دباتے ہوئے الپس نے ایک دستی بم اندر پھینک کر اوپر سے ڈھکن بند کر دیا۔ زوردار دھماکے سے بکتر بند اس کے قدموں کے نیچے لرز کر رہ گئی تھی۔ اندر موجود افراد یقیناً چیتھڑوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

مشین گن سنبھالتے ہی اس نے ہر طرف قیامت برپا کر دی۔ اس دفعہ دشمنوں میں سراسیمگی دوڑ گئی تھی۔

نئے جوش اور ولولے نے الپس کے وجود میں توانائی دوڑا دی۔ وہ چند منٹ اور دشمنوں کو روک سکتا تھا۔ اس کی امید بھری نظریں کنٹرول روم کے بند فولادی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

قیامت برپا تھی اور پندرہ منٹ گزر گئے تھے۔ وہ تینوں شکاری ڈرون کو قابو کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ذاکر کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ نجیب بھی ان کے قریب جھکا ہوا تھا۔ اس کا پورا وجود پسینے میں ڈوب گیا تھا۔

ڈرون جب ایک خاص مقام کے قریب سے آگے بڑھ گیا تو ذاکر نے اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا۔

نجیب گھٹنوں کے بل فرش پر گر گیا۔ اس کے دہن سے دلدوز آہ برآمد ہوئی۔ ''میں ناکام ہو گیا۔ میں زندگی کا سب سے بڑا جُوا ہار گیا۔ میری قوم کی امید ''آخری امید'' آگ کے سمندر میں غرق ہونے والی ہے۔'' اس کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہہ رہے تھے۔

ذاکر بھی رونے لگ گیا تھا۔ اسپائیڈر گرلز البتہ آخری کوشش میں مصروف تھیں۔

نجیب نے پسٹل نکال کر اپنی کنپٹی پر رکھا۔ ذاکر دیکھ رہا تھا مگر جانتا تھا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

نجیب کی انگلی ٹریگر پر جمی تھی۔ اینی نے تیزی سے انگلیاں چلائیں۔ مدھم سیٹی کی سی آواز بلند ہوئی اور اسکرین پر منظر بدل گیا۔

شکاری ڈرون میں لگا کیمرا سامنے کا منظر دکھا رہا تھا۔ اینی خوشی سے چلّائی۔ ''ہم کامیاب ہو گئے۔ شکاری ڈرون اب ہمارے کنٹرول میں ہے۔''

یہ جادوئی الفاظ تھے۔ جنھوں نے پل بھر میں سب کچھ بدل دیا۔ نجیب کا پورا وجود توانائی سے بھر گیا۔ پسٹل بیلٹ میں اڑس کر وہ تیزی سے آگے آیا۔

''ذاکر! ڈرون کا کنٹرول تم سنبھالو اور اسے واپس

گھماؤ۔'' ہیجان کے سبب اُس کی آواز بیٹھ سی گئی تھی۔

ذاکر نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

نجیب نے اینی اور پامی کو اپنی کرسیاں چھوڑ کر پیچھے آنے کے لیے کہا۔ فولادی دروازے کے بند ہونے کے سبب فائرنگ وغیرہ کا شور بے حد کم سنائی دے رہا تھا۔

کام سے فارغ ہوتے ہی اینی کو الپس کی فکر نے آگھیرا تھا۔ وہ، الپس اور پامی کے ہمراہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''الپس کسی محفوظ جگہ پر ہے؟''

نجیب نے کہا۔ ''سب سے محفوظ جگہ اس وقت یہ کنٹرول روم ہے۔ الپس کو یہاں بلالیتے ہیں۔''

اینی خوش ہوگئی۔ اس پل نجیب اسے بے حد بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ وہ، اس تبدیلی کو کوئی معنی پہنانے سے قاصر تھی۔

نجیب نے تھوڑا سا فولادی گیٹ کھولا تو فائرنگ کا شور شدت سے سنائی دینے لگا۔ اتنے شور میں الپس کو آواز دینا ممکن نہیں تھا۔ پہلے سے طے شدہ اشارے کے تحت نجیب نے گولیاں چلا کر کئی روشن بلب توڑ دیے۔

یہ منظر الپس نے دیکھا تو اُس کا وجود بھی توانائی سے بھر گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کنٹرول روم میں تھا۔ آتے ہی اس نے ماسک اتار پھینکا تھا۔ وہ جس انداز سے نجیب سے گلے ملا اور انہوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی...... وہ سب اینی کے لیے بے حد شاک دینے والا تھا۔ وہ، الپس پر جھپٹی۔

''تم دونوں ساتھی ہو...... تم نے میرا جذباتی استحصال کیا ہے۔'' الپس کا گریبان جھنجوڑتے ہوئے اس کی آنکھیں پانی گرانے لگیں۔ پامی بھی الپس کو گھورے جارہی تھی۔

الپس نے نرمی سے اپنا گریبان چھڑایا۔ ''مجھے معاف کردو، میں زندہ رہا تو ہمیشہ تمہارا رہوں گا۔''

اینی ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

پامی نے اپنی بانہیں اس کے گرد لپیٹ دیں۔

نجیب اور الپس برق رفتاری سے ذاکر کی طرف جھکے۔ ذاکر ''ہیل فائر'' میزائل کو ایک ٹارگٹ پر انگیج کررہا تھا۔ کیمرا زوم کرکے ٹارگٹ کو واضح کررہا تھا۔ یہ کچھ مکانات تھے۔

اسی وقت اسکرین پر ایک ننھا سا سرخ پوائنٹ تیزی سے جلنے بجھنے لگا۔ ذاکر کے چہرے پر سراسیمگی دوڑ گئی۔ اس نے ہیجان زدہ آواز میں کہا۔

''ڈرون کو فضائی دفاعی نظام نے انگیج کرلیا ہے۔''

نجیب حلق کے بل چلّایا۔ ''جلدی سے میزائل فائر کرو۔''

ذاکر نے تیزی سے ایک بٹن دبا دیا۔ ہیل فائر میزائل ڈرون سے جدا ہو کر برق رفتاری سے نظر آنے والے مکانوں سے جا ٹکرایا۔ لمحوں میں ہی وہاں آگ کا دریا نظر آنے لگا۔ اسی وقت اسکرین بھی تاریک ہوگئی۔ فضائی دفاعی نظام نے ڈرون کو مار گرایا تھا۔

وہ تینوں سب کچھ بھول کر خوشی سے جیسے پاگل ہوگئے۔ وہ لوگ اسرائیل کو اب تک کی سب سے بڑی زک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

زریون ایٹمی پلانٹ پر کام کرنے والے سائنس داں اور ٹیکنیشن جو اپنے بیوی، بچوں سے دور ایٹمی پلانٹ پر کام کررہے تھے، ان کی چھوٹی سی بستی آگ کے سمندر میں ڈوب گئی تھی۔

اسی وقت زوردار دھماکا ہوا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ پاور روم اُڑانے کے ساتھ ہی برقی رو بھی معطل کردی گئی تھی۔ مگر ان لوگوں کو ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنا کام کر چکے تھے۔

اب یہاں سے سلامت نکلنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ فولادی دروازہ کھول کر وہ رینگتے ہوئے باری باری باہر نکل آئے مگر فوراً ہی بھاری فائرنگ کی زد میں آگئے۔ ایک گولی نے الپس کے پاس موجود دستی بم کو پھاڑ دیا تو دیگر بم بھی پھٹ گئے۔ تیز چکاچوند اور زوردار دھماکوں کے ساتھ الپس کا وجود چیتھڑوں میں تبدیل ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ نجیب، ذاکر اور ان کے بھی ساتھی مارے گئے تھے۔ اینی اور پامی اسرائیل کی فورسز کے ہاتھ زندہ آگئی تھیں۔

پورا اسرائیل سوگ میں ڈوب گیا تھا۔

موساد کے ایجنٹ میجر کمال کو کھوجنے میں کامیاب رہے تھے وہ فارس کنارے کئی ہفتوں سے اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ہنی مون منا رہا تھا۔

الپس، اسرائیل کے لیے ایسا معما ثابت ہوا تھا جسے وہ کبھی بھی حل نہیں کرسکیں گے۔

ہاں، الپس تو زندہ تھا۔ جیل میں ساری زندگی سڑنے والی اینی شاویز کے دل میں۔

ایرانی بھی اپنے سینے میں بھڑکتی بدلے کی آگ بجھانے میں کامیاب رہے تھے۔ نجیب نے بھی لاکھوں یتیم اور بے گھر فلسطینی بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام کردیا تھا......

❖❖❖

صبر آزما

سلمان سلیم

فاطمہ حسام
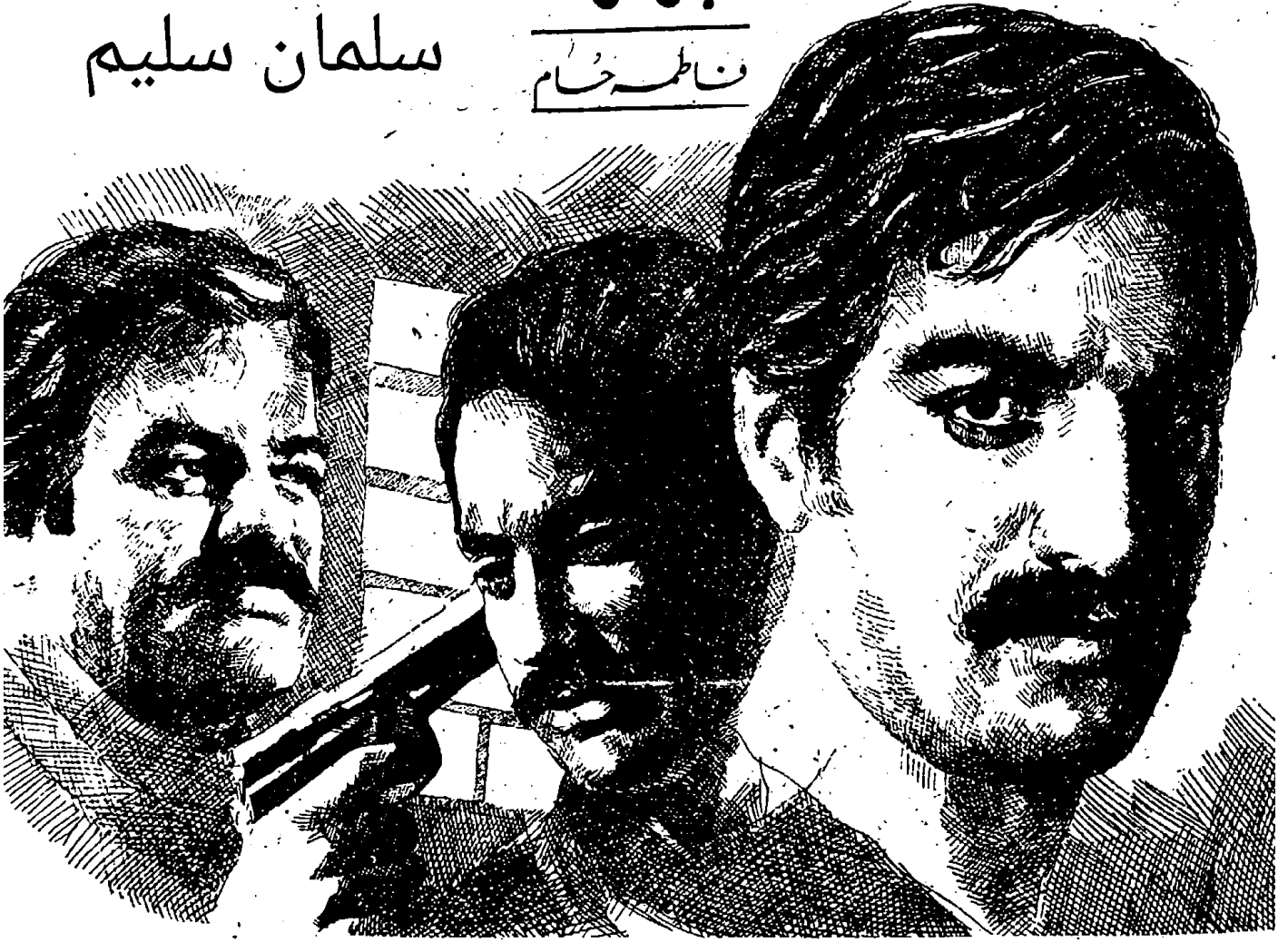
مصائب و مشکلات کو جھیلنا بڑا صبر آزما کام ہے... کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد... انتظار جیسے کٹھن لمحات کو صبر کے گھونٹ پی کر سہل اور نرم بنانے والے کم ہوتے ہیں... مناسب اور برمحل موقع کی تلاش میں ٹھنڈی چھائوں میں بیٹھے دو ایسے ہی کرداروں کا قصہ... دونوں اپنی پسند کے موقع کے منتظر تھے...

ہمارے اردگرد چلتے پھرتے چہروں میں گم کچھ اجنبی چہرے......

ڈیوٹی آف کرنے کے بعد فضل داد سیدھا گراؤنڈ فلور کے اپارٹمنٹ نمبر ''جی تھری'' میں پہنچا۔ ''پیراڈائز ہومز'' ایک نئی تعمیر شدہ بلڈنگ تھی جو گراؤنڈ پلس ٹو کیٹگری میں شمار ہوتی تھی۔ اس کے ہر فلور پر چار اپارٹمنٹس تھے۔ دو چھوٹے اور دو بڑے۔ اس طرح کل ملا کر یہ بارہ اپارٹمنٹس کا ایک خوب صورت اور جدید طرز کا رہائشی پروجیکٹ تھا۔ فضل داد اس بلڈنگ میں بطور چوکیدار کام کرتا تھا... اور اس کی ڈیوٹی صبح سات بجے سے شام سات بجے تک تھی۔

اپارٹمنٹ ''جی تھری'' میں ملک سلیم رہتا تھا جو ''ملک صاحب'' کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک خاموش طبع اور کم آمیز شخص تھا۔ عام تاثر یہی تھا کہ ملک صاحب کا تعلق ملک کے کسی حساس ادارے سے ہے اور وہ کسی خاص مشن پر ہے۔ یہ بعض لوگوں کی ذاتی رائے تھی۔ اس سلسلے میں کبھی کسی نے ملک سلیم سے بات نہیں کی تھی۔ لہٰذا تصدیق یا تردید کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا البتہ فضل داد اس حوالے سے پُریقین تھا کیونکہ ''پیراڈائز ہومز'' میں ملک سلیم صرف فضل داد ہی سے کھل کر بات کرتا تھا اور وہ بھی اپنے اپارٹمنٹ کے اندر۔

ملک صاحب نے فضل داد کو ہدایت کر رکھی تھی کہ کبھی اس کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی نہیں بجانا۔ جب بھی آنا ہو، دستک دے کر آنا اور وہ بھی مخصوص انداز میں۔ فضل داد نے ہمیشہ اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ اس وقت بھی فضل داد نے اسی مخصوص طریقے سے ملک سلیم کے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے پر تین بار دستک دی تھی۔

کم و بیش ایک منٹ کے انتظار کے بعد اپارٹمنٹ کا دروازہ کھل گیا۔ فضل داد یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ دروازہ کھولنے سے پہلے ملک سلیم دروازے کے وسط میں نصب پیپنگ گلاس سے آنکھ لگا کر اطمینان کر لیا کرتا تھا کہ باہر کون ہے اور اس ''کون'' کے لیے دروازہ کھولنا چاہیے یا نہیں۔ عموماً دیکھنے میں یہی آیا تھا کہ اس کے ملاقاتیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ زیادہ تر فوڈ ڈیلیوری بوائز ہی اس کے دروازے تک پہنچ پاتے تھے یا پھر دن والا چوکیدار فضل داد!

''آؤ فضل داد......'' اس پر نظر پڑتے ہی ملک سلیم نے اپنایت بھرے لہجے میں کہا اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

فضل داد اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ یہاں پہلے بھی کئی بار آچکا تھا۔ یہ اپارٹمنٹ دو بیڈ اور لاؤنج پر مشتمل تھا اور اس کا شمار چھوٹے اپارٹمنٹس میں ہوتا تھا۔ بڑے اپارٹمنٹس ''ٹو بیڈ ڈی، ڈی'' کی کیٹگری میں آتے تھے۔ ملک سلیم جیسے اکیلے رہائشی کے لیے یہ چھوٹا اپارٹمنٹ بھی کافی سے زیادہ تھا۔

''کافی پیو گے؟'' ملک سلیم نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''میں تمہارے آنے سے پہلے اپنے لیے کافی بنانے ہی جا رہا تھا۔''

''سر! میں آپ کو انکار نہیں کر سکتا۔'' فضل داد نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''مگر کافی مجھے زیادہ پسند نہیں ہے۔ ہم لوگ چائے پینے کے عادی ہیں اور وہ بھی سبز۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' ملک سلیم نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آج تمہاری پسند ہی چلے گی۔ میرے پاس کالی، سبز الغرض ہر قسم کی چائے موجود ہے۔''

''شکریہ سر۔'' فضل داد ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

''تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں قہوہ چڑھا کر آتا ہوں۔'' ملک سلیم نے اوپن کچن کا رخ کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''پھر بات کرتے ہیں۔''

فضل داد لاؤنج میں بچھے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے کچن واضح طور پر نظر آتا تھا کیونکہ ان دونوں مقامات کے درمیان فاصلہ صفر کے برابر تھا۔ لاؤنج کے اختتام پر کچن کا آغاز تھا۔

''افسر خان نے ریسیپشن سنبھال لیا؟'' ملک سلیم نے اس کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

''جی سر! وہ آگیا ہے۔'' فضل داد نے بتایا۔

''تم لوگوں کی ڈیوٹی بہت سخت اور ذمّے داری والی ہے۔'' ملک سلیم نے کہا۔

فضل داد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر آپ سے زیادہ نہیں سر۔''

''بارہ اپارٹمنٹس کے معاملات کو دیکھنا۔'' وہ فضل داد کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''ریسیپشن کو سنبھالنا، پارکنگ کے مسائل کو نمٹانا، پانی والی موٹروں کو چلانا، اسٹینڈ بائی جنریٹر کو آن آف کرنا اور آج کل تو بکروں اور گائے بیل بچھیا کی آمد سے آپ لوگوں کے کام میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔''

ملک سلیم غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ''پیراڈائز ہومز'' میں چوکیداری کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا۔ ایک تو بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی ہی اعصاب کو توڑ ڈالنے والی تھی پھر یہاں رہائش پذیر افراد کو ہر سہولت فراہم کرنا بھی چوکیدار کے فرائض کا حصہ تھا۔ اسی لیے بارہ بارہ گھنٹے ڈیوٹی دینے والے دو چوکیدار رکھے گئے تھے جو ہر وقت باقاعدہ مسلح بھی ہوتے تھے۔ اگرچہ اس جدید طرزِ تعمیر کی حامل رہائشی عمارت میں جابجا سیکیورٹی کیمرے نصب تھے جو چوبیس گھنٹے ریکارڈنگ میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے باوجود بھی دونوں چوکیداروں کو سیکیورٹی گارڈز کا کردار بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ سب اس بلڈنگ کے رہائشیوں کی سیفٹی اور سیکیورٹی کے لیے

تھا کیونکہ وہ لوگ مینٹی نینس کے نام پر ہر ماہ دس ہزار روپے کرائے کے علاوہ ادا کرتے تھے جس کے بدلے میں انہیں جان و مال کا تحفظ، چوبیس گھنٹے لائن میں میٹھا پانی، آپریٹو لفٹ، انڈر گراؤنڈ کار پارکنگ اور زیرو لوڈ شیڈنگ کی سہولیات حاصل تھیں۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں فضل داد کے ذہن سے گزرے اور اس نے ملک سلیم کے بیان کے جواب میں کہا۔ ''سر! ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، وہ اس کا پاسنگ بھی نہیں ہے جو آپ کر رہے ہیں۔''

''اوہ...... اچھا'' ملک سلیم کچن والے ایریا سے لاؤنج کی جانب بڑھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہم ایسا کیا کرتے ہیں؟'' اس نے فضل داد کے سامنے دوسرے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''سرحدوں کی حفاظت!'' فضل داد نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''آپ لوگوں کی قربانیوں کے طفیل اس ملک میں بسنے والا ہر شخص سکون کی نیند سوتا ہے۔''

''یہ ہمارا فرض بلکہ عزم کا تقاضا ہے۔ ہم اپنی جان، مال اور عزت ہر لحہ وطنِ عزیز کی سلامتی پر نثار کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔'' ملک سلیم نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''خیریت...... اس وقت کیسے آنا ہوا؟''

''سر! ایک تو آپ کو 'ایک سو چار' والی فیملی کے بارے میں رپورٹ دینا تھی اور دوسرے اپنے دوست کا شکریہ آپ تک پہنچانا تھا۔'' فضل داد نے کہا۔

''تو تم نے فرسٹ فلور کے اپارٹمنٹ نمبر چار میں آکر بسنے والے اس جوڑے پر گہری نگاہ رکھی ہوئی ہے؟''

''جی سر! میں بھلا آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔'' فضل داد نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اس فیملی پر ہم قہوہ پیتے ہوئے بات کریں گے۔'' ملک سلیم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پہلے تم مجھے اپنے دوست کے بارے میں بتاؤ۔ وہ بندہ کون ہے اور وہ کس سلسلے میں میرا شکر گزار ہے؟''

''سر! میں سعید کی بات کر رہا ہوں جس کا آپ نے نادرا والا کام چٹکی بجاتے میں کروا دیا تھا۔'' فضل داد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے والدین کا نادرا میں ریکارڈ موجود نہیں تھا جس کی وجہ سے اس کے شناختی کارڈ کی تجدید میں مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ آپ کی مہربانی سے سعید کا سادہ نہیں، بلکہ اسمارٹ کارڈ بن گیا ہے۔''

''اوہ......'' ملک سلیم نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بے پروائی سے بولا۔ ''اتنے معمولی سے کام کے لیے بھلا شکریے کی کیا ضرورت ہے۔''

''سر! سعید تو آپ سے ملنے کی ضد کر رہا تھا۔'' فضل داد نے بتایا۔ ''لیکن میں نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ سر کسی سے ملاقات نہیں کرتے اور آج کل تو وہ ویسے بھی اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔''

''یہ تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے فضل داد۔'' ملک سلیم نے ستائشی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''تم میری حقیقت سے واقف ہو اور اس واقفیت کو تمہیں اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا ہے۔ میری بات تمہارے بھیجے میں اتر رہی ہے نا؟''

ملک سلیم کا آخری استفسار یہ جملہ اپنے اندر حد درجہ سنگینی دبائے ہوئے تھا اور اس خطرناکی کو فضل داد نے بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کر لیا تھا جس کے جواب میں وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولا۔ ''یس سر...... سمجھ گیا سر......''

''گڈ!'' ملک سلیم نے شاباشی دینے والے انداز میں کہا اور صوفے سے اٹھ کر کچن کی سمت بڑھ گیا۔

دو منٹ کے بعد وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ادرک اور پودینے والی سبز چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ملک سلیم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں تو فضل داد! کیا خبریں ہیں؟''

''سر! آج دو ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جس سے آپ کی باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔'' فضل داد نے قہوے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''واقعہ نمبر ایک؟'' ملک صاحب نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''سر! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، چند روز کے بعد بڑی عید ہے جس کی سب سے خاص بات قربانی ہے۔'' فضل داد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے دیکھا ہے، گلی میں ہر بنگلے کے سامنے قربانی کے جانور بندھے ہوئے ہیں۔ ہمارے جیسی اپارٹمنٹ بلڈنگز کا حال تو ایسا ہے کہ ان کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں گاڑیاں کم اور قربانی کے بکرے زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ حالیہ بارشوں کی وجہ سے لوگوں نے اپنے جانوروں کو گھروں کے اندر اور پارکنگ ایریا میں باندھنا شروع کر دیا ہے۔ خیر، تو میں آپ کو اہم

واقعات کے بارے میں بتارہا تھا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر بولا۔

''محلے والوں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ قربانی کے جانوروں کی حفاظت کے لیے شامیانے وغیرہ لگا کر کوئی معقول انتظام کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اپنے جانور گھروں کے اندر نہ باندھنا پڑیں۔ علاوہ ازیں ایک مسلح چوکیدار کے بندوبست کا بھی پروگرام ہے کیونکہ آج کل قربانی کے جانوروں کی چوری کے واقعات بھی سننے میں آرہے ہیں۔ محلے والے یہ سب انتظامات اپنی مدد آپ کے تحت کررہے ہیں اور ظاہر ہے اس نیک کام کے لیے سب کو مالی تعاون بھی کرنا تھا۔ اسی سلسلے میں ہر کسی کو اس پروگرام کے بارے میں بتایا جارہا تھا۔ آج میں نے دن میں ''ایک سو چار'' نمبر اپارٹمنٹ میں انٹرکام کیا۔ مجھے یہ پتا تھا کہ وہ بندہ دن بھر گھر کے اندر ہی موجود رہتا ہے۔''

''وہ ایک مصنف کی حیثیت سے یہاں آباد ہوا ہے۔'' ملک سلیم نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس کا کور ہے۔ وہ لوگوں پر یہی ظاہر کررہا ہے کہ وہ کہانیاں اور افسانے وغیرہ لکھتا ہے جو گاہے بہ گاہے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں تو تم انٹرکام کا ذکر کررہے تھے؟''

''جی سر! میں نے اسے انٹرکام کیا۔'' فضل داد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے 'ہیلو' کے جواب میں، میں نے کہا۔ ''عارف صاحب! محلے والے اپنی گلی کو، جانوروں کی حفاظت کے لیے سجا سنوار رہے ہیں اور اس کے لیے فی جانور دو ہزار روپے دینا ہوں گے۔ آپ کے کتنے جانور آئیں گے؟ اس نے مجھے بہت روکھا پھیکا جواب دیا۔ آپ تصور بھی نہیں کرسکتے، اس نے کیا کہا ہوگا۔''

''مجھے تصور کی زحمت سے بچاؤ۔'' ملک سلیم قہوے کا ایک بڑا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''تم خود ہی بتادو، اس نے کیا کہا تھا؟''

''کسی مسلمان سے تو ایسے جواب کی توقع نہیں کی جاسکتی۔'' فضل داد نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے بتایا۔ ''اس نے کہا، مجھے قربانی جیسے فضول کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لہٰذا مجھے اس سلسلے میں دوبارہ انٹرکام نہیں کرنا...... سر! بھلا یہ کیا بات ہوئی؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا ناکہ وہ بندہ ہمارے دشمن ملک کا ایک تربیت یافتہ ایجنٹ ہے۔'' ملک سلیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے یہاں کی شہریت اختیار کررکھی ہے۔ ہمارے ہاں ہر محکمے میں کالی بھیڑیں موجود ہیں۔ پیسا خرچ کرنے سے ہر ناممکن کام پلک جھپکتے میں ممکن ہوجاتا ہے۔ اس دشمن ایجنٹ نے اپنے وسائل کا استعمال کرتے ہوئے نہ صرف پاکستان کی شہریت حاصل کرلی ہے بلکہ ایک مقامی رخسانہ نامی عورت سے شادی بھی کررکھی ہے۔ رخسانہ کسی سرکاری محکمے میں کام کرتی ہے۔ اس بے چاری کو بالکل خبر نہیں کہ اس کا قلم کار شوہر عارف ایک خطرناک سیکرٹ ایجنٹ ہے جو ہمارے ملک کو کوئی سنگین نقصان پہنچانے کی غرض سے ایک مسلمان کی حیثیت سے یہاں رہائش پذیر ہے۔ بہرکیف...... میری اس بندے پر کڑی نظر ہے۔ میں اس کے مذموم عزائم کو پورا نہیں ہونے دوں گا۔''

''سر! جب آپ کو پتا ہے کہ عارف کا نام اختیار کر کے ایک مصنف کی حیثیت سے یہاں رہنے والا یہ بندہ دشمن ملک کا جاسوس ہے تو پھر آپ اسے پکڑ کیوں نہیں لیتے؟'' فضل داد نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''فضل داد!'' ملک سلیم ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''عارف یعنی منوہر لال پر ہاتھ ڈالنا اتنا اہم نہیں ہے جتنا اس کے نیٹ ورک کا سراغ لگانا۔ ہماری اطلاعات کے مطابق، منوہر لال کا نیٹ ورک پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر ہم نے اسے اٹھالیا تو اس نیٹ ورک کو کھودیں گے۔ ہم اس شیطانی جال کو ایک ساتھ، ایک ہی وار میں کاٹ ڈالیں گے اور اس آپریشن کا وقت زیادہ دور نہیں۔'' وہ لمحے بھر رکا پھر فضل داد کے چہرے پر نگاہ جمانے کے بعد مستفسر ہوا۔ ''دوسرا واقعہ......؟''

''ہماری بلڈنگ کا خاکروب لگ بھگ گیارہ بجے آتا ہے اور تین بجے تک وہ ادھر ہی موجود رہتا ہے۔'' فضل داد نے بتایا۔ ''اس دوران میں وہ سب کے گھروں سے کچرا لیتا ہے، پوری بلڈنگ کی جھاڑو نکالنے کے بعد پونچھا لگاتا ہے اور ضرورت پڑے تو زینوں کی دھلائی بھی کرتا ہے۔ آج جب سوئپر اپارٹمنٹ نمبر ایک سو چار کا کچرا اٹھانے گیا تو ڈسٹ بن میں دیگر کچرے کے علاوہ رسائل اور میگزینز کے پھٹے ہوئے اوراق بھی موجود تھے جن میں کچھ رسالے ہندی زبان کے تھے۔ میں اس زبان کو پڑھ تو نہیں سکتا لیکن انڈین نیوز چینلز کو بعض اوقات دیکھنے کا اتفاق ہوجاتا ہے۔ وہاں اسی رسم الخط کی سرخیاں چل رہی ہوتی ہیں۔''

''ہوں۔'' ملک سلیم گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ''کیا تم نے ان پھٹے ہوئے رسائل کے صفحات کو

اپنے پاس محفوظ کرلیا ہے یا وہ سب دیگر کچرے کے ساتھ گئے کسی اندھے گڑھے میں؟''

''نہیں سر، میں ایسی غلطی بھلا کیسے کر سکتا ہوں۔''

فضل داد اپنی قمیص کی سائڈ پاکٹ سے چند کاغذات نکالتے ہوئے بولا۔ ''سر! وہ ٹکڑے یہ ہیں۔''

''تم ان ٹکڑوں کو ادھر میز پر رکھ دو۔'' ملک سلیم سینٹر ٹیبل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں انہیں بعد میں دیکھ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' کہتے ہوئے فضل داد نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی پھر متذبذب نظر سے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔

''کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' ملک سلیم نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی سر!'' فضل داد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے آپ سے ایک کام ہے۔''

''ہاں بولو؟'' ملک سلیم نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''کام بہت ہی خاص اور ذاتی نوعیت کا ہے سر۔'' فضل داد نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے اُمید ہے، آپ انکار نہیں کریں گے۔''

''کچھ بتاؤ گے تو پتا چلے گا نا، کام کیا ہے؟'' ملک سلیم نے بیزاری سے کہا۔ ''اس کے بعد ہی انکار اور اقرار کا فیصلہ کیا جائے گا۔''

''سر! وہ کام آپ کے بائیں ہاتھ کا ہے۔'' فضل داد نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے میں نے اتنے وثوق سے کہا ہے کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔ سر! یہ میرے چھوٹے بھائی کی زندگی کا سوال ہے۔ میری ماں نے رو، رو کر اپنی آنکھیں گنوا دی ہیں۔''

''کیا تمہارا چھوٹا بھائی کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہے؟''

''نہیں سر! وہ پچھلے ایک سال سے مفرور ہے۔''

''مفرور!'' ملک سلیم نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''کس سلسلے میں؟''

''ایک سال پہلے خلق داد نے ایک بندے کو قتل کر دیا تھا سر......'' فضل داد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مقتول مردان کے ایک بااثر اور طاقتور قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے خلق داد کے خلاف بڑا خطرناک قسم کا پرچہ کٹوا کر

''یتیم''

یتیم لڑکے کے دودھ جیسے اجلے کپڑوں کی طرف دھیان سے دیکھتے ہوئے جگو نے پوچھا۔

''تو اسکول جاتا ہے؟''

''ہاں! یتیم خانے کے سارے بچے جاتے ہیں۔''

''بڑا قسمت والا ہے تو!'' جگو نے اسے حسرت سے دیکھا۔

''یتیم کے ساتھ مذاق نہیں کرتے۔'' لڑکا دکھ سے بولا۔

''تو قسمت والا ہے پیارے! میرے پاس نہ تیرے جیسے کپڑے ہیں نہ میں اسکول جا سکتا ہوں۔'' جگو کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تو اسکول نہیں جاتا؟ پھر سارا دن کیا کرتا ہے؟'' یتیم لڑکے نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہوٹل میں برتن مانجھتا ہوں۔''

''تو... تو یتیم خانے میں کیوں نہیں آجاتا؟''

''جی تو بہت چاہتا ہے لیکن وہ لوگ مجھے رکھتے نہیں۔''

''کیوں...؟'' یتیم حیران تھا۔

''میرے ماں، باپ جو زندہ ہیں۔''

(ہندی پنجابی ادب۔ شیام سندر اگروال)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

عدالت سے اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کرا رکھے ہیں۔ پولیس عدالت کے حکم پر اس کی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے اور وہ بے چارہ ایک سال سے مفروری کی زندگی گزار رہا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میری والدہ کو یقین ہے کہ خلق داد زندہ ہے اور وہ ایک دن ضرور لوٹ کر آئے گا۔ اسی آس اور انتظار میں وہ لگاتار روتی رہتی ہے۔''

ملک سلیم نے نہایت ہی توجہ سے فضل داد کی پتا سنی اور اس کے خاموش ہونے پر معتدل انداز میں کہا۔ ''تم مجھے اپنے بھائی کے کوائف، قتل کی تاریخ اور اس کورٹ کا نمبر وغیرہ لکھ کر دے دو جہاں سے اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے گئے ہیں۔ میں متعلقہ جج کو فون کر کے اس معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے کہہ دوں گا...... اور کچھ؟''

''بہت بہت شکریہ سر......'' فضل داد ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اور کچھ نہیں جناب۔ آپ بس خلق داد کا کیس ختم کرا دیں۔ یہ آپ کا ہم لوگوں پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ میری والدہ آپ کو تا عمر دعائیں دے گی۔''

''سمجھ لو، تمہارا کام ہو گیا۔'' ملک سلیم نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

فضل داد تشکرانہ نظر سے اسے تکنے لگا۔

☆☆☆

آئندہ روز فضل داد ریسیپشن پر موجود تھا کہ انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ اس نے انٹرکام کے ڈیجیٹل بورڈ کے اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہاں ''ایک سو چار'' کا فگر ڈسپلے ہو رہا تھا۔ یہ ابھی عارف یعنی منوہر لال کے اپارٹمنٹ کا نمبر تھا۔ اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے مہذب لہجے میں کہا۔

''جی سر!''

''لالہ! کیا تم تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس آسکتے ہو؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''کیوں نہیں عارف صاحب! میں ابھی آتا ہوں۔'' فضل داد نے فرمانبرداری سے کہا۔

''آجاؤ۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

فضل داد جب اپارٹمنٹ نمبر ایک سو چار کے دروازے پر پہنچا تو عارف نے برہمی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہمارے گھر میں پانی کی سپلائی دو مختلف جگہوں سے آتی ہے؟''

''نہیں سر!'' فضل داد نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''اس بلڈنگ کے بارہ اپارٹمنٹس میں ایک ہی چھت والی ٹینکی سے پانی سپلائی ہوتا ہے۔''

''پھر کیا وجہ ہے کہ میرے کچن کے سنک میں تو پانی آرہا ہے اور واش رومز میں بالکل نہیں۔'' عارف نے بہ دستور خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''کیا مجھے کچن کے نل سے بالٹیوں میں پانی بھر بھر کر واش رومز میں پہنچانا ہوگا؟''

''آپ غصہ نہ کریں سر! میں ابھی چیک کر لیتا ہوں۔'' فضل داد نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''عین ممکن ہے، ائر لاک ہوگیا ہو۔''

''ائر لاک نہیں ہونا چاہیے۔'' عارف نے زور دے کر کہا۔ ''آخر ہم دس ہزار روپے مینٹی نینس کے نام پر کس لیے دیتے ہیں۔''

''میں ابھی آپ کی شکایت دور کرتا ہوں سر۔'' فضل داد نے فدویانہ انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بے دلی سے بولا اور لاؤنج میں بچھے صوفے کی جانب بڑھ گیا جہاں ایک کلپ بورڈ، دو تین پوائنٹرز، کچھ سادہ کاغذات اور چند رسالے پڑے ہوئے تھے۔

عارف اسی صوفے پر بیٹھ کر لکھنے کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ ٹیبل چیئر کا عادی نہیں تھا۔ اس نے ساری زندگی کلپ بورڈ کو کسی چھوٹے بچے کے مانند گود میں رکھ کر تخلیقی کام کیا تھا۔

چند منٹ کے بعد فضل داد اس کے پاس آیا اور بتایا۔

''سر! میرا انداز درست نکلا۔ یہ ائر لاک ہی تھا۔ بہرحال، میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے۔ آپ چیک کر لیں۔''

''مجھے تمہاری بات پر بھروسا ہے۔'' عارف نے معتدل انداز میں کہا۔ ''چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے میں نے واش رومز کے نل سے پانی گرنے کی آواز سن لی ہے۔''

''شکریہ سر!'' فضل داد نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔

ملک سلیم کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، یہ شخص عارف نہیں بلکہ منوہر لال تھا۔ ایک خطرناک انڈین سیکرٹ ایجنٹ لیکن یہ ظاہر دیکھنے میں وہ ایک عام سا معصوم اور بے ضرر انسان نظر آتا تھا جیسا کہ لکھاری حضرات عموماً ہوتے ہیں۔ وہ منوہر لال جاسوس کے حوالے سے متضاد سوچوں میں گم تھا کہ عارف کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''تمہارا کام ہوگیا۔ اب جاؤ یہاں سے اور مجھے بھی میرا کام کرنے دو۔''

''ٹھیک ہے سر، میں جاتا ہوں۔'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولا پھر اندرونی تجسس سے مجبور ہوکر کہا۔ ''سر! آپ کو اگر برا محسوس نہ ہو تو میں ایک دو باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔''

عارف نے اپنے پوائنٹر کو کیپ لگایا، نظر کے چشمے کو اتار کر کلپ بورڈ پر رکھا اور کہا۔ ''پوچھو بھائی۔''

''میں نے چند روز پہلے آپ کے کچرے میں پھٹے ہوئے رسائل دیکھے تھے جو کسی غیر ملکی زبان میں تھے۔'' فضل داد نے کہا۔ ''میرے علم میں تو یہی ہے کہ آپ قومی زبان میں کہانیاں لکھتے ہیں۔ تو کیا آپ باہر کے رسالوں کے لیے بھی ان کی زبان میں کہانیاں بھجواتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کیا آپ کو اردو کے علاوہ اور زبانیں بھی آتی ہیں؟''

''تم نے پھٹے ہوئے میگزینز کے جو ٹکڑے میرے ڈسٹ بن میں پڑے دیکھے تھے وہ انڈیا کے ایک معروف فکشن میگزین کے چند اوراق تھے۔'' عارف نے بتایا۔ ''میں صرف اردو ہی لکھنا اور پڑھنا جانتا ہوں اس لیے قومی زبان ہی میں کہانیاں تحریر کرتا ہوں۔''

عارف کے جواب سے فضل داد کی تسلی نہ ہوسکی جس سے وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ

کہتا، عارف نے پوچھ لیا۔ ''کوئی اور سوال؟''

''سر، آپ گھر سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔'' فضل داد نے ہمت کر کے ایک نازک بات پوچھ لی۔ ''اس کا سبب بھی سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کا زیادہ وقت تخلیقی کام میں گزرتا ہے جو کہ ظاہر ہے، آپ گھر میں بیٹھ کر ہی کرتے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ آپ عموماً گھر سے باہر جانے کے لیے بیس منٹ والا راستہ ہی استعمال کرتے ہیں؟''

''اس بارے میں تو میں یہی کہوں گا کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' عارف نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ''پہلے تو میں ریسپشن والے راستے ہی سے باہر جایا کرتا تھا، یہ الگ بات کہ مجھے جب بھی باہر جانے کی ضرورت پیش آئی وہ رات آٹھ، نو بجے کے بعد کا ٹائم تھا اور ایسے میں ریسپشن پر تم نہیں بلکہ دوسرا لالہ افسر خان ہوتا ہے اور جہاں تک آج کل کی بات ہے تو......'' وہ چند لمحات کے لیے رکا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تم بھی دیکھ رہے ہو، کافی دنوں سے برسات کا سماں ہے۔ ہماری گلی میں جا بجا پانی اور کیچڑ سے واسطہ پڑتا ہے اور قربانی کے جانوروں کی وجہ سے تو اور بھی بُرا حال ہو گیا ہے۔ واپس آؤ تو چپل اس قابل نہیں ہوتی کہ اس سے بلڈنگ کی صاف شفاف لابی اور آئینے کے مانند چمکتے ہوئے زینوں کو خراب کیا جائے۔ چپلوں کی اس کنڈیشن کے ساتھ لفٹ میں سوار ہونا تو انتہائی غیر اخلاقی محسوس ہوتا ہے۔ بس، اسی لیے میں بیس منٹ سے عقبی زینہ چڑھ کر اپنے گھر آجاتا ہوں۔''

فضل داد نے عارف کا شکریہ ادا کیا اور واپس ریسپشن پر آگیا۔ دو روز بعد وہ ایک بار پھر ملک سلیم کے اپارٹمنٹ ''جی تھری'' میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ملک صاحب کو ''ایک سو چار یاترا'' کا احوال تفصیل سے سنا دیا۔ ملک سلیم نے بڑے انہماک سے اس کی بات سنی اور کہا۔

''تمہاری اسٹوری میں کام کی صرف ایک ہی بات ہے فضل داد اور وہ یہ کہ تم منوہر لال کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے اور اس نے تمہیں واش رومز کے ائر لاک کو ٹھیک کرنے کے لیے بالکل آزاد اور خود مختار چھوڑ دیا۔''

ملک سلیم کا بیان فضل داد کے پلے نہ پڑا۔ اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''اور باقی چیزوں کی واقعی کوئی اہمیت نہیں ہے، میں نے اس سے جو سوال کیے، کیا وہ سب بیکار ہی تھے؟''

''دیکھو فضل داد! تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ یہ سیکرٹ ایجنٹس کس قدر ہوشیار، چالاک اور چال باز ہوتے ہیں۔'' ملک سلیم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس نے تمہارے سوالات کے جوابات میں سراسر بکواس کی ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر جی؟'' فضل داد بے یقینی سے اسے تکنے لگا۔

''سچ جاننا چاہتے ہو تو سنو......'' ملک سلیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ شاطر جاسوس منوہر لال بلڈنگ میں آمد و رفت کے لیے ریسپشن اور لابی والے صاف ستھرے راستے کے بجائے بیس منٹ والا سنسان راستہ اس لیے استعمال کر رہا ہے کہ اس طرف لوگوں کی زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی اور بیس منٹ میں سیکیورٹی کیمرا بھی ایک آدھ ہی نصب ہے جسے وہ بہ آسانی دھوکا دے سکتا ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو سیکیورٹی کیمروں کی ریکارڈنگ کو چیک کر لو۔ وہ تمہیں لابی سے گزرتا تو بالکل دکھائی نہیں دے گا اور عین ممکن ہے، وہ بیس منٹ والے کیمرے کی ریکارڈنگ میں بھی نظر نہ آئے اور جہاں تک اُن چھپے ہوئے اوراق کی بات ہے تو اس سلسلے میں بھی منوہر لال نے تمہیں ماموں بنایا ہے۔ وہ کسی فکشن انڈین میگزین کے نہیں بلکہ ایک بھارتی اخبار کے صفحات کے ٹکڑے تھے جن پر ہمارے ملک کے خلاف واہیات خبریں چھپی ہوئی تھیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر جی۔'' فضل داد نے ہونقوں کے سے انداز میں کہا۔ ''میرا ذہن واقعی اس معصوم نظر آنے والے مکار منوہر لال کی خطرناک چالوں تک نہیں پہنچ سکتا۔''

''میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے ''ایک سو چار نمبر'' اپارٹمنٹ کے لینڈ لارڈ اور وہاں انٹرنیٹ کی سروس مہیا کرنے والے شخص سے بھی بات کی ہے۔'' ملک سلیم نے فضل داد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔

''مالک مکان نے مجھے بتایا ہے کہ کرائے داری والا اگریمنٹ منوہر لال کی بیوی رخسانہ کے نام ہے اور اس بلڈنگ میں فاسٹ اسپیڈ انٹرنیٹ ''فائبر آپٹک'' کی سروس فراہم کرنے والے صاحب کا بیان ہے کہ اپارٹمنٹ نمبر ایک سو چار کے کنکشن کی ڈیٹیلز بھی رخسانہ نے اپنے نام اور شناختی کارڈ و سیل نمبر ہی کے مطابق بھری ہیں یعنی منوہر لال کسی بھی ڈاکیومنٹس میں اپنا نام، کانٹیکٹ نمبر اور سی این آئی سی استعمال نہیں ہونے دے رہا تا کہ وہ سب کی نگاہوں

سے اوجھل رہے لیکن اس بے وقوف کو بالکل اندازہ نہیں کہ میری عقابی نگاہ چوبیس گھنٹے اسی پر گڑی ہوئی ہے اور میں اس کی ایک ایک حرکت سے بہ خوبی واقف ہوں۔''

''آگے آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' فضل داد نے پوچھا۔

''اب تمہارے کچھ کرنے کی باری ہے فضل داد......''

''میں سمجھا نہیں سر؟''

''منوہر لال نے تمہیں ماموں بنایا ہے۔ اسے چاچو بنانا تو تم پر واجب ہو چکا ہے۔'' ملک سلیم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم کسی بھی بہانے اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو سکتے ہو، خصوصاً دن کے وقت جب رخسانہ گھر میں موجود نہیں ہوتی اور منوہر لال تخلیقی عمل سے گزرنے کی اداکاری کر رہا ہوتا ہے۔ تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا...... میرا نہیں، بلکہ وطنِ عزیز کا۔ اس ارضِ پاک کی مٹی کا قرض اور فرض ہم سب پر ہے...... ہے یا نہیں؟''

''ہے سر...... بالکل ہے۔'' فضل داد تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ تو بتائیں، مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

ملک سلیم اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔

☆☆☆

شام کے چھ بجے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد فضل داد کی چھٹی ہو جاتی اور اس کی جگہ رات کی ڈیوٹی والے لالہ افسر خان نے لے لینا تھی۔ فضل داد کی چھٹی یقیناً ہو جاتی لیکن ابھی اسے اپنے گھر نہیں جانا تھا۔ ملک سلیم کے پاس اس کے دو مہمان آئے ہوئے تھے۔ اس نے فضل داد کو چھٹی کے بعد رکنے کے لیے کہا تھا۔ وہ فضل داد سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا مگر مہمانوں کے جانے کے بعد۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ دونوں مہمان ملک سلیم کے گھر کے اندر موجود تھے۔ اس مہمان داری کو کب تک جاری رہنا تھا اس بارے میں فضل داد کچھ نہیں جانتا تھا تاہم اسے یہ اندازہ ضرور تھا کہ وہ لوگ سات بجے کے بعد ہی رخصت ہوں گے اسی لیے ملک سلیم نے اسے چھٹی کے بعد ادھر ہی ٹھہرنے کو کہا تھا۔

فضل داد نے دو روز قبل ملک سلیم کے کہنے پر منوہر لال کے اپارٹمنٹ میں جا کر ایک خطرناک اور حساس نوعیت کا کام سرانجام دیا تھا جس کی حقیقت سے وہ پوری طرح واقف بھی نہیں تھا۔ ''شاید ملک صاحب مجھ سے ویسا ہی کوئی اہم کام لینا چاہتے ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''میں ان کے حکم کو ٹال نہیں سکتا۔ وہ وطنِ عزیز کی حفاظت اور سلامتی کے لیے کوشاں ہیں۔ اس نیک کام میں مجھے بھی اپنا حصہ ڈالنا ہے، چاہے اس کے بدلے میں میری جان بھی کیوں نہ چلی جائے۔''

وہ انہی جذبات انگیز خیالات کی اُدھیڑ بن میں مصروف تھا کہ انٹرکام کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے سسٹم کے ڈائل پر نگاہ ڈالی تو وہاں ''ایک سو چار'' کا فگر ڈسپلے ہو رہا تھا۔ یہ کال فرسٹ فلور کے اپارٹمنٹ نمبر چار سے تھی جہاں دشمن ملک کا خطرناک ایجنٹ منوہر لال اپنی مسلمان بیوی رخسانہ کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ بے چاری رخسانہ کو اپنے شوہر کی اصلیت سے آگاہی نہیں تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی منوہر لال کو عارف ہی کے نام سے جانتی تھی۔ ایک کہانی کار عارف انصاری!

رخسانہ کسی سرکاری محکمے میں ملازمت کرتی تھی اور پانچ بجے تک وہ اپنے آفس سے لوٹ آیا کرتی لیکن اس وقت چھ بج رہے تھے اور رخسانہ ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ انہی سوچوں کے درمیان فضل داد نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو سر!'' اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

منوہر لال کی بپھری ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''کال اٹینڈ کرنے میں اتنی دیر کیوں؟''

''سر! میں پارکنگ والا گیٹ بند کرنے گیا تھا۔'' فضل داد نے عذر تراشی سے کام لیتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''اسی لیے پہلی گھنٹی پر ریسیور نہیں اٹھا سکا۔ سوری سر۔''

''اچھا، اچھا، ٹھیک ہے۔'' منوہر لال نے درگزر کرنے والے سرسری انداز میں کہا۔ ''ذرا یہاں آکر میرے واش رومز کا ائرلاک چیک کرلو۔ آج پھر کسی نل میں پانی نہیں آرہا۔ میں تو اس بلڈنگ کے مسائل سے تنگ آگیا ہوں۔ اتنی بھاری مینٹی نینس دینے کے بعد بھی اگر سکون کی زندگی نصیب نہ ہو تو پھر کیا فائدہ؟''

''میں آرہا ہوں سر۔'' فضل داد نے خاصی مستعدی سے کہا۔

فضل داد کے پاس اچھا خاصا وقت تھا۔ ملک سلیم نے اسے سات بجے کے بعد اپنے اپارٹمنٹ میں آنے کو کہا تھا اور وہ بھی مہمانوں کے جانے کے بعد۔ وہ اس دوران میں منوہر لال کے واش رومز کی پرابلم کو بہ آسانی دور کر سکتا تھا۔

فضل داد جب اپارٹمنٹ نمبر ایک سو چار کے دروازے پر پہنچا تو منوہر لال اس کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھا۔

اور وہ بھی کھلے ہوئے دروازے کے ساتھ۔

''اندر آجاؤ۔'' منوہر لال نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''واش رومز تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔''

''جی سر..... میں ابھی آپ کا مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا۔

واش رومز تک رسائی حاصل کرنے کے لیے فضل داد کو بیڈ رومز کے اندر سے گزرنا تھا اور بیڈ رومز میں قدم رکھنے کے لیے لاؤنج کو عبور کرنا ضروری تھا۔ فضل داد کے اندر داخل ہوتے ہی منوہر لال نے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کو بند کر دیا تھا۔ فضل داد تیز قدموں سے چلتے ہوئے لاؤنج سے گزرا اور اوپن کچن سے ملحقہ بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ پھر قبل اس کے کہ وہ اٹیچڈ واش روم میں قدم رکھتا، اس کے پچھواڑے پر ایک طوفانی لات پڑی۔

منوہر لال کی اس لات میں اتنی زیادہ طاقت تھی کہ فضل داد جیسا صحت مند شخص منہ کے بل بیڈ روم کے چکنے فرش پر گرا پھر پھسلتے ہوئے اس واش روم کے دروازے کے پاس پہنچ گیا اور اس کا سر بری طرح واش روم کے چوبی دروازے سے ٹکرایا۔ اس تصادم کے نتیجے میں فضل داد کے حلق سے ایک اذیت ناک آواز برآمد ہوئی۔

اس غیر متوقع صورتِ حال میں فضل داد نے کمال ہمت کا مظاہرہ کیا اور تکلیف کی پروا کیے بغیر وہ ایک دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا اور اپنی کمر کے عقبی حصے میں ہاتھ گھما کر کچھ برآمد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں منوہر لال اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

''کیا تم اسی کو ڈھونڈ رہے ہو؟'' منوہر لال نے ایک گن اسے دکھاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''یہ تو اسی وقت تمہارے لباس سے نکل کر دور جاگری تھی جب میں نے تمہاری تشریف پر لات مار کر تمہیں راجو راکٹ بنا دیا تھا۔ اگر تم آتشیں اسلحے کی حفاظت کرنا نہیں جانتے تو ایسی چیزوں کو اپنے پاس رکھتے ہی کیوں ہو؟''

''منوہر لال.....!'' فضل داد نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔ اگر سر کو تمہاری اس حرکت کا.....!''

''منوہر لال ہوگا تمہارا وہ باپ جو ''جی تھری'' میں کسی چوہے کے مانند چھپا بیٹھا ہے اور ملک سلیم بن کر تمہیں اپنے اشاروں پر نچا رہا ہے۔'' فضل داد کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گن بردار نے زہریلے لہجے میں کہا۔

مطالعہ

امریکہ میں تین ہزار لوگوں پہ ریسرچ کی گئی جن کی عمریں پچاس سال سے زائد تھیں۔ ہفتے میں تین گھنٹے کا مطالعہ کرنے والوں میں موت کا خطرہ 23 فیصد تک کم ہوگیا۔ ریسرچ سے ثابت ہوا ہے کہ روزانہ آدھا گھنٹا کتاب پڑھنے سے عمر بڑھ سکتی ہے کیونکہ مطالعہ سے ذہنی سکون اور دماغی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ کورٹیول ہارمون کی مقدار کم ہوتی ہے جو ڈپریشن کا باعث بنتا ہے۔ مطالعہ انسان کو فریش تو رکھتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ لوگوں سے بھی جوڑتا ہے۔ کہانی کے مختلف کردار لاشعوری طور پر ہمارے دماغ پر اثرانداز ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہی کردار حقیقی زندگی میں بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ یہ احساس قریبی رشتوں پہ ہی اثرانداز نہیں ہوتا بلکہ انجانے لوگوں پہ بھی ہوتا ہے۔ یوں انسان خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا بلکہ دکھ اور سکھ میں لوگوں کو اپنے قریب پاتا ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ مطالعہ ہمیں سوشل بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

حیدرآباد سے صابر فیاض کی تحقیق

''اگر اس ملک دشمنی میں ہم نے تمہیں گھسیٹ لیا تو مسنگ پرسن بن جاؤ گے۔ سوچو، پھر تمہاری بوڑھی ماں کا کیا ہوگا۔ وہ تو پہلے ہی تمہارے بھائی خلق داد کی جدائی کے غم میں رو، رو کر اندھی ہو چکی ہے۔''

''یہ..... یہ سب..... تمہیں کیسے پتا چلا؟'' فضل داد نے بکھری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ملک سلیم کا اصلی نام وکرم ہے اور وہ دشمن ملک کا ایک تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ ہے۔'' ایک سو چار والے رہائشی نے فضل داد کو بتایا۔ ''ہم لوگ چھ ماہ سے اس کی تلاش میں تھے۔ یہ دہلی سے کابل، کابل سے پشاور پھر پشاور سے لاہور پہنچا تھا۔ پھر یہ اچانک غائب ہوگیا۔ ایک ماہ پہلے ہم نے کراچی میں اس کا سراغ لگا لیا۔ یہ ملک سلیم کی حیثیت سے اس بلڈنگ کے اپارٹمنٹ ''جی تھری'' میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ مجھے اپنی اسسٹنٹ رخسانہ کے ساتھ اسی عمارت میں ایک کرائے دار کی شناخت کے ساتھ قیام کرنا پڑا تاکہ میں وکرم پر نظر رکھ سکوں۔''

''تو..... رخسانہ آپ کی بیوی نہیں ہے؟'' فضل داد نے قطع کلامی کرتے ہوئے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ محض میری ایک ورکنگ پارٹنر ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''رخسانہ ایک مستعد کمانڈو ہے اور آئی ٹی اس کی خصوصی فیلڈ ہے۔ اس نے ''اے آئی'' میں گولڈ میڈل لے رکھا ہے۔''

''اے آئی......؟'' فضل داد نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آرٹیفیشل انٹیلی جنس!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''تم وکرم کے کہنے پر املی کے بیج کے سائز کی جو ریکارڈنگ ڈیوائس میرے اپارٹمنٹ میں چھپا گئے تھے، رخسانہ نے اس کے ساتھ ''چھیڑ چھاڑ'' کر کے اسے ایسا بنا دیا ہے کہ یہاں سے ہماری جو آوازیں ''جی تھری'' میں بیٹھے ہوئے وکرم کے سسٹم تک پہنچیں گی، ان میں اس قدر شور اور خرخراہٹ شامل ہوگی کہ وہ کافر کا بچہ ہماری زبان سے ادا ہونے والے ایک لفظ کو بھی سمجھ نہیں پائے گا۔ ہم جب چاہتے، اس پر ہاتھ ڈال سکتے تھے لیکن ہمیں وکرم کے ان دو ساتھیوں کا انتظار تھا جو اس وقت وکرم کے اپارٹمنٹ میں موجود ہیں۔ وہ دونوں ممبئی سے آئے ہیں اور اپنے ساتھ ہزاروں افراد کی بہ یک وقت ہلاکت کا منصوبہ بھی لے کر آئے ہیں۔ یہ لوگ کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ اور اسلام آباد میں ایسے خوفناک دھماکے کرنے والے تھے جن میں، ایک ساتھ دس ہزار سے زیادہ معصوم اور بے گناہ افراد لقمۂ اجل بن سکتے تھے لیکن ہم ان کمینوں کے مذموم عزائم کو خاک میں ملا دیں گے...... ابھی اور اسی وقت......!''

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے سیل فون کو اسپیکر پر ڈالنے کے بعد گمبھیر انداز میں کہا۔ ''ہاں!''

''سر! دو مسلح کمانڈوز بیس منٹ میں لفٹ اور زینے کے نزدیک تعینات کر دیے گئے ہیں اور دو کمانڈوز اس وقت ریسیپشن پر موجود ہیں۔'' دوسری جانب رخسانہ تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''اس بلڈنگ میں آمد و رفت کا کوئی تیسرا راستہ موجود نہیں ہے۔ میں میجر عاصم کے ساتھ چارج کرنے ''جی تھری'' میں جا رہی ہوں۔ اگر وہ کم بخت کسی طرح ہم پر بھاری پڑ گئے تو بیس منٹ اور ریسیپشن والے کمانڈوز انہیں قابو کر لیں گے۔''

''آل دی بیسٹ!'' اس نے معتدل انداز میں کہا اور رابطہ موقوف کر دیا۔

اس نے یہ گفتگو فضل داد کو سنانے کے لیے اپنے سیل فون کو دانستہ اسپیکر پر ڈالا تھا۔ ادھر سیلولر رابطہ ختم ہوا، ادھر فضل داد اس شخص کے قدموں پر گر گیا پھر منت ریز لہجے میں بولا۔

''سر! مجھے معاف کر دیں...... مجھ سے غلطی ہوگئی...... میری نیت میں فتور نہیں ہے۔ میں اس دشمن ایجنٹ کو واقعی محب وطن ملک سلیم سمجھ بیٹھا تھا۔ آپ میری حب الوطنی پر شک نہ کریں۔ میں دشمنوں کا آلۂ کار نہیں ہوں۔''

''میں جانتا ہوں اور تمہیں اس وقت ائرلاک کے بہانے میں نے یہاں اس لیے بلایا ہے کہ اس آپریشن کے دوران میں تم وکرم سے اور وکرم تم سے رابطہ نہ کر سکے۔ خیر...... اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔'' اس شخص نے فضل داد کی گن اسے لوٹاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اپنا حلیہ درست کرو اور جا کر ریسیپشن پر بیٹھو۔ ابھی تمہاری ڈیوٹی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اگر کسی رہائشی نے شکایت کر دی تو اس غفلت اور غیر ذمے داری کے پیش نظر تمہاری نوکری بھی جا سکتی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی سر!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بس، آپ لوگ مجھے معاف کر دیں۔ دوسرے کسی کی مجھے پروا نہیں ہے۔''

''اگر میں نے تمہاری خطا کو درگزر نہ کیا ہوتا تو اس وقت تم اپنے قدموں پر کھڑے دکھائی دیتے اور نہ ہی یہ گن تمہارے ہاتھوں میں نظر آتی اور......'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تم ایک لمحہ برباد کیے بغیر ریسیپشن پر پہنچو۔ تمہارے ملک سلیم کی برات، دوشہ بالوں کے ساتھ روانہ ہونے والی ہے۔ کیا تم اس دل فریب اور سبق آموز منظر سے لطف اندوز نہیں ہونا چاہو گے۔''

''جانتا ہوں سر، جانتا ہوں۔'' فضل داد نے اضطراری لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''سر! کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟''

''سن آف دی سوئل......!'' اس نے فضل داد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اس ارض پاک کا بیٹا ہوں۔ اس سے بہتر میرا اور کوئی تعارف ہو نہیں سکتا۔''

''سر! آپ کا کام بہت مشکل، بہت پیچیدہ ہے۔'' فضل داد بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''اور صبر آزما بھی۔'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور تم نے بزرگوں سے یہ تو سن ہی رکھا ہوگا...... صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' فضل داد اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

❖❖❖

بے سمت

عکسِ فاطمہ

کبھی کبھی بِنا سوچے سمجھے بے سمت سفر بھی انسان کی منزل کا تعین کر دیتا ہے... اسے کسی نہ کسی سنگِ میل تک پہنچا دیتا ہے... جہاں پہنچ کر منزل منتظر کھڑی ملتی ہے... ایسے ہی ایک مزاج داں کا سفر... مختلف رہ گزاروں نے اسے ایک کامیاب سوار بنا دیا...

اسیری سے آزادی کی جانب گامزن ایک پروفیسر کی سرشاری......

سلمان سلیم

ایڈ وائلڈ نے بالآخر اپنے منصوبے کو حتمی شکل دے ہی دی تھی۔ اُس نے اِس منصوبے کا نام بھی بڑا انوکھا اور نرالا رکھا تھا۔ ''اچانک غائب ہو جانا'' بالکل! وہ چپ چاپ خود کو دنیا کے ہنگاموں میں گم کر دینا چاہتا تھا اور اس کا سبب اس کی بیوی پیٹریشیا تھی۔

ایڈ اپنی بیوی سے بہت تنگ تھا۔ پیٹریشیا زبان دراز، آتش مزاج اور حاکمانہ فطرت کی مالک تھی۔ وہ اُس کی بد دماغی اور بد کلامی سے عاجز آ چکا تھا اسی لیے اس نے ''گم

شدہ'' ہو جانے کا فیصلہ کیا تھا اور آج اس فیصلے پر عمل کرنے کا دن تھا۔

وہ بہت ہی سلجھا ہوا اور سنجیدہ طبیعت کا انسان تھا۔ اس کی ساری زندگی درس و تدریس میں گزری تھی۔ وہ کیمسٹری کا ٹیچر تھا اور حال ہی میں ریٹائر ہوا تھا۔ پیٹریشیا اپنے مزاج کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ ایڈ کے ساتھ گھریلو ملازموں جیسا سلوک کرتی تھی اور خود کو جینئس ثابت کرنے کے لیے وہ ایڈ کے ہر کام میں کیڑے نکالتی رہتی تھی چنانچہ ایک روز اُس کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے بہانہ کیا کہ وہ چند روز کے لیے آزادانہ گھومنا پھرنا چاہتا ہے۔ یہ محض پیٹریشیا کے سامنے کی جانے والی خانہ پُری تھی۔ درحقیقت اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''تمہیں کچھ دن میرے بغیر ہی گزارنے ہوں گے پیٹریشیا۔'' اس نے کہا۔ ''ریٹائرمنٹ کے بعد پہلی مرتبہ اتنی فرصت ملی ہے۔ اگر تمہیں کوئی پرابلم نہ ہو تو میں ذرا آوارہ گردی کے موڈ میں ہوں۔''

''یہ بات تو تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے تمہاری غیر حاضری سے میری موت واقع ہو جائے گی۔'' پیٹریشیا کی الٹی کھوپڑی نے ٹیڑھا جواب دیا۔ ''تم کیمسٹری کے ٹیچر ہو گے، آکسیجن تیار کرنے والی مشین نہیں! میں تمہارے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ تم شوق سے چند دن نہیں، چند ہفتوں یا چند مہینوں کے لیے بھی جہاں چاہو، جا سکتے ہو۔ ویسے بھی میری بہن یہاں رہنے آنے والی ہے۔ وہ مجھے بور نہیں ہونے دے گی۔''

ایڈ نے خاموشی اختیار کرنے ہی میں عافیت جانی کیونکہ اس کے آگے کچھ بولنے کا مطلب تھا، کسی نئے فساد کی شروعات......

اس نے اتوار کی صبح کوچ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تمام ضروری سامان وین میں لوڈ کر دیا گیا تھا۔ عین گھر سے نکلتے وقت پیٹریشیا نے اسے ایک واہیات کام بتا دیا تھا۔

''ایڈ! جانے سے پہلے تم اس ڈربے کی جگہ بدل دو۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اسے کہاں رکھنا ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ......''

''ڈربے'' سے پیٹریشیا کی مراد وہ بڑا سا پنجرہ نما باکس تھا جس میں درجن بھر خرگوش یا اسی طرح کے گھریلو پالتو جانور رکھے جا سکتے تھے۔ اس کی تیاری میں لکڑی اور شیشے کا استعمال کیا گیا تھا۔ پنجرے کی دیواروں میں مختلف سائز کے شیلف بھی بنے ہوئے تھے تاہم اس کا فرش، بڑے سائز کے چوبی تختوں سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ پیٹریشیا کی ماں کا دیا ہوا تحفہ تھا جو لیونگ روم کے وسط میں رکھا رہتا تھا۔ وہ پنجرہ وزن میں اتنا بھاری تھا کہ اسے کھسکانے کا کام بھی کسی ایک بندے کے بس کا نہیں تھا اور اس پر احتیاط الگ کہ کہیں جھٹکا لگنے سے اس کا کوئی شیشہ نہ ٹوٹ جائے اس پس منظر کے ساتھ یہ کہا جا سکتا تھا کہ پیٹریشیا نے ایڈ کو ایک کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اس نے بھی آخری کڑوا گھونٹ سمجھ کر اسے حلق سے اتار لیا تھا۔

بہرکیف، ایڈ نے پیٹریشیا کا کام نمٹانے کے بعد، ایک نامعلوم منزل کی سمت اپنا سفر شروع کر دیا۔

وہ اتوار کا دن تھا اور اسے امید نہیں تھی کہ کوئی اسے گھر سے روانہ ہوتے دیکھے گا لیکن جب وہ اپنی وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا تو اس کا پڑوسی نظر آیا۔

ایڈ نے فوراً اپنی پی کیپ کو جھکا کر آنکھوں کو اس حد تک ڈھانپ دیا کہ پڑوسی اُس کا چہرہ واضح طور پر نہ دیکھ سکے۔ ایڈ کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی اور وہ پڑوسی اس سے ''ہیلو ہائے'' کیے بغیر اپنے ٹرک کی جانب بڑھ گیا۔ یہ دیکھ کر ایڈ کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس سے سوال جواب کرے۔

☆☆☆

رات کے نو بجے تھے۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ پیٹریشیا کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا لیکن اُس کے ذہن میں بیوی کی تلخ یادیں جیسے رچ بس گئی تھیں۔ باوجود کوشش کے بھی وہ ان اذیت ناک سوچوں سے نجات حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔

''کل پیٹریشیا کی بہن اُس کے پاس رہنے آ رہی ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ''وہ ہمارے گھر کے داخلی دروازے پر نصب اطلاعی گھنٹی بجائے گی۔ دو تین بار ڈور بیل بجانے کے باوجود بھی جب پیٹریشیا دروازہ کھولنے نہیں آئے گی تو وہ دروازے کے ہینڈل کو گھما کر دیکھے گی۔ اسے دروازہ لاک ملے گا۔ پریشان ہو کر وہ پیٹریشیا کو کال کرے گی۔ کئی بار کی کوشش کے بعد بھی پیٹریشیا اس کا فون اٹینڈ نہیں کرے گی جس سے اس کی تشویش میں اضافہ ہو جائے گا۔ وہ کسی بھی قیمت پر گھر کے اندر داخل ہونا چاہے گی تاکہ پیٹریشیا کی خیریت دریافت کر سکے۔ وہ گھر کے عقبی حصے میں جا کر بھی دیکھے گی اور آس پڑوس والوں سے بھی پوچھ تاچھ کرے گی......''

پیٹریشیا کی بہن کے بارے میں سوچتے ہوئے اُس

کے حلق میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ وہ اپنی سالی کو حد سے زیادہ ناپسند کرتا تھا۔ وہ پیٹریشیا سے بھی دس ہاتھ آگے تھی۔

ایڈ وائلڈ باسٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی ایسی ذہنی کیفیت سے نہیں گزرا تھا جو اِس وقت اُس پر طاری تھی۔ اس کا ذہن بُری طرح اُلجھا ہوا تھا اور اندر جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔

اس نے سکون حاصل کرنے کے لیے اپنی شرٹ کے سامنے والے بٹن کھول لیے۔ ائرکنڈیشنر کی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا نے اس کی بگڑتی ہوئی حالت کو سہارا دیا اور وہ خاصا بہتر محسوس کرنے لگا۔

اب وہ ''ڈبوکے'' نامی ایک جگہ سے گزر رہا تھا۔ یہ مقام ایڈ کی زندگی میں ایک یادگار کی حیثیت رکھتا تھا۔ کئی سال پہلے اس نے اپنی پہلی بیوی کیل کے ساتھ یہاں ہنی مون منایا تھا۔ کیل کی اس کی زندگی میں بہت اہمیت تھی۔ ایک اندوہناک حادثے نے کیل کو اس سے چھین لیا تھا۔ پیٹریشیا، کیل کے پاؤں کے ناخن جتنی حیثیت کی بھی حامل نہیں تھی۔

ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ خوش گوار اور سوگ وار یادیں اس کے ساتھ اس کے ذہن پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ اس نے سر جھٹک کر تمام متضاد سوچوں کو دماغ سے باہر پھینکا اور وین کو ڈاؤن ٹاؤن کی طرف موڑ لیا۔ اب اسے ٹھیک ٹھاک بھوک لگ رہی تھی اور وہ پیٹ پوجا کا ارادہ رکھتا تھا۔

☆☆☆

''برگر پیلس'' نامی ریسٹورنٹ کے سامنے اپنی وین روکنے کے بعد ایڈ باہر نکل آیا اور اس نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر اپنے عضلات اور ہڈیوں کو آرام پہنچایا۔ دو، چار گھنٹوں کی ڈرائیونگ تو چلتی ہے مگر وہ مسلسل کئی گھنٹوں سے اپنی وین کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے بیٹھا تھا لہٰذا تھکن سے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور اسے احساس دلا رہا تھا کہ اس کا بڑھاپا شروع ہو چکا ہے چنانچہ جو بھی عمر باقی بچی ہے، اسے انجوائے کرتے ہوئے گزارنا چاہیے اور اس مقصد کے لیے ''غائب ہو جانا'' سب سے بہترین راستہ ہے۔

اس نے اپنے لیے چیز برگر اور فرائز کا آرڈر دیا اور کھڑکی والی ایک میز پر جا بیٹھا۔ وہ نصف شب تک ڈرائیونگ کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے بعد آرام لہٰذا ڈنر میں الابلا کھانے کے بجائے برگر یا پھر پزا ہی عقل مندانہ انتخاب تھا۔

اس وقت ڈائننگ ایریا میں وہ اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا اور شاید وہ اس برگر پیلس کا آخری کسٹمر بھی تھا۔ ایک اُدھیڑ سالڑکا میزوں کی صفائی میں مصروف تھا جو اس بات کا اشارہ بھی تھا کہ کچھ ہی دیر میں وہ ریسٹورنٹ بند ہونے جا رہا تھا۔ برگر کھاتے ہوئے ایڈ وائلڈ اس لڑکے کو کام کرتے ہوئے توجہ سے دیکھنے لگا۔

اس لڑکے کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ سر کے بال لٹوں کی صورت میں اس کی پیشانی پر جھول رہے تھے اور چہرہ دانوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ ایک کے بعد ایک میز کی صفائی کرتے ہوئے ایڈ کے نزدیک پہنچا تو اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''مسافر ہو......؟''

ایڈ نے اثبات میں گردن ہلائی اور دریافت کیا۔ ''کیا تم یہاں نزدیک ہی میں کسی سستے اور مناسب ہوٹل کے بارے میں جانتے ہو؟''

''ہوٹل یا موٹیل؟'' لڑکے نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس دوران میں اس کا ایک ہاتھ مسلسل میز کی صفائی میں لگا ہوا تھا۔

''میرا مطلب تھا، موٹیل!'' ایڈ نے جواب دیا۔

''اسٹار لائٹ!'' لڑکے نے بتایا۔ ''چار بلاک آگے۔ میں سمجھتا ہوں، وہ تمہارے لیے ٹھیک رہے گا۔ صاف ستھرا اور سستا بھی۔'' اب اس نے اپنا کام روک دیا تھا۔

''بہت خوب!'' ایڈ نے کہا۔ ''تھینک یو۔''

''اسٹار لائٹ میں میری کزن نائٹ کلرک کی ڈیوٹی کرتی ہے۔ وہ تمہاری مدد کرے گی۔'' لڑکا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم اس سے روم نمبر فورٹین مانگنا۔ وہ اس موٹیل کا سب سے بڑا کمرا ہے اور وہاں ٹی وی بھی ہے۔ مسافر اپنے کمرے میں ٹی وی کا ہونا پسند کرتے ہیں۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟''

''ایک دم ٹھیک۔'' ایڈ نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''تم میری کزن کو بتانا کہ تمہیں جسٹن نے بھیجا ہے۔'' لڑکے نے مزید کہا۔ ''میں مسافروں کو وہاں رات گزارنے کا مشورہ دیتا ہی رہتا ہوں۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ چند لمحات تک ایڈ کے ردِعمل کا انتظار کرتا رہا۔ جب ایڈ اسے کوئی جواب دینے کے بجائے برگر کھانے میں مصروف رہا تو وہ بھی اپنے کام سے لگ گیا۔

برگر ختم کرنے کے بعد ایڈ اپنی جگہ سے اٹھا اور واش

روم میں گھس گیا۔ اس دوران میں لڑکا وہاں کے کچرے کو ایک بڑے بیگ میں بھرنے لگا تاکہ ریسٹورنٹ بند ہونے سے پہلے وہ اس بیگ کو باہر رکھے کچرے کے ڈرم میں ڈال سکے۔

ایڈ واش روم سے نکلنے کے بعد واش بیسن پر ہاتھ دھو رہا تھا تو اس نے اس لڑکے کو کام میں مصروف پایا۔ وہ بیسن والے آئینے میں، ایڈ کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایڈ کی پی کیپ کو احترام سے اٹھا کر میز کو صاف کرنے کے بعد دوبارہ اسی جگہ رکھ دیا تھا جہاں ایڈ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ لڑکے کے اس عمل نے ایڈ کے ذہن میں پیٹریشیا کے عمومی ردِعمل کو جگا دیا تھا۔

وہ کبھی غلطی سے اپنی کیپ کو ڈائننگ ٹیبل پر چھوڑ دیتا تو پیٹریشیا فوراً اس ٹوپی کو ایڈ کے سر پر پھینک مارنے کے بعد غصے سے کہتی تھی۔

''اس کی جگہ کچن ٹیبل نہیں، تمہارا سر ہے۔ اگر یہ دوبارہ مجھے اِدھر اُدھر پڑی دکھائی دی تو میں اسے کچرے کے ڈبے میں ڈال دوں گی۔''

کسی بدمزگی سے بچنے کے لیے ایڈ خاموش ہو جایا کرتا تھا۔ جب پیٹریشیا ایسے موڈ میں ہوتی تو وہ ایڈ کی ایک نہیں سنتی تھی۔ اس کے نزدیک اپنی کہنا ہی سب سے زیادہ اہم تھا۔

''پیٹریشیا!'' وہ تصوراتی دنیا میں اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تمہارے ساتھ جو بھی کیا ہے، اس پر مجھے کوئی ندامت یا شرمندگی نہیں ہے۔ تم اس سے بھی بدتر سلوک کی مستحق تھیں۔ کاش! میں نے یہ قدم بہت پہلے اٹھا لیا ہوتا تو میری زندگی کے کئی ایک سال تمہارے ہاتھوں برباد ہونے سے بچ جاتے۔''

جب ایڈ واش روم سے باہر نکلا تو ریسٹورنٹ کی بیش تر لائٹس آف کر دی گئی تھیں۔ اس نے جسٹن کو ایک شخص کے ساتھ کاؤنٹر کے پاس کھڑے دیکھا۔ مرد مذکورہ شکل اور وضع قطع سے باورچی نظر آتا تھا۔ ریسٹورنٹ کا مالک کیش رجسٹر کے ساتھ مصروف تھا۔ گویا ''برگر پیلس'' کو بند کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔

''گڈ نائٹ!'' جسٹن نے ایڈ پر نگاہ پڑتے ہی شائستہ لہجے میں کہا۔ ''اور ہاں ''اسٹار نائٹ'' کو یاد رکھنا۔''

''میں اپنی ضرورت کی چیزوں کو کبھی نہیں بھولتا بچے۔'' ایڈ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور اس وقت میں آرام کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔''

جب ایڈ ریسٹورنٹ سے باہر نکلا تو اس نے ''برگر پیلس'' کے سامنے اپنی وین کے پہلو میں دو اور گاڑیوں کو کھڑے دیکھا۔ ان میں سے ایک پرانی زنگ آلود سرخ پک اَپ تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ایڈ کے ذہن میں جسٹن کا چہرہ اُجاگر ہو گیا۔

''یہ پک اَپ جسٹن ہی کی ہو سکتی ہے۔'' اس نے خودکلامی کی۔ ''دونوں کی ظاہری حالت میں کوئی تضاد دکھائی نہیں دیتا۔''

وین کے اندر بیٹھتے ہی اُس نے ڈیش بورڈ کو چیک کیا جہاں اس کے سن گلاسز والے کیس کے اندر پانچ سو ڈالرز کے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ یہ رقم اس نے اپنے خفیہ اکاؤنٹ سے نکالی تھی۔ مذکورہ اکاؤنٹ کو اس نے پیٹریشیا سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی ہر پندرہ دن کے بعد ملنے والی تنخواہ میں سے کچھ نہ کچھ بچا کر اس اکاؤنٹ میں ڈالتا رہتا تھا تاکہ کسی مصیبت یا ایمرجنسی میں ان میاں بیوی کے کام آتے رہیں۔ اب پیٹریشیا تو اس کے ساتھ نہیں رہی تھی لہٰذا اس اکاؤنٹ میں موجود رقم اور پینشن کا مخصوص اماؤنٹ سب اسی کے کام آنے والا تھا۔ اس خیال نے ایڈ کو مسرور کر دیا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ واقعتاً ہر فکر و غم سے آزاد ہو چکا ہے۔

☆☆☆

''اسٹار لائٹ'' موٹیل بالکل ویسا ہی تھا جیسا ایڈ نے تصور کیا تھا۔ موٹیل کے مخصوص نیون سائن کے نیچے کسی جاب کی ویکینسی کا اشتہار بھی لگا ہوا تھا۔ نیون سائن سے خارج ہونے والی گلابی روشنی اس اشتہار کو بھی نمایاں کر رہی تھی۔ ایڈ کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ یہ ایک پبلسٹی ٹیکٹ تھا۔

موٹیل کے ریسپشن پر جو عورت بیٹھی دکھائی دی، اُس کی عمر تیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس نے گلے میں طلائی زنجیر پہن رکھی تھی اور وہ ایک خوش شکل عورت تھی۔ جب ایڈ نے کمرا نمبر چودہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تو ریسپشنسٹ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔

''چودہ نمبر ہی کیوں؟''

''اس کمرے کے بارے میں مجھے تمہارے کزن جسٹن نے بتایا ہے۔'' ایڈ نے جواب دیا۔ ''وہ جسٹن جو ادھر ''برگر پیلس'' میں کام کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ روم فورٹین اس موٹیل کا سب سے عمدہ کمرا ہے۔''

''تم خوش قسمت ہو......'' ریسپشنسٹ دھیرے سے مسکرائی۔ ''روم فورٹین اتفاق سے اس وقت خالی ہے۔'' اس نے کی بورڈ پر لٹکی ہوئی متذکرہ کمرے کی چابی اتاری اور اسے ایڈ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پینسٹھ ڈالرز...... ایک رات کے لیے۔''

ایڈ نے دو سو ڈالرز کے چھوٹے نوٹ اپنے والٹ میں رکھ چھوڑے تھے۔ اس نے ایک پچاس ڈالر اور ایک بیس ڈالر کا نوٹ نکال کر ریسپشن پر رکھ دیا اور چابی اٹھا کر کمرا نمبر چودہ کی جانب بڑھ گیا۔

جسٹن نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعتاً ایک کشادہ اور صاف ستھرا کمرا تھا جس میں چھتیس انچ اسکرین والا ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا۔ اس ٹی وی پر نظر پڑتے ہی اسے بیوی یاد آ گئی۔

اُن کے گھر میں نئے ماڈل کا ایک خوب صورت ٹی وی موجود تھا مگر پیٹریشیا صبح و شام پینسٹھ انچ والے بڑے اسکرین کا مطالبہ کرتی رہتی تھی اور وہ بھی اپنے بیڈروم میں۔

''جب وہ بدبخت میری زندگی سے نکل چکی ہے تو میں اُس کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں۔'' اس نے خود کو سرزنش کی۔ ''اگر وہ بات بے بات یونہی مجھے یاد آتی رہی تو میری زندگی پہلے کی طرح نمونۂ جہنم بنی رہے گی۔ مجھے خود کو بدلنا ہوگا، اپنی سوچ میں تبدیلی لانا ہوگی۔ ہاں، میں ایسا کر سکتا ہوں۔''

اس مثبت خود ترغیبی سے اسے بہت حوصلہ ملا۔ اس نے واش روم میں گھس کر ایک بھرپور شاور لیا اور مکمل آزادی کے احساس کے ساتھ خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

ایڈ کی نیند اُتھلی سے گہری میں نہیں بدلی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ کمرے کے باہر اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بیڈ چھوڑ چکا تھا۔ وہ بلی کے مانند دبے پاؤں چلتے ہوئے کمرے کے دروازے تک آیا اور اپنی آنکھ پیپنگ ہول پر لگا دی۔

دروازے کے دوسری طرف اسے ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ وہ اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ مردِ مذکور اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ اس نے سر پر ہیٹ پہن رکھا تھا اور وہ بڑے اطمینان سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔

''اوہ...... یہ کیا؟'' ایڈ نے اضطراری انداز میں سوچا۔ ''میرے غائب ہونے کی خبر اتنی جلدی کیسے پھیل سکتی ہے۔ پیٹریشیا کی بہن کی آمد سے پہلے تو کسی کو اس کی گمشدگی

بگ باس

ایک ٹیچر ترقی پا کر ہیڈ ماسٹر بن گئے تو اگلے دن ہی اسکول میں بڑا سا بورڈ آویزاں کر دیا۔ جسے پڑھ کر سب کی جان ہی نکل گئی۔

''یہاں میں باس ہوں۔ صرف میرا ہی حکم چلے گا ہمیشہ یاد رکھنا اور اپنی اوقات میں رہنا۔''

ہیڈ ماسٹر صاحب باتھ روم گئے۔

جب واپس آفس میں داخل ہوئے تو میز پر ایک کاغذ پر پیغام لکھا ہوا ملا۔

''آپ کے گھر سے آپ کی بیگم کا فون آیا تھا۔ انہوں نے پیغام دیا ہے کہ۔

کچن کے دروازے سے جو بورڈ اتار کے لے گئے ہو۔ وہ شرافت سے واپس لے آنا......

☆☆☆

ایک آدمی کار دھو رہا تھا۔ تبھی پیچھے سے ایک عورت گزری۔ اور پوچھا۔ ''کار دھو رہے ہو؟''

آدمی: (جل کے) ''نہیں پانی دے رہا ہوں شاید بڑی ہو کر بس بن جائے۔''

ملیر سے امتیاز احمد کی بے چارگی

کے سبب کا علم نہیں ہونا چاہیے تھا۔

وہ دروازے کو چھوڑ کر کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ روم نمبر چودہ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کی ایک کھڑکی موٹیل کے سامنے والے حصے کی سمت کھلتی تھی جہاں سے موٹیل کا پارکنگ لاٹ اور ہائی وے صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کھڑکی پر پڑے ہوئے دبیز پردے کو ذرا سا سرکا کر باہر جھانکا تو اسے اپنی وین کے نزدیک ایک شخص نظر آیا۔ وہ بھی ہیٹ لگائے ہوئے تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔

''شاید یہ کوئی چور اُچکا ہے۔'' ایڈ نے سوچا۔ ''یہ تو اچھا ہوا کہ میں وین سے نکلتے وقت اپنے سن گلاسز اور سیل فون ساتھ لے آیا تھا۔ اب وین کے اندر چُرانے لائق کوئی بھی قیمتی شے نہیں ہے لیکن وہ کوئی سادہ لباس میں پولیس والا بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُس ٹرک والے پڑوسی نے میرے فرار ہونے کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔''

ایڈ کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی وین کے نزدیک کھڑا بندہ موٹیل کے آفس کی جانب بڑھنے لگا۔ ''ضرور کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔'' اس کے ذہن میں یہ خطرناک سوال اُبھرا پھر اس مسئلے کا حل بھی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے خود سے کہا۔ ''مجھے

فوراً اس موٹیل سے نکلنا ہوگا...... ابھی کے ابھی۔‘‘

وہ دوبارہ کمرے کے دروازے کے پاس پہنچا اور آئی گلاس سے باہر جھانکا۔ وہ سگریٹ نوش ہیٹ پوش کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

’’میرے پاس صرف دو منٹ کا وقت ہے۔‘‘ اس نے خود سے کہا اور سامان سمیٹنے میں مصروف ہوگیا۔ ’’تیسرا منٹ شروع ہونے سے پہلے مجھے یہاں سے روانہ ہوجانا ہے۔ میں نے خدا خدا کرکے یہ آزادی حاصل کی ہے۔ میں کسی بھی قیمت پر اس نعمت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔‘‘

وہ بہ آہستگی دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ کوری ڈور خالی پڑا تھا۔ دروازے کے ہینڈل کے نزدیک ایک پیلا کاغذ چپکا ہوا تھا جو یقیناً اسی کے لیے تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ وہاں رک کر اس نوٹ کو پڑھتا۔ اس نے کاغذ کو دروازے پر سے اتارا اور مروڑ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ آئندہ تیس سیکنڈ میں وہ ریسپشن سے گزر رہا تھا۔

جسٹن کی ریسپشنسٹ کزن نے اُلجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ’’سر! کیا آپ چیک آؤٹ کر رہے ہیں؟‘‘

’’نہیں...... میں ذرا اپنی گاڑی تک جارہا ہوں۔‘‘ اس نے فوری بہانہ بنایا۔ ’’میں اپنا سیل فون گاڑی میں بھول آیا تھا۔ وہی لینے جارہا ہوں۔‘‘

’’اوہ...... تب تو ٹھیک ہے۔‘‘ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ’’میں بھی سوچ رہی تھی کہ ہمارے موٹیل کی سروس اتنی بھی بُری نہیں ہے کہ کوئی مسافر ایک رات بھی یہاں نہ گزار سکے۔‘‘

ریسپشنسٹ اس کے بعد بھی کافی کچھ بولتی رہی تھی لیکن ایڈ کے پاس اس کی بکواس سننے کا بالکل وقت نہیں تھا۔ وہ جب پارکنگ لاٹ میں پہنچا تو وہاں سب خیریت تھی۔ اس نے موٹیل کے کمرے کی کھڑکی میں سے جس شخص کو اپنی وین کے پاس کھڑے دیکھا تھا، وہ اب دور و نزدیک کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

’’یہی سنہری موقع ہے یہاں سے فرار ہونے کا۔‘‘ اس نے اپنی گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے خود سے کہا۔ ’’اس سے پہلے کہ وہ ہیٹ پوش دونوں افراد میرے لیے کوئی مشکل کھڑی کردیں، مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔‘‘

وہ اس وقت تک بیک ویو مرر میں دیکھتا رہا جب تک اس کی وین نے آٹھ دس بلاک کا فاصلہ طے نہیں کرلیا۔ خیریت گزری کہ کوئی اس کے تعاقب میں نہیں آیا تھا۔ تھوڑا اور آگے جاکر اُس نے اپنی وین کو ایک اسٹور کے سامنے روک دیا اور جیب میں سے وہ مڑا تڑا پیلا کاغذ نکال کر اسے پڑھنے لگا۔

اس پیلے رنگ کے پیپر پر صرف ایک لائن لکھی ہوئی تھی۔ ’’امید ہے کمرا نمبر فورٹین میں قیام اور ٹی وی کو تم نے خوب انجوائے کیا ہوگا۔‘‘

’’اوہ...... تو جسٹن ریسٹورنٹ سے آف کرنے کے بعد ’’اسٹار لائٹ‘‘ موٹیل تک آیا تھا اور اسی نے یہ نوٹ میرے کمرے کے دروازے پر چپکایا ہے۔‘‘ ایڈ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سوچا۔

وہ دس پندرہ منٹ تک مزید وہاں رُکا رہا پھر مطمئن ہونے کے بعد اس نے اپنی وین کو ہائی وے کی جانب بڑھا دیا۔

☆☆☆

پیر کی صبح، ساڑھے چھ بجے ایڈ وائلڈ کی آنکھ کھل گئی۔ گزشتہ رات اس نے مزید ڈرائیونگ کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ وہ خطرے سے باہر تھا اس لیے نیند لینا ضروری ہوگیا تھا چنانچہ ہائی وے پر چڑھنے سے پہلے ہی اس نے اپنی وین کو ایک پُرسکون مقام پر سڑک کے کنارے گھاس پر روک لیا تھا اور درمیان والی سیٹ پر خوب پھیل کر سو گیا تھا۔

’’اب وہ تروتازہ تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کھڑکی کے باہر نگاہ دوڑائی۔ اس کی ایک جانب سڑک اور دوسری طرف مکئی کے کھیت تھے۔ یہ منظر خاصا دلکش تھا۔

ایڈ نے زادِراہ کے طور پر اپنے ساتھ اچھے خاصے پھل، اسنیکس اور پانی کی بوتلیں رکھ لی تھیں۔ اب اسے ہلکی پھلکی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس نے بیگ کے اندر سے ایک سنگترہ اور ڈرنکنگ واٹر کی دو چھوٹی بوتلیں نکال لیں۔ دو چار چھینٹے آنکھوں پر مار کر اس نے خود کو فریش اَپ کرلیا پھر سنگترہ چھیل کر مزے سے اس کی ایک ایک پھانک کھانے لگا۔

ایڈ کی خوراک ہمیشہ سے کم رہی تھی اور ناشتے میں وہ صرف جوس پر گزارہ کیا کرتا تھا۔ سنگترے کی قاشیں ختم ہوئیں تو اس نے بوتل سے منہ لگا کر لگ بھگ ایک گلاس پانی پیا...... یہ ہوگیا فریش اورنج جوس کا ناشتا!

اورنج کو چھیلتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں چپچپی سی ہوگئی تھیں۔ وہ ہاتھ دھونے کے لیے وین سے باہر نکل آیا۔ پہلے اس نے سنگترے کے چھلکوں کو سمیٹ کر مکئی کے کھیت میں پھینکا پھر بوتل سے پانی گرا کر وہ اپنے ہاتھوں کو

دھونے لگا۔ اپنی انگلیاں صاف کرتے ہوئے اسے پیٹریشیا کی انگلیاں یاد آ گئیں لیکن فوراً ہی اس نے اُدھر سے اپنا دھیان ہٹالیا۔ وہ پیٹریشیا کے بارے میں بالکل نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ اس کی انگلیاں ہوں یا گردن اور یا پھر پورا بدن...... ایڈ کا اب پیٹریشیا کی کسی بھی چیز سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ وہ اسے جانتا تک نہیں تھا اور جان کر کرنا بھی کیا تھا۔ اتنی مشکلوں سے تو اس نے اپنی بیوی سے نجات حاصل کی تھی۔ وہ اُس کے بارے میں سوچ کر اپنی آزادی کا مزہ کرکرا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہاتھ دھوتے ہوئے جو پانی زمین پر گرا، ایڈ نے اپنے جوتے کی ایڑی کی مدد سے وہاں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود ڈالا۔ زمین پہلے سے خاصی نرم تھی اس لیے ایڈ کو اس کام میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ گڑھا اس نے ایک خاص مقصد سے بنایا تھا۔

''مجھے بہت پہلے ہی اِس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرلینا چاہیے تھا۔'' وہ جیب سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''سیل فون کو اپنے پاس رکھنے کا مطلب ہے، کسی شاطر جاسوس کو اپنے گھر میں پناہ دینا۔ اس کی بہ دولت انسان کو آسانی سے ٹریس اور ٹریک کیا جاسکتا ہے۔ وہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ ابھی تک بچا ہوا ہوں۔''

اس نے اپنے سیل فون کو آف کرنے کے بعد اس کی بیٹری بھی الگ کر دی پھر ان تمام پارٹس کی اس ننھے سے گڑھے میں ''تدفین'' کرنے کے بعد وہ واپس اپنی وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوگیا اور ''ایلی نوائے'' کا نقشہ کھول کر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ آگے بڑھنے سے پہلے راستوں کی صحیح صحیح پہچان کرلینا چاہتا تھا۔

وہ اس نقشے کو اسٹیئرنگ پر پھیلائے اس کی اسٹڈی میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے مطلق احساس نہ ہوا کہ پسنجر سیٹ والی کھڑکی کے پاس سے کوئی کھڑا اسے دیکھ رہا ہے لیکن جب وین سے باہر موجود شخص نے ونڈو گلاس پر دستک دی تو وہ چونک اٹھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی نگاہیں جسٹن سے چار ہوئیں۔

''ہاں...... یہ میں ہی ہوں۔'' جسٹن نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم برگر پیلس میں مجھ سے ملے تھے اور میں نے تمہیں اسٹار لائٹ موٹیل کا پتا بتایا تھا۔''

جسٹن کو ایڈ نے پہچان تو لیا تھا تاہم اُس کے تعارفی کلمات ایڈ کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر پائے تھے۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ گرایا اور حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''جسٹن! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں ایک ٹرک سے لفٹ لے کر یہاں تک پہنچا ہوں۔'' جسٹن نے بتایا۔ ''پھر مجھے تمہاری وین نظر آ گئی اور میں اِدھر چلا آیا مگر تم اسے دیکھنے میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ تمہیں میری آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔'' اس نے اسٹیئرنگ پر پھیلے ہوئے نقشے کی جانب اشارہ کیا اور پوچھا۔ ''کیا تم 'ایلی نوائے' جا رہے ہو؟''

اپنی بات کے اختتام پر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

ایڈ نے اس کے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے ابھی اس بارے میں سوچا نہیں ہے۔''

''میں نے ایلی نوائے کے نقشے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا ہے۔'' جسٹن وضاحت پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔ اگر تم مجھے لفٹ دو گے تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔''

''میں اجنبی لوگوں پر بھروسا نہیں کرتا۔''

''ہم اجنبی تو نہیں ہیں۔'' جسٹن اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ''پچھلی رات ہی ہم برگر پیلس میں مل چکے ہیں۔''

''اتنی شناسائی کافی نہیں ہے جسٹن۔'' ایڈ نے رُکھائی سے کہا۔ پھر اسٹیئرنگ کے پہلو میں دیکھنے لگا۔

''تم فیول لیول دکھانے والے میٹر کو اتنے غور سے مت دیکھو۔'' جسٹن نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔'' وہ اپنے بیگ کو ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہوئے بولا۔ ''اگلے گیس اسٹیشن پر جب آپ اپنی گاڑی میں پیٹرول بھرواؤ گے تو میں بھی شیئر کردوں گا اور یہ میرا وعدہ ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں کروں گا۔''

ایڈ متذبذب نظر سے اُسے تکنے لگا۔

''اور ہاں......'' جسٹن نے اپنا کام بنتا دیکھ کر جلدی سے کہا۔ ''مجھے راستوں کی اگرچہ زیادہ پہچان نہیں ہے لیکن میں بہت اچھا ڈرائیور ہوں۔ ایلی نوائے یہاں سے کئی گھنٹوں کے فاصلے پر ہے۔ میں ڈرائیونگ کے حوالے سے تمہیں ریلیف بھی دوں گا۔''

ایڈ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ منزل پر جا کر ٹھہرے گا۔ ایسے میں جسٹن کی پیشکش اسے اچھی لگی۔ اس نے اپنے

اندرونی معاملے کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور سپاٹ آواز میں بولا۔

''ٹھیک ہے، آجاؤ لیکن اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو میں تمہیں کان سے پکڑ کر گاڑی سے باہر نکال دوں گا۔''

''سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

ایڈ نے اس کے لیے پسنجرز سائڈ والا دروازہ کھول دیا۔ جسٹن وین کے اندر آگیا۔ ایڈ نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''تم جا کہاں رہے ہو؟''

''ایلی نوائے خصوصاً شکاگو میں سیٹل ہونا میرا ایک خواب ہے۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ''ویسے میں اوہائیو سے ہوں۔''

''سمجھ سکتا ہوں۔'' ایڈ نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''شکاگو ہے ہی خوابوں کا جزیرہ۔''

''مگر شکاگو آئی لینڈ تو نہیں ہے۔''

''میں نے شکاگو کو محاورتاً جزیرہ کہا ہے۔'' ایڈ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تو تم شکاگو کو خوابوں کا محل سمجھ لو جیسے برگر پیلس......!''

''تم باتیں بہت دلچسپ کرتے ہو۔'' جسٹن نے کہا۔

اب اُن کے درمیان باقاعدہ گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ''تم سے زیادہ دلچسپ نہیں۔'' ایڈ نے گول مول انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تمہاری کیا کہانی ہے؟ پچھلی رات تک تم برگر پیلس میں ڈیوٹی کررہے تھے اور آج ایلی نوائے جارہے ہو؟''

''میں کہیں بھی ٹک کر کام نہیں کرتا۔'' جسٹن نے بتایا۔ ''کبھی کہیں تو کہیں محنت مزدوری کر کے کچھ رقم جمع کر لیتا ہوں اور آگے بڑھ جاتا ہوں۔ بس، یہی میری کہانی ہے۔ میں اسی طرح اوہائیو سے یہاں تک پہنچا ہوں اور میری منزل ایلی نوائے ہے۔''

''اور تمہاری فیملی......؟''

''ہماری تین افراد کی فیملی تھی یعنی ڈیڈ، موم اور میں۔'' وہ بتانے لگا۔ ''ایک سال پہلے ڈیڈ فلو کا شکار ہو کر چل بسے۔ دو ماہ بعد موم نے دوسری شادی کر لی۔ میرا سوتیلا باپ بہت ہی غلیظ اور کج رو شخص ہے۔ وہ مجھے اپنا مفعول بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے موم کو اس بارے میں بتایا تو اسے میری بات کا یقین نہ آیا کیونکہ وہ اس شیطان کے سحر میں جکڑی ہوئی تھیں۔ سو، اپنے سوتیلے باپ کی ہوس کا نشانہ بننے کے بجائے میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''اوہ......'' ایڈ نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ بہرکیف، تمہاری کہانی سن کر مجھے جہاں افسوس ہوا، وہیں اس بات کی خوشی بھی ہے کہ تم نے بروقت ایک درست فیصلہ کیا۔ انسان کو اپنے کردار کی تعمیر میں برسوں لگ جاتے ہیں اور اسی کردار کو بگاڑنے کے لیے ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔''

''تم فلسفیوں کے انداز میں باتیں کرتے ہو۔'' جسٹن نے اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کوئی شاعر، ادیب یا پھر پروفیسر ٹائپ کی چیز ہو سکتے ہو۔''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے جسٹن۔'' ایڈ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کیمسٹری کا ٹیچر ہوں...... مطلب ٹیچر تھا۔ اب تو میں ریٹائر ہو گیا ہوں۔''

''ٹیچر ہو یا کوئی بھی علم بانٹنے والا، وہ کبھی ریٹائر نہیں ہوتا سر......'' جسٹن نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اب بتاؤ، فلسفیانہ باتیں کون کررہا ہے۔'' ایڈ نے تیکھی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں یا تم؟''

''یہ آپ کی کمپنی کا اثر ہے سر۔''

جب سے جسٹن کو یہ پتا چلا تھا کہ ایڈ ایک استاد ہے اور وہ بھی کیمسٹری جیسے مشکل سائنس مضمون کا، جسٹن کے لب و لہجے میں اس کے لیے احترام کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ وہ ایڈ کو ''سر'' کہنے لگا تھا۔

''تمہاری حاضر جوابی مجھے پسند آئی جسٹن۔'' ایڈ نے توصیفی انداز میں کہا۔

''اسی خوشی میں آپ مجھے اپنے بارے میں بتائیں سر......'' جسٹن نے پُراشتیاق انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی کہانی بھی سننا چاہتا ہوں۔''

''میری کہانی بہت بور ہے بچے۔'' ایڈ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

جسٹن ضدی لہجے میں بولا۔ ''میں پھر بھی سننا چاہوں گا۔''

''مجھے چینج چاہیے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔'' ایڈ نے اپنی وین کو سڑک کے کنارے روکتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح تمہاری ڈرائیونگ کا ٹیسٹ بھی ہو جائے گا۔''

''کیوں نہیں، ضرور۔'' جسٹن بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا سر۔''

آئندہ دو منٹ میں انہوں نے اپنی جگہ بدل لی۔ ایک

مرتبہ پھر اُن کا ایلی نوائے کی سمت سفر شروع ہو گیا۔
''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا، میری زندگی کی کہانی میں کچھ خاص نہیں ہے۔'' ایڈ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں نے تمام عمر ہائی اسکول میں بچوں کو کیمسٹری پڑھاتے ہوئے گزار دی اور ابھی حال ہی میں ریٹائر ہوا ہوں۔''
''اور آپ کے بیوی بچے۔'' جسٹن نے پوچھا۔ ''یقیناً آپ نے شادی تو کی ہوگی؟''
''بالکل، میں نے شادی کی تھی۔'' ایڈ نے دلگرفتہ لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''میری بیوی کیل مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ پھر اچانک سب کچھ ختم ہو گیا۔''
''سب کچھ ختم ہو گیا کا کیا مطلب ہوا سر......'' جسٹن نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''کیا کیل آپ کو چھوڑ کر کسی اور کی ہو گئی تھی۔''
''بالکل!'' ایڈ نے اٹل انداز میں کہا۔ ''لیکن جیسا تم سوچ رہے ہو، ویسا ہرگز نہیں۔''
''میں آپ کی ٹریجڈی کو سمجھنا چاہتا ہوں سر۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''پلیز......''
''کیل مجھے چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جاملی تھی۔'' ایڈ نے نمناک آواز میں کہا۔ ''وہ میری زندگی کا بدترین حادثہ تھا۔ کیل پریگنینسی کی ابتدائی منزل پر تھی۔ ہم دونوں والدین بننے والے تھے۔ میں کیل کے لیے میڈیسنز لینے فارمیسی تک گیا تھا۔ کیل گھر میں اکیلی تھی۔ جب میں واپس آیا تو کیل کو خون میں لت پت پایا۔ پڑوسیوں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی اور ایک شخص کو گھر کے اندر سے گن بہ دست نکلتے دیکھا تھا۔ وہ کوئی ڈکیت تھا۔ میرا سب کچھ لوٹ کر لے گیا۔ اس نے مزاحمت کرنے پر کیل کو شوٹ کر دیا تھا۔ کیل کے ساتھ ہی وہ بچہ بھی ختم ہو گیا جسے کچھ عرصے کے بعد اس دنیا میں آنکھ کھولنی تھی۔''
اتنا کہنے کے بعد ایڈ خاموش ہو گیا۔ باقی کچھ بتانے کے لیے بچا ہی کہاں تھا۔ اس کے باوجود بھی جسٹن نے ایک سوال ضرور کیا۔
''اس حادثے کے بعد آپ نے دوبارہ شادی کرنے کے بارے میں نہیں سوچا؟''
''ہرگز نہیں۔'' ایڈ نے بڑے اعتماد سے غلط بیانی کی۔ ''میرے لیے کیل کی یادیں ہی کافی ہیں۔''
جسٹن خاموش ہو گیا اور ایڈ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی کہانی سناتے ہوئے ایڈوائلڈ نے بھولے سے بھی ایک بار پیٹریشیا کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اُسے اپنی دنیا سے ہمیشہ کے لیے نکال چکا تھا لہٰذا وہ اس کی ہر یاد کو بھی حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتا تھا، سوائے ایک منظر کے...... وہ پیٹریشیا سے اس کی آخری ملاقات کا منظر تھا۔
گھر سے روانہ ہونے سے قبل پیٹریشیا نے اُسے ایک بے ہودہ کام بتا دیا تھا۔ وہ خرگوشوں والے کنگ سائز پنجرے کو لیونگ روم کے فرش کے وسط سے ہٹوا کر ایک دیوار کے ساتھ لگوانا چاہتی تھی اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ اس پنجرے میں لکڑی کم اور لوہے و شیشے کا بہت زیادہ استعمال ہوا تھا۔ جس نے اسے حد درجہ وزنی بنا دیا تھا۔ اس پر مستزاد اس کا سائز...... وہ چھ ضرب چھ فٹ کا ایک مربع پنجرہ تھا اور کمرے کے فرش کا ایک چوبی تختہ بھی اپنی جگہ سے کوئی انچ بھر اوپر اٹھا ہوا تھا جس کی وجہ سے اسے کھسکانے اور گھسیٹنے میں بہت مشکل پیش آ رہی تھی۔ ایڈ فرش پر بیٹھ کر اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ پنجرے کی دوسری جانب پیٹریشیا بھی چوبی فرش پر بیٹھی اسے ہدایات دے رہی تھی۔ اس کی باتوں میں مشورہ کم اور ڈانٹ پھٹکار زیادہ تھی۔ بس، پھر ایڈ کا دماغ خراب ہو گیا۔ پتا نہیں، کہاں سے اس کے وجود میں ہرکولیس جیسی طاقت آ گئی اور اس نے پنجرے کو کھسکانے کے بجائے جسم و جان کی ساری قوت استعمال کر کے اس دیوزاد پنجرے کو پیٹریشیا پر الٹ دیا تھا۔ پیٹریشیا کے حلق سے ایک معمولی سی ''اوں'' تک خارج نہیں ہوئی تھی۔ اس کا پورا بدن اس قاتل پنجرے کے نیچے دب کر گویا چٹنی بن گیا تھا۔ بس، اس کے ایک ہاتھ کی انگلیاں پنجرے کے نیچے سے جھانک رہی تھیں اور بہ زبانِ خاموشی ایڈ سے کہہ رہی تھیں۔
''آج سے تم آزاد ہو ایڈ وائلڈ۔ جاؤ، اپنی دائمی آزادی کا جشن مناؤ۔''
''ہم کہاں تک پہنچے؟'' ایڈ نے یکایک آنکھیں کھول کر جسٹن سے پوچھا پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔
''سر! مجھے صحیح اندازہ نہیں ہے۔'' جسٹن نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''بس، میں ایلی نوائے جانا چاہتا ہوں اسی لیے آگے بڑھ رہا ہوں۔ آپ کو میری ڈرائیونگ کیسی لگی؟''
''ونڈرفل...... تم کمال کے انسان ہو۔ بس، اسی طرح آگے بڑھتے رہو۔'' ایڈ دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''بعض اوقات بنا سوچے سمجھے بے سمت سفر ہی انسان کی منزل کا تعین کرتا ہے۔''
جسٹن حیرت بھری نظر سے اُسے دیکھنے لگا۔

❖❖❖

سلمان سلیم

مخبر

اے۔آر۔راجپوت

انسان کو اپنے کردار کی تعمیر میں برسوں لگ جاتے ہیں... اور اسی کردار کو بگاڑنے کے لیے ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے... اسی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں کا حال ہے... ان کی معمولی سی کوتاہی اور غیر ذمّے داری پورے محکمے کو بدنام کر دیتی ہے... آلاتِ جراحی کے ذریعے لوگوں کی زندگی بدلنے والے ڈاکٹر کی اچانک موت کا سنسنی خیز احوال...

اپنی بھرپور توانائی صرف کر دینے والے وفا پیشہ کی جانفشانی......

ڈاکٹر مسعود سہیل کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ جہاں اِس خبر سے سنسنی پھیلی تھی وہاں انتہائی تاسف کا بھی اظہار کیا جا رہا تھا۔ وہ شہر کا ہی نہیں بلکہ ملک کا بھی ماہر کاسمیٹک سرجن تھا۔

وہ ”لپوسکشن“ (Liposuction) کا ماہر تھا۔

موٹے اور فربہ انداز مرد خواتین جو اپنے جسم کی زائد چربی کم کرنے میں ناکام رہتے تھے، وہ اسی ڈاکٹر سے رابطہ کرتے تھے۔ وہ اُن کا کامیاب آپریشن کر کے اُن کے جسم کی زائد

چربی بذریعہ آلاتِ جراحی ..... کاٹ کر انہیں سلم اور اسمارٹ بنادیا کرتا تھا۔

عموماً لیپوسکشن صرف انہی افراد کا کیا جاتا ہے جن پر بہت زیادہ چربی کی تہ در تہ چڑھ چکی ہو، یا پھر وہ لوگ جو صرف اپنے جسم کے کسی ایک مخصوص حصے کی چربی گھٹانا چاہتے ہوں، مثلاً پیٹ، کولھے، یا بازو وغیرہ۔

یہ وہ افراد تھے جنہوں نے ورزش اور دیگر ٹوٹکوں کو آزمایا تھا مگر نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلا تھا۔ کئی موٹے، بے ڈول اور تھلیلے کی طرح تھل تھل کرتے لوگ اس کی ''دستکاری'' سے حیرت انگیز طور پر اسمارٹ اور سلم ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر مسعود سہیل عام سرجن کی طرح ایک دن میں دو دو تین تین آپریشن کرنے کے قائل نہیں تھے، یوں بھی اس کے اتنے کیس ہوتے بھی نہیں تھے۔ تاہم پھر بھی وہ ہفتے میں صرف ایک ہی آپریشن کرتے تھے۔

اب ایسے مسیحا کا قتل ہو جانا اور وہ بھی پُراسرار طریقے سے کہ قاتل کا بھی پولیس کو کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا تو شہر بھر میں افسوس کے ساتھ سنسنی کی لہر کا بھی پھیل جانا کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں تھی۔

ڈاکٹر مسعود سہیل کا سلم اینڈ ہیلتھ کلینک آبادی سے دور مضافات میں واقع تھا۔ یہ ایک پُرفضا مقام ہل ٹاپ پارک کے نام سے موسوم تھا۔ لوگ یہاں سیر و تفریح کے لیے بھی آیا کرتے تھے۔ اس علاقے کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے جنوب مغرب میں ساحلِ سمندر بھی تھا۔

اس پُرفضا اور پوش علاقے میں وہی لوگ رہائش پذیر تھے جن کے پاس بے بہا دولت تھی۔ کیونکہ یہ ایک مہنگا ترین علاقہ تھا۔ عام آدمی یہاں گھومنے اور سیر و تفریح کے لیے تو آسکتا تھا مگر یہاں زمین خریدنا ... ان کی دسترس سے باہر تھا۔

سلم اینڈ ہیلتھ کلینک بھی ایک اونچی پہاڑی کی سطحِ مرتفع پر بنا ہوا تھا، جہاں تک بل کھاتا راستہ اوپر تک جاتا تھا، اس کے متوازی سنگل بیلٹ ایک سڑک بھی تھی۔

انسپکٹر رشید شاہ اس کیس کی تفتیش کر رہا تھا مگر اسے ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اخبارات میں متعلقہ تھانے کے عملے اور پولیس پر زبردست تنقید ہو رہی تھی۔

انسپکٹر رشید کے لیے یہ کیس ایک چیلنج بن چکا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے طور پر ہر قسم کی تفتیش اور ضابطے کی کارروائی مکمل کر چکا تھا مگر اس کے ہاتھ کوئی کلیو نہیں لگ سکا تھا۔

اس کی ناکامی کو کئی دن بیت چکے تھے اور کیس قریب قریب داخلِ دفتر ہی کیا جانے والا تھا کہ ایک دن اچانک...... رشید کے علم میں آیا کہ مقتول سرجن مسعود کے کلینک کی باگ ڈور اب اس کے سینئر اسسٹنٹ ڈاکٹر جمیل نے سنبھال لی ہے۔

نجانے کیا بات تھی کہ رشید کے اندر کوئی نامعلوم سی کھٹک اُسے بے چین کرنے لگی۔ اس نے ہونٹ سکیڑ کر کچھ سوچا اور پھر اپنے ایک ماتحت اسلم کو ساتھ لے کر ہل ٹاپ پارک کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اسلم ایک بائیس تیئس سالہ نوجوان تھا۔ پولیس میں سرکاری طور پر بھرتی ہونے سے قبل وہ پولیس کا مخبر تھا۔ پھر ایک سینئر آفیسر کی سفارش پر کانسٹیبل بھرتی ہو گیا۔

رشید کو ابھی تک اسلم کو ''آزمانے'' کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس کی خواہش تھی کہ وہ اسے آزمائے یا ایسا کوئی موقع ملے۔ وجہ یہ تھی رشید کو وہ پرلے درجے کا احمق ہی نظر آتا تھا۔ آج تک اس نے اس مسعود مرڈر کیس کے سلسلے میں کوئی پتے کی بات نہیں کہی تھی۔

ویسے دیکھا جاتا تو کوئی کلیو تو خود انسپکٹر رشید کو بھی نہیں ملا تھا۔ بہرکیف...... وہ اسلم کو ساتھ رکھنے پر مجبور تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا اور آسمان پر بادل کے سفید ٹکڑے تیرتے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ ہلکی سبک خرام ہوا چل رہی تھی۔ قریب سمندر تھا۔ وہاں آبی پرندوں کی اُڑانیں اچھا منظر پیش کر رہی تھیں۔

پولیس کو دی گئی نئے ماڈل کی مہران کار میں وہ اسلم کے ساتھ کلینک تک پہنچا۔ کار اسلم ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔

کلینک پہنچ کر اُسے عجیب سی خاموشی اور سناٹے کا احساس ہوا۔ وجہ سمجھ میں تو آتی تھی کہ کلینک کا اصل ''مالک'' اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

دیکھنا یہ تھا کہ اس کا سینئر اسسٹنٹ جو خود بھی سرجن ڈاکٹر تھا، اسے کس طرح ہینڈل کرتا ہے کہ پرانی رونق بحال ہو جائے۔

اس وقت بھی کچھ مریض لاؤنج میں نظر آ رہے تھے۔ عملہ بھی جوں کا توں موجود تھا۔ باہر وسیع احاطے میں کلینک پر آئے ہوئے لوگوں کی کچھ گاڑیاں بھی کھڑی نظر آ رہی تھیں۔

اس نے ڈاکٹر جمیل سے فون پر وقت لینا مناسب نہیں جانا تھا۔ دھڑلے سے وہاں جا پہنچا تو اس کی اسمارٹ سی سیکریٹری نے بتایا کہ وہ ایک مریض دیکھ رہے ہیں، میں مطلع کر دیتی ہوں۔ وہ آپ کو اندر بلا لیں گے۔

رشید انتظارگاہ میں بیٹھ گیا۔ اندر سے مریض نکلا اور

سیکریٹری نے انہیں اندر جانے کا اشارہ دے دیا۔ وہ یقیناً انٹرکام پر ڈاکٹر جمیل کو دو پولیس والوں کی آمد کا بتا چکی تھی۔

رشید کے اندازے کے مطابق اس نئے ڈاکٹر کی عمر بہ مشکل تیس پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک خوش شکل اور وجیہہ انسان تھا۔ تاہم اس کے چہرے پر اسے دیکھ جو تاثر لمحے بھر کو اُبھرا تھا، رشید کی بھانپتی ہوئی آنکھوں سے وہ اوجھل نہیں تھا۔

وہ بڑے پُرتپاک انداز میں ملا اور بھرپور تعاون پر آمادگی بھی ظاہر کر ڈالی۔ اس کے رویّے سے کسی قسم کی بیزاری یا ''کلینک ٹائمنگ'' میں پولیس کی مداخلت سے ناگواری ہرگز مترشح نہ ہوتی تھی۔

''میں معذرت خواہ ہوں ڈاکٹر صاحب!'' رشید نے ہولے سے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ ''کلینک ٹائمنگ میں مخل ہوا ہوں لیکن ہمارا کام ہی ایسا ہے، مجبوری تھی۔''

''کوئی بات نہیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں.....؟'' ڈاکٹر جمیل نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''صرف چند سوالات۔ آپ مقتول ڈاکٹر مسعود کے ہاں کتنے عرصے سے کام کر رہے تھے؟''

''تقریباً پانچ سال سے.....''

''یہ ملکیت کس کی ہے؟''

''ایک چیریٹی ادارے ''ہیلتھ'' کی ہے۔''

''اوہ، یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف ہے۔'' انسپکٹر رشید قدرے چونکتے ہوئے بولا۔ حالانکہ یہ بات اسے پہلے ہی پتا تھی۔ وہ آگے مستفسر ہوا۔

''ان کا کوئی ایڈمن یا منتظمِ اعلیٰ ہوگا جو ڈاکٹر مسعود سے رابطے میں رہتا ہو۔ ظاہر ہے اب وہ آپ کے رابطے میں ہوں گے؟''

''یقیناً۔ مسٹر ذیشان، مذکورہ ادارے کی طرف سے ہمارے مستقل رابطے میں ہیں اور انہی کی اجازت/سفارش سے اب میں اس کلینک کو چلاؤں گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' رشید نے پہلو بدلا۔ ''مجھے اس ادارے کا تفصیلی پتا اور مسٹر ذیشان کا ڈائریکٹ نمبر مل جائے گا؟''

''ضرور.....'' کہتے ہوئے ڈاکٹر جمیل نے اسے پتا اور نمبرز نوٹ کرا دیے۔ تھوڑی دیر تک رشید نے چند اور سوالات کیے اس کے بعد وہ ڈاکٹر جمیل کا شکریہ ادا کر کے اپنے ماتحت اسلم کے ساتھ وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

ان کے جانے کے ذرا ہی دیر بعد دُبلی پتلی سیکریٹری اندر داخل ہوئی۔ وہ کچھ متفکر سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دروازہ اچھی طرح بند کیا۔ جمیل کو اس نے گہری سوچ میں مستغرق پایا۔

''ڈاکٹر! کیا کوئی گڑبڑ ہے؟'' سیکریٹری جس کا نام مس ندا تھا۔ جمیل سے بولی۔

''فی الحال تو ایسی کوئی بات نہیں مگر لگتا کچھ ایسا ہی ہے کہ کچھ نیا سامنے آیا ہے۔'' ڈاکٹر جمیل نے گومگو سے انداز میں کہا۔

''کچھ تو ظاہر کیا ہوگا اس پولیس آفیسر نے؟'' مس ندا بولی۔

''نہیں.....'' ڈاکٹر جمیل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن یہ بہت چالاک اور ہوشیار لگتا ہے۔ حالانکہ یہ آفیسر پوری تفتیش پہلے ہی کر چکا ہے اور مایوس ہو گیا تھا لیکن شاید.....''

''اسے آپ پر کسی قسم کا شبہ ہوا ہو؟'' ندا نے درمیان میں کہا۔

''لامحالہ کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس کلینک کی باگ ڈور میں نے جو سنبھال لی ہے۔'' ڈاکٹر جمیل معنی خیز مسکراہٹ سے بولا مگر مس ندا کی تشویش کم نہ ہوئی تھی۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔

''لیکن سر! آپ پر شبہ کرنے کی اس کے پاس اگر کوئی ٹھوس وجہ ہوئی تو.....'' اس نے پُرتشویش انداز میں دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' ڈاکٹر جمیل کو محتاط ہونا پڑا۔ وہ ندا کی ذہنی فراست سے واقف تھا۔

''سر! اس کے ساتھ جو بظاہر مجہول سا ماتحت تھا، اسلم..... میں اُسے جانتی ہوں۔ یہ پہلے پولیس کا مخبر رہ چکا ہے۔ اب شاید باقاعدہ بھرتی کر لیا گیا ہے۔''

''کوئی خاص بات؟''

''خاص تو نہیں مگر محتاط رہنا چاہیے ہمیں۔ اسلم پولیس کا بڑا چالاک مخبر ہے۔ ڈاکٹر مسعود کے دور میں اسی نے گڑبڑ پھیلائی تھی اور پہلے والے آفیسر کو ہمارے پیچھے لگایا تھا۔''

''تم اسلم سے محتاط رہو۔''

''میں نے ماجد کو اس کے پیچھے لگا دیا ہے۔ ضرور اس نے کوئی بات نوٹ کی ہے۔ ماجد رپورٹ کر دے گا آج رات تک۔''

''گڈ۔''

''مریض بھیجوں سر؟''

''میں بیل دیتا ہوں، پہلے امجد سے بات کر لوں۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔ ندا اٹھ کر چلی گئی۔

تھوڑی دیر تک ڈاکٹر جمیل کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد اپنے سیل پر امجد سے رابطہ کرنے ہی والا تھا کہ بیل گنگنا اُٹھی۔ اسی کی کال آرہی تھی۔

''میں آچکا ہوں، پارکنگ میں ہوں۔ فارغ ہو یا پھر ریسٹ روم کا رخ کروں میں......؟'' دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

''تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔ فوراً آجاؤ۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس کے چیمبر میں ایک چھوٹی جسامت کا درمیانی عمر والا شخص بیٹھا تھا۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ بظاہر وہ عام سا ہی آدمی نظر آتا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر اس کی آنکھوں سے ہی نہیں چہرے سے بھی وحشت پھوٹتی محسوس ہوئی۔

''نجانے کیوں پولیس تم پر شبہ کرنے لگی ہے۔'' امجد نامی آدمی نے ڈاکٹر جمیل سے کہا، جو پہلے ہی ندا کی بات پر متفکر تھا۔

''کیسا شبہ؟'' وہ بولا۔

''اس کا کھوج لگانا تمہارا کام ہے، میرا کام اطلاع دینا۔ پولیس بہت جلد اپنے کسی مخبر کو مریض کے روپ میں یہاں بھیجنے والی ہے۔''

''کک......کہیں پولیس کو واقعی مجھ پر شبہ تو نہیں ہو گیا کہ میں نے ہی ڈاکٹر مسعود کو قتل......''

''شش......شش......'' امجد نے اسے ٹوک دیا۔ ''محتاط رہ کر بات کیا کرو ڈاکٹر، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''اوہ......'' ڈاکٹر جمیل ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''دراصل پولیس کو شروع سے ہی اس کلینک کی آڑ میں ہونے والے کاروبار کی بھنک پڑ چکی تھی، پچھلے پولیس آفیسر نے تو اپنے جاسوس بھی پھیلا دیے تھے، اسی لیے اسے حادثاتی رنگ دے کر چھٹکارا پالیا گیا۔ اب وہی کھیل دوبارہ کھیلا جانے والا ہے۔ تاہم اس بار ترپ کا پتا کلی طور پر ہمارے ہاتھوں میں ہے، اسی لیے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''پولیس کا مخبر، مریض کی شکل میں کب تک یہاں کا رخ کرے گا؟'' ڈاکٹر جمیل نے پوچھا۔

''کسی وقت بھی متوقع ہے۔''

''اوکے! کوئی اور بات؟''

''جو شپمنٹ ڈاکٹر مسعود کی ہلاکت کے بعد روک دی گئی تھی، وہ پہنچ رہی ہے۔''

''کیا؟ ان حالات میں؟ تھوڑا ٹھہر تو جاتے؟'' ڈاکٹر جمیل نے فکرمندی سے کہا۔

''ہم تو ٹھہر جائیں، مگر اُوپر والے نہیں ٹھہرتے۔'' امجد سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''وہ تمہیں وصول کرنا ہی پڑے گی۔ کل رات پہنچ رہی ہے۔''

''ابھی نہیں۔'' ڈاکٹر جمیل بولا۔ ''فی الحال ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ میں خود مسٹر حماد کو فون کر کے کہہ دوں گا کہ وہ کل کا پروگرام ملتوی کر دیں۔''

''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کرو گے۔'' امجد کی دھیمی آواز میں غراہٹ کا عنصر شامل تھا۔

''جذباتی بننے کی کوشش نہ کرو، امجد! ذرا سوچو، اس وقت پولیس ہمارے پیچھے لگ چکی ہے۔ بقول تمہارے اُن کا ایک مخبر مریض کے روپ میں پہنچنے والا ہے۔ پھر ہمیں معلوم بھی نہیں کہ وہ کون ہے؟ اسے ٹریس کرنے میں وقت لگے گا۔ ایسی صورت میں ہم کس طرح اتنا بڑا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ کیپٹن تو مجھے زبیر بھی دیتا تھا مگر وہ ہمیشہ میری پوزیشن کا خیال رکھتا تھا۔''

''تمہاری پوزیشن کے علاوہ کاروبار کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ یہاں کے معاملات تمہارا دردِ سر ہے۔''

''اس وقت بہترین تعاون یہ ہے کہ میں حماد کو یہاں آنے سے منع کر دوں اور یہ کام میں ابھی کر رہا ہوں۔'' کہتے ہوئے ڈاکٹر جمیل نے اپنے سیل فون کی جانب ہاتھ بڑھایا، جو اس کے سامنے میز پر ہی رکھا تھا۔

''شپمنٹ کی واپسی یا التوا کی صورت میں ہمارا کروڑوں کا نقصان ہوگا۔'' امجد نے کہا اور یکلخت اپنی جیب سے بے آواز پستول نکالا اور کچھ کہے بغیر ڈاکٹر جمیل کی کنپٹی کا نشانہ لے کر دو فائر کر دیے۔ سائیلنسر کی وجہ سے بڑی معمولی آواز پیدا ہوئی تھی۔ زیادہ خون بھی نہیں نکلا تھا۔

امجد نے جلدی سے دروازہ بولٹ کیا۔ پھر ڈاکٹر جمیل کی لاش کو کونے میں رکھی ہوئی بڑی سی الماری میں بند کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ملحقہ کمرے کا دروازہ کھول کے ریسٹ روم میں آگیا۔ یہ خالی تھا۔ یہاں ایک ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ اس نے ماؤتھ پیس کے اُوپر رومال لپیٹ کر ڈاکٹر جمیل کی نقل کرتے ہوئے کسی سے کہا۔

''میں ڈاکٹر جمیل بول رہا ہوں۔ میں ایک فوری کام

سامنے لے آیا۔ اس وقت عمارت کے اندر باہر مکمل سناٹا تھا۔
اس نے حفظِ ماتقدم کے تحت کار کی لائٹس روشن نہیں کی تھیں۔ کار دروازے کے سامنے کھڑی کرنے کے بعد وہ اندر گیا اور ڈاکٹر جمیل کی لاش اُٹھا کر لے آیا۔ اُس کی نظریں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن آس پاس کسی ذی روح کا نشان نہیں تھا۔
چند لمحوں کے بعد اس کی کار قصبے کی طرف جانے والے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے کار کو کچے راستے پر موڑ دیا۔ چند سو گز کے فاصلے پر گھنے درختوں کے درمیان پتھروں کی ایک شکستہ اور غیر مستعمل عمارت بنی ہوئی تھی۔
وہاں کسی زمانے میں شکاری پارٹیاں قیام کرتی تھیں لیکن جب سے یہاں شکار پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، شکاریوں نے یہاں آنا چھوڑ دیا تھا۔
امجد نے کار عمارت کی اوٹ میں کھڑی کر دی۔ ڈاکٹر جمیل کی لاش کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا اور اپنی اُنگلیوں کے نشانات صاف کرنے کے بعد وہاں سے پیدل قصبے کی طرف روانہ ہو گیا، جو وہاں سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔
قصبے پہنچ کر سب سے پہلے جس شخص پر اس کی نظر پڑی وہ کلینک کی کوسٹر کا ڈرائیور جمشید تھا، جو قریب واقع ریلوے اسٹیشن کے باہر اپنی اسٹیشن ویگن کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ کلینک میں داخل شدہ مریضوں کو سیر کرانے یا کسی ورزشی پروگرام کے لیے روزانہ صبح اور شام میں گھاس کے ایک بڑے میدان کی طرف لے جایا کرتا تھا۔ نیز ٹرین سے کسی کلائنٹ کی آمد متوقع ہوتی تو وہ اسے ''پک'' بھی کرتا تھا۔
''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' امجد نے اس کے قریب جا کر کہا۔
جمشید ہاتھ میں پکڑے ہوئے سگریٹ کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ ''سگریٹ پی رہا ہوں اور اس وقت تم کہاں؟ غالباً میں نے تمہیں ڈاکٹر امجد کے کلینک میں دیکھا تھا۔''
''تم نے بالکل ٹھیک دیکھا تھا۔ ظاہر ہے میں وہاں داخل ہوں۔ بولو، چلو گے ڈاکٹر جمیل کے کلینک؟''
''کیوں نہیں، مزدوری ملے گی تو ضرور چلوں گا۔'' جمشید نے کہا۔ ''کرایہ چارج کرنا ہوگا، کیونکہ یہ آؤٹ آف روٹین ہے۔''
''کوئی بات نہیں، چلو چلیں۔''

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راستے میں جمشید نے پوچھا۔ ''کیا تم پیدل آئے تھے؟''
''آں...... ہاں۔'' امجد نے سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔ اس کے لہجے میں بے پروائی تھی۔
''رات کے کھانے کے بعد چند میل چہل قدمی ضرور کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آج میں کچھ زیادہ ہی دور نکل آیا تھا۔ واپسی مشکل معلوم ہو رہی تھی۔ تمہاری گاڑی دیکھ کر میں نے سوچا کیوں نا تھوڑی سی عیاشی کر لی جائے۔''
دس منٹ کے اندر جمشید نے اسے کلینک کے سامنے اُتار دیا اور کرایہ لینے کے بعد بولا۔ ''آئندہ چہل قدمی کے لیے کچا راستہ نہیں اختیار کرنا۔'' اس کی نظریں امجد کے جوتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ''تمہارے جوتوں کی گرد نے گاڑی گندی کر دی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے سروس کرائی تھی۔''
امجد نے جوتوں کی طرف دیکھا۔ ان پر خاصی گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ جمشید کی بات سن کر جواب دیے بغیر اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے سے پہلے جنگل میں دوڑ کے دوران اس کی ملاقات منیر سے ہو گئی۔ حسبِ معمول منیر نے دوسرے ہیلتھ سینٹروں کا ذکر چھیڑ دیا۔ لُبِ لباب موازنے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ امجد کا ان سے باتیں کرنا ضروری ہوتا۔
وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔ اسے کسی نئے مریض پر کڑی نظر رکھنا تھی، جیسا کہ تنظیم کے جاسوس نے مطلع کیا تھا کہ پولیس کا کوئی مخبر عن قریب مریض کے بھیس میں کلینک کے پُراسرار معاملے کی کھوج کرنا چاہتا ہے۔
شام کو اس نے حماد کو فون کیا۔
''اچھا ہوا تم نے فون کر لیا۔'' دوسری جانب سے حماد چھوٹتے ہی بولا۔ ''پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی ہے۔ میں کل رات آ رہا ہوں۔''
''اوہ...... اچھا اچھا۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ ڈاکٹر جمیل کو اچانک جانا پڑ گیا ہے۔ غالباً دو تین روز بعد واپس آئے گا۔''
''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رقم تیار ہے؟''
''اس معاملے میں فکر کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔''
''بہت خوب، تو پھر کل ملاقات ہو گی۔ شمال میں بڑی چٹان کے قریب......''
امجد نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز ناشتے کے بعد حسبِ پروگرام سب لوگ لیکچر ہال میں جمع تھے۔ جہاں ٹیم کا ایک اور ڈاکٹر جواد دماغی صحت کے موضوع پر لیکچر دے رہا تھا۔ امجد نے دیکھا کہ چند مریض نہیں تھے، جن سے وہ گپ شپ لگانا اور راہ و رسم بڑھانا ضروری سمجھتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ سب جنگل کی سیر اور تالاب میں ڈبکی لگانے گئے ہوئے ہیں۔

وہ لیکچر کی طرف متوجہ ہوگیا، حالانکہ اس کے ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا۔ ابھی تک اطلاع کے مطابق کوئی نیا مریض (پولیس مخبر) نہیں آیا تھا۔ امجد نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ وہ بہت سفاک آدمی تھا۔ جو اس کا بزنس تھا' اس میں ایک ذرا سی بھی تاخیر یا رسک لینے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی سبب اس نے پہلے ڈاکٹر جمیل کو ساتھ ملایا پھر اسے تنظیم والوں نے یہاں نوکری دلوائی، سینئر ڈاکٹر مسعود حائل ہونے لگا تو ڈاکٹر جمیل کے ذریعے ہی اسے ادویات کے ذریعے غلط ڈوز دے کر پُراسرار طریقے سے مروا دیا۔ اس کے بعد جمیل خود بھی امجد کے ہاتھوں نہ بچ سکا۔

لیکچر کے بعد امجد استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بھاگا۔ اس کی توقع کے عین مطابق دو نئے مریض داخل ہوئے تھے۔ ایک کا نام شوکت تھا، دوسری کوئی خاتون تھیں۔

خاتون تو مخبر نہیں ہوسکتی تھی پولیس کی۔ اس نے سوچا۔ شوکت پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

وہ محتاط ہوگیا اور تنظیم کے سربراہ کو مطلع کر دیا کہ اس نے پولیس کے متوقع جاسوس کو ٹریس کرلیا ہے۔ مگر بے فکر رہا جائے اس کے وہاں ہوتے ہوئے کام میں مداخلت نہ ہوگی، باقی لوگ بھی عملے کے بھیس میں اپنا ''کام'' صحیح طور پر بجا لا رہے ہیں وغیرہ۔

امجد نے اب شوکت سے راہ و رسم رکھنے کا پلان بنالیا۔ باقی تین، چار افراد (مریضوں) کو اس نے اپنی شک کی لسٹ سے خارج کر دیا تھا۔

شوکت اب اس کا مین ٹارگٹ تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ وقت ضائع نہیں کرے گا۔ شک کے یقین میں بدلتے ہی وہ اسے ہلاک کر ڈالے گا۔ تنظیم کی طرف سے اب یہاں سے ''معاملات'' لپیٹنے کا حکم مل چکا تھا، کیونکہ اب یہ سب کچھ پولیس کی نظروں میں آچکا تھا۔ اب دوسرا ٹھکانا بنانے کا گرین سگنل امجد کو مل چکا تھا۔ امجد منشیات اور جعلی ادویات بنانے کی ایک خفیہ جرائم پیشہ تنظیم کا اہم مہرہ تھا۔ اپنے گھناؤنے کاروبار کے لیے یہ لوگ ہمیشہ ایسے پروفیشنز کو استعمال کرتے تھے جو لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے متعلق یہاں کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا تھا اور ڈاکٹر مسعود کے دور میں یہ ہوتا رہا۔

اگرچہ ڈاکٹر مسعود کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا مگر اس کے اسسٹنٹ کو لالچ دے کر ملا لیا گیا تھا، مگر جیسے ہی وہ ڈرنے اور ٹوکنے لگا تو اس کا خاتمہ کرنا ضروری ہوگیا۔

بہرکیف...... امجد نے پستول لوڈ کیا اور شوکت کی تاک میں رہنے لگا۔ ایک دن وہ شوکت سے تالاب میں نہانے کے دوران ملا۔ اس نے چالاکی سے ہائے، ہیلو کرتے ہوئے شوکت سے بات چیت شروع کر ڈالی۔ دونوں کے درمیان کچھ ہی رسمی گفتگو ہو پائی اور اس کے بعد شوکت دوسری طرف چلا گیا۔ امجد سوچتا رہ گیا، ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

تاہم اس نے اپنی طرف سے شوکت کو مین ٹارگٹ قرار دے دیا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ دن میں ایک بار اپنی کار ضرور چیک کرلیا کرتا تھا۔ وہ عمارت کی عقبی سمت آگیا۔

اس نے دیکھا کہ کار کا پچھلا حصہ جھکا ہوا ہے۔ قریب پہنچنے پر عقدہ کھلا کہ کسی نے کار کے دونوں پچھلے ٹائر پنکچر کر ڈالے تھے۔ اس کے اندر شبہ یقین میں بدلنے لگا۔

''ہم...... گویا پولیس کے اس مخبر نے آتے ہی اس کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے مجھ پر بھی شبہ ہو چکا ہے۔'' وہ نیچی آواز میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے کمرے کی کھڑکی سے گاڑی پر نظر ڈالی تھی۔ اس وقت دونوں ٹائر سلامت تھے۔

یہ اُس کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی کہ اس پر شبہ کیا جا چکا ہے۔ یا پھر کار پر...... بھلا ایک مریض کا اپنی کار یہاں رکھنے کا کیا مقصد؟ اسی شے نے پولیس اور مخبر کو کھٹکا دیا ہوگا۔

وہ ہونٹ بھینچ کر اپنے قیاسات قائم کرنے لگا۔ امجد اب اس نازک صورت حال پر غور کرنے لگا۔ مخبر شوکت، اس سے زیادہ ہوشیار اور چابک دست ثابت ہوا تھا، وہ اس کے راہِ فرار پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ تب اسے ڈاکٹر جمیل کی بات یاد آنے لگی۔ اس نے یہی کہا تھا کہ پولیس کو یقین کی حد تک اس پر شبہ ہو چکا ہے۔

وہ سوچتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے پولیس کا نادیدہ گھیرا اس کے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے شوکت کو اب ختم کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔

اسے اس بات کی بھی فکر تھی کہ...... حماد ہیروئن لے کر پہنچنے والا تھا۔ امجد راتوں رات وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ پولیس کے جاسوس (شوکت) کی موجودگی میں وہ اب ہیروئن کی کھیپ اپنے کمرے میں رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

اچانک ہی اُس کے ذہن رسا میں ایک خیال کلک ہوا۔ وہ واپسی کے لیے جمشید کی خدمات حاصل کر سکتا تھا، وہ ایک لالچی ڈرائیور تھا کلینک کا۔

لہٰذا اس نے کمرے میں جا کر جمشید کو فون کیا مگر اس نے اٹینڈ نہیں کیا۔ اس نے کلینک کے ڈرگ اسٹور کا نمبر پنچ کیا۔ وہاں اسٹور انچارج رافع نے اسے بتایا کہ جمشید دوائیں لینے کے لیے...... گیا ہوا ہے بعد دوپہر ہی آسکتا ہے۔

☆☆☆

لنچ پر اُس کے سابقہ مشکوک تین ساتھی مریض موجود تھے۔ وہ خوب ڈٹ کر کھانا کھا رہے تھے۔

"پتا نہیں یہ ڈاکٹر جمیل کہاں چلا گیا ہے؟" ایک بولا۔

"ہاں، دو روز سے نظر ہی نہیں آیا۔" دوسرے نے کہا۔

"میں نے سنا ہے چند روز کے لیے کہیں باہر چلا گیا ہے۔" تیسرا بولا۔

امجد نے دُزدیدہ نظروں سے اُن کی جانب دیکھا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے کھانے میں مصروف رہا۔ لنچ کے بعد امجد نے دوبارہ جمشید کو فون کیا۔

"ہیلو، جمشید! کیا حال ہے؟" امجد نے دوستانہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا اور آگے بولا۔ "میں امجد ہوں۔ مجھے پہچانتے ہو نا؟"

"تم وہی ہو نا، جو پرسوں رات میری گاڑی میں کلینک تک گئے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک پہچانا۔ آج رات پھر تمہاری گاڑی کی ضرورت ہے۔"

"سواری مل جائے گی۔ لیکن تمہیں ہمیشہ رات کے وقت ہی گاڑی کی کیوں ضرورت پیش آتی ہے؟"

"اتفاق کی بات ہے۔ اچھا سنو، تم رات ٹھیک ایک بجے سڑک کے کنارے لگے ہوئے سائن بورڈ کے پاس میرا انتظار کرنا۔ ہارن نہیں بجانا۔ خواہ مخواہ لوگوں کی نیند خراب ہو گی۔ میں خود ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا، اگر چند منٹ کی دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں ہے۔"

"جمشید کبھی نہیں گھبراتا۔ مگر ریٹ......"

"ڈبل ہی دوں گا۔" اس نے جیسے جمشید کا جملہ مکمل کر دیا۔

پھر رابطہ منقطع کرنے کے بعد اُس نے پہلی مرتبہ کچھ اطمینان محسوس کیا۔

"آخری کھیپ وصول کرنے اور "وائنڈ اپ" کا منصوبہ کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اب صرف ایک کام باقی تھا۔ اس نے الماری سے خواب آور گولیوں کی شیشی نکالی اور چند گولیاں پیس کر ان کا پاؤڈر بنا لیا۔

رات کے کھانے کے بعد اس نے شوکت کو چائے کی دعوت دی۔ جسے اس نے قبول کر لیا۔ امجد کو یقین تھا کہ اس پر شبہ ہونے کے باوجود شوکت اس کی دعوت قبول کر لے گا۔ کیونکہ اس کی طرح وہ بھی اس سے راہ و رسم بڑھانے کی سوچ رہا ہوگا۔ اب کسے پہل ملتی ہے، یہ وقت بتانے والا تھا۔

امجد نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر کپ اُسے پیش کیا اور نہایت صفائی سے خواب آور سفوف شوکت کے گلاس میں ڈال دیا۔

چائے پینے کے بعد دونوں چند منٹوں تک باتیں کرتے رہے۔ پھر شوکت جمائیاں لینے لگا پھر وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ امجد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ مرحلہ بھی بہ خیر و خوبی مکمل ہو گیا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ اب پولیس رات بھر سنہرے خواب دیکھتی رہے گی، مگر ان کے مخبر کی آنکھ کھلے گی تو وہ کچھ کر پائے گی نا......

☆☆☆

"زبردست سر...... بہت ہی زبردست چال چلی ہے آپ نے۔" سابقہ پولیس مخبر اور حال کا کانسٹیبل اسلم توصیفی لہجے میں انسپکٹر رشید شاہ سے کہہ رہا تھا۔ "آپ نے مجھے یا تھانے کے کسی آدمی کو مخبر بنانے کے بجائے وہیں کے ہی آدمی کو خرید لیا۔"

"لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔" انسپکٹر رشید بولا۔ "مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ خفیہ جرائم پیشہ تنظیم کے لوگ ڈاکٹر مسعود کے کلینک پر قابض تھے۔ مگر وہ سب غیر اہم مہرے تھے۔ اصل اور اہم مہرہ امجد ہے۔ اسی کے پیچھے میں نے اپنا مہرہ لگا دیا۔ یہ قابو میں آ گیا تو پورا گروہ قابو میں آ جائے گا۔"

"آج رات رزلٹ آ جانا چاہیے۔" اسلم جوش سے بولا۔

"یقیناً۔" رشید نے ہولے سے کہا۔ "ثبوت کے ساتھ...... نتیجہ برآمد ہوگا۔"

☆☆☆

رات کے ٹھیک بارہ بجے وہ شمال میں بڑی چٹان کے پاس بیٹھا تھا۔ چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور ماحول پر سکوت طاری تھا۔ امجد نے سگریٹ سلگایا اور انتظار کرنے لگا۔

چند منٹوں کے بعد درختوں کی تاریکی سے اُلّو کی آواز سے ملتی جلتی ایک آواز سنائی دی۔ اس... آواز کے جواب میں امجد نے کُتے کے بھونکنے کی مدھم آواز نکالی۔ دوسرے ہی لمحے ایک سایہ درختوں کی تاریکی سے نکل کر امجد کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں ہیروئن سے بھرا ہوا بیگ اور دوسرے ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔

"تم امجد ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، کیا آوازوں کے کوڈورڈ سے مطمئن نہیں ہوئے؟" امجد بولا۔ "تم...... حماد ہی ہونا۔"

"تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔ رقم لائے ہو؟" اس نے پوچھا۔

امجد نے ایک سفید لفافہ حماد کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے لفافہ لیا اور کھول کر رقم گننے لگا۔ دو منٹ بعد اس نے لفافہ جیب میں ٹھونس لیا اور ہیروئن سے بھرا ہوا بیگ امجد کی طرف بڑھا دیا۔ امجد نے بیگ کھول کر تھوڑی سی ہیروئن چکھی اور مطمئن ہونے کے بعد بیگ بند کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ اب تم پستول جیب میں رکھ سکتے ہو۔" امجد نے کہا۔ تاہم حماد نے اس کے مشورے پر کوئی توجہ نہ دی۔ امجد نے مزید کہا۔

"اگر زحمت نہ ہو تو میرا ایک چھوٹا سا کام کر دینا۔" کہتے ہوئے اس نے چھوٹا سا لفافہ نکال کر اسے دیا۔ "اس میں چند چابیاں ہیں۔ انہیں راستے میں جنگل کے اندر کہیں پھینک دینا۔"

"کوئی چکر تو نہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

لیکن...... اس میں یقیناً چکر والی بات تھی۔ وہ چابیاں ڈاکٹر جمیل کی کار کی تھیں۔ اگر وہ اتفاق سے پولیس کے ہاتھ لگ گئیں تو ان پر انہیں حماد کی انگلیوں کے نشانات مل جائیں گے اور اس طرح وہ ڈاکٹر جمیل کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو سکتا تھا۔

حماد نے لفافے کے اندر سے چابیاں نکال کر دیکھیں۔ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر چابیاں لفافے میں ڈال کر تیزی سے درختوں کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

اُس کے جانے کے بعد امجد نے جھاڑیوں کی اوٹ سے اپنا سوٹ کیس نکالا اور ہیروئن کے بیگ کو اس کے اندر بند کرنے کے بعد سائن بورڈ کی طرف چل پڑا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سوٹ کیس اور دایاں ہاتھ جیب میں رکھے ہوئے پستول کے دستے پر تھا۔

سائن بورڈ کے قریب جمشید اپنی گاڑی کے ساتھ موجود تھا۔ امجد کو دیکھ کر وہ سوٹ کیس لینے کے لیے آگے بڑھا۔

"لاؤ، میں اُٹھا لیتا ہوں۔"

لیکن جیسے ہی امجد نے سوٹ کیس والا ہاتھ آگے کیا، جمشید نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس پر جھپٹا مارا۔

امجد کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ اس کے سنبھالا لینے سے پہلے ہی اس کا پستول جمشید کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ...... یہ...... کیا تماشا ہے؟" وہ غرایا۔

"سوٹ کیس گاڑی کے اندر رکھ دو۔" جمشید نے کہا۔ "اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔" امجد نے تھوڑا سا تامل کیا لیکن جمشید کے تیور دیکھ کر فوراً اس کے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"چاہنے سے یاد آیا......" جمشید بولا۔ "میں اس ڈرائیوروں والے حلیے میں بوریت محسوس کر رہا ہوں، اب میں اپنے کپڑے پہننا چاہتا ہوں، پھر سیدھے تھانے چلتے ہیں۔"

"کک...... کیا......؟ تت...... تم؟"

"ہاں، تمہارا خادم، مخبر...... پولیس کا مخبر...... تم کیا سمجھے تھے، مخبر صرف مریض بن کے آئے گا؟ یہ تو ہم نے یونہی بات لیک آؤٹ کی تھی، ہمیں معلوم تھا تم تک یہ اطلاع پہنچ جائے گی اور تم مریضوں میں ہی مخبر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے۔" جمشید ہنسا۔ امجد پر سکتہ طاری ہو گیا۔

پھر سنبھل کر بولا۔ "تم میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔"

"خوش قسمتی سے اس وقت تمہارا سوٹ کیس ہیروئن سے بھرا ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم نے ڈاکٹر جمیل کی لاش بھی برآمد کر لی ہے اور ماہرین کو یہ اندازہ لگانے میں چنداں دشواری پیش نہیں آئے گی کہ اُسے اس پستول سے ہلاک کیا گیا تھا، اُس رات اگر میں تمہارے جوتوں پر گرد نہ دیکھتا تو شاید ڈاکٹر جمیل کی لاش تلاش کرنے میں چند دن اور لگ جاتے۔ چلو چلیں، انسپکٹر رشید تمہارا منتظر ہوگا۔"

جمشید نے آخر میں گویا حظ اُٹھاتے ہوئے کہا اور امجد ہارے ہوئے جواری کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کرتا رہ گیا......

❖❖❖

سلمان سلیم

دہر

حسام بٹ

زندگی آزمائشوں کا نام ہے۔ کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی دونوں قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانۂ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے اَن مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا ایسا بحرِ بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا جس کے حصول کے لیے آزاد فضاؤں کے تعلیمی و تربیتی ادارے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصدِ حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزار فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیق سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

عروس البلاد کراچی سے شہرِ ظلمات ”تی یوم“ تک دراز
ایک سنسنی خیز اور تحیر آمیز ناقابلِ فراموش سلسلہ

قسط: 4

پلیٹ فارم نمبر پانچ پر، بیالیس ڈاؤن سے آنے والے مسافروں کا استقبال کرنے والوں کا رش اناؤنسمنٹ کے بعد دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ گویا ان لوگوں کے ایکشن میں آنے کا وقت سر پر آن پہنچا تھا۔

''برو! تمہارا منصوبہ تو شاندار ہے۔'' جاسم نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''اگر ہم ٹریسی اور مائیکل کو بہ حفاظت سارہ کے گھر تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ ہماری جیت ہوگی لیکن جو لوگ ٹریسی کی گھات میں ہیں، کیا وہ اتنی آسانی سے ہمیں جیتنے دیں گے؟''

''ہرگز نہیں۔'' کامل نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''کینٹ سے صدر تک کے سفر کے دوران میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور جو کچھ ہوگا اس سے ذہنی اور جسمانی طور پر نمٹنے کے لیے تیار ہیں۔ میرے تینوں ساتھی پوری طرح لوڈ ہیں اور تم جانتے ہو، میں اپنے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں رکھتا البتہ، تمہارے لیے میری بائیک کے سائڈ باکس میں ایک گن موجود ہے۔ باہر نکلتے ہی میں وہ گن تمہارے حوالے کر دوں گا۔ فیضان کی گن اس کے رکشے میں ہے۔''

''یہ تو ہو گیا پلان اے.....'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس پلان کے دو رخ ہیں یعنی ہم کامیاب ہو جائیں گے اور یا پھر ناکام رہیں گے۔ ہماری شکست کے نتیجے میں شعیب چاچا کے لوگ ٹریسی کو لے اُڑیں گے۔ اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''ایسے حالات میں ہم پلان بی کا استعمال کریں گے۔'' کامل نے اعتماد سے جواب دیا۔ ''اگر شعیب چاچا کے آدمی ٹریسی کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو صرف ہم دونوں نہایت خفیہ انداز میں ان کا تعاقب کریں گے۔ گڈز ٹرانسپورٹر اشفاق علی کے کڈنی ٹرانس پلانٹ میں ابھی چار دن باقی ہیں۔ ٹریسی کا کڈنی نکالنے اور اسے اشفاق علی میں لگانے کا سرجیکل پروسس ایک ہی دن کیا جائے گا یعنی اٹھارہ تاریخ پیر کی صبح لہٰذا یہ تو طے ہے کہ وہ لوگ ٹریسی کو دو تین روز تک اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر رکھیں گے۔ ہمیں اسی مقام کا سراغ لگانا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے کامل نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سنسنی خیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میرے ذہن میں پلان سی بھی ہے لیکن وہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

''باتیں بہت کر لی ہیں ہم نے.....'' جاسم نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''اب حرکت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بیالیس ڈاؤن ایکسپریس پلیٹ فارم نمبر پانچ میں داخل ہو رہی ہے۔''

قلی حضرات کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ بیالیس ڈاؤن کی وہ بوگی انیس بیس کے فرق سے ان کے سامنے ہی لگی تھی جس میں مائیکل اور ٹریسی فیصل آباد سے یہاں پہنچے تھے۔ کامل کے خبری نے اسے باپ بیٹی کے فوٹوز بھی بھیج رکھے تھے۔ کامل کی ایک نظر اپنے سیل فون کے اسکرین پر اور دوسری نگاہ ٹرین سے اترنے والے مسافروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ فیضان بھی بے تابی سے کامل کے اشارے کا انتظار کر رہا تھا۔

انتظار کے ان لمحات نے طوالت نہیں پکڑی اور وہ باپ بیٹی بوگی سے باہر نکل آئے۔ ٹریسی کے پاس اس کا پرس تھا جبکہ مائیکل نے ایک میڈیم سائز کا بیگ اٹھا رکھا تھا جس میں یقیناً ان دونوں کے کپڑے اور دیگر سامان ہوگا۔ کامل نے مخصوص اشارے سے فیضان کو بتا دیا کہ دونوں باپ بیٹی کو اپنے رکشے میں بٹھا کر صدر جعفری چشمے والی گلی میں پہنچانا ہے۔

ٹریسی اور مائیکل ٹرین سے نیچے اتر آئے تھے لیکن وہ دونوں پلیٹ فارم پر ہی رک کر بوگی کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جاسم نے کامل کی طرف دیکھتے ہوئے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔

''یہ لوگ اسٹیشن سے باہر کیوں نہیں جا رہے؟''

''یہی بات میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' کامل نے بھیڑ میں آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو۔''

''لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ فیصل آباد سے وہی دونوں آ رہے ہیں۔'' جاسم بھی اس کے ساتھ ہی آگے بڑھنے لگا۔ ان دونوں کا رخ ان باپ بیٹی کی جانب تھا۔ ''جب ان کے ساتھ کوئی تیسرا چوتھا نہیں تو پھر وہ کس کے لیے یہاں رکے ہوئے ہیں؟''

''ابھی پتا چل جائے گا۔'' کامل نے سرسری انداز میں کہا۔ ''فیضان ان کے قریب پہنچ چکا ہے۔ دیکھیں، ان میں کیا بات ہوتی ہے؟''

کامل اور جاسم ان باپ بیٹی سے چند فٹ کی دوری پر تھے۔ وہ لوگ بہ آسانی فیضان سے ہونے والی ان کی گفتگو سن سکتے تھے۔ اگرچہ اس وقت پلیٹ فارم پر اچھا خاصا رش ہو رہا تھا اور مختلف لوگوں کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو کر شور کا سماں پیدا کر رہی تھیں مگر ان دونوں کی بصارت اور سماعت مستقل اپنے ٹارگٹ پر لگی ہوئی تھی۔

''سر! آپ کو کہاں جانا ہے؟'' فیضان نے مائیکل سے

پوچھا۔ ''باہر میرا رکشا کھڑا ہے۔'' پھر اس نے مائیکل کے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے شائستہ لہجے میں اضافہ کیا۔ ''لائیں اپنا سامان مجھے دے دیں۔''

''سوری...... ہمارے پاس سواری کا انتظام ہے۔'' مائیکل نے فیضان سے کہا۔ ''ہم خود ہی چلے جائیں گے۔''

اس کے بعد فیضان کے پاس مزید جرح کا جواز باقی نہیں رہا۔ اس نے بے بسی سے کامل کی طرف دیکھا اور کندھے اُچکا دیے۔ مائیکل کا جواب جاسم اور کامل نے بھی سن لیا تھا۔

''مجھے کوئی گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔'' کامل نے فیضان کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اضطراری انداز میں کہا۔ ''تم میرے ساتھ ساتھ رہو۔''

اگلے ہی لمحے وہ ''گڑبڑ'' ٹرین کی بوگی سے برآمد ہوئی جس کا خدشہ کامل نے ظاہر کر دیا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اور دراز قامت شخص تھا جس نے اپنی آنکھوں پر نظر کا خاصا موٹا چشمہ لگا رکھا تھا۔ جسم مائل بہ فربہی، سر کے بال ندارد۔ وہ تھوڑا سا جھک کر چل رہا تھا اور کمر کا یہ جھکاؤ اس کی غیر معمولی ہائٹ کے باعث تھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔

اس لم ڈھینگ کو دیکھتے ہی مائیکل اور ٹریسی کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ یقیناً وہ دونوں اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر وہ باپ بیٹی اس لمبو کے ساتھ چل پڑے۔

''برو! یہ زرافہ کون ہو سکتا ہے؟'' جاسم نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

''شعیب چاچا کا کوئی آدمی۔'' کامل نے ان تینوں سے چند قدم کا فاصلہ رکھ کر چلتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کم بخت نے ٹرین کے اندر ہی مائیکل اور ٹریسی کو اپنے شیشے میں اتار لیا ہے۔ یہ دیر سے اسی لیے... نکلا ہے تاکہ یہ دیکھ سکے کہ کوئی ٹریسی اور مائیکل کو فالو تو نہیں کر رہا۔ اب یہ انہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے جائے گا۔ تم نے سنا ہے نا، مائیکل نے فیضان سے کہا تھا...... ہمارے پاس سواری کا انتظام ہے۔ ہم خود ہی چلے جائیں گے۔''

''ہمارا پلان اسے تو بُری طرح فلاپ ہو گیا برو......'' جاسم نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب ہمیں بہت زیادہ ہوشیاری دکھانا ہوگی۔''

''یس! دیٹ اِز۔'' کامل نے جاسم کی تشویش کے جواب میں کہا پھر وہ فون پر اپنے بیرونی ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔

''ناصر! میں جن تین مسافروں کے ساتھ اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلوں گا، ان میں دو تو وہی کرسچن باپ بیٹی ہیں جن کی حفاظت کے لیے ہم یہ سارا کشٹ اٹھا رہے ہیں اور تیسرا بندہ ہمارا دشمن اور شعیب چاچا کا نمک خوار ہے۔ سمجھ لو کہ ہمارے دونوں مطلوبہ افراد کو ٹرین کے اندر ہی سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ یہ شعیب چاچا کے آدمی کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے روانہ ہوں گے۔ شعیب کے بندے کا قد لگ بھگ ساڑھے چھ فٹ ہے۔ وہ سر سے گنجا ہے اور اس نے نظر کا موٹا سا چشمہ لگا رکھا ہے۔ تم لوگ تیار ہو؟''

''یس باس!'' ناصر نے فرمانبرداری سے کہا۔ ''آپ حکم کریں...... اِدھر اسٹیشن کی پارکنگ میں کارروائی کرنا ہے یا باہر جا کر......؟''

''فی الحال تم دونوں تھوڑا فاصلہ رکھ کر ان کی گاڑی کا تعاقب کرو گے۔ میں تمہیں گاڑی کی تفصیلات میسج کر دوں گا۔'' کامل نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''جب تک میں نہ کہوں، تم لوگوں نے اپنے طور پر کوئی کارروائی نہیں کرنی ہے۔''

''سمجھ گیا باس۔'' ناصر نے ٹھوس انداز میں کہا۔

کامل نے اگلی کال فیضان کو کی۔ ''تمہارا کام ختم ہو چکا۔ تم واپس چلے جاؤ۔''

فیضان نے جواب دیا۔ ''او کے باس۔''

کامل نے جاسم کو اپنی ہونڈا کے پاس رکنے کے لیے کہا اور محفوظ فاصلہ رکھ کر اس وقت تک ان تینوں کو فالو کرتا رہا جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ نہیں گئے۔ اس کے بعد کامل نے ناصر کو یہ میسج کر دیا۔

''تمہاری ہائی روف کے بائیں جانب پانچ گاڑیاں چھوڑ کر ایک سلور کلر کی ''ہائی جیٹ'' وین کھڑی ہے۔ وہ لوگ اسی وین میں سوار ہوئے ہیں۔ ہائی جیٹ کا نمبر ہے، یہ یہ یہ......''

''باس! میں نے آپ کو دیکھ لیا ہے اور اس سلور کلر ہائی جیٹ کو بھی۔'' ناصر نے میسج کے جواب میں کال کر کے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔''

''میں اپنے دوست جاسم کے ساتھ تم لوگوں کے قریب ہی رہوں گا۔ میرے اگلے حکم کا انتظار کرو۔''

''او کے باس۔'' ناصر نے سعادت مندی سے کہا۔

کامل نے اپنے سیل فون کو ہینڈز فری پر ڈال کر اپنی جیب میں رکھا اور تیز قدموں سے اپنی ڈائنا مک ہونڈا ون سیون فائیو کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

ٹریسی اور مائیکل سلور ہائی جیٹ کی عقبی نشست پر اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا سامان بھی وین

کے اسی حصے میں رکھ لیا تھا۔ ان کے بعد ٹرین سے برآمد ہونے والا وہ ادھیڑ عمر لبوں وین کی پسنجر سیٹ پر براجمان تھا۔

''فادر!'' مائیکل نے اپنے مہربان کو مخاطب کرتے ہوئے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ بہت عظیم انسان ہیں۔ آپ کے ساتھ حیدرآباد سے کراچی تک کا سفر بڑا شاندار گزرا اور آپ ہمیں گھر تک ڈراپ کرنے جارہے ہیں۔ اس نوعیت کی انسانی ہمدردی اور اخلاقیات دنیا سے ناپید ہوتی جارہی ہیں۔''

اس شخص نے ٹریسی اور مائیکل کو اپنا نام فادر جیکب بتایا تھا اور پچھلے تین گھنٹے سے وہ ایک پادری کی بڑی جاندار ایکٹنگ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں باپ بیٹی اس پر اندھا بھروسا کرنے لگے تھے۔

''پیٹر!'' جیکب نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے دھیمے انداز میں کہا۔ ''ہم ان مہمانوں کو پہلے صدر میں چھوڑیں گے۔ اس کے بعد چیپل کا رخ کریں گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''یس فادر۔'' پیٹر نے مختصر سا جواب دیا۔

''میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔'' فادر نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا گاڑی میں پینے کے لیے کچھ ہے؟''

''جی فادر!'' پیٹر نے اثبات میں جواب دیا۔ ''منرل واٹر بھی ہے اور جوس بھی۔ آپ جو بھی پسند فرمائیں۔''

''میں نے آج کل گلوکوز کا استعمال کم کر دیا ہے۔'' جیکب نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو منرل واٹر دو اور مہمانوں کی تواضع جوس سے کرو۔''

پیٹر نے وین کو ریلوے اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکالتے ہوئے فرمانبرداری سے کہا۔ ''او کے فادر۔''

آئندہ چند سیکنڈ میں پیٹر نے فادر کے حکم کی تعمیل کر دی۔ جب وین ریلوے اسٹیشن کی حدود سے باہر آئی تو ٹریسی اور مائیکل جوس کے ایک دو گھونٹ اپنے حلق سے اتار چکے تھے۔ فادر نے مائیکل کو مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''دنیا سے انسانیت اور اخلاص اس لیے غائب ہوتے جارہے ہیں کہ ہم نے جیسس کی تعلیمات کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔ ہم محبت کرنا بھول گئے ہیں۔ دوسرے انسانوں کی تکلیف ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ ہم صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ دوسروں کے مسائل کی طرف سے ہم نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں لیکن......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر عقب نما آئینے میں ان باپ بیٹی کا جائزہ لینے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''مائی سن! ابھی اس دنیا میں، چاہے کم تعداد ہی میں سہی مگر ایسے لوگ موجود ہیں جو دوسرے انسان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں اور ان کے لیے ایثار و قربانی کی عظیم مثالیں قائم کرتے ہیں جیسا کہ تمہاری بیٹی ٹریسی۔ یہ اپنی بڑی بہن کو ایک کڈنی ڈونیٹ کرنے فیصل آباد سے کراچی پہنچی ہے۔ مجھے اس کے فیصلے نے متاثر کیا ہے۔ ٹریسی، جیسس کی سچی پیروکار ہے۔ ایسے عقیدت مند میری نظر میں عظمت کے بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ گاڈ بلیس ہر......''

مائیکل کی بوجھل آواز ابھری۔ ''جو جیسس کو منظور......''

''جیسس تم سے بہت خوش ہیں میرے بچے۔'' فادر جیکب نے کہا۔ ''میں بھی تم لوگوں کے لیے خصوصی دعا کروں گا۔''

''ان باپ بیٹی کو اب واقعتاً دعا ہی کی ضرورت ہے فادر......'' پیٹر کا نام اختیار کرنے والے ڈرائیور نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جوس نے اپنا کام کر دیا ہے۔ وہ دونوں انٹا غفیل ہو چکے ہیں۔ دو تین گھنٹے سے پہلے ان کی آنکھ نہیں کھلنے والی۔''

''بشارت! اتنا ٹائم ہمارے لیے بہت کافی ہے۔'' فادر نے ڈرائیور کو اس کے اصلی نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہراہ فیصل کراس کر کے صدر کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ اب ہمیں اپنی منزل کا رخ کرنا ہے۔ سمجھ گئے تم؟''

''جی بہت اچھی طرح۔'' بشارت نے توانا لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆

ہونڈا ون سیون فائیو کی کمانڈ کامل کے ہاتھ میں تھی۔ جاسم اس کے پیچھے ریڈ الرٹ بیٹھا تھا۔ کامل نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا اور ہینڈز فری کے توسط سے وہ اپنے بندوں سے مسلسل رابطے میں تھا۔ جاسم نے بھی اپنے چہرے کو چھپانے کے لیے پی کیپ لگا رکھی تھی۔ کامل کی دی ہوئی گن جاسم نے اپنی کمر پر پینٹ کی بیلٹ میں اُڑس رکھی تھی اور ہر قسم کی ہنگامی کارروائی کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار تھا۔

کامل کے سیل فون پر ناصر کی کال موصول ہوئی۔

''باس! ہائی جیٹ راستہ بدل رہی ہے۔''

''بدلنے دیتے ہیں۔'' کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے دیکھ لیا ہے۔ وہ لوگ شاہراہ فیصل پر چڑھ

کر میٹروپول کی طرف جارہے ہیں۔ گاڑی تم چلا رہے ہو یا وسیم؟"

"اسٹیئرنگ وسیم کے ہاتھ میں ہے اور میں فون پر آپ سے رابطے میں ہوں۔" ناصر نے بتایا۔

"تم لوگ محفوظ فاصلہ رکھ کر ہائی جیٹ کا تعاقب جاری رکھو۔" کامل نے ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا۔ "ہم کبھی تم لوگوں سے آگے اور کبھی پیچھے رہیں گے۔ ہائی جیٹ والوں کو کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی باس۔" ناصر نے جواب دیا۔

"جب ہائی جیٹ اپنی منزل پر پہنچ جائے تو تم لوگ آگے نکل جانا اور کسی گلی میں رک کر میرے اگلے احکامات کا انتظار کرنا۔" کامل نے کہا۔ "اگر اس دوران میں کوئی نئی بات سامنے آئی تو میں صورتِ حال کی مناسبت سے تمہیں آگاہ کر دوں گا۔"

"او کے باس۔" ناصر نے کہا۔

"برو...... ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔" جاسم نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "ہائی جیٹ نے اپنا روٹ بدل لیا ہے لیکن مائیکل یا ٹریسی کی طرف سے کوئی ردِعمل دیکھنے میں نہیں آرہا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لوگ پہلی مرتبہ کراچی آئے ہوں اور انہیں کینٹ اسٹیشن سے صدر تک کا راستہ معلوم نہ ہو۔ پتا نہیں، اس گنجے لبو نے انہیں کس طرح اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔"

"میرے محتاط اندازے کے مطابق، وہ باپ بیٹی اس وقت دنیا و مافیہا سے غافل ہوں گے۔" کامل نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"اوہ۔" جاسم نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "پھر تو ہمیں انہیں راستے ہی میں چھاپ لینا چاہیے اور ان کے قبضے سے بے ہوش باپ بیٹی کو نکال کر آگے بڑھ جانا چاہیے۔"

"اگرچہ ایسا کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔" کامل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس صورت میں ہم اُن کے ٹھکانے کے بارے میں جاننے سے محروم رہ جائیں گے۔ میں نے شعیب چاچا کی بربادی کے جو جو منصوبے بنا رکھے ہیں، انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہونا چاہئیں، خصوصاً ان کے خفیہ اڈوں کی جان کاری۔"

"برو! اس بدذات کے نام کے ساتھ "چاچا" کا لفظ کسی بھی طور مناسب محسوس نہیں ہوتا۔" جاسم نے بیزارکن لہجے میں کہا۔ "اس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے تو ابکائی سی آنے لگتی ہے۔ کیا ہم اسے محض "شعیب" نہیں کہہ سکتے۔"

"ضرور کہہ سکتے ہیں۔" کامل نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "آج کے بعد ہم اس شیطان کو صرف شعیب ہی کہا کریں گے۔"

سلور ہائی جیٹ میٹروپول سے پی آئی ڈی سی پہنچی اور پھر سیدھی ایم ٹی خان روڈ پر آگے بڑھتی چلی گئی۔

"برو! مولوی تمیزالدین روڈ تو سمندر کی طرف جاتا ہے۔" جاسم نے کہا۔ "آخر انہوں نے سوچ کیا رکھا ہے؟"

"ان کی سوچ عملی شکل میں ہمارے سامنے ظاہر ہونے والی ہے۔" کامل نے کہا۔ "بس، دیکھتے جاؤ...... اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔"

ایم ٹی خان روڈ پر کافی آگے جانے کے بعد ہائی جیٹ بائیں طرف مڑ گئی۔ یہ رہائشی علاقہ تھا مگر انتہائی پُرسکون اور شانت۔ وہاں کے ماحول اور فضا میں رچی بسی خاموشی اور سناٹے کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی پوش رہائشی اسکیم نہ ہو بلکہ شہرِ خموشاں ہو۔ ان میں سے بیشتر بنگلوں میں نیشنل اور ملٹی نیشنل کمپنیز نے اپنے آفس کھول رکھے تھے۔

سلور ہائی جیٹ ایک ایسے دو منزلہ بنگلے کے سامنے جا کر رکی جس کی دیوار پر بڑا سا اسٹار فارماڈسٹری بیوٹرز کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ گویا اس بنگلے میں مذکورہ فارماسیوٹیکل کمپنی نے اپنا ڈسٹری بیوشن آفس بنا رکھا تھا۔ ہائی جیٹ کے رکنے سے پہلے ہی کامل نے اپنی بائیک کو ایک گلی کے کونے پر لگا دیا جبکہ وسیم اور ناصر والی گرین ہائی روف کامل کی ہدایت کے مطابق آگے نکل گئی۔ سلور ہائی جیٹ والوں کو اپنے تعاقب کا احساس اس لیے بھی نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی کینٹ اسٹیشن سے انہیں فالو کرتے ہوئے یہاں تک بھی پہنچ سکتا ہے۔

جاسم اور کامل جس مقام پر کھڑے تھے وہاں سے مذکورہ بنگلے کا گیٹ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ ان دونوں کی نظریں اسی گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ ہائی جیٹ نے رکنے کے بعد تین بار مخصوص انداز میں ہارن بجایا تھا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد بنگلے کے گیٹ پر سانولے رنگ کا ایک شخص نمودار ہوا اور اس نے ہائی جیٹ کے لیے گیٹ کھول دیا۔ جب وہ بنگلے کے اندر داخل ہو گئی تو اس شخص نے چوکنا انداز میں دائیں بائیں دیکھنے کے بعد گیٹ بند کر دیا۔ وہ دونوں جہاں کھڑے تھے، اُن کے دیکھے جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

''بردا تم اِدھر ہی رکو، میں اندر جاتا ہوں۔'' جاسم نے پُرعزم انداز میں کہا۔

''جگر! اندر جانا تو لازم ہو چکا......'' کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم دونوں ہی بنگلے میں داخل ہوں تو کیسا رہے گا؟''

''میں سمجھتا ہوں، تمہیں باہر رہنا چاہیے۔'' جاسم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور بائیک سے نیچے اترنے کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''ہم دونوں فون پر رابطے میں رہیں گے۔ اگر مجھے تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں بلا لوں گا۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔''

''جگر! تم پر بھروسا ہے اسی لیے تو ہم ایک ساتھ نظر آرہے ہیں۔'' کامل نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم جاؤ مگر سامنے سے بنگلے میں داخل ہونا محفوظ نہیں ہوگا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' جاسم نے کہا۔ ''میں بنگلے میں داخل ہونے کے لیے عقبی حصے سے کوشش کروں گا۔''

''آل دی بیسٹ۔'' کامل نے تہ دل سے کہا۔

''میں اندر کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد تمہیں رپورٹ دیتا ہوں۔'' جاسم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''پھر ہم موقع محل کی مناسبت سے کوئی قدم اٹھائیں گے۔ یہ تو طے ہے کہ ہمیں ٹریسی اور مائیکل کو یہاں سے صحیح سلامت اپنے ساتھ لے کر جانا ہے اور شعیب کے آدمیوں کو یادگار سبق سکھانے کے بعد......''

''یہ بات......'' کامل نے ستائشی انداز میں کہا۔

جاسم نارمل انداز میں چلتے ہوئے بنگلے کی عقبی سمت بڑھ گیا۔ مذکورہ بنگلے کے پچھلے حصے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ جاسم نے محتاط نظر سے گردوپیش کا جائزہ لیا اور سیوریج پائپ کی مدد سے۔ کوئی آواز پیدا کیے بغیر بنگلے کی چھت پر پہنچ گیا پھر دبے قدموں وہ نیچے اتر آیا۔ احتیاطاً اس نے سائیلنسر لگا کر گن کو اپنے ہاتھ میں کرلیا تھا۔

بنگلے کی بالائی منزل پر دو کمروں میں اسے گتے کے کارٹن رکھے دکھائی دیے۔ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ مذکورہ کارٹن کا تعلق ٹرائی اسٹار فارماسیوٹیکل کمپنی سے ہے۔ اس نے بڑی سرعت سے بالائی منزل کو کھنگال ڈالا۔ وہاں کوئی انسان موجود تھا اور نہ ہی دوسری کوئی کام کی شے اس کے ہاتھ لگی۔ یہ طے ہو گیا کہ آج اس بنگلے پر ہونے والی ہنگامی کارروائی زیریں منزل تک ہی محدود ہے۔

بالائی منزل سے زیریں منزل کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے وہ حد درجہ محتاط اور چوکنا تھا۔ وہ زینے پر پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا کہ ایک کھڑکی میں سے اسے اس لمبو کی جھلک نظر آئی جو ٹریسی اور مائیکل کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر ہائی جیٹ میں بیٹھا تھا۔ اس زرافہ نما شخص کے سامنے ایک آدمی ڈاکٹروں والا مخصوص سفید کوٹ پہنے کھڑا تھا۔ جب وہ لم ڈھینگ بولا تو اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ مذکورہ شخص ڈاکٹر ہی تھا۔

''ڈاکٹر آفتاب! لڑکی کیسی ہے؟'' زرافہ نے پوچھا۔

''یاسمین نے ابھی اسے نیند کا انجکشن دیا ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے بتایا۔ ''حالات ہمارے کنٹرول میں ہیں اور ہماری تیاری بھی مکمل ہے۔ بس سرجن صاحب کا انتظار ہے۔''

''اوہ......تو یہاں یہ چل رہا ہے۔'' جاسم نے سوچا۔ ''ان کم بختوں نے ڈاکٹر، نرس اور سرجن......سب کا انتظام کر رکھا ہے۔ لگتا ہے، اس بنگلے میں انہوں نے آپریشن تھیٹر کی سہولت بھی رکھی ہوگی۔''

''میری سر سے بات ہوگئی ہے۔ تھوڑی دیر میں ہارٹ سرجن یہاں پہنچ جائے گا۔ جمیل باقر اپنے کام کا ماہر ہے۔ بس، تم نے اور یاسمین نے اس سے بھرپور تعاون کرنا ہے۔''

''قادر صاحب! ہم نے ہمیشہ آپ کے ساتھ تعاون کیا ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے احسان مندانہ انداز میں کہا۔ ''کیونکہ آپ ہمارا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ یہ جو ابھی آپ دوسری لڑکی لے کر آئے ہیں، اس کا کیا کرنا ہے؟''

''دوسری لڑکی!'' جاسم کے دماغ پر ایک ہتھوڑا سا لگا۔ قادر نامی یہ شخص تو ابھی ٹریسی کو لے کر آیا تھا تو......جس لڑکی کو نرس یاسمین نے نیند کا انجکشن دیا تھا، وہ بدنصیب کون تھی؟ ان لمحات میں جاسم کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ایک لڑکی پہلے سے بنگلے پر موجود تھی جس کی سرجری کے لیے ہارٹ سرجن جمیل باقر یہاں پہنچنے والا تھا۔

''اس لڑکی کا نام ٹریسی ہے اور یہ ایک کڈنی کیس ہے۔'' قادر نے ڈاکٹر آفتاب کو بتایا۔ ''پہلے ہمارا پروگرام یہی تھا کہ ٹریسی کو چار روز تک یہیں رکھا جائے گا کیونکہ اس کے کڈنی جس پیشنٹ میں ٹرانس پلانٹ ہونا ہے، اس کے آپریشن کے لیے اٹھارہ تاریخ کی صبح مقرر کی گئی تھی لیکن اچانک حالات بدل گئے ہیں کیونکہ ہمارے پیشنٹ اشفاق علی کی حالت بڑی کریٹیکل ہوگئی ہے۔ کل ہر صورت میں اسے آپریٹ کیا جائے گا لہٰذا ٹریسی بس ایک دن اس بنگلے پر قیام کرے گی۔ اس دوران میں ہم ٹریسی کے تمام ٹیسٹ کر لیں گے۔ مریض کو کس طرح اپنے قابو میں کرکے رکھنا ہے، یہ تم اور یاسمین اچھی طرح جانتے ہو۔''

''قادر صاحب! اس معاملے میں آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ڈاکٹر آفتاب نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''ہم ایک سال سے آپ کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور آپ نے ہمارا کام دیکھا ہوا ہے۔''

''ٹریسی کا باپ مائیکل وین کے اندر بے ہوش پڑا ہے۔'' قادر نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''جمیل باقر اپنا کام نمٹا لے پھر بشارت، نادیہ اور مائیکل کو کسی گٹر میں پھینک آئے گا۔ دل نکال لیے جانے کے بعد نادیہ تو زندہ نہیں بچے گی اور مائیکل کی قسمت اس کے ساتھ......''

''قادر صاحب! اگر ٹریسی کے دونوں کڈنی نکال لیے گئے تو وہ بھی نہیں بچے گی۔'' ڈاکٹر آفتاب نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں ڈاکٹر......'' قادر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ہر شخص کا اپنا نصیب ہے۔ جس کی موت جیسے لکھی ہے، وہ ویسے ہی مرے گا۔''

جاسم انہیں وہیں چھوڑ کر بنگلے کی بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ اس نے نہایت مختصر الفاظ میں، فون پر کامل کو اندرونی حالات سے آگاہ کرنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''برو! تمہیں ہارٹ سرجن جمیل باقر کا رول کرنا ہے۔''

''جگر، تمہارے ذہن میں جو چل رہا ہے، میں اُسے اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' کامل نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں آ رہا ہوں۔ بتاؤ، بنگلے کے اندر ہمارے دشمنوں کی تعداد کتنی ہے؟''

''ٹریسی، مائیکل اور نادیہ کا شمار ہمارے دشمنوں میں نہیں کیا جاسکتا۔'' جاسم نے جواب دیا۔ ''باقی رہ گئے چار مرد یعنی قادر، بشارت، آفتاب اور وہ بندہ جس نے ہائی جیٹ کے لیے گیٹ کھولا تھا۔ ان کے علاوہ نرس یاسمین ہے۔ تم جب ہارٹ سرجن بن کر آؤ گے تو سب سے پہلا واسطہ تمہارا گیٹ کھولنے والے اسی بندے سے پڑے گا۔''

''ڈونٹ وری...... میں سنبھال لوں گا۔'' کامل نے ہونڈا ون سیون فائیو کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسے لوگوں سے نمٹنا مجھے خوب آتا ہے۔''

''آجاؤ برو...... مل کر نمٹتے ہیں۔'' جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''شعیب اور اس کے گروہ کی ایسی کم تیسی۔''

☆☆☆

گرین ہائی روف کے اندر جدید اسلحے کے علاوہ ہنگامی ضروریات کی مختلف چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کامل نے اپنی بائیک یہ کہتے ہوئے ناصر کے حوالے کر دی۔

''تم ہائی روف کے نزدیک ہی رہنا۔ اگر ہمیں تمہاری ضرورت پیش آئی تو بلا لیں گے۔ بہ صورت دیگر، جب ہماری ہائی روف یہاں سے روانہ ہو تو تم نے بھی ہمارے پیچھے چلے آنا ہے۔''

ناصر نے کامل کو اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور کامل ہائی روف کے اندر پہنچ گیا۔ آئندہ ایک منٹ کے اندر اس نے وہائٹ لیب کوٹ پہن کر اس کی کنگ سائز پاکٹ میں اسٹیتھو اسکوپ ڈال کر خود کو ہارٹ سرجن جمیل باقر کا کردار کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

وسیم نے کامل کے حکم پر ہائی روف کو ٹرائی اسٹار فارماسیوٹیکل کے بنگلے کے عین سامنے روک دیا۔ کامل گاڑی سے نیچے اترا اور بڑے اعتماد سے چلتے ہوئے بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

چند سیکنڈ کے بعد ہٹا کٹا سانولا ملازم صورت شخص اندر سے نمودار ہوا اور سیدھا گیٹ پر پہنچنے کے بعد کامل کی جانب دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں پوچھا۔

''کون ہو تم...... کس سے ملنا ہے...... کیا کام ہے؟''

''پتا نہیں، قادر نے کیسے کیسے اندھے لوگوں کو اس بنگلے پر ملازم رکھا ہوا ہے۔'' کامل نے ناگواری سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں میرے لباس اور حلیے سے نظر نہیں آ رہا کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔''

گینڈا نما شخص کامل کے آہنی اعتماد کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ قبل اس کے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، کامل نے جاسم کی فراہم کردہ معلومات کا استعمال کرتے ہوئے برہمی سے اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام جمیل باقر ہے۔ میں ہارٹ سرجن ہوں۔ مجھے قادر کے سر نے یہاں بھیجا ہے۔ میں نادیہ نامی ایک لڑکی کا ایمرجنسی آپریشن کرنے آیا ہوں۔ سر نے بتایا تھا کہ قادر اور بشارت بنگلے پر موجود ہوں گے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو ان میں سے کسی کو بلاؤ......''

''سوری سر۔'' گینڈے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا پھر گیٹ کھولتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ہدایت ہے اس لیے میں نے آپ سے ''سوال جواب'' کر لیا۔ آپ تشریف لے آئیں۔ قادر صاحب اندر آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔''

کامل نے ہائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے وسیم سے کہا۔ ''تم گاڑی ہی میں رکو۔ میں کام نمٹا کر آتا ہوں۔''

"جی ڈاکٹر صاحب!" وسیم نے جواب دیا۔
ہٹے کٹے ملازم نے بنگلے کا دروازہ بند کیا اور کامل کے ساتھ چلتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ قادر صاحب سے میری شکایت نہیں کرنا، میں اپنے رویّے کی معافی چاہتا ہوں۔"
"تم نے جو کیا، وہ تمہارا فرض تھا۔" کامل نے سلور ہائی جیٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے دھیمے انداز میں کہا۔ "مجھے تمہاری کارکردگی اچھی لگی۔ لہٰذا کسی شکایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم اس حوالے سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔" پھر اس نے ہائی جیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ "لگتا ہے، فیصل آبادی باپ بیٹی بھی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ سر نے مجھے ان کے بارے میں بھی بتایا تھا۔"
"جی سر۔" ملازم نے ایکسٹرا ایفی شینسی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا۔ "وہ کرپچن بندہ تو دین میں پڑا سو رہا ہے اور اس کی بیٹی کو قادر صاحب نے اندر نادیہ کے پاس پہنچا دیا ہے۔"
جاسم نے بالائی منزل کی کھڑکی سے "ہارٹ سرجن" جمیل باقر کو بنگلے سے اندر بہ خیریت داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ دبے پاؤں زینے پر چلتے ہوئے ایک ایسے مقام پر آکر رک گیا جہاں سے وہ بہ وقت ضرورت چشم زدن میں، میدانِ جنگ میں کود سکتا تھا۔ یہاں پر زیریں منزل کی ہر کارروائی کو بہ آسانی سماعت بھی کیا جاسکتا تھا۔
"طارق! باہر کون تھا؟" قادر نے گینڈا نما ملازم سے استفسار کیا۔
جاسم تھوڑی دیر پہلے قادر اور ڈاکٹر آفتاب کے بیچ ہونے والی سنسنی خیز گفتگو سن چکا تھا لہٰذا اسے قادر کی آواز پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ گن تھامے ریڈ الرٹ ہو گیا۔
"قادر صاحب! ہارٹ سرجن آئے ہیں۔" طارق نے جواب دیا۔ "میں انہیں لے کر آپ ہی کے پاس آرہا ہوں۔"
"ٹھیک ہے...... آجاؤ۔" قادر نے بے پروائی سے کہا۔
"تمہارا نام طارق ہے نا؟" کامل نے گینڈے سے ایک قدم پیچھے چلتے ہوئے سوال کیا۔
"یس سر...... میں طارق ہی ہوں۔"
اس دوران میں کامل نے اپنے لیب کوٹ کی بائیں سائڈ پاکٹ میں سے ایک ڈوری والا پیراشوٹ کا بیگ نکال لیا تھا۔ اس قسم کے بیگز عموماً اسٹوڈنٹس ٹیوشنز جانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کی ڈوری کھینچ کر بہ سہولت اس کا منہ بند کیا جاسکتا ہے۔ کامل نہ صرف طارق کا منہ بلکہ اس کی آنکھیں بھی بند کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔
"تم کتنے عرصے سے قادر کے ساتھ کام کر رہے ہو؟" کامل نے اسے باتوں میں لگاتے ہوئے پوچھا۔
"چھ ماہ سے سر......"
"تم یہاں خوش تو ہونا؟"
"جی سر۔" طارق نے بنگلے کے اندرونی حصے میں داخل ہوتے ہوئے بتایا۔
اگلا سوال کرنے کے بجائے کامل نے اپنے ہاتھوں کو برق رفتاری سے حرکت دی جس کے نتیجے میں طارق کا سر گردن تک پیراشوٹ والے بیگ کے اندر غائب ہو گیا۔ کامل نے بیگ کی ڈوری کھینچ کر طارق کو دم گھٹ کی حالت میں پہنچا دیا۔ طارق کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک یوں گرفتارِ بلا ہو جائے گا۔ اس نے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی تو کامل نے نیک لاک لگانے کے بعد اس کے کان کے نزدیک اپنا منہ لے جا کر دھمکی آمیز انداز میں کہا۔
"چپ چاپ میرے آگے چلتے رہو۔ اس بیگ کے اندر اتنی آکسیجن ہے کہ تم پانچ منٹ تک بلا تردد سانس لے سکتے ہو اور میرا کام ایک سے دو منٹ کا ہے۔ ہاں...... اگر تمہیں ہیرو بننے کا شوق ہے تو تمہاری مرضی۔ بس، یہ بات ذہن میں رکھ لینا کہ میں نادیہ کا دل بعد میں نکالوں گا، اس سے پہلے تمہاری گردن کا منکا توڑوں گا۔ اس وقت تمہاری زندگی کا اسٹیئرنگ تمہارے فیصلے کے ہاتھ میں ہے۔"
طارق نے صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپ لیا تھا لہٰذا وہ بے چون و چرا کامل کے حکم کی تعمیل میں جت گیا۔ اگرچہ پیراشوٹ کے بیگ کے اندر تھوڑی آکسیجن موجود تھی لیکن طارق کو سانس لینے میں خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ بہرحال، اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا چنانچہ وہ کسی بے بس اور لاچار انسان کی طرح کامل کی بات پر عمل کرتا چلا گیا۔
جلد ہی وہ دونوں ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے جاسم انہیں بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ ان کے بیچ پندرہ سے بیس فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ قبل اس کے کہ جاسم حرکت میں آنے کا فیصلہ کرتا، ایک کمرے سے بشارت نمودار ہوا اور ٹھوس انداز میں استفسار کیا۔
"کہاں ہے ہارٹ سرجن جمیل با......؟"
آنکھوں کے سامنے موجود صورتِ حال نے اس کی زبان کو بریک لگا دیے۔ یقیناً بشارت، قادر کے پاس سے اٹھ

کر آرہا تھا اور اسے توقع تھی کہ طارق اور ہارٹ سرجن سے اس کا سامنا ہوگا اسی لیے اس نے بغیر دیکھے ہی طارق سے سوال کر دیا تھا لیکن اب تو سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

''میں ہی ہارٹ سرجن ہوں۔'' کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''باہر نکالو اپنے گرو قادر کو۔ میں تم دونوں کے سینے چیر کر تمہارے ہارٹ نکالنے آیا ہوں۔''

''کیا بک رہے ہو......؟'' بشارت نے غصیلے انداز میں کہا اور اپنی جیب میں سے گن نکال لی پھر بہ آواز بلند بولا۔ ''قادر! کوئی سرپھرا دشمن بنگلے میں گھس آیا ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' قادر کی تشویش بھری آواز ابھری۔

''باہر آکر خود دیکھ لو۔'' بشارت نے قادر کے سوال کا جواب دیتے ہی کامل پر گولی چلا دی۔

کامل اس امکان سے قطعی بے خبر نہیں تھا۔ وہ دادا کا سچا جانشین تھا، چاروں جانب چوکنا نگاہ رکھنے والا...... اور مدِمقابل کی سوچ تک کو پڑھ لینے والا۔ اس نے طارق کا نیک لاک کھولا اور کسی ریسلر کے مانند طارق کی ٹانگوں کے بیچ بازو ڈال کر ایک جھٹکے سے اسے اوپر اٹھایا اور اگلے ہی لمحے اس سانولے گینڈے کو بشارت کی جانب اچھال دیا۔

بشارت اس دوران میں گن کا ٹریگر دبا چکا تھا۔ گن کے بیرل سے گولی اور کمرے کے اندر سے قادر ایک ساتھ برآمد ہوئے۔ بشارت کی چلائی ہوئی گولی طارق کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ گولی کھاتے وقت وہ فضا میں بلند تھا۔ وہ اناج سے بھری ہوئی بوری کے مانند دھپ سے پختہ فرش پر گرا اور تڑپے بغیر ٹھنڈا ہوگیا۔

کامل کے پہنائے ہوئے پیراشوٹ بیگ نے پہلے ہی طارق کو ادھ موا کر رکھا تھا، دل میں دھنسنے والی خطرناک گولی نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ اس خوں چکاں منظر نے قادر کو دم بہ خود کر دیا۔ اس دوران میں جاسم گن بہ دست فریم میں داخل ہوگیا۔ وہ ایسے اینگل سے اِن ہوا تھا کہ سب سے پہلے قادر کی اس پر نگاہ پڑی۔

اسی وحشت ناک نگاہ نے اس کی دم بہ خودی کا دامن تار تار کر دیا۔ وہ اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے حلق کے بل چیخا۔ ''بشارت! اپنے پیچھے دیکھو۔''

جب تک بشارت پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا، جاسم برق رفتار قدم اٹھاتے ہوئے اس کے انتہائی نزدیک پہنچ چکا تھا پھر اس سے پہلے کہ بشارت، جاسم پر فائر کرتا، جاسم نے اس کی پیشانی میں ''ٹھک'' سے ایک بے آواز گولی اتار دی۔

بشارت مردہ چھپکلی کے مانند فرش پر جا گرا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' قادر نے وحشیانہ انداز میں چیخ کر پوچھا۔ ''یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

ایک بات تو طے تھی کہ قادر ان لحات میں نہتا تھا ورنہ وہ کب کا گن نکال چکا ہوتا۔ کامل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت بے رحمی سے کہا۔

''شعیب کے ٹکڑوں پر پلنے والے بدبودار کتّے! تم ہمیں اپنی موت سمجھ لو اور موت تم جیسے غلیظ جانداروں کے سوالات کے جوابات نہیں دیا کرتی۔ ہم یہاں پر جو کچھ بھی کرنے آئے ہیں اسے دیکھنے کے لیے تم زندہ نہیں رہو گے۔''

اِدھر کامل کی بات ختم ہوئی، اُدھر قادر نے اس کمرے کی جانب دوڑ لگا دی جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا۔ کامل نے جاسم سے کہا۔

''میں اسے دیکھتا ہوں۔ تم لڑکیوں کی طرف جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ بشارت کی چلائی ہوئی گولی کی آواز اس بنگلے سے باہر بھی گئی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہو، ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

جاسم نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اگلے دومنٹ کے اندر جاسم نے زیریں منزل کے اس حصے تک رسائی حاصل کر لی جہاں نادیہ اور ٹریسی کو رکھا گیا تھا۔ یہ حصہ دراصل پہلو بہ پہلو بنے ہوئے دو کمروں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک کمرا آپریشن تھیٹر کی حیثیت کا حامل تھا جبکہ دوسرے کمرے کو آپ آئی سی یو سمجھ لیں۔ جاسم کی مطلوبہ لڑکیاں اسی کمرے میں ہوسکتی تھیں کیونکہ اس نے آپریشن تھیٹر کے اندر جھانک کر دیکھ لیا تھا۔

جاسم نے آئی سی یو کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمانے کی کوشش کی تو وہ اسے لاک ملا۔ نادیہ اور ٹریسی اس پوزیشن میں نہیں تھیں کہ وہ اس کمرے کو لاک کر پاتیں۔ یہ کام یقیناً ڈاکٹر آفتاب یا نرس یاسمین میں سے کسی کا تھا اور اس سے یہ بھی پتا چلتا تھا کہ وہ دونوں ذلیل انسان بھی اس وقت آئی سی یو کے اندر بند تھے۔

جاسم نے آئی سی یو کا دروازہ کھلوانے کے لیے دستک دینے کا تکلف ضروری نہ سمجھا اور دروازے کے لاک پر سائیلنسر لگی گن سے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ گولیوں کی بہ نسبت لاک ٹوٹنے کی آواز زیادہ تھی۔ جاسم کسی منہ زور طوفان کے مانند آئی سی یو کے اندر داخل ہوگیا۔

اندر کے منظر نے جاسم کو متاثر کیا۔ وہ کمرا کسی بھی مہنگے پرائیویٹ اسپتال کے وی آئی پی روم جیسا تھا جہاں پر مریض

کی ضرورت کی ہر جدید ترین مشین موجود تھی۔ اس کمرے کے ایک حصے میں پہلو بہ پہلو، دو بیڈ لگے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر ٹریسی کو اور دوسرے پر نادیہ کو لٹایا گیا تھا۔ وہ دونوں بے ہوش تھیں اور مختلف نلکیاں ان سے منسلک تھیں۔ نادیہ کی عمر پچیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ معصوم صورت والی ایک پُرکشش لڑکی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر میں ایک شیطان صفت ہارٹ سرجن جمیل باقر اس مظلوم لڑکی کا دل نکالنے بنگلے پر پہنچنے والا تھا لیکن اس سے پہلے ہی قدرت نے نادیہ کی دادرسی کے لیے ”جاسم اینڈ کو“ کو وہاں نازل کردیا تھا۔

خلافِ توقع جب جاسم کو اس کمرے میں آفتاب اور یاسمین نظر نہیں آئے تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے متلاشی نگاہ کمرے کے دوسرے حصے میں دوڑائی۔ اس طرف ایک بڑی سی چوبی میز پر لیبارٹری میں استعمال ہونے والے مختلف آلات اور اسی سے متعلق دیگر سامان رکھا دکھائی دیا۔ میز کے آخری کنارے پر ایک الماری بھی ایستادہ تھی جس کے سامنے والے حصے میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ الماری کے اندر شیلفس پر رکھی ہوئی مختلف سائز کی بوتلوں کو بڑے واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ ان بوتلوں میں کئی ایک رنگ کے محلول بھرے ہوئے تھے جو ادویات اور دیگر کیمیکلز ہوسکتے تھے۔ ایک بڑی سی کانچ کی بوتل میں اسپرٹ بھرا ہوا تھا۔ جاسم کی آنکھوں کو جس شے کی تلاش تھی، وہ بالآخر اس کے دائرۂ نگاہ میں آگئی۔

محلولات والی الماری کے برابر میں اس کمرے کی ایک کھڑکی واقع تھی جس کے اوپر بلائنڈز پڑے ہوئے تھے۔ جاسم نے ان بلائنڈز میں ایک پُراسرار سی حرکت دیکھی تھی۔ وہ کمرا ائرکنڈیشنڈ تھا۔ وہاں پر ہوا کا گزر نہیں تھا جو یہ سوچ لیا جاتا کہ ہوا اس ”حرکت“ کا موجب ہوگی۔ جاسم نے اپنی گن کو بلائنڈز کی جانب سیدھا کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”ڈاکٹر آفتاب...... سسٹر یاسمین! میں نے تم لوگوں کو ڈھونڈ لیا ہے۔ میں تین تک گنوں گا۔ اگر زندگی عزیز ہے تو ہاتھ اٹھا کر باہر آجاؤ...... ایک!“

بلائنڈز کے عقب میں خاموشی اور سکوت طاری رہا۔ جاسم نے اپنے لہجے میں جارحیت بھرتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔

”قادر، بشارت اور طارق کو میں نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ بس، تم دونوں ہی بچے ہو۔ تمہارے پاس زندہ رہنے کا چانس ہے...... دو...... میں تین کے بعد بے دریغ فائرنگ شروع کردوں گا۔ تم دونوں انہی بلائنڈز کے پیچھے، اپنے ہی خون میں نہا جاؤ گے۔ اس کے بعد میری زبان سے صرف ایک ہی لفظ نکلے گا اور وہ لفظ ہے...... تین!“

جاسم کو آفتاب اور یاسمین کے پیشہ ورانہ تعاون کی ضرورت تھی تاکہ وہ نادیہ اور ٹریسی کو ان آلات اور ٹیوبز سے نجات دلا کر اپنے ساتھ لے جاسکتا اسی لیے وہ ان دونوں کے ساتھ مکالمے بازی کرنے کی کوشش کررہا تھا ورنہ تو وہ کب کا انہیں بلائنڈز کے پیچھے جہنم واصل کرچکا ہوتا۔

جاسم کی ”تین“ والی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ بلائنڈز میں اضطراری حرکت دیکھنے کو ملی اور اگلے ہی لمحے ڈاکٹر اور نرس ”ہینڈز اَپ“ پوزیشن میں جلوہ گر ہوگئے۔ ان کی آنکھوں اور چہرے پر موت سے پہلے کا خوف بڑا واضح دکھائی دے رہا تھا۔ جاسم نے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کیا اسی دن کے لیے تم لوگوں نے میڈیکل کا مقدس پیشہ اختیار کیا تھا کہ جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر انسانیت کی دھجیاں اُڑا سکو......؟“

”ہمیں معاف کردو۔“ یاسمین نے ساجت آمیز لہجے میں کہا۔ ”ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ اتنے سفاک اور درندہ صفت ہیں۔ ہم بے خبری میں ان کے جال میں پھنس گئے ہیں۔“

”بکواس بند کرو کمینی عورت......“ جاسم نے طیش کے عالم میں کہا۔ ”تم دونوں اور تم جیسے دوسرے لوگ میڈیکل پروفیشن کے ماتھے پر غلاظت کا دھبا ہو۔ زیادہ نیک پروین بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے آفتاب اور قادر کے بیچ ہونے والی ساری گفتگو اپنے کانوں سے سنی ہے۔ تم دونوں پچھلے ایک سال سے ان شیطانوں کے آلۂ کار بن کر انسان اور انسانیت کی تذلیل کے شرمناک ریکارڈز قائم کررہے ہو۔“

ان دونوں کے چہرے سیاہ پڑ گئے۔ انہیں یقین ہوگیا کہ آج تو موت پکی ہے۔ ڈاکٹر نے اپنی سی آخری کوشش کرتے ہوئے منت ریز لہجے میں کہا۔ اس کا مخاطب جاسم تھا۔

”ہم نہیں جانتے، تم کون ہو لیکن تمہاری باتوں سے اندازہ ہوگیا ہے کہ تم ایک اچھے انسان ہو۔ ہمیں بھی اپنے جیسا ایک اچھا انسان بننے کا موقع دے دو۔ ہمیں مار کر تمہیں کیا مل جائے گا؟“

”ٹھیک ہے، ایک موقع تمہارا حق بنتا ہے۔“ جاسم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تم لوگوں کی جان بخش دوں گا۔ اب تم دونوں مل کر جتنی جلدی ممکن ہو، ان لڑکیوں کی تمام ٹیوبز اور دیگر مشینیں نکال کر انہیں یہاں سے

کہیں اور شفٹ کرنے کے قابل بنا دو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''اوکے...... ہم تمہاری ہدایات پر عمل کررہے ہیں۔'' ڈاکٹر آفتاب نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

یاسمین کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تھینک یو......''

آئندہ دس منٹ میں آفتاب اور یاسمین نے اپنے پیشہ ورانہ تجربے اور مہارت کو استعمال میں لاکر جاسم کے حسب منشا اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ جب انسان کے سر پر تلوار لٹک رہی ہو تو گھنٹوں کا کام بہ سہولت منٹوں میں ممکن ہو جاتا ہے۔

کامل، جاسم کو ڈھونڈتے ہوئے ادھر آنکلا۔ ''جگر! سب ٹھیک ہے نا؟'' اس نے آئی سی یو میں داخل ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''یس برو۔'' جاسم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ''تمہاری طرف کیا صورتِ حال ہے؟''

''بشارت نے طارق کو اور تم نے بشارت کو دوسری دنیا میں پہنچا دیا تھا۔'' کامل نے معنی خیز انداز میں بتایا۔ ''میں نے قادر اور جمیل باقر کی گردنوں کے کڑاکے نکال کر انہیں بھی جہنم واصل کر دیا ہے۔''

''جمیل باقر...... مطلب ہارٹ سرجن؟'' جاسم نے حیرت سے کامل کی طرف دیکھا۔

''یہ سرجن کردار کا کمینہ اور وقت کا بہت پابند تھا۔'' کامل نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جیسے ہی قادر کی زندگی کا چراغ گل کر کے فارغ ہوا، وہ کم بخت گیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے اسے اندر بلا لیا۔ قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا، میں نے اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالا۔''

''زبردست۔'' جاسم نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا گردن توڑ کر موت کے گھاٹ اتارنا تمہارا فیورٹ اسٹائل ہے؟''

''یہ میرا نہیں، اپنے دادا کا پسندیدہ انداز ہے جگر!'' کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دادا کہتے تھے، بعض اوقات کھوپڑی میں اور سینے میں بھی گولی اترنے کے باوجود لوگ زندہ بچ جاتے ہیں مگر گردن کا منکا اگر ٹوٹ جائے تو پھر موت لازمی ہے۔''

''تم ان دونوں لڑکیوں کو گاڑی میں پہنچانے کا انتظام کرو......'' جاسم نے کہا۔ ''میں ان دونوں معزز افراد سے ایک ضروری بات کر کے آتا ہوں۔''

''اوکے جگر......'' یہ کہتے ہوئے کامل نے ناصر اور وسیم کو آواز دے کر اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔

''ٹریسی کے باپ مائیکل کو ان لوگوں نے پہلے ہی گرین ہائی روف میں منتقل کر دیا تھا۔ ٹریسی اور نادیہ کو بھی آئندہ پانچ منٹ میں مائیکل کے قرب میں پہنچا دیا گیا۔ گرین ہائی روف کی ونڈو سائڈز اور پچھلے شیشے کے اوپر کرٹن ریلنگ لگی ہوئی تھی جس میں پردے بھی ٹنگے ہوئے تھے۔ عام حالات میں یہ پردے کھنچے رہا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت حالات عام تھے اور نہ ہی سچویشن نارمل لہٰذا ان تین بے ہوش افراد کو ہائی روف میں شفٹ کرنے سے پہلے مذکورہ پردوں کو برابر کر دیا گیا تھا۔

''تم نے ہم سے جاں بخشی کا وعدہ کیا ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔ ''اب ہمیں یہاں سے جانے دو۔''

''میں نے تمہاری جان نہ لینے کا وعدہ کیا ہے اور بے شک میں تمہیں قتل نہیں کروں گا لیکن......!''

''لیکن کیا؟'' یاسمین نے بکھری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''تم لوگوں سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، انہیں سدھارنے کے لیے ہلکی پھلکی سزا تو ملنا ہی چاہیے۔'' جاسم باری باری اُن کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تم فوراً اس بنگلے سے نکل نہ سکو۔''

''تم ہمارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' ڈاکٹر آفتاب نے متوحش نظر سے جاسم کی طرف دیکھا۔

''ہاں بتاؤ۔'' یاسمین نے کہا۔ ''تم کس ہلکی پھلکی سزا کا ذکر کر رہے ہو؟''

''اپنے دونوں ہاتھ اس چوبی میز پر رکھ دو۔'' جاسم نے ڈاکٹر آفتاب کے چہرے پر نگاہ جما کر تحکمانہ انداز میں کہا۔

ایک لمحہ سوچے بغیر ڈاکٹر نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

''ایسے نہیں...... ایک دوسرے کے اوپر۔'' جاسم نے اسے گھرکا۔

ڈاکٹر نے اپنے ایک ہاتھ کے اوپر دوسرا ہاتھ جما دیا۔

''سسٹر! اب تم اپنے دونوں ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھوں کے اوپر رکھ دو۔'' جاسم نے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔

یاسمین کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگلے ہی

لمحے اس نے بھی اپنے ہاتھ آفتاب کے ہاتھوں پر جما دیے۔ چاروں ہاتھ کسی فور سلائس سپر سینڈوچ کے مانند سج گئے تھے۔ جاسم نے اپنی گن کے سائیلنسر کو سب سے اوپر والے ہاتھ پر ٹکا کر بے رحمی سے کہا۔

''خطا ان ہاتھوں کی ہے لہٰذا پورے جسم کو ختم کر دینا ناانصافی ہو گی۔ جب تم دونوں ایک دوسرے کی ڈریسنگ سے فارغ ہو جاؤ تو سلور کلر ہائی جیٹ پر سوار ہو کر یہاں سے چلے جانا۔''

اپنی بات کے اختتام پر جاسم نے ٹریگر دبا دیا۔ بے آواز گولی ان چاروں ہاتھوں کو چھیدتے ہوئے چوبی میز میں جا دھنسی۔ گن کی تو مجبوری تھی۔ اس کے منہ پر سائیلنسر فٹ تھا، وہ گرج نہیں سکتی تھی لیکن وہ دونوں اور ان کے منہ چیخنے چلّانے کے لیے آزاد تھے۔

اگلے ہی لمحے اس آئی سی یو کی فضا آفتاب اور یاسمین کی ہیبت ناک، دل خراش چیخوں سے گونج اٹھی۔ جاسم بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے گرین ہائی روف کی جانب بڑھ گیا جہاں بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

گرین ہائی روف اسٹریٹ سے نکل کر ایم ٹی خان روڈ پر چڑھی تو کامل اپنے سیل فون پر مصروف ہو گیا۔ پہلی کال اس نے ایک نیوز چینل کے رپورٹر کو کی۔

''ہیلو فرید، کیا چل رہا ہے؟'' اس نے فرید نامی رپورٹر سے پوچھا۔

''امن و امان ہے۔ بس سوشل میڈیا نے ہماری بینڈ بجا رکھی ہے۔'' فرید نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم چاہے کیسی بھی نیوز بریک کریں، اس ایشو کے حوالے سے پہلے ہی سوشل میڈیا پر بہت کچھ اَپ لوڈ ہو چکا ہوتا ہے۔''

''مکافاتِ عمل اسی چیز کا نام ہے پیارے صاحب.....'' کامل نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اسے ''جیسی کرنی، ویسی بھرنی'' بھی کہا جاتا ہے۔ تم لوگوں نے بھی تو پرنٹ میڈیا کے ساتھ ایسا ہی ہاتھ کیا تھا۔ رات کو بارہ، ایک بجے اخبارات اپنا کام مکمل کر کے کاپی پرنٹنگ پریس بھیج دیتے ہیں۔ علی الصباح جب اخبار عوام کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے، اخبار والوں نے باسی خبریں چھاپ دی ہیں کیونکہ رات بارہ سے صبح تک ان خبروں کو اپنے چینلز پر چلا چکے ہوتے ہو۔ رات کو دیر تک جاگنے والوں کے لیے صبح کے تمام اخبارات ردّی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ہر سیر کے لیے اللہ نے سوا سیر اور ہر نہلے پر دہلا پیدا کر رکھا ہے۔ سمجھ لو سوشل میڈیا تم لوگوں پر سوا سیر اور دہلا بن کر نازل ہوا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہو۔'' فرید ذکا بیزاری سے بولا۔

''زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔'' کامل نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک لوکیشن بھیج رہا ہوں۔ اپنے کیمرا مین اور دیگر ٹیم کے ساتھ فوراً وہاں پہنچو۔ اہم پوائنٹس میں تمہیں ٹیکسٹ کر دوں گا۔ باقی کی کہانی تم خود بنا لینا۔ آج چینل کا مالک تمہاری کارکردگی سے خوش ہو جائے گا۔''

''او کے..... میں سمجھ گیا۔'' فرید نے کہا۔

دوسری کال کامل نے اے ایس آئی منظور حسین کو کی اور رابطہ ہونے پر استفسار کیا۔ ''ماموں کا کیا حال ہے؟''

یہ وہی اے ایس آئی تھا جس کے توسط سے کامل نے جلیل کو منشیات کے کیس میں پھنسایا تھا۔ اس نے بتایا۔

''وہ بندہ ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے اور جوڑ توڑ کا عمل جاری ہے۔ وہ پانچ پیٹی دینے کو تیار ہے مگر ڈیمانڈ دس پیٹی کی، کی جا رہی ہے۔ چھ، سات، آٹھ..... پر کہیں بھی معاملہ ٹھہر جائے گا۔ آپ سناؤ.....؟''

کامل نے منظور حسین کو ٹرائی اسٹار فارماسیوٹیکل کے ڈسٹری بیوشن سینٹر کی لوکیشن بتانے کے بعد پوچھا۔ ''یہاں کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہو؟''

''زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ۔'' اس نے بتایا۔ ''میں اس وقت بحریہ کمپلیکس کے نزدیک ہوں۔''

''ویری گڈ.....'' کامل نے اسے جنید واسطی اور اس کے کالے کرتوتوں کے حوالے سے بریف کرنے کے بعد کہا۔ ''تم کسی کو ساتھ لے کر فوراً اس بنگلے پر پہنچو اور پولیس ڈپارٹمنٹ میں خود کو ایک ہیرو کے طور پر منوا لو۔''

''تھینک یو.....'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں ابھی لوکیشن پر پہنچتا ہوں۔''

''اور ہاں۔'' کامل نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''وہاں پر تمہیں ایک نیوز چینل کا رپورٹر فرید ذکا ملے گا۔ میں نے فرید کو اس کی ٹیم کے ساتھ اُدھر بھیج دیا ہے۔ تم ان لوگوں کے کام میں مداخلت نہیں کرنا بلکہ فرید کے سامنے میرا نام لینا، پھر وہ تمہیں کیمرے کے سامنے ہی رکھے گا۔ عین ممکن ہے کہ وہاں پر تمہیں ڈاکٹر آفتاب اور اس کی ساتھی نرس یاسمین بھی مل جائیں لیکن اگر تم نے وہاں پہنچنے میں دیر کر دی تو وہ جائے وقوعہ سے فرار بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ دونوں پرائیویٹ اسپتال کے مالک ڈاکٹر جنید واسطی کے لیے کام کرتے ہیں۔''

"میں انہیں فرار ہونے کا موقع نہیں دوں گا۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"آل دی بیسٹ۔" کامل نے سیلولر رابطہ منقطع کرنے کے بعد ناصر کا نمبر ملایا اور اسے یہ ہدایت جاری کر دی۔

"مائی کولاچی والا برج کراس کرنے کے بعد سڑک کے کنارے رک جانا۔ تمہیں جاسم کو اس کے آفس پر ڈراپ کرنا ہے۔ سمجھ گئے؟"

"یس باس۔" ناصر کی جانب سے جواب آیا۔

کامل نے سیل فون کو ایک طرف رکھا تو جاسم نے پوچھا۔ "برو! تم ان تین بے ہوش افراد کو کہاں لے کر جا رہے ہو؟"

"اپنے ٹھکانے پر۔" کامل نے مختصر جواب دیا۔

"میں سمجھتا ہوں، انہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

"میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔"

"تو پھر......؟" جاسم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک ڈاکٹر سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔" کامل نے بتایا۔ "میں مذکورہ ڈاکٹر کو اپنے پاس بلا کر ان تینوں کا ٹریٹمنٹ کراؤں گا کیونکہ انہیں کسی اسپتال لے کر جانا ٹھیک نہیں۔ ایسی صورت میں سو قسم کے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا اور میرا آج کا دن اتنا زیادہ مصروف ہے کہ ہوسکتا ہے، آئندہ تین، چار گھنٹوں میں بعض مقامات پر مجھے سانس لینا بھی یاد نہ رہے......"

"اوہ......!" جاسم ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری مصروفیت کا یہ عالم ہے اور مجھے ناصر کے ساتھ بھیج رہے ہو؟"

جاسم کے الفاظ سے شکایت جھلکتی تھی۔ کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں آرام کرنے نہیں بھیج رہا ہوں۔ آفس پہنچ کر فریش ہو جاؤ۔ پھر بتاتا ہوں، تمہیں کیا کرنا ہے۔"

جاسم نے واضح طور پر محسوس کیا کہ کامل کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ اس میں اس کی کوئی مجبوری حائل تھی یا کسی مصلحت کا دخل تھا، بہرحال اس نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہ جانا۔ تھوڑی دیر میں وسیم نے ہائی روف کو روڈ کے کنارے پر روک دیا۔

کامل نے کہا۔ "جگر! ناصر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

"اور وہ تمہارا پلین سی......؟"

"پلین سی اس وقت پائپ لائن میں سکون کی سانس لے رہا ہے۔" کامل نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "اور جب تک میں اسے ایگزیکیوٹ نہیں کر لیتا، مجھے سکون کی سانس نہیں آئے گی۔" پھر وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے گمبھیر انداز میں بولا۔ "بتایا تو ہے، آج مجھے بہت کام ہے۔ تم بھی جلدی سے آفس پہنچو اور کام سے لگ جاؤ...... ہوں۔"

جاسم کوئی سوال کیے بغیر گاڑی سے اتر گیا۔

☆☆☆

یہ روز بدھ تیرہ تاریخ کی سہ پہر کا آغاز ہو چکا تھا۔ جاسم اس وقت ایک دم فریش تھا۔ آفس پہنچنے کے بعد اس نے پہلے شاور لیا پھر ہلکی پھلکی پیٹ پوجا کی اور اب وہ کامل کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹرائی اسٹار فارماسیوٹیکل کے ڈسٹری بیوشن ہاؤس والے مشن کو نمٹانے کے بعد کامل نے فون پر فرید ذکا اور منظور حسین کو ٹپس دی تھیں اس سے تو یہی لگتا تھا کہ آئندہ دو چار گھنٹوں میں کچھ سنسنی خیز ہونے جا رہا تھا جس کا تعلق اس کے پلان سی سے تھا۔

سیل فون کی گھنٹی بجی تو جاسم نے ڈسپلے پر نگاہ دوڑائی۔ یہ ناجیہ کی کال تھی۔ اس نے فون کال اٹینڈ کر لی۔ یہ ناجیہ کا آج کی تاریخ کا پہلا رابطہ تھا۔

"کیا تم آفس پہنچ گئے؟" ناجیہ نے چھوٹتے ہی استفسار کیا۔

"آفس پہنچ گئے کا کیا مطلب ہوا؟" وہ گڑبڑا کر بولا۔

آج کے مشن کے بارے میں جاسم نے ناجیہ کو کچھ نہیں بتایا تھا اسی لیے ناجیہ کے سوال پر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ ناجیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ تم آج صبح سے اپنے ٹھکانے پر نہیں ہو۔"

"تم نے گویا میری جاسوسی بھی شروع کر دی ہے۔" وہ قدرے خفگی بھرے انداز میں بولا۔

"جے بی! میری بات کا سیدھا جواب دو۔" ناجیہ نے زور دے کر کہا۔ "مجھے تم سے ایک ضروری معاملے پر ڈسکس کرنا ہے۔ کیا تم اس وقت آفس میں موجود ہو یا نہیں اور مصروف ہو؟"

ناجیہ کی پُراعتماد باتوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جاسم کے غیاب میں آفس کا ایک چکر لگا کر جا چکی ہے۔ بہرحال، اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔

"بالکل! میں صدیقی صاحب کے آفس میں موجود ہوں۔تم کہاں ہو؟"

"زینے پر۔" ناجیہ نے بتایا۔"چند سیکنڈ میں تمہارے سامنے ہوں گی۔"

"اوکے۔" جاسم ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔"میں دروازہ کھول رہا ہوں......آجاؤ۔"

جب وہ آمنے سامنے بیٹھ چکے تو ناجیہ نے کہا۔"جاسم! پاپا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔آج اُن کا آف ہے۔تمہیں ڈنر پر آنا ہوگا۔"

"کہاں؟" جاسم نے سوالیہ نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ظاہر ہے، ہمارے اپارٹمنٹ پر اور کہاں......" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔"کیا تمہیں اپنے گھر کا ایڈریس بھی سمجھانا ہوگا۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔"تمہارے پاپا مجھ سے کس سلسلے میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" وہ شرارت بھرے انداز میں بولی۔"میں نے سر کو بھی اس حوالے سے بتا دیا ہے۔ہوسکتا ہے، سر تم سے کوئی بات بھی کریں۔بس، تم وقت پر پہنچ جانا۔"

اسی لمحے جاسم کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔دوسری جانب کامل تھا۔جاسم نے ناجیہ سے ایک منٹ کہتے ہوئے کامل کی کال اٹینڈ کرلی۔

"کیا کر رہے ہو جگر؟" رسمی علیک سلیک کے بعد کامل نے پوچھا۔

"بس، بیٹھا ہوں۔" جاسم نے جواب دیا۔"تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا۔"

"خالی بیٹھنا ٹھیک نہیں۔" کامل نے کہا پھر ایک معروف و معتبر نیوز چینل کا نام لینے کے بعد کہا۔"ٹی وی آن کرلو۔میں نے تمہاری تفریح طبع کا بندوبست کیا ہے۔"

جاسم نے دیوار پر آویزاں کنگ سائز ایل ای ڈی آن کر کے مذکورہ نیوز چینل لگا لیا۔اس وقت چینل پر کسی پولیس آپریشن کی رپورٹ پیش کی جارہی تھی جس کے مطابق، آج دوپہر پولیس نے ایک مقامی پوش رہائشی ایریا کے ایک بنگلے پر چھاپا مار کر سماج دشمن عناصر کے ایک گروہ کا پردہ فاش کیا تھا۔مذکورہ بنگلے پر ایک فرضی فارماسیوٹیکل کمپنی "ٹرائی اسٹار" کا بورڈ لگا کر اس کی آڑ میں ایک گھناؤنا کام کیا جارہا تھا۔بنگلے کے اندر جدید لیبارٹری، آئی سی یو روم اور آپریشن تھیٹر کی سہولت موجود تھی۔موقع پر دو زخمی افراد کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا جن میں ایک ڈاکٹر آفتاب اور دوسری اس کی معاون وسسٹر یاسمین تھی۔ان کے بیان کے مطابق، اس بنگلے میں ڈاکٹر جنید واسطی کے حکم پر لوگوں کے قیمتی اعضا جسم کے اندر سے نکال لیے جاتے تھے۔بعدازاں ان ہیومن آرگنز کو مہنگے داموں ضرورت مند امیر لوگوں میں ٹرانس پلانٹ کیا جاتا تھا۔ڈاکٹر آفتاب نے بتایا کہ وہ لوگ آج ہارٹ سرجن جمیل باقر کی مدد سے ایک لڑکی نادیہ کا سینہ چیر کر اس کا دل نکالنے والے تھے کہ یکایک دو خدائی فوجدار گن بہ دست وہاں آن ٹپکے۔انہوں نے آناً فاناً سرجن جمیل باقر اور ڈاکٹر جنید واسطی کے تین نمک خواروں قادر، بشارت اور طارق کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔انہوں نے ڈاکٹر آفتاب اور نرس یاسمین کو محض گھائل کرنے پر اکتفا کیا اور بے ہوش نادیہ کو لے کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ڈاکٹر آفتاب نے بتایا کہ حملہ آوروں نے اپنے چہروں پر ڈھاٹے لگا رکھے تھے لہٰذا وہ لوگ ان کی صورتیں نہیں دیکھ سکے۔آفتاب نے خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ سنگین کارروائی ڈاکٹر جنید واسطی کے کسی خطرناک دشمن کی معلوم ہوتی ہے۔آفتاب کے آخری الفاظ بڑے رقت انگیز اور متاثر کن تھے۔

"میں اپنے کردار پر بے حد شرمندہ ہوں۔میں نے میڈیکل کے پیشے کے ساتھ بدترین غداری کی ہے۔اس کی مجھے جتنی بھی سزا دی جائے، کم ہے۔میں نے جنید واسطی جیسے ننگِ انسانیت شخص کا آلہ کار بن کر ظلم، بے غیرتی اور بے حسی کی انتہا کر دی تھی لیکن میڈیا اور پولیس کے سامنے یہ سچائی بیان کرنے کے بعد میرا ضمیر مطمئن ہوگیا ہے۔میں کڑی سے کڑی سزا پانے کے لیے تیار ہوں۔"

رپورٹر نے مزید بتایا۔"اس معاملے کے ساتھ ڈاکٹر جنید واسطی کا نام جڑ جانے کے بعد ان سے بھی رابطہ کیا گیا تو اس نے ایسے کسی بنگلے اور وہاں ہونے والی غیر نصابی سرگرمیوں سے قطعی لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔جنید واسطی نے میڈیا کو بتایا کہ اس کے خلاف کسی شخص نے بھیانک سازش کی ہے۔شاید یہ دہشت گردوں کا وہی گروہ ہے جو پچھلے کچھ عرصے سے اسے دھمکی آمیز کالز کر رہا ہے۔وہ جب ان لوگوں کی دھمکیوں سے نہیں ڈرا تو انہوں نے اسے بدنام کرنے کے لیے یہ ہتھکنڈا آزمایا ہے۔پولیس کی تفتیش جاری ہے۔"

"جب تم ہائی روف کے اندر اے ایس آئی منظور حسین اور نیوز چینل رپورٹر فرید ذکا کو خصوصی ہدایات دینے

میں مصروف تھے تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تم پہلے سے سوچے ہوئے کسی منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہے ہو۔" جاسم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "لیکن ایک بات میرے پلے نہیں پڑی۔"

"کون سی بات جگر؟" کامل نے پوچھا۔

نیوز چینل دیکھنے کے دوران میں جاسم، کامل سے مسلسل سیلولر رابطے پر تھا اور ناجیہ گمبھیر خاموشی کے ساتھ کبھی ایل ای ڈی کی اسکرین اور کبھی جاسم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔

"ڈاکٹر آفتاب کا بیان مجھے ہضم نہیں ہو رہا۔" جاسم نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "اگر وہ اور سسٹر یاسمین پولیس کے ہتھے چڑھ بھی گئے تھے تو ڈاکٹر نے ایسا بیان کیوں دیا جو ہمارے حق میں اور ڈاکٹر جنید واسطی کے سراسر خلاف جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر آفتاب ہمارا پلانٹ کیا ہوا بندہ ہے۔"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جب تمہارے جلیل ماموں نے پولیس کے سامنے اپنے بھانجے یعنی تمہارا ذکر گول کر کے، اپنے اغوا اور تاوان کا سارا ملبا شعیب چاچا پر ڈال دیا تھا۔" کامل نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے بھی وہ خلافِ توقع معاملہ بالکل ہضم نہیں ہوا تھا۔ پھر تم نے مجھے چورن دیا تو بات بن گئی۔ کیا میں تمہیں بھی تھوڑا چورن چٹاؤں؟"

کامل کی پُرمعنی بات کے جواب میں جاسم نے دلچسپی بھرے انداز میں کہا۔ "ہاں، ہاں...... ضرور۔"

"جس طرح میں نے ٹریسی اور مائیکل کے بارے میں اپنا ہوم ورک مکمل کر رکھا تھا، بالکل ویسے ہی میں نے ڈاکٹر جنید واسطی کی نگرانی میں چلنے والے اس خفیہ آپریشن تھیٹر کے بارے میں بھی مکمل معلومات حاصل کر رکھی تھیں لیکن میں نے اس حوالے سے بہت ساری باتوں کا تم سے ذکر نہیں کیا تھا۔" کامل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اور اس میں میری کوئی بدنیتی شامل نہیں۔"

"میں نے ایسا کب کہا؟" کامل بولتے بولتے رکا تو جاسم نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "تم اپنی بات جاری رکھو۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔"

"مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ٹرائی اسٹار فارماسیوٹیکل والے اس بنگلے پر قائم جنید واسطی کے آپریشن تھیٹر پر ڈاکٹر آفتاب ایک اہم کردار ہے لہٰذا میں نے اس کی کنڈلی نکال کر اس کے گھر اور فیملی سے متعلق تمام اہم معلومات حاصل کر کے اُن سے کھیلنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔" کامل نے بتایا۔ "لیکن میں قادر، بشارت اور طارق کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ ریلوے اسٹیشن سے وہ لمبو قادر اُن باپ بیٹی کو لے کر اسی خفیہ آپریشن تھیٹر میں پہنچا دے گا مگر جب ہائی جیٹ ایم ٹی (مولوی تمیز الدین) خان روڈ پر آگے ہی آگے بڑھتی گئی تو مجھے ان لوگوں کی منزل کا اندازہ ہو گیا تھا۔"

"سمجھ گیا۔" جاسم نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "اور وہ چورن؟"

"آج صبح ہی سے میرے دو آدمی ڈاکٹر آفتاب کے گھر کی نگرانی پر مامور تھے۔ وہ دونوں مسلح اور میرے اشارے کے منتظر تھے۔ جب میں نے ہارٹ سرجن جمیل باقر کا روپ دھارا تو اپنے بندوں کو بھی گرین سگنل دے دیا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر آفتاب کے گھر میں گھس کر اس کی خوب صورت بیوی شگفتہ کو یرغمال بنا لیا تھا۔" کامل نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "جب کسی کی حسین و جمیل بیوی کی کھوپڑی پر خطرناک گن کی نال ٹکی ہو تو وہ ہر قسم کا بیان دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔"

"اگر ڈاکٹر آفتاب نے بعد میں اپنا بیان بدل دیا تو......؟" جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اگر جلیل ماموں نے بعد میں اپنا بیان بدل دیا تو......؟" کامل نے جاسم کے سوال کو اسی پر لوٹاتے ہوئے استفسار کیا۔ "جگر! ہمارے دھندے میں بعد کی بعد میں دیکھی جاتی ہے لہٰذا تم ٹینشن نہ لو۔ میں ذرا جنید واسطی کے مہنگے پرائیویٹ اسپتال کی خبر لے لوں، پھر تمہیں کال کرتا ہوں۔ ٹی وی اسکرین کے سامنے سے ہٹنا نہیں۔ ایک بریکنگ نیوز بڑی بے چینی سے تمہاری بصارت اور سماعت میں سمانے کے لیے مچل رہی ہے۔"

جاسم نے سیل فون رکھا تو ناجیہ کی چشم خشم آلود سے اس کا سامنا ہوا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے خفگی آمیز انداز میں بولی۔

"جے بی پلیز...... کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ تم سدھرنے والے نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ دماغ سوزی کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"کامل سے میری گفتگو کو مکمل ہو جانے دو، پھر میں تمہیں اس معاملے کے پس منظر سے آگاہ کر دوں گا۔" جاسم نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "جب حقیقت تم پر کھلے گی تو تمہارا سارا غصہ ہوا ہو جائے گا۔"

"مجھے کسی حقیقت سے روشناس نہیں ہونا جے پی۔" وہ جاسم کو نظرانداز کر کے ایل ای ڈی کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمہیں چوڑیاں پہن کر اور مہندی لگا کر گھر پر بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ استنبول والا پروجیکٹ مکمل ہونے تک تم کسی بھی پھڈے میں نہ پڑو کیونکہ اس سیریل کی تکمیل کے ساتھ تمہارا مستقبل جڑا ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر قدرے روہانسی ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"آج پاپا سے ہونے والی تمہاری ون ٹو ون میٹنگ سے بھی کوئی مثبت نتیجہ نکلنے والا نہیں۔"

"جب تم اپنی ہی کہے چلی جاؤ گی تو پھر میرے کچھ کہنے کا کیا فائدہ......" جاسم نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "جب تمہارا موڈ ٹھیک ہو جائے گا، تب بات کریں گے۔"

اِدھر جاسم کی بات ختم ہوئی اُدھر اسکرین پر جنید واسطی کے اسپتال کا بیرونی منظر دکھایا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کامل کی کال بھی آ گئی۔ اس نے چہک کر پوچھا۔

"جگر! ٹی وی آن ہے نا؟"

"ہاں، اور میری نظر جنید واسطی کے اسپتال پر ہے۔"

"ویری گڈ!" کامل نے توانا لہجے میں کہا۔ "یہ لائیو ٹیلی کاسٹ ہے۔ میں سیلولر لائن پر موجود ہوں۔ کوئی چیز سمجھ میں نہ آئے تو پوچھ لینا۔ میں نے اپنا پلان سی ایگزیکیوٹ کر دیا ہے۔"

"پلین سی...... او مائی گاڈ......" بے ساختہ جاسم کے منہ سے نکلا۔ "ٹھیک ہے، میں لائیو کوریج کو پوری توجہ سے دیکھ رہا ہوں۔"

اس وقت جاسم کی نگاہ کے سامنے جو منظر تھا، اس میں سب انسپکٹر لیول کا ایک پولیس اہلکار میڈیا والوں کے سوالات کا سامنا کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بم ڈسپوزل اسکواڈ کے چند افراد بھی نظر آ رہے تھے۔ علاوہ ازیں پبلک کی تعداد کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہاں کوئی روڈ شو ہو رہا ہے۔ سب انسپکٹر کے ساتھی پولیس اہلکاروں نے عوام کو بمشکل کنٹرول کر رکھا تھا۔

ایک ٹی وی رپورٹر نے پولیس آفیسر سے سوال کیا۔ "آپ کو اس بم کی اطلاع کس نے دی تھی؟"

"اس اسپتال کے ایڈمنسٹریشن والوں نے پولیس اسٹیشن فون کر کے ہمیں اس بم کے بارے میں بتایا تھا۔ انہیں کسی گمنام کالر نے فون کر کے اطلاع دی تھی کہ اسپتال کے بیسمنٹ میں ایک طاقتور بم پلانٹ کیا گیا ہے جو ٹھیک ساڑھے تین بجے بلاسٹ ہو جائے گا۔" سب انسپکٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ہم لوگ بم ڈسپوزل اسکواڈ کے ساتھ فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ سب سے پہلے ہم نے اس اسپتال کو انسانوں سے خالی کروایا۔ اس کے ساتھ ہی بم ڈسپوزل اسکواڈ بیس منٹ میں پہنچ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور...... الحمدللہ! اس ٹیم نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بلاسٹنگ ٹائم سے دس منٹ پہلے ہی اس مہلک بم کو ڈیفیوز کر دیا ہے۔ اگر یہ بم پھٹ جاتا تو اسپتال کی عمارت کو ملبے کے ڈھیر میں بدلتے ہوئے چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔"

"اسپتال کے مالک سے آپ کی بات ہوئی؟" ٹی وی رپورٹر نے پوچھا۔

"جی بالکل۔" پولیس آفیسر نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "ڈاکٹر جنید واسطی کا کہنا ہے کہ دہشت گردوں کا ایک گروہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ پولیس کو باخبر کرنے کی صورت میں وہ لوگ ڈاکٹر جنید واسطی اور اس کی فیملی کو بم سے اُڑانے کی دھمکی دیتے ہیں اسی لیے اب تک ڈاکٹر جنید واسطی نے اپنی زبان نہیں کھولی تھی۔ جنید واسطی نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ دہشت گردوں کے اس گروہ میں پڑھے لکھے پروفیشنلز بھی شامل ہیں۔ ایسے ہی دہشت گردوں کے ایک ساتھی ڈاکٹر آفتاب نے آج دوپہر میں پولیس کو گرفتاری دیتے ہوئے، جنید واسطی کو بدنام کرنے کے لیے بہت زیادہ زہر اُگلا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب اور اس کی ساتھی نرس یاسمین اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہیں۔"

"ایک بات کلیئر کریں آفیسر......" رپورٹر نے چبھتا ہوا سوال کیا۔ "اس دہشت گرد گروہ کی ڈاکٹر جنید واسطی سے کیا دشمنی ہے۔ آخر وہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

"دولت...... بے تحاشا دولت۔" سب انسپکٹر نے دونوں ہاتھ پھیلا کر جواب دیا۔ "انہوں نے ڈاکٹر جنید واسطی سے ہاف بلین کا مطالبہ کیا تھا...... پورے پچاس کروڑ روپے۔"

"برو! تمہارا پلین سی تو بُری طرح فلاپ ہو گیا۔" جاسم نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

"جگر! ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔" کامل چہک کر بولا۔

کامل کے لہجے سے جھلکنے والے بے پناہ اعتماد نے

جاسم کے دل و دماغ میں کھلبلی مچا دی۔ بے ساختہ اس کی زبان سے پھسل گیا۔
''کیا مطلب ہے تمہارا؟''
کامل کے جواب دینے سے پہلے ہی اسکرین پر ایک مہیب، دلدوز دھماکا ہوا۔ وہاں پر موجود لوگ خوف زدہ ہوکر جدھر منہ اٹھا، چیختے چلّاتے ہوئے بھاگ نکلے۔ وہ دھماکا جنید واسطی کے اسپتال کی عمارت کے اندرونی حصے میں ہوا تھا۔
''جگر......'' کامل کی سنسناتی ہوئی آواز جاسم کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''بیس منٹ والا بم تو محض چارا تھا۔ وہ ڈیفیوز نہ بھی کیا جاتا تو اسے گیلے پٹاخے کے مانند ٹھُس ہوجانا تھا۔ اصل بم تو میں نے اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں پلانٹ کروایا تھا۔ ہیومن آرگنز کی اس آپریشن تھیٹر میں پلانٹیشن تو بہت ہو چکی...... میری ''پلانٹیشن'' نے ایک ہی جھٹکے میں شیطان صفت ڈاکٹر جنید واسطی کی کروڑوں کی میڈیکل مشینری اور اسپتال کی ریپوٹیشن کو ہوا میں اُڑا دیا...... بوووم!''
کامل نے ڈاکٹر جنید واسطی کو بڑا لاجواب جھٹکا دیا تھا جس کے مابعد اثرات سلسلے وار جنید واسطی کے بزنس پارٹنر شیطان ابن شیطان اور درندے صفت شعیب چاچا تک بھی پہنچنا تھے جو اس کی بنیاد کو ہلانے اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی شروعات تھی۔
جب تک اللہ کے حکم سے اس کائنات کا نظام چلتا رہے گا، شیطان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے بارے میں سوچنا بُرا نہیں لیکن اس مردود کا خاتمہ ممکن نہیں کیونکہ وہ اس کھیل کا سب سے طاقتور ولن ہے، اس کی موجودگی ہی سے اس تماشے میں رنگ اور جنگ ہے۔ البتہ، یہ ضرور ہے کہ جاسم و کامل اور انہی کی سوچ کے حامل افراد شیطان کی بنیاد کو ہلانے کی غرض سے شعیب چاچا اور ڈاکٹر جنید واسطی جیسے مردودوں کا ناک میں دم کیے رہیں گے۔
کامل نے بے ضمیر ڈاکٹر جنید واسطی کو بڑا زوردار جھٹکا دیا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر اس بم بلاسٹ کی لائیو کوریج جاری تھی۔ ناظرین، ڈاکٹر جنید واسطی کے اس مہنگے پرائیویٹ اسپتال کی تباہی و بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسپتال کا اوٹی (آپریشن تھیٹر) مکمل طور پر ملبے میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اسپتال کی عمارت کے دیگر حصوں کو بھی شدید نقصان پہنچا تھا تاہم کسی جانی زیاں کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔
جاسم کی نگاہ ایل ای ڈی پر جمی تھی اور کامل سے اس کا سیلولر رابطہ بھی تھا۔ اس دوران میں ناجیہ چپ چاپ، لاتعلق سی بیٹھی تھی مگر اس کے ذہن میں سنگین سوچوں کا جوار بھاٹا اپنے عروج پر تھا۔ کامل کی چہکتی ہوئی آواز نے جاسم کی سماعت تک رسائی حاصل کرلی۔
''جگر......!'' وہ جوشیلے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''میرا پلان سی تمہیں کیسا لگا؟''
''سپرب پرفارمنس۔'' جاسم نے ستائشی انداز میں جواب دیا۔ ''پلین (پلان) سی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی ایگزیکیوشن سے کسی بے گناہ انسان کی جان نہیں گئی۔ اول آخر سارا نقصان تخم ابلیس ڈاکٹر جنید واسطی کا ہوا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔''
''میں تھوڑی دیر کے بعد تم سے تفصیلی بات کروں گا۔'' کامل نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''ہمارے انٹاغفیل مہمانوں کو ہوش آگیا ہے۔ میں ذرا ان کی خبر لے لوں۔''
''اوکے، ٹیک کیئر۔'' جاسم نے کہا۔
کامل بولا۔ ''ٹوٹو......!''
جاسم نے سیل فون رکھا تو ناجیہ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''تو میں چلوں؟''
''کہاں؟''
''ظاہر ہے، اپنے گھر ہی جاؤں گی۔'' اس نے روکھے انداز میں جواب دیا۔ ''تمہاری دعوت کی تیاری کا بہت سا کام باقی ہے۔ تم وقت پر آجانا۔''
''لیکن تم نے وقت تو بتایا ہی نہیں۔'' جاسم نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔
''ڈنر دس بجے کریں گے۔'' ناجیہ نے بتایا۔ ''تم نو بجے تک آجاؤ تاکہ تم سے بات بھی کرلیں...... میرا مطلب ہے، پاپا۔''
''میں تمہارے پاپا سے تو بات کرہی لوں گا۔'' جاسم اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا موڈ کیوں آف ہے؟''
''جے لی! میری ذہنی کیفیت سے اَن جان بن کر مجھے ٹارچر نہ کرو۔'' وہ خفگی بھرے لہجے میں بولی۔
''اچھا، اتنا بتادو کہ کب تک ناراض رہوگی؟''
''میری ناراضی سے تمہیں فرق پڑتا ہے؟'' ناجیہ نے شاکی سوالیہ نظروں سے اُسے گھورا۔
''کیوں نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میری زندگی میں ایک تم ہی تو ہو۔ تمہاری ناراضی اور خوشی دونوں مجھے متاثر کرتی ہیں۔''

"انسان جس کے نزدیک ہوتا ہے، اس شخص کے جذبات کا احترام اس پر واجب ہوجاتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟" جاسم نے اُلجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔ "میں نے کب تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے؟"

"جو اپنوں کے جذبات کا احترام کرتا ہے، وہ اُن کی بات بھی مانتا ہے۔"

"اوہ...... تو تمہارا اشارہ آج والے واقعات کی جانب ہے۔" جاسم نے اس کی معنی خیز بات کے جواب میں کہا۔ "تم نے مجھے آؤٹ ڈور ایکٹی ویٹی سے منع کیا تھا اور میں باز نہیں آیا...... ہیں نا۔"

"جے بی! عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور میری نظر میں تم ایک سمجھ دار انسان ہو۔" ناجیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ میری کسی بات کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لگتا ہے، تم نے اپنے دونوں کانوں کے بیچ میں نلکی فٹ کر رکھی ہے اسی لیے میرے الفاظ تمہارے ایک کان سے داخل ہوکر پلک جھپکتے میں، دوسرے کان سے خارج ہوجاتے ہیں۔"

ناجیہ کی لتاڑ پر جاسم جز بز ہوکر رہ گیا۔ اس نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے ناجیہ......"

"نظر تو ایسا ہی آرہا ہے۔ باقی نیت کا حال اللہ جانتا ہے۔"

"اگر آج ہم لوگ اس بنگلے پر ہلّا نہیں بولتے تو شیطان کے چیلوں نے ٹریسی کے دونوں گردے اور نادیہ کا دل نکال لینا تھا۔" جاسم نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "باقی ڈاکٹر جنید واسطی کے اسپتال میں دھماکا کرنے کا منصوبہ کامل کا تھا اور اس نے مجھے اپنے اس پلین سے قطعی لاعلم رکھا تھا اور جہاں تک جلیل ماموں کا معاملہ ہے تو......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اس کمینے انسان کو دیکھ لینے کے بعد میرے تن بدن میں ایک خوفناک آتش فشاں جاگ اٹھا تھا۔ میں نے اپنی آتشی سوچ کو تھپک تھپک کر ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی، پھر جب کامل کی شکل میں مجھے ایک مضبوط اور محفوظ سہارا مل گیا تو میں نے اس رذیل شخص کو کڑی سزا دینے کے منصوبے پر عمل کر ڈالا۔ بتاؤ، میں نے کیا غلط کیا ہے؟"

"کسی صد فیصد درست کام کو اگر غلط انداز میں یا غلط وقت پر کیا جائے تو وہ انسان کی غلطی بن جاتا ہے جے بی۔" وہ جاسم کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھوس انداز میں بولی۔ "جو گزر گیا، اس پر مٹی ڈالو۔ آج تیرہ تاریخ ہے اور سولہ تاریخ کی دوپہر ہم لوگ استنبول کے لیے فلائی کرنے والے ہیں۔ اب صرف دو دن بچے ہیں یعنی چودہ اور پندرہ تاریخ۔ کیا میں تم سے کوئی اچھی امید رکھ سکتی ہوں؟"

ناجیہ کے آخری سوالیہ جملے نے جاسم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اضطراری لہجے میں جواب دیا۔ "بالکل، کیوں نہیں...... تمہیں مجھ سے ہمیشہ اچھے ہی کی توقع رکھنا چاہیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس لمحے سے میں اس آفس میں خود کو مکمل طور پر نظر بند کرلوں گا اور جب ہمارا یونٹ استنبول یاترا کے لیے ائرپورٹ جارہا ہوگا، تبھی میں یہاں سے باہر قدم نکالوں گا۔"

"یہ تو بڑا خطرناک اور مایوس کن وعدہ ہے۔" ناجیہ نے شکایتی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "وہ کس طرح؟"

"اگر تم اپنے اس وعدے کو ایفا کرنے پر ڈٹ گئے تو میرے پاپا کا کیا ہوگا۔ وہ آج ڈنر پر تم سے بہت ساری ضروری باتیں کرنے والے ہیں۔"

"تم بھی نا......" جاسم نے اسے گھورا۔ "میرا مطلب یہ تھا کہ جب میں تمہارے گھر میں ڈنر کرنے کے بعد واپس یہاں آجاؤں گا تو اس کے بعد استنبول روانگی تک میں خود کو اس آفس میں مقید کرلوں گا۔"

"بہتر......" ناجیہ نے شاباشی دینے والے انداز میں کہا۔

ناجیہ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سرمد صدیقی آفس پہنچ گئے۔ انہوں نے آتے ہی جاسم کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد صدیقی نے پوچھا۔

"ناجیہ سے تمہاری بات ہوگئی؟"

"یس سر!" جاسم نے اثبات میں جواب دیا۔ "وہ ابھی تو یہاں سے گئی ہے۔"

"آج تمہیں اس کے گھر دعوت پر جانا ہے۔" سرمد صدیقی نے کہا۔ "اس کے پاپا اور میرے دوست غفار داؤد تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"ضروری باتوں کا ذکر تو ناجیہ نے کیا تھا مگر اُس کی

وضاحت نہیں کی اور میں نے پوچھا بھی نہیں۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ انکل غفار کے دوست ہیں۔ یقیناً آپ کو آج والی میٹنگ کی تفصیل معلوم ہوگی۔''

جاسم نے بال کو سرمد صدیقی کی کورٹ میں پھینکا تو وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولے۔

''جے بی! میں نے تمہیں کبھی غیر نہیں سمجھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم اور ناجیہ سال، ڈیڑھ سال سے ریلیشن شپ میں ہو۔ تم دونوں ایک دوسرے کو دل سے پسند کرتے ہو۔ میرے توسط سے یہ باتیں غفار دادؤ تک پہنچی ہیں۔ اگرچہ ناجیہ ان کی سگی اولاد نہیں لیکن انہوں نے اسے ایک حقیقی باپ سے بڑھ کر محبت اور توجہ دی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم دونوں کے اس تعلق کو قانونی اور شرعی حیثیت حاصل ہو جائے۔ جب تم لوگ استنبول والے مشن سے کامیاب لوٹو تو اس نیک کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ غفار دادؤ اسی سلسلے میں تم سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم بڑی خوب صورتی سے اس میٹنگ کو ہینڈل کرلو گے۔''

''سر! میں آپ کی امید پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

''ایک توقع مجھے تم سے اور بھی ہے۔''

جاسم نے چونک کر صدیقی کی طرف دیکھا اور بولا۔

''وہ کیا سر؟''

صدیقی نے کہا۔ ''اب میں تم سے جو سوال کروں، اس کا تم مجھے سولہ آنے درست جواب دوگے۔''

''او کے سر!'' جاسم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''جی پوچھیں۔''

''آج دن بھر ڈاکٹر جنید واسطی کے اسپتال اور بنگلے کے حوالے سے جو سنسنی خیز نیوز چل رہی ہیں، ان میں تمہارا ہی ہاتھ ہے نا؟'' صدیقی نے سرسراتی آواز میں استفسار کیا۔

''صرف میرا نہیں سر......''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' صدیقی تعجب خیز نظر سے جاسم کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''میں تمہاری بات کو سمجھ نہیں پایا۔''

جاسم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔

''ہم دونوں کا ہاتھ ہے یعنی میرا اور کامل کا......''

''اوہ......'' صدیقی ایک متفکر سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔ ''اس کی تفصیلات کیا ہیں؟''

سرمد صدیقی کے سامنے واقعاتی ہیر پھیر کرنا جاسم کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ ناجیہ حقیقتِ حال سے واقف تھی۔ اگر صدیقی اس ذیل میں ناجیہ سے پوچھ تاچھ کرتے تو جاسم کا جھوٹ چھپا نہ رہتا لہٰذا راست گوئی ہی میں عافیت تھی چنانچہ جاسم نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنے پروڈیوسر کو اس سنگین صورتِ حال سے آگاہ کردیا اور آخر میں کہا۔

''سر! آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے ایس پی دوست شعیب چاچا کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر جنید واسطی، شعیب کا پارٹنر ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا، وہ سراسر ان دونوں شیطانوں کا نقصان ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہیومن آرگنز کی غیر قانونی ٹرانس پلانٹیشن کا معاملہ پہلی مرتبہ میڈیا میں رجسٹر ہوا ہے۔ یہ سماج دشمن عناصر کے خلاف ہماری ایک بڑی کامیابی ہے۔''

سرمد صدیقی نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایس پی احسان الحق صاحب اپنے طریقے سے شعیب چاچا اور اس کے دیگر پارٹنرز کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ تم لوگوں نے اپنے طور پر ایک بڑی کارروائی کی ہے لیکن میری نظر میں یہ تمہاری کھلی وعدہ خلافی ہے جبکہ میں اپنے وعدے پر قائم و دائم ہوں۔''

جاسم نے ندامت بھرے انداز میں کہا۔ ''مجھ سے غلطی ہوگئی سر...... آئی ایم ویری سوری۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ ایسی کسی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کروں گا۔''

''دیٹس گڈ!'' صدیقی نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم خیر سے استنبول والا کام مکمل کر کے واپس آؤ۔ میں خود تمہیں ایس پی صاحب سے ملواؤں گا۔ تمہیں جو بھی کرنا ہے، احسان الحق کی نگرانی اور ہدایات کے مطابق کرنا ہے۔''

''سمجھ گیا سر!'' وہ فرمانبرداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

''شاباش!'' صدیقی نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔ ''اب جاکر تیاری کرو۔ آج تمہیں اپنے ہونے والے سسر سے ون ٹو ون میٹنگ کرنا ہے۔''

''یس سر......'' جاسم نے مختصر جواب دیا۔

لگ بھگ آٹھ بجے کامل نے جاسم سے سیلولر رابطہ کیا۔ تب تک جاسم تیار ہو چکا تھا اور چند منٹ میں وہ ناجیہ کی طرف روانہ ہونے ہی والا تھا۔ جاسم نے کامل کی کال پک کر لی اور کہا۔

''برو! کیا خبریں ہیں؟''

''مائیکل اور ٹریسی کو حالات کی سنگینی سے مکمل آگاہی دینے کے بعد جعفری چشمے والی گلی میں، سارہ کے گھر پہ

حفاظت پہنچا دیا گیا ہے۔'' کامل نے بتایا۔ ''وہ دونوں بہت زیادہ ڈرے ہوئے ہیں۔ بہر حال میں نے انہیں تسلی دی ہے کہ گردہ چور گروہ اب اُن کا پیچھا نہیں کرے گا، وہ لوگ اپنے پروگرام کے مطابق جو کرنا چاہیں کریں۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جگر! میں اُن باپ بیٹی کے لیے فی الحال اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتا۔''

''ٹھیک ہوگیا...... یہ بھی بہت ہے۔'' جاسم نے کہا پھر پوچھا۔ ''اور اس لڑکی نادیہ کا کیا اسٹیٹس ہے؟''

''وہ ہوش میں ہے اور بالکل ٹھیک ٹھاک بھی لیکن اس کا کیس خاصا پیچیدہ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' جاسم نے پوچھا۔

''وہ اپنے گھر جانے کے لیے راضی نہیں۔''

''کیوں؟''

''چندروز پہلے وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔'' کامل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس نے اپنے عاشق ساجد نامی ایک شخص کے ساتھ کراچی سے لاہور جانے اور وہاں سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان دونوں کو سہراب گوٹھ والے کوچ اسٹینڈ سے روانہ ہونا تھا لیکن ساجد وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ پہلے نادیہ کا خیال تھا کہ ساجد کسی مشکل میں پھنس گیا ہوگا مگر اب اُسے یقین ہے کہ اس کے عاشق نے بزدلی دکھائی ہے۔ بہرکیف، سہراب گوٹھ والے کوچ اسٹینڈ پر نادیہ، ڈاکٹر جنید واسطی کے لیے کام کرنے والی ''مارکیٹنگ ٹیم'' کے ہتھے چڑھ گئی اور انہوں نے نادیہ کو اس بنگلے پر پہنچا دیا جہاں سے ہم نے اسے ریسکیو کیا ہے۔''

''انٹرسٹنگ۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا پھر سوال کیا۔ ''نادیہ نے اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ بتایا؟''

''وہ فیڈرل بی ایریا کی رہنے والی ہے اور اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔'' کامل نے بتایا۔ ''اس کی ماں جمیلہ ایک نابینا عورت ہے اور باپ مولوی یعقوب کھانے اور چائے کا ایک چھوٹا سا ہوٹل چلاتا ہے۔ نادیہ کا کہنا ہے کہ اس کا باپ انتہائی غصہ ور، سخت گیر اور پرانے خیالات کا مالک ہے۔ اگر وہ واپس گھر گئی تو یعقوب اس کے ٹکڑے کرکے چیل کووں کو کھلا دے گا۔ وہ حد سے زیادہ خوف زدہ ہے اور گھر واپسی کا ذکر سنتے ہی رونے لگتی ہے۔''

''اوہ...... یہ تو خاصی تشویشناک صورتِ حال ہے۔''

جاسم نے تاسف بھرے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''پھر تم نادیہ کا معاملہ کیسے نمٹاؤ گے؟''

''میں مولوی یعقوب جیسے ٹیڑھے اور خرد ماغ لوگوں سے نمٹنا اچھے سے جانتا ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''جب تک نادیہ کی واپسی کی راہ محفوظ انداز میں ہموار نہیں ہو جاتی، میں اسے اپنے پاس ہی رکھوں گا اور میں نے نادیہ سے، اس کے ڈرپوک وعدہ خلاف بے وفا عاشق ساجد کا ایڈریس اور سیل نمبر بھی لے لیا ہے۔ اس کم ظرف کو سبق سکھانا بھی ضروری ہے تاکہ آئندہ وہ کسی لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اس قسم کی گھٹیا بزدلانہ حرکت کی جرأت نہ کر سکے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو برو۔ غلطی اور سزا لازم و ملزوم ہیں۔ غلطی کرنے والے کو فوری سزا دے کر ہی اس دنیا سے غلطیوں کی تعداد اور مقدار کو کم کیا جاسکتا ہے۔'' جاسم نے کہا۔ ''میں تم سے رات میں تفصیلی بات کروں گا۔ ابھی میں کہیں جانے کے لیے نکل رہا ہوں۔''

''کہاں کا ارادہ ہے جگر؟''

''ناجیہ کے پاپا نے کوئی ضروری بات کرنے کے لیے مجھے ڈنر پر بلایا ہے۔'' جاسم نے بتایا۔

کامل نے معنی خیز انداز میں دریافت کیا۔ ''اس ضروری بات کا تعلق کہیں شہنائی کی آواز سے تو نہیں؟''

''ایسا ہوسکتا ہے۔'' جاسم نے گول مول جواب دیا۔

''آل دی بیسٹ جگر۔'' کامل نے خلوصِ دل سے کہا پھر اچانک کچھ یاد آجانے والے انداز میں بولا۔ ''میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

''وہ گڈز ٹرانسپورٹر اشفاق علی دو گھنٹے پہلے چل بسا ہے۔''

''اوہ......'' جاسم نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''ایسے عیاش طبع، بدکردار لوگوں کا اٹھ جانا ہی بہتر ہے۔ اشفاق جیسے بدعنوان، خبیث فطرت کردار اس معاشرے کی گندگی ہیں...... خس کم، جہاں پاک!''

''صحیح کہا۔'' کامل نے حتمی لہجے میں کہا۔

جاسم نے سیلولر رابطہ موقوف کیا اور ناجیہ کے اپارٹمنٹ جانے کے لیے سرمد صدیقی کے آفس سے نکل گیا۔

☆☆☆

اس وقت نو بجے تھے۔ رات نے اپنے سفر کا آغاز کر

دیا تھا۔ جاسم نے ناجیہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچنے کے بعد ڈوربیل کا بٹن دبا دیا۔ وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ آج ناجیہ کے پاپا غفار داؤد سے ہونے والی میٹنگ کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔

اطلاعی گھنٹی کے جواب میں اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ کھلا اور وہاں پر غفار داؤد کی شکل دکھائی دی حالانکہ جاسم، ناجیہ سے سامنا ہونے کی توقع کررہا تھا۔ غفار داؤد کی صورت دیکھتے ہی جاسم کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ ناجیہ کا پاپا بے حد بوکھلاہٹ کا شکار نظر آتا تھا۔ قبل اس کے کہ جاسم ''السلام علیکم'' کہنے کے لیے اپنے لبوں کو زحمت دیتا، غفار داؤد نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''تم ٹھیک ہونا...... ناجیہ کہاں ہے؟''

''آپ ناجیہ کے بارے میں مجھ سے کیوں سوال کررہے ہیں انکل؟'' جاسم نے بے حد اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اسے تو اس وقت گھر پر ہونا چاہیے تھا۔''

''اندر آجاؤ......'' غفار داؤد نے متفکر انداز میں کہا۔

جاسم اس کی معیت میں چلتے ہوئے ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا۔ ''تمہیں اکیلے دیکھ کر مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے بلکہ یوں سمجھو کہ میں بہت زیادہ ڈر محسوس کررہا ہوں۔''

غفار داؤد پر نگاہ پڑتے ہی جاسم یہ تو سمجھ گیا تھا کہ اس وقت وہ کسی مصیبت میں گھرا ہوا ہے اور اب اس کی بات چیت سے بھی یہی ظاہر ہورہا تھا۔ جاسم کو یہ سمجھنے میں قطعی کوئی دقت نہیں ہوئی کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ اس نے ناجیہ کے پاپا کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔

''انکل! آپ مجھے ٹھیک سے بتائیں کہ آخر ہوا کیا ہے؟ آپ ناجیہ کے حوالے سے اتنے پریشان کیوں ہورہے ہیں اور وہ اس وقت ہے کہاں؟''

''تمہاری آمد سے تھوڑی دیر پہلے ناجیہ کے سیل فون پر ایک انجان نمبر سے کال آئی تھی۔'' غفار داؤد نے گمبھیر انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''کال کرنے والے نے اسے بتایا کہ تمہارا تین تلوار کے نزدیک ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ تمہیں بہت زیادہ چوٹیں آئی ہیں اور تم اس وقت بے ہوش ہو۔ تمہارے سیل فون کے کالز ریکارڈ سے فون کرنے والے کو ناجیہ کا نمبر ملا اسی لیے اس نے ناجیہ کو فون کیا۔ یہ اطلاع ملتے ہی ناجیہ تمہیں دیکھنے تین تلوار کی طرف گئی ہے مگر تم تو صحیح سلامت میرے سامنے بیٹھے ہو۔''

بات کے اختتام پر غفار داؤد نے متوحش انداز میں جاسم کی طرف دیکھا۔ غفار داؤد کا بیان سننے کے دوران میں جاسم مسلسل ناجیہ کا نمبر ٹرائی کررہا تھا۔ جب ناجیہ کا پاپا خاموش ہوا تو اس نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

''ناجیہ کا نمبر سوئچ آف آرہا ہے۔''

''میں بھی ناجیہ کو کئی بار فون کر چکا ہوں مگر اُدھر سے کوئی رسپانس نہیں ہے۔'' غفار داؤد نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''ناجیہ خیریت سے تو ہوگی نا؟''

''ہوپ فلی......'' جاسم نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس نے نہایت ہی سنگین حماقت کی ہے جو منہ اٹھا کر تین تلوار چل پڑی۔ اَن ناؤن کالز پر ایسا غیر ذمے دارانہ رویّہ تو نہیں اپنایا جاتا۔ کم از کم وہ تصدیق کے لیے مجھے ایک کال تو کرتی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا۔ ناجیہ سے غلطی ہوئی ہے۔'' غفار داؤد نے معتدل انداز میں کہا۔ ''وہ تمہارے معاملے میں بہت زیادہ جذباتی ہو جاتی ہے۔ تمہارے ایکسیڈنٹ کا سنا تو وہ سوچے سمجھے بغیر تمہیں دیکھنے چل پڑی۔ اللہ اس کی حفاظت کرے۔''

یہ سب سن کے جاسم یکدم پریشان ہوگیا تھا۔ آج دن بھر فون پر ناجیہ سے اس کی بات نہیں ہوئی تھی۔ اگر اس کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع دینے والے اس شخص نے جاسم کے کالز ریکارڈ کو چیک کیا ہوتا تو اسے ناجیہ کو نہیں بلکہ کامل کو کال کرنا چاہیے تھا اور وہ بھی جاسم کے سیل فون سے تاکہ سامنے والا اس کی فراہم کردہ اطلاع کو درست مان کر فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ جاتا لیکن یہاں معاملات اس کے بالعکس تھے۔ جاسم کو اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ ناجیہ کو دھوکا دے کر پھانسا گیا تھا۔ اس کا سوئچ آف فون بھی اسی شبہے کو تقویت دیتا تھا۔ اطلاع کنندہ کوئی بہت ہی عیار اور چالباز شخص تھا۔ اس نے جاسم کے ایکسیڈنٹ کی خبر دے کر ناجیہ کو جذباتی کردیا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ ناجیہ کو اپارٹمنٹ سے باہر نکلنے پر مجبور کرنے والا وہ مکار شخص جاسم سے اس کی جذباتی وابستگی سے بہ خوبی واقف تھا۔ گویا اس نے ناجیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے شکار کیا تھا۔

یہ تمام ترسنسنی خیز خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں جاسم کے ذہن سے گزرے۔ اگلے ہی لمحے غفار داؤد کی بوجھل آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''بیٹا...... تم کس سوچ میں پڑ گئے۔ ناجیہ کو واپس لانے کے بارے میں ہمیں کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔ میری بیٹی اس وقت مشکل میں ہے۔ کیا ہمیں......''

''ون منٹ پلیز......'' جاسم نے انگشتِ شہادت اٹھا کر غفار داؤد کو......... رکنے کا اشارہ کیا پھر سیل فون اپنے کان سے لگالیا۔

اس نے کامل کو کال کی تھی۔ دوسری جانب رابطہ ہونے پر اس نے نہایت مختصر الفاظ میں کامل کو موجودہ سچویشن کے بارے میں بتانے کے بعد دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''برو...... فوراً حرکت میں آجاؤ۔ مجھے ہر حال میں ناجیہ واپس چاہیے اور وہ بھی صحیح سلامت۔''

''فکر کی ضرورت نہیں جگر۔ سمجھ لو، میں کام سے لگ گیا۔'' کامل مضبوط لہجے میں بولا پھر پوچھا۔''ناجیہ کو وہ اَن نوَن کال کس نمبر سے آئی تھی؟''

''نہیں معلوم......'' جاسم نے کہا۔''ناجیہ اپنا سیل فون ساتھ لے گئی تھی اور اس کا سیل فون مسلسل سوئچ آف آرہا ہے۔''

''جگر! جہاں تک میں سمجھ رہا ہوں، ناجیہ کو کڈنیپ کر لیا گیا ہے۔'' کامل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔''اور وہ بھی نہایت ہوشیاری کے ساتھ۔ ایسا کام تمہارا یا ناجیہ کا کوئی دشمن ہی کرسکتا ہے۔''

''میں بھی اسی زاویے پر سوچ رہا ہوں۔'' جاسم نے ٹھوس لہجے میں کہا۔''لیکن میرے ذہن میں دشمن کے حوالے سے ایک تیسرا آپشن بھی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، ناجیہ کے پاپا کا کوئی دشمن؟''

''یہ ناممکن تو نہیں ہے برو۔''

''جگر! تمہاری بات میں وزن ہے۔'' کامل نے کہا۔

''بہرحال، میں تھوڑی دیر میں تمہیں کال کرتا ہوں۔''

''اوکے برو۔'' جاسم نے یہ کہتے ہوئے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا پھر ناجیہ کے پاپا کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں انکل...... آپ کیا کہہ رہے تھے؟''

جب تک جاسم، کامل سے بات کرتا رہا تھا، غفار داؤد بڑی گہری نظر سے اُسے دیکھتے رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کال کے دوسرے اینڈ پر کون موجود تھا لیکن جاسم کے اعتماد اور ناجیہ کی بازیابی کے سلسلے میں کی جانے والی اس کی کوشش کو دیکھ کر غفار داؤد کو اس حقیقت کا تو ادراک ہو گیا تھا کہ ناجیہ کا انتخاب پرفیکٹ ہے۔ وہ ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس نے جس مقصد کے لیے آج جاسم کو ڈنر کے لیے اپنے گھر مدعو کیا تھا، وہ مقصد کسی میٹنگ کے بغیر ہی پورا ہو چکا تھا۔ اس کی طرف سے جاسم ''اوکے'' تھا۔

''انکل! آئی ایم ویری سوری......'' غفار داؤد کو سوچوں میں غلطاں دیکھ کر جاسم نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔''یہ کال بہت ضروری تھی اسی لیے میں نے آپ کو بولنے سے روک دیا تھا۔ خیر...... مجھے بتائیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے؟''

''مجھے یہ حالات کافی سنگین نظر آرہے ہیں۔'' غفار داؤد نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔''میں اپنی بیٹی کے لیے بہت فکرمند ہوں۔ میڈیا میں ہونے کی وجہ سے میرے تعلقات کئی بااثر افراد سے ہیں جن میں بعض پولیس آفیسرز بھی ہیں۔ ناجیہ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے، ہمیں اس کے بارے میں پولیس کو بتادینا چاہیے۔''

''انکل! آپ بالکل درست محسوس کررہے ہیں۔ حالات کی سنگینی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔''آپ یقیناً ناجیہ کے لیے فکرمند ہوں گے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے ایک فون پر پولیس حرکت میں آجائے گی۔ میں پولیس کو اطلاع دینے کے خلاف نہیں ہوں لیکن......''

جاسم نے لمحاتی توقف کیا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔''لیکن کیا بیٹا؟''

''پولیس میں رپورٹ درج کرانے سے پہلے ہمیں چند چیزوں کو چیک کرلینا چاہیے۔'' جاسم نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں، تم کن چیزوں کا ذکر کررہے ہو؟''

جاسم نے جواباً اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔''انکل! مجھے صد فیصد سچ بتائیں، آپ کا کوئی ایسا دشمن ہے جس سے آپ کو اتنی گھٹیا حرکت کی توقع ہو؟''

''میں پورے وثوق کے ساتھ کہوں گا...... نہیں۔''

''پھر یہ میرے کسی دشمن کی کارروائی ہے۔''

''کہیں تم یہ تو نہیں کہہ رہے کہ ناجیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے؟''

''سردست حالات تو اسی جانب اشارہ کررہے ہیں۔'' جاسم نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''او مائی گاڈ!'' غفار داؤد نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

''اس صورت میں تو ہمیں فوراً پولیس کو انفارم کردینا چاہیے۔''

''دو گھنٹے......'' جاسم نے چٹانی انداز میں کہا۔''آپ مجھے صرف دو گھنٹے دے دیں۔ اس کے بعد میں آپ کو پولیس کے پاس جانے سے نہیں روکوں گا بلکہ میں خود آپ کے ساتھ پولیس اسٹیشن چلوں گا۔''

''بیٹا......'' غفار داؤد نے عجیب سے لہجے میں استفسار

کیا۔ ''تم ان دو گھنٹوں میں کیا کرنے والے ہو؟''

''میں ناجیہ کے غیاب کا اسٹیٹس جاننے میں گہری دلچسپی رکھتا ہوں انکل۔'' جاسم نے سرسراتی آواز میں جواب دیا۔ ''اگر ناجیہ کی گمشدگی میں میرے کسی دشمن کا ہاتھ ہے تو وہ رات گیارہ سے پہلے کسی بھی وقت یعنی انہی دو گھنٹوں میں مجھ سے ضرور رابطہ کرے گا۔''

''اور اگر یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہوا تو......؟''

''تو بھی کڈنیپر آپ سے لازمی رابطہ کرے گا تاکہ آپ کو رقم کی ادائیگی اور ڈیلیوری کی جگہ کے بارے میں بتا سکے۔'' جاسم نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''تاوان کی وصولی کا طریقۂ کار اس کھیل کا سب سے نازک مرحلہ ہوتا ہے۔''

''ہاں، میں اس معاملے کی حساسیت کو سمجھ سکتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''تم اس دوران میں کیا کرو گے؟''

''میں جو کچھ بھی کروں گا، آپ کی نظر کے سامنے ہی کروں گا بلکہ میں تو اپنا کام شروع بھی کر چکا ہوں۔'' جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ فون کال اسی سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔''

اِدھر جاسم کی بات ختم ہوئی، اُدھر ڈور بیل بج اٹھی۔ ''یہ کون ہو سکتا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے جاسم نے ایک بار پھر ناجیہ کا نمبر ٹرائی کیا۔

''شاید یہ پزا والا ہے۔'' غفار داؤد نے کہا۔

ناجیہ کا نمبر ابھی تک سوئچ آف ہی آ رہا تھا۔ جاسم نے ناجیہ کے پاپا سے پوچھا۔ ''کیا آپ لوگوں نے پزا آرڈر کیا تھا؟''

''ہاں...... یہ ناجیہ کا آئیڈیا تھا۔'' غفار داؤد نے جواب دیا۔ ''اس نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں پزا بہت پسند ہے اس لیے دیگر پکوان کی تیاری کے ساتھ ہی ہم نے پزا کا آرڈر بھی کر دیا تھا......''

''ٹھیک ہے، آپ پزا وصول کریں۔'' جاسم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میں آپ کے بہت نزدیک رہوں گا تاکہ کسی گڑبڑ کی صورت میں سچویشن کو سنبھال سکوں۔''

غفار داؤد اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ جاسم دروازے کے نزدیک، دیوار کے ساتھ لگ کر ایک ایسے مقام پر کھڑا ہو گیا جہاں دروازہ کھلنے کے بعد وہ دروازے کے پٹ کی اوٹ میں چلا جاتا۔ دروازے کے باہر کھڑا ہوا کوئی شخص یا اندر داخل ہونے والا کوئی بھی آدمی مذکورہ مقام پر جاسم کی موجودگی کو محسوس کر سکتا تھا اور نہ ہی دیکھ سکتا تھا۔

غفار داؤد نے دروازہ کھولا تو سامنے باوردی پزا ڈیلیوری بوائے کھڑا تھا۔ ''پزا سر......'' کہتے ہوئے وہ رکوع کے بل جھک کر اپنے ڈیلیوری بیگ کے اندر سے ان لوگوں کا آرڈر باہر نکالنے لگا۔ جاسم اس ڈیلیوری بوائے کو دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم ان دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو کو وہ سہولت سے سن سکتا تھا۔

پزا ڈیلیوری بوائے نے اپنے بلیک بیگ کے اندر سے لارج پزا کے بجائے گن برآمد کی تو غفار داؤد بے ساختہ بول اٹھا۔ ''یہ کیا......؟''

غفار داؤد کی خوف میں ڈوبی ہوئی ''یہ کیا؟'' نے جاسم کو ریڈ الرٹ کر دیا۔ گویا وہ جس گڑبڑ کی توقع کر رہا تھا، وہ وقوع پذیر ہو چکی تھی۔ اس نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال میں اس کا دماغ کئی گنا زیادہ تیز رفتاری سے کام کرنے لگتا تھا۔ وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسی لمحے پزا والے نام نہاد ڈیلیوری بوائے کی غراتی ہوئی آواز جاسم کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے تحکمانہ انداز میں غفار داؤد سے کہا تھا۔

''چپ چاپ الٹے قدموں اندر چلو۔ اگر ذرا سی بھی آواز نکالی تو تمہیں ڈھیر کر دوں گا۔''

جاسم نے سانس روک لی اور پزا والے کے ''اِن'' ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ آدھ کھلے دروازے میں سے پہلے غفار داؤد... ہینڈز اَپ انداز کے ساتھ ریورس گیئر میں، اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اس سے محض دو فٹ کے فاصلے پر گن بردار موجود تھا۔ وہ بڑے نازک لمحات تھے۔ جاسم ہنگامی ایکشن کے لیے چارج ہو چکا تھا۔

گن بردار نے اپارٹمنٹ کے اندر آنے کے بعد اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ بند کر دیا۔ اسی لمحے جاسم نے اس کی کمر پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ گن بردار اس نوعیت کی صورتِ حال کی امید نہیں کر رہا تھا لہٰذا جاسم نے اپنی ہونے والی سسرال میں، اس نقلی پزا ڈیلیوری بوائے کا ''شاندار'' استقبال کیا۔

جاسم کی لات کھانے والے اس شخص نے اپنے ایک ہاتھ میں ڈیلیوری بیگ اور دوسرے ہاتھ میں گن تھام رکھی تھی۔ وہ ان دونوں چیزوں کے ساتھ فضا میں پرواز کرتے ہوئے لاؤنج میں جا گرا۔ اس ایمرجنسی لینڈنگ کے دوران میں گن اور بیگ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکل کر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ جاسم نے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے

کو اندر سے لاک کیا اور غفار داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے شانت لہجے میں بولا۔

''انکل! آپ آرام سے صوفے پر بیٹھ کر تماشا دیکھیں۔ میں اس مہمان کی خاطر داری کرتا ہوں۔''

اس دوران میں حملہ آور فرش سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ جاسم پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھا اور بے یقینی سے بولا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''اچھا ہوا، تم نے مجھے پہچان لیا۔'' جاسم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کڑے انداز میں کہا۔ ''اب تم شرافت سے اپنا تعارف کرادو۔''

بات کے اختتام پر جاسم نے گھوم کر اس کے تھوبڑے پر ایک طوفانی بیک کک جمادی۔ مدِمقابل ڈگمگایا پھر ہاتھ کی پشت سے اپنی ناک پونچھنے لگا۔ جاسم کی کک نے اس کی ناک سے خون جاری کر دیا تھا۔

''بتاؤ، کون ہو تم؟'' جاسم نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

جواب دینے کے بجائے گھائل ناک والے نے جاسم پر چھلانگ لگادی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے دور جا گرے۔ جاسم نہایت پھرتی سے لوٹ لگا کر اس کے نیچے سے نکلا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر فولادی پنچنگ شروع کر دی۔

جاسم کے مکّوں نے اتنی بے دردی سے اس کے چہرے کو نشانہ بنایا تھا کہ اسے مزاحمت کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ جعلی پزا ڈیلیوری والے کا اچھا خاصا حلیہ بگاڑنے کے بعد جاسم اس کے اوپر سے اتر آیا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''کس کے لیے کام کرتے ہو...... شعیب، جنید یا راجو...... تم کس کے حکم پر یہاں آئے ہو؟''

لمحاتی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ناک منہ اور چہرے کے دیگر حصوں سے نکلنے والے خون نے اس کی شکل کو خوفناک بنا دیا تھا۔ اب کی بار بھی اس کم بخت نے زبان نہیں کھولی اور جاسم کے سوال کا جواب دینے کے بجائے متلاشی نظر سے بھونڈے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اگلے ہی لمحے اسے اپنی مرضی کی شے مل گئی۔ یہ وہی خطرناک گن تھی جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لاؤنج کے دور اُفتادہ حصے میں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ایک لمبی لوٹ لگا کر گن تک پہنچنے کی کوشش کی۔

ایسی صورتِ حال میں جاسم بھلا کہاں چوکنے والا تھا۔ اس نے چیتے کے مانند جست بھری اور مذکورہ گن کے نزدیک پہنچ گیا۔ جب لوٹ لگانے والا اپنی منزل پر پہنچا تو وہاں جاسم کو دیکھ کر ٹھٹکا پھر اس نے بڑی سرعت سے گن کی جانب ہاتھ بڑھادیا۔

قبل اس کے کہ اس کا ہاتھ گن کو چھو پاتا، جاسم نے فٹ بال کا تصور کر کے اس کے سر پر ایک دھواں دھار ٹھوکر مار دی۔ وہ کسی ذبح ہوتے جانور کے مانند ڈکراتے ہوئے پیچھے کو الٹا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر اذیت ناک انداز میں کراہنے لگا۔

جاسم نے گن اٹھالی اور اس کے نزدیک ہی کرسی ڈال کر بیٹھ گیا پھر غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اگر یہاں سے زندہ واپس جانا چاہتے ہو تو اپنے بارے میں خود ہی سب کچھ سچ بتادو۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔ اپنی موت اور زندگی کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں تم سے اب کوئی سوال نہیں کروں گا۔''

وہ بندہ بُری طرح پھنس چکا تھا۔ جاسم نے گن اس کی کھوپڑی پر تان رکھی تھی۔ اس کے فرار کی تمام راہیں مسدود ہوگئی تھیں اور جاسم کے روپ میں اسے اپنی سفاک موت دکھائی دے رہی تھی۔ جب انسان کسی ایسی سچویشن کا شکار ہو جائے کہ اسے موت اور زندگی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو احمق سے احمق شخص بھی اپنے لیے زندگی ہی منتخب کرتا ہے۔ وہ بھی سپر اندازی پر مجبور ہوگیا۔

آئندہ دو منٹ میں اس نے اس حقیقت کا اقرار کرلیا کہ وہ راجو کے گینگ سے تعلق رکھتا تھا۔ راجو ہی کے حکم پر ان لوگوں نے جاسم کے طارق روڈ والے فلیٹ میں آگ لگائی تھی اور آج وہ ان باپ بیٹی کو موت کے گھاٹ اتارنے کی نیت سے پزا ڈیلیوری بوائے بن کر یہاں آیا تھا۔ راجو نے اپنے ذرائع سے معلوم کرلیا تھا کہ اس وقت ناجیہ اور اس کا باپ غفار داؤد گھر پر موجود ہوں گے۔ اس نے اپنا نام حنیف بتایا تھا۔ راجو کی یہ ساری کوششیں جاسم کو سپردِ عذاب کر کے اس سے اپنی ہزیمت کا بدلہ مع سود لینے کے ذیل میں تھیں......

حنیف کے بیان سے یہ تو عیاں ہوگیا تھا کہ ناجیہ کے اغوا میں ''راجو اینڈ کو'' کا ہاتھ نہیں تھا۔ جاسم نے ناجیہ کے پاپا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''انکل! مجھے ایک مضبوط رسی اور تین چار دوپٹوں یا بیڈ شیٹس کی ضرورت ہے۔''

''ایسی کوئی رسی تو گھر میں موجود نہیں ہے۔'' غفار داؤد

نے بتایا۔ ’’البتہ میں دوپٹے اور بیڈ شیٹس لا دیتا ہوں۔‘‘

’’آپ لوگ اپنے کپڑے کہاں سکھاتے ہیں؟‘‘

’’گیلری میں پانچ چھ الگنیاں بندھی ہوئی ہیں۔ تمام کپڑوں کو دھونے کے بعد وہیں ڈالا جاتا ہے۔‘‘

’’کام بن گیا۔‘‘ جاسم نے حنیف کی گن غفار داؤد کی طرف بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’آپ اس نالائق کو گن پوائنٹ پر رکھیں۔ جب تک میں اپنی ضرورت کی چیزیں جمع کرتا ہوں۔‘‘ پھر اس نے خونخوار لہجے میں حنیف سے استفسار کیا۔

’’زندہ رہنا چاہتے ہو نا؟‘‘

حنیف نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ جاسم کی دہشت نے اسے بُری طرح خوف زدہ کر رکھا تھا۔

’’انکل! مجھے نہیں امید کہ یہ مردود کسی مہم جوئی کا خیال بھی دل میں لائے گا۔‘‘ جاسم نے غفار داؤد سے کہا۔ ’’اگر یہ میری امید پر پورا نہیں اترا اور اس نے کوئی پھرتی دکھانے کی کوشش کی تو آپ بلا تکلف اس کی کھوپڑی میں ہوا دان بنا دینا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔‘‘

گن غفار داؤد کو تھما کر جاسم کچن کی جانب بڑھا تو اطلاعی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

’’لگتا ہے......‘‘ اس کا مخاطب غفار داؤد تھا۔ ’’اصلی پزا والا آپ کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ آپ اپنی جاب پر فوکس کریں۔ میں پزا ڈیلیوری وصول کرتا ہوں۔‘‘

جاسم کا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ باہر اصلی پزا ڈیلیوری بوائے ہی تھا۔ جاسم نے آرڈر ریسیو کرنے کے بعد پے منٹ کر دی پھر دوبارہ داخلی دروازے کو لاک کر کے وہ کچن میں گھس گیا۔

جلد ہی اُسے اپنے مطلب کی ایک چیز مل گئی۔ یہ ایک تیز دھار چھری تھی۔ آئندہ دو منٹ میں وہ گیلری میں بندھی ہوئی تمام الگنیاں کاٹ لایا پھر اس نے حنیف کے دونوں بازوؤں کو پشت پر لے جا کر، کلائیوں کے مقابل پر نائیلون کی مضبوط رسی سے خوب کس کر باندھ دیا۔ یہی حشر اس نے حنیف کے دونوں پاؤں کا بھی کیا۔ جاسم نے اس کے ہاتھ اور پاؤں کو ایسی مہارت سے جکڑ ڈالا تھا کہ وہ کوئی بھی سرگرمی دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس دوران میں غفار داؤد وارڈ روب میں سے ناجیہ کے چند دوپٹے اور بیڈ شیٹس اٹھا لایا تھا۔ جاسم نے حنیف کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے دوپٹا باندھ دیا۔ سانس کی آمد و رفت کے لیے ناک کے دونوں نتھنوں کو آزاد چھوڑ کر جاسم نے حنیف کے سر اور چہرے پر اس طرح کس کر دوپٹے لپیٹ دیے جیسے قدیم مصر کے بادشاہ یعنی فرعون اپنے آبا کی حنوط شدہ ممی کی تیاری کے وقت اس کے بدن کو سفید سوتی پٹیوں میں لپیٹ دیا کرتے تھے۔

’’انکل! میں نے آپ کی گیلری میں فریج والا قدِ آدم گتے کا ڈبا رکھا دیکھا ہے۔‘‘ جاسم نے غفار داؤد سے کہا۔ ’’آپ وہ باکس اٹھا کر یہاں لے آئیں۔‘‘

’’ابھی لایا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے ناجیہ کا پاپا گیلری کی جانب بڑھ گیا۔

جب تک غفار داؤد فریج والے ڈبے کو لے کر واپس آتا، جاسم نے کامل کو اپارٹمنٹ میں پیش آنے والے اس واقعے سے آگاہ کر دیا اور آخر میں بہ آواز بلند کہا۔ یہ بات اس نے غفار داؤد کو سنانے کے لیے کی تھی۔

’’آپ کا فریج ہماری سمجھ میں نہیں آرہا۔ آپ اپنے کسی بندے کو بھیج کر ابھی یہ فریج اٹھوالیں۔ میں کل کسی وقت آپ کی دکان پر آ کر کوئی دوسرا فریج پسند کر لوں گا۔‘‘

اس کے بعد جاسم نے حنیف کے دھڑ کو بیڈ شیٹس میں اچھی طرح لپیٹ دیا۔ حنیف اپنی اس کسمپرسی پر کیا سوچ رہا ہوگا، وہ سب اسے ہی معلوم تھا یا پھر اس کے خدا کو۔

غفار داؤد نے حنیف کی ’’حنوط شدہ ممی‘‘ کے نزدیک، فریج والے باکس کو کھڑا کر دیا اور اُلجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ’’تم ابھی فون پر کس سے بات کر رہے تھے؟‘‘

’’انسانوں کی مرمت کرنے والے ایک ماہر فن مستری سے۔‘‘ جاسم نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ’’اس ڈبے کو لٹا دیں ذرا۔‘‘

’’مگر تم تو کسی فریج کی واپسی کا ذکر کر رہے تھے؟‘‘

’’وہ کوڈ ورڈز تھے۔‘‘ جاسم نے حنیف کی افسوسناک حالت کی سمت اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’کیا آپ اس ہوم میڈ ممی کو اپنے گھر کے کسی حصے میں سجا کر رکھنا چاہتے ہیں؟‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ’’میں اس مصیبت کو ایک لمحہ بھی اپنے اپارٹمنٹ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ اگر یہاں رہا تو ضرور مجھ پر کوئی آفت نازل ہوگی۔ میں پہلے ہی ناجیہ کے لیے بے حد پریشان ہوں۔‘‘

’’اس کے لیے تو میں بھی کچھ کم ڈسٹرب نہیں ہوں انکل......‘‘ جاسم ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ’’اور آپ کی طرح میں بھی اس لوکل ممی کو جلد از جلد

یہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کی فکر میں ہوں۔ آپ اس مچر کو فریج والے باکس میں پیک کرنے میں میری مدد کریں گے؟"

جاسم کے استفسار کے جواب میں غفار داؤد نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ پھر وہ دونوں امداد باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے حنیف کی ممی کی "پیکنگ" میں جُت گئے۔

دس پندرہ منٹ میں کامل کے بھیجے ہوئے دو افراد فریج کو اٹھانے غفار داؤد کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گئے۔ جب وہ لوگ واپس چلے گئے تو غفار داؤد نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔

"میں نے فلموں اور ڈراموں میں ایسا ہوتے کئی بار دیکھا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ سب میرے اپارٹمنٹ پر پیش آچکا ہے۔"

"حقیقی زندگی یہی ہے انکل۔" جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "باقی آئیڈیل لائف تو قصے کہانیوں اور ناولوں ہی میں ملتی ہے۔ اگر زندگی میں تھرل، ایکشن اور سسپنس نہ ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی بیمار کے لیے تیار کیا جانے والا پرہیزی کھانا کھا رہے ہیں...... پھیکا سیٹھا اور بدذائقہ...... اوہ! کھانے پر مجھے یاد آیا کہ آج آپ نے مجھے ڈنر پر انوائٹ کر رکھا ہے۔ ناجیہ نے بتایا تھا کہ ٹھیک دس بجے کھانا لگادیا جائے گا۔"

غفار داؤد سے گفتگو کے دوران میں وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ناجیہ کا نمبر بھی ٹرائی کرتا جارہا تھا۔ وہ ناجیہ کے غیاب کے حوالے سے گہری تشویش میں مبتلا تھا تاہم اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو ناجیہ کے پاپا پر عیاں نہیں ہونے دیا تھا مبادا وہ ہمت ہار بیٹھے۔ ایک باپ کی حیثیت سے وہ ناجیہ کے لیے پہلے ہی بہت پریشان تھا۔ اس کے حوصلے کو قائم رکھنے کی غرض ہی سے جاسم خود کو پُراعتماد اور مطمئن ظاہر کر رہا تھا۔

"دس تو بج گئے ہیں۔" غفار داؤد نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور کھانا بھی تیار ہے لیکن ناجیہ کے بغیر میرے حلق سے ایک نوالہ نہیں اتر سکتا۔ پتا نہیں، میری بچی کس حال میں ہوگی۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر جاسم کی طرف شاکی نظر سے دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

"بیٹا! تم نے مجھ سے دو گھنٹے کی مہلت لی تھی جس میں سے ایک گھنٹا گزر چکا ہے۔ ناجیہ کی بازیابی کے سلسلے میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا...... آہ!"

اِدھر غفار داؤد کی بات مکمل ہوئی اُدھر جاسم کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ کال ناجیہ کے نمبر سے آئی تھی۔ جاسم نے یہ کہتے ہوئے کال پک کرلی۔

"انکل...... ناجیہ بازیاب ہوگئی۔"

جاسم کے اس سنسنی خیز جملے نے غفار داؤد کے رگ و پے میں کرنٹ سا دوڑا دیا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

"کہاں ہے وہ...... میری اس سے بات کراؤ......"

جاسم نے ہاتھ کے اشارے سے غفار داؤد کو صبر کرنے کے لیے کہا پھر سیل فون کے مائیک میں ناجیہ سے استفسار کیا۔ "ناجیہ! تمہاری طرف سب خیریت ہے نا؟"

"میں ڈیوڈ بات کر رہا ہوں۔"

خلافِ توقع ناجیہ کے بجائے ایک مرد کی آواز سن کر جاسم چونک اٹھا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"تم اصلی ڈیوڈ ہو یا وہ بہروپیا جس سے میں چند روز پہلے مارکوپولو میں ایک مختصر سی ملاقات کر چکا ہوں؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کب، کس کے توسط سے، تم سے ہم کلام ہوتا ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تمہیں بس، یہ یاد رکھنا ہے کہ میں ڈیوڈ ہوں، تمہارا ایک قدرداں۔"

"قدرداں، مہرباں......" جاسم نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ "میری دوست کا سیل فون تمہارے پاس کیا کر رہا ہے؟"

"صرف سیل فون ہی نہیں، تمہاری وہ بلیک کیٹ بھی میرے پاس ہے۔" ڈیوڈ نامی اس شخص نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ "میں نے اسے اس کے گھر سے زیادہ آرام دہ جگہ پر رکھا ہوا ہے کیونکہ مجھے تم سے زیادہ اُس کا خیال ہے۔"

"اوہ...... تو یہ تمہاری کارستانی ہے۔" جاسم ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "تم نے میرے ایکسیڈنٹ کی فیک اطلاع دے کر ناجیہ کو اغوا کرایا ہے؟"

"اغوا...... کا لفظ بہت چیپ ہے جے بی۔" اس نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یوں سمجھو کہ میں نے تمہاری کالی بلی کو چند روز کے لیے اپنا مہمان بنالیا ہے۔"

"کیوں...... کیا چاہتے ہو تم؟" جاسم نے بپھرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"پہلے تم اس امر کا اطمینان کرلو کہ بلیک کیٹ میری تحویل میں صحیح سلامت اور خوش ہے۔" ڈیوڈ نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "لو، اس سے بات کرو۔"

ڈیوڈ کی پُراسرار دعوت پر جب جاسم، ناجیہ کی معیت میں، مارکوپولو پہنچا تھا تو ڈیوڈ نے ناجیہ کے بلیک ڈریس کی وجہ سے اسے کالی بلی کہا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے ناجیہ کے لیے ''پروڈیوسر کی چمچی'' کے الفاظ بھی استعمال کیے تھے۔ اس سہ پہر مارکوپولو میں یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ جاسم جس سوٹڈ بوٹڈ مقامی شخص سے ملا تھا، وہ ڈیوڈ نہیں بلکہ اس کا کوئی خاص نمائندہ تھا جس کے توسط سے وہ کوئی اہم بات جاسم سے کرنا چاہتا تھا لیکن ناجیہ کی وہاں موجودگی کے باعث وہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا اور ڈیوڈ کا وہ نمائندہ یہ کہہ کر ٹیبل سے اٹھ گیا تھا۔ استنبول میں ملاقات ہوگی۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں جاسم کے ذہن سے گزرے۔ اگلے ہی لمحے اس نے ناجیہ کی مانوس آواز سماعت کی۔

''جے بی! تم پاپا کے پاس پہنچ گئے؟''

''میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا تھا۔'' جاسم نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ ''یہاں پر سب خیریت ہے۔ ڈیوڈ کی کسٹڈی میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟''

''ایز یچ کوئی پرابلم نہیں ہے۔'' ناجیہ نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن اپنوں سے دوری شاق گزر رہی ہے۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں۔'' جاسم نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے بالکل پریشان نہیں ہونا۔ میں ڈیوڈ سے معاملات طے کر کے تمہاری واپسی کی راہ نکال لوں گا..... اوکے۔''

''تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کیا پریشانی؟'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''بس، میں پاپا کے لیے فکرمند ہوں۔''

''انہیں میں سنبھال لوں گا۔'' جاسم نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''لو، ان سے بات کرو۔''

جاسم نے سیل فون غفار داؤد کی جانب بڑھا دیا۔ باپ بیٹی میں مختصر سی مکالمت ہوئی پھر غفار داؤد نے سیل فون جاسم کو واپس دیتے ہوئے برہمی سے کہا۔

''اس بندے نے ناجیہ سے فون لے لیا ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا ڈیوڈ.....'' جاسم نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اس طرح تم مجھے دوست نہیں بلکہ دشمن بنا رہے ہو۔''

''مسٹر جے بی! بدگمانی اچھی چیز نہیں۔'' ڈیوڈ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہمارے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت ٹرسٹ کی ہے۔ ٹرسٹ می پلیز..... ہم بہت اچھے دوست ثابت ہوں گے۔''

''تمہارا انداز بھڑکانے والا ہے مسٹر ڈیوڈ.....'' جاسم نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''جب مارکوپولو میں تم نے بتا دیا تھا کہ اب ہماری ملاقات استنبول میں ہوگی تو پھر اس ناٹک کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ کوئی ناٹک نہیں مسٹر جے بی۔ تم اسے حفظِ ماتقدم کا نام دے سکتے ہو۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''جب تک تم ری ایلیٹی ٹی وی والے پروجیکٹ کا کنٹریکٹ سائن نہیں کر لیتے، تمہاری دوست ہماری تحویل میں رہے گی اور اس بات کا اطمینان رکھو کہ تمہاری یہ بلیک کیٹ کسی شاہی مہمان کی طرح ہمارے پاس قیام کرے گی۔''

''یہ تو خوامخواہ کی زبردستی ہے۔'' جاسم نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔ ''میں کسی ٹی وی شو کا حصہ بنوں یا نہ بنوں، یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔ تم اپنی بدمعاشی سے مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔''

''یہ ری ایلیٹی ٹی وی کوئی عام شو نہیں ہے مسٹر جے بی!'' ڈیوڈ نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''ایسے میگا پروجیکٹس میں شامل ہونا فنکاروں کے لیے کسی خواب کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے تم خوش قسمت ہو۔ میں فون پر تمہیں زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ بس، اتنا جان لو کہ اس مہم میں چھ براعظموں کے بارہ ایسے مرد شامل کیے گئے ہیں جن کی عمریں اٹھارہ اور پچیس سال کے درمیان ہیں یعنی ہر براعظم سے دو جوان مرد۔ ایشیا سے جن دو آرٹسٹوں کو چنا گیا ہے ان میں ایک آپ ہو مسٹر جے بی..... صرف پینتالیس دن کا کام اور اس سنسنی خیز کام کا معاوضہ ڈیڑھ ملین روپے یعنی دس ہزار یو ایس ڈالرز۔ قیام، طعام اور شاپنگ اس کے علاوہ.....''

''اگر میں تمہارے اس ری ایلیٹی ٹی وی شو میں کام کرنے سے انکار کر دوں تو.....؟''

''تمہارے پاس دوسرا کوئی آپشن نہیں ہے مسٹر جے بی۔'' ڈیوڈ نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایک لمحے کے لیے بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا کہ تمہاری عزیز از جان ہستی میرے قبضے میں ہے۔''

''دھمکی دے رہے ہو؟''

''نہیں..... ایک خیرخواہ کی حیثیت سے سمجھا رہا ہوں مسٹر جے بی۔''

ڈیوڈ، جاسم سے گفتگو کرتے وقت ''آپ'' اور ''تم'' دونوں صیغے استعمال کر رہا تھا۔ جاسم کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال ابھرا۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''مسٹر ڈیوڈ! کیا تم جانتے ہو، میں اس وقت کہاں ہوں؟''

''بلیک کیٹ کے اپارٹمنٹ پر۔'' ڈیوڈ نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''اس کے باگڑ بلے باپ کے ساتھ......''

''تو آپ ری ایلیٹی شو کا کنٹریکٹ اور ناجیہ کو لے کر فوراً یہاں آجاؤ۔'' جاسم نے اپنے اچھوتے خیال کو زبان پر لاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تم ایک ہاتھ ناجیہ کو اس کے باپ کے حوالے کرو، میں دوسرے ہاتھ تمہارا وہ کنٹریکٹ سائن کردوں گا۔''

''یہ ممکن نہیں ہے مسٹر جے بی!'' ڈیوڈ نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہر کام کا وقت اور جگہ پہلے سے طے ہے۔ آئی ایم سوری...... اب ہماری ملاقات استنبول ہی میں ہوگی۔ کچھ پوچھنا ہے تو ابھی پوچھ لو۔ میں دوبارہ کال نہیں کروں گا اور اس کال کے بعد یہ سیل فون تمہیں ڈیڈ ملے گا۔''

''تم نے اپنے اس ری ایلیٹی کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟'' جاسم نے اُلجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا پورے براعظم ایشیا میں اٹھارہ اور پچیس سال کے درمیان عمر کے مردوں کا کال پڑ گیا ہے؟''

جاسم کی جھنجلاہٹ کے جواب میں ڈیوڈ نے نہایت ہی پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''ہم نے اپنے ری ایلیٹی ٹی وی شو کے لیے چھ براعظموں سے جن بارہ افراد کو چنا ہے، ان کی اپنی ایک جداگانہ خصوصیت ہے۔ اس موضوع پر شو کی افتتاحی تقریب میں تفصیلی بات ہوگی۔''

''اور یہ افتتاحی تقریب استنبول میں رکھی گئی ہے؟''

''نہیں۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔

جاسم نے اصراری لہجے میں پوچھا۔ ''پھر کہاں؟''

''وقت آنے پر آپ کو بتادیا جائے گا۔''

''دو روز کے بعد ہمارا یونٹ استنبول کے لیے فلائی کر جائے گا۔'' جاسم نے کہا۔ ''ناجیہ ہمارے یونٹ کا حصہ ہے۔ کیا ناجیہ کو استنبول پہنچانے کا بندوبست تم کروگے؟''

''کالی بلی کہیں نہیں جارہی۔ وہ اِدھر کراچی ہی میں رہے گی۔'' ڈیوڈ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تم اپنے پروڈیوسر سے کہو کہ اپنے کسی اور اچھے یا اچھی کو یونٹ کے ساتھ بھیج دے یا پھر ایسوسی ایٹ پروڈیوسر کے بغیر ہی گزارہ کرو آپ لوگ......''

ڈیوڈ سے ہونے والی اس عجیب وغریب مگر بے حد اہم گفتگو سے جاسم کو بہ خوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ ڈیوڈ اسے اتنا ہی بتائے گا جتنا بتانے کے بارے میں اس نے سوچ رکھا ہے۔ وہ یہ جان کر مطمئن ہوگیا تھا کہ ناجیہ خیروعافیت سے تھی۔

''ایک آخری سوال......'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں استنبول میں تم سے رابطہ کیسے کروں گا؟''

''تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''میں خود تم سے رابطہ کرلوں گا۔ تم بس، استنبول پہنچ کر رپورٹ کردینا۔''

''رپورٹ کردوں۔'' جاسم نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''ہماری معلومات کے مطابق، تمہارا یونٹ استنبول کے ایک عالی شان ہوٹل ''ون ون سکس ریزیڈینس'' میں اسٹے کرے گا۔'' ڈیوڈ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہارے ہوٹل سے ''گلاٹا برج'' ساڑھے سات کلو میٹر کی دوری پر ہے۔ تم بہ آسانی پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ جاؤ گے۔ آبنائے باسفورس کے اوپر۔ تعمیر شدہ عظیم الشان گلاٹا برج کے نیچے، ایک لائن سے مختلف قسم کے ریسٹورنٹس بنے ہوئے ہیں۔ اسی قطار کے آخر میں ''زینان'' نامی یونانی ریسٹورنٹ ہے۔ عام طور پر لوگ اسپیلنگ کے حساب سے اس ریسٹورنٹ کو ''زینو'' بھی پڑھتے اور بولتے ہیں۔ بہر حال، تمہیں زینان پہنچ کر ریسٹورنٹ کے ماسٹر شیف بن عرفات کو اپنی آمد کے بارے میں بتانا ہے۔ بن عرفات عرب النسل ہے۔ وہ یونانی، ٹرکش، انگلش اور عربی ایک جیسی مہارت کے ساتھ بولتا اور سمجھتا ہے۔ تمہیں بن عرفات سے عربی میں بات کرنا ہے۔ اب یہ نہیں کہنا کہ تمہیں عربی نہیں آتی......'' لحاتی توقف کر کے ڈیوڈ نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تم نے اپنی زندگی کے آٹھ سال ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں جیل کاٹی ہے جہاں پر تمہیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا جس میں ایک چیز عربی زبان بھی ہے۔ مسٹر جے بی...... ہم سب جانتے ہیں۔ ہم ایک ایسی نادیدہ آنکھ ہیں جو اس دنیا کے ہر معاملے کو برابر دیکھتی رہتی ہے لیکن کوئی اس آنکھ کو نہیں دیکھ سکتا...... آل دی بیسٹ! استنبول میں ملیں گے۔''

اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ نے سیلولر رابطہ موقوف کردیا۔ جاسم ہیلو، ہیلو کرتا رہ گیا۔ دوسری جانب مہیب سناٹا چھا چکا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' جاسم نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں خودکلامی کی۔ ''استنبول میں تمہاری گردن ہوگی اور...... میرے ہاتھ...... مزہ آئے گا......!''

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے
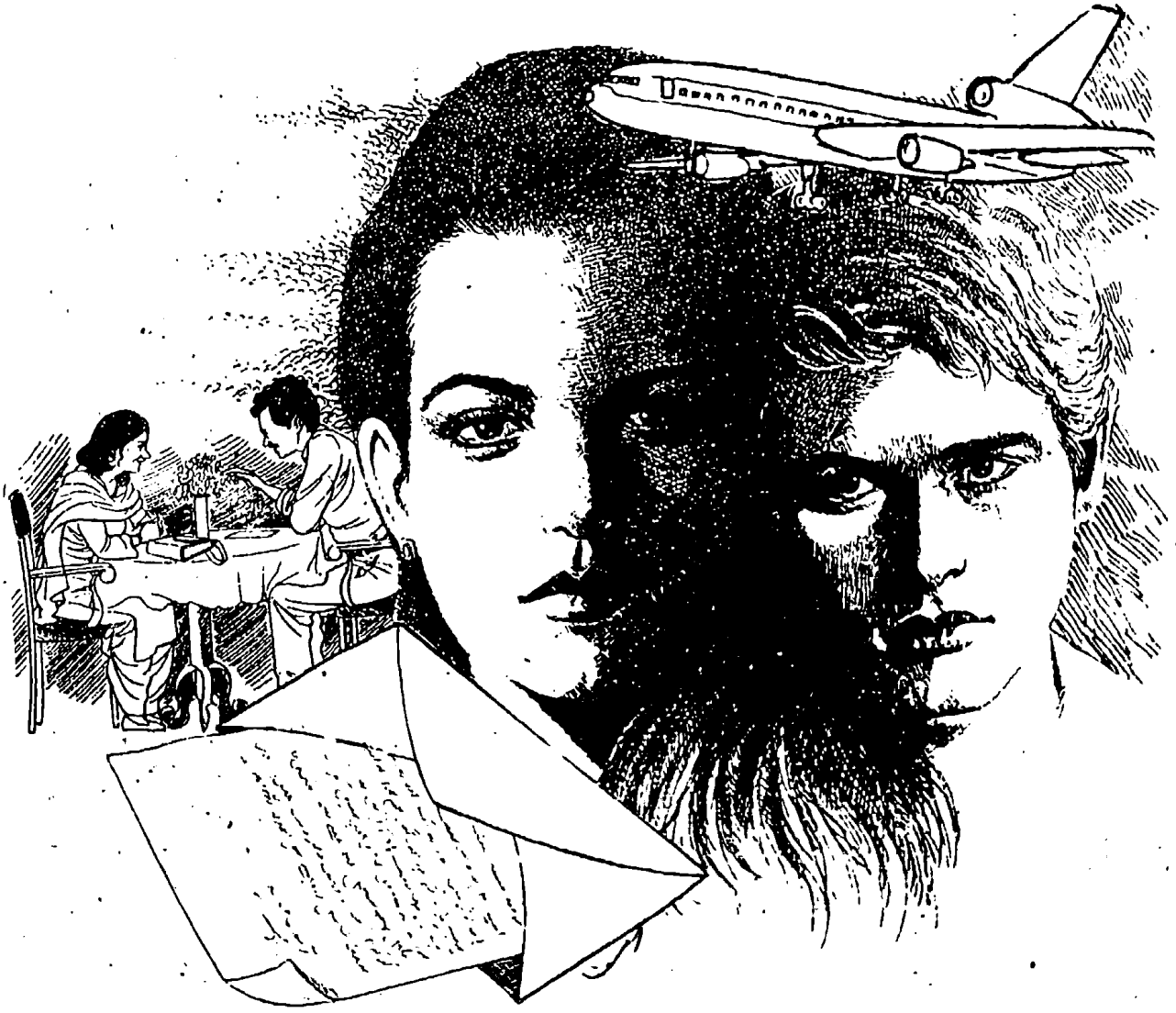
محاذ

سلمان سلیم

عمران قریشی

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس اپنی جگہ بنانے کی صلاحیت ہوتی ہے نہ استقلال اور نہ وقار... بس اپنی مفلسی کو شاندار الفاظ اور دل فریب ملمع سازی کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں... اسی طرح دلربا اور خوب صورت خواتین ذہانت سے محروم ہوتی ہیں اور ہوشیار عورتیں خوب صورتی سے... لیکن بعض ایسی خوش نصیب عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کے پاس ظاہری حسن بھی ہوتا ہے اور ذہن کی تیزی و چالاکی بھی... متضاد صلاحیتوں کے مالک دو ایسے ہی کرداروں کے ملاپ کا شاخسانہ...

ایک ہی تیر سے دو مختلف محاذوں پر پسپا ہوجانے والا ستم گزیدہ......

میں سہانا کو انگلش گرامر اور انگلش پر مشتمل مضامین پڑھا کر فارغ ہوا تو اُس نے مجھے بتایا کہ اس کے والد مجھ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کندھے اُچکا دیے۔ مجھے ٹیوشن پڑھاتے ہوئے ابھی ڈھائی ماہ ہوئے تھے۔ اس دوران ملک صاحب نے مجھ سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اور کرتے بھی کیوں...... کام کرنے کے لیے اُن کے آگے پیچھے ملازمین کی فوج

دوڑتی پھرتی تھی۔ میرے جیسے معمولی لوگوں سے ملنا ان کے لیے توہین آمیز بات تھی۔ پھر ملک ہاؤس کے تمام کمروں میں سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ ٹیوشن پڑھاتے ہوئے مجھ پر گہری نظر رکھی جاتی تھی۔ میں حتیٰ الوسع کوشش کرتا تھا کہ مجھ سے کوئی غیر اخلاقی حرکت سرزد نہ ہونے پائے۔ اس لیے ملاقات کے لیے مجھے اندر بلانے پر حیرت کے علاوہ پریشانی بھی ہوئی۔ شاید میری کسی حرکت کو سی سی ٹی وی کیمروں نے نمایاں کر دیا تھا۔ جس کی جواب دہی کے لیے میری طلبی ہوئی تھی۔ اب آپ سے کیا چھپانا...... میری نیت میں فطور سہانا کو دیکھنے کے بعد ہی آ گیا تھا۔ میں نے اس کا اظہار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اُس نے نہایت دیدہ دلیری سے مجھے حالِ دل سے آگاہ کر دیا تھا۔

میں اٹھ کر رہائشی کمروں کی طرف آ گیا۔ یہ بتانا فضول ہے کہ ملک ہاؤس میں دولت کی فراوانی کا کیا عالم ہے۔ آپ اس بات سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملک صاحب اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ وزیر بھی رہے تھے۔ تاہم اب فارغ التحصیل تھے۔ میری اتنی اوقات نہیں تھی کہ میں اُن کی اکلوتی لڑکی کو ٹیوشن پڑھا سکتا۔ یہ سب سر ہاشم کی مہربانیوں کا نتیجہ تھا۔ جن کی وجہ سے میری ملک ہاؤس تک رسائی ہوئی۔

سہانا نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے والد کی طبیعت چند دنوں سے خراب ہے۔ انہیں دل کا عارضہ لاحق تھا۔ ڈاکٹرز نے انہیں مکمل آرام کی تلقین کی تھی اس لیے وہ اپنی وسیع و عریض آرام گاہ کے ڈبل بیڈ پر استراحت فرما تھے۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کی عمر ساٹھ کے قریب تھی۔ قد درمیانہ اور جسم فربہی مائل تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھے۔ سگار پینا ان کے مشاغل میں شامل تھا۔ ان سب باتوں کے متعلق سہانا نے مجھے متعدد بار بتایا تھا۔ اب سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہونے کے باوجود اس نے کیونکر بتایا تھا۔ میں اس کے متعلق آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تو اس ملاقات کی تفصیل بتانا ضروری ہے۔ جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس ملاقات کا مقصد کچھ خاص نہیں تھا۔ وہ اپنی اکلوتی لڑکی کے متعلق پریشان تھے۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے مجھے قریبی صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ گویا ہوئے۔

''تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے تمہیں خواب گاہ میں کیوں بلایا ہے۔ میں تم سے ملنے کے لیے سٹنگ روم میں بھی آ سکتا تھا۔ دراصل میری طبیعت بہت خراب ہے۔ مجھے دل کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ اس بیماری نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور موت مجھے سر پر منڈلاتی نظر آ رہی ہے۔ تم حیران ہو رہے ہو گے کہ میں یہ سب تمہیں کیوں بتا رہا ہوں۔ میں اصل مدعے کی طرف بعد میں آؤں گا۔ پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ سہانا کے متعلق کتنا جانتے ہو؟'' میں نے حیرت بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

''میں جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ تمہاری دل سے قدر کرتی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اپنے دل کے بہت سے راز تم سے شیئر کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہیں بتایا ہو کہ اسے کالج میں کون پسند ہے اور کون ناپسند ہے۔ اگر نہیں...... تو مجھے معلوم کر کے بتاؤ...... میں تمہیں اس کا معاوضہ الگ سے دوں گا۔'' ملک صاحب نے مجھے عجیب شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے سہانا کے دل کا احوال اچھی طرح معلوم تھا لیکن یہاں یہ بتا دوں کہ آگے چل کر یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی اور جو کچھ مجھے معلوم تھا، وہ میں ملک صاحب کو بالکل بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر بتا دیتا تو شاید وہ مجھے کھڑے کھڑے گولی مار دیتے اس لیے میں نے مسکین شکل بناتے ہوئے جواب دیا۔

''میں ٹیوشن کے دوران میں غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرتا ہوں۔ آپ نے سی سی ٹی وی کیمرے میں بخوبی دیکھا ہو گا۔ میری توجہ مضمون تک محدود ہوتی ہے اسی لیے میں اس کی پسند اور ناپسند کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ تاہم اگر آپ کہتے ہیں تو میں اس سے بات کر کے دیکھ لیتا ہوں۔''

ملک صاحب بیڈ سے اتر کر کھڑکی کی طرف چلے آئے۔ انہوں نے ڈور کھینچ کر پردوں کو ہٹایا۔ کھڑکی کے سامنے وسیع و عریض کار پورچ میں مہنگی ترین گاڑیوں کی قطار کھڑی تھی۔ یہاں یہ بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ مجھے گاڑیوں کے متعلق کچھ علم نہیں۔ ملک صاحب نے مجھے اشارہ کر کے کھڑکی کے پاس بلایا۔ میں اٹھ کر قریب آ گیا۔

''وہ گاڑی دیکھ رہے ہو؟'' انہوں نے سفید رنگ کی ایک گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

وہ فخریہ لہجے میں بولے۔ ''اس کی قیمت پچاس لاکھ روپے ہے۔ میں نے اپنے داماد کے لیے خریدی ہے۔ تم بیرسٹر احتشام بیگ کو جانتے ہو۔ میں اس کے لڑکے سے سہانا

کی شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ انکار کیے جا رہی ہے۔ مجھے اپنی زندگی سے کوئی امید نہیں۔ میں جلد از جلد اس کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے بیرونِ ملک اس کے لیے فلیٹ بھی خریدا ہے۔ تاکہ وہ اپنا ہنی مون وہاں منا سکے۔ میں نے ایک تگڑا اکاؤنٹ وہاں کے بینک میں کھول دیا ہے تاکہ اسے رقم کی بھی کمی نہ ہو۔ میں اس کے لیے سب کچھ کر رہا ہوں اور وہ مان کے نہیں دے رہی۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ مجھے سہانا نے بتایا تھا کہ وہ گفتگو کے دوران دخل اندازہ برداشت نہیں کرتے، میں چپ ہو کر سب کچھ سنتا رہا۔ تاہم وہ اپنی امارت کے متعلق بتا کر مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا کیے دے رہے تھے۔ وہ دوبارہ ہم کلام ہوئے۔

''تم اُسے شادی کے لیے منالو۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ میں کچھ نہ کچھ تمہارے نام بھی کر دوں گا۔ چند دن پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہیں ایک استاد کی حیثیت سے بہت پسند کرتی ہے اور دل سے تمہاری عزت بھی کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری بات کو رد نہیں کرے گی۔ اگر وہ مان گئی تو میں تمہاری فیس ڈبل کر دوں گا۔''

میرے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات پیدا ہوئے۔ میں ماہانہ پچاس ہزار روپے ٹیوشن کی فیس لے رہا تھا۔ اگر اسے ڈبل کر دیا جاتا تو رقم لاکھ کے قریب بن جاتی۔ میرے تو وارے نیارے ہو جاتے۔ مجھے ان کی آواز سنائی دی۔

''لیکن ٹیوشن کی فیس اسی صورت میں ڈبل ہو گی جب وہ شادی کے لیے ہامی بھرے گی۔ تم کل سے اسے منانے کی کوششیں شروع کر دو۔ اگر اس مقصد کے لیے اسے ملک ہاؤس سے باہر کسی تفریحی مقام پر لے جانا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ ملک ہاؤس کی گاڑی تمہیں ہر جگہ لے جا سکتی ہے۔''

میں نے سہانا سے بات چیت کرنے کا وعدہ کیا اور انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

ملک ہاؤس سے باہر نکلنے کے بعد میں نے موٹر سائیکل کا رخ خالہ زینب کے گھر کی طرف کر دیا۔ مجھے کمیٹی کی رقم ان کے حوالے کرنا تھی۔ میں چند دنوں سے سیکنڈ ہینڈ گاڑی لینے کے متعلق سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ میری حیثیت معقول ہے۔ ایک استاد ہونے کے ناتے قابلِ احترام ضرور ہوں لیکن میرا تعلق سفید پوش طبقے سے ہے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد میں نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ تب کتنا ہی عرصہ مجھے نوکری کی تلاش میں دربدر ہونا پڑا۔ لیکن نوکری پھر بھی نہیں ملی۔ انہی دنوں کاغذات کی تصدیق کے لیے میں سر ہاشم کے پاس گیا۔ انہوں نے پریشانی کی وجہ دریافت کی۔ میں نے حالات کے متعلق انہیں بتا دیا۔ تب انہوں نے مجھے پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر کی جاب دلوا دی۔ تنخواہ پندرہ ہزار ماہوار تھی۔ جو نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے صبر و شکر کے ساتھ اسکول جانا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد میری دوبارہ سر ہاشم سے ملاقات ہوئی۔ تب انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ پی ایچ ڈی کرنے کے لیے باہر جا رہے ہیں۔ اگر میں اُن کی جگہ سہانا کو ٹیوشن پڑھا سکوں تو مجھے پچاس ہزار مہینا فیس مل سکتی ہے۔ اندھے کو کیا چاہئیں دو آنکھیں...... میں نے فوراً ہامی بھر لی۔ انہی دنوں والدہ کا انتقال ہو گیا اور میں تنہا رہ گیا۔ خالہ زینب نے مجھے سہارا دیا۔ ان کی اکلوتی لڑکی ساجدہ سے میری بات چیت بچپن میں ہی طے کر دی گئی تھی۔ اسے باقاعدہ منگنی کا روپ دے دیا گیا۔ یوں میرا تعلق اُن کے گھر سے پختہ ہو گیا لیکن آپ نے ناموں سے حیثیت کے تضاد کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ ساجدہ اور سہانا...... کچھ نقاب کشائی میں کیے دیتا ہوں۔ سہانا پڑھی لکھی اور مال دار آسامی تھی جبکہ ساجدہ میٹرک پاس سیدھی سادی گھریلو لڑکی تھی۔ میں نے اسے کبھی اچھے کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔ چند دن قبل اس نے جو کپڑے زیب تن کیے تھے، وہ دو سال قبل عید پر بنائے گئے تھے۔ خالہ زینب کے حالات اچھے نہیں تھے۔ شوہر کی وفات کے بعد قلیل پنشن میں انہوں نے کھینچ تان کر گزارا کیا تھا۔ مجھے اُن سے دلی ہمدردی تھی۔ لیکن جب سے میں نے سہانا کو ٹیوشن دینا شروع کی اور اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ میری سوچ میں تبدیلی آ گئی تھی۔ میرے خیال میں اس پر بھی بعد میں بات چیت کی جائے تو بہتر ہے۔ ابھی تو مجھے خالہ کے گھر کمیٹی دینے جانا تھا۔ جب سے مجھے پچاس ہزار ماہوار ملنے لگے تھے، میں نے دس ہزار مہینا کی کمیٹی ڈال لی تھی۔ سوچ میں تبدیلی کے ساتھ میرے خواب بھی بدل گئے تھے۔ مجھے اب موٹر سائیکل بُری لگنے لگی تھی۔ میں گلی کوچوں کے بجائے محلوں کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ میرے آگے پیچھے نوکروں کی فوج دوڑتی پھرتی تھی۔ میں مہنگے لباس زیب تن کرتا تھا۔ بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومتا تھا۔ تاہم صبح خواب سے بیدار ہونے پر وہی تنہائی اور محرومیوں بھری زندگی میری منتظر ہوتی تھی۔ ان حالات میں خالہ زینب اور ساجدہ کا ساتھ غنیمت تھا۔ اُن کے گھر جا کر تنہائی کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ خالہ نے کئی دفعہ زور دیا کہ میں اپنا

سامان لے کران کے گھر آجاؤں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ان کے گھر میں دو کمرے تھے۔ ایک میں ساجدہ کا سامان تھا اور دوسرے میں وہ دونوں رہتی تھیں۔ میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ساجدہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ میں جب بھی اس کے گھر جاتا تھا، وہ میرے لیے الائچی والی چائے بناتی تھی۔ اگر کچھ دیر ٹھہرنا ممکن ہوتا تو میرے لیے گاجر کا حلوہ تیار کرتی۔ میرے کپڑے بھی وہی دھوتی تھی اور انہیں استری کرنے کے بعد ان پر میرے پسندیدہ پرفیوم کا چھڑکاؤ بھی کر دیا کرتی تھی۔ یہ پرفیوم میں نے اسے سالگرہ کے موقع پر دیا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل کو تنگ و تاریک گلی میں موڑ دیا۔ اس گلی کے آخر میں خالہ کا گھر تھا۔ کھلی اور بڑی سڑکوں سے گزرنے کے بعد تنگ و تاریک گلیوں میں داخل ہونے کے بعد میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے دل میں تہیہ کیا کہ کمیٹی کی رقم خالہ کو دروازے سے ہی دینے کے بعد گھر کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن دروازے پر دستک دینے کے بعد میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ گزشتہ روز میں نے کپڑے دھونے کے لیے ساجدہ کو دیے تھے۔ وہ لینا بہت ضروری تھے، ورنہ دوسرے دن ٹیوشن پر جانے کے لیے میرے پاس کپڑے نہیں تھے۔ دروازہ ساجدہ نے کھولا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پیدا ہوئے اور اس نے مجھے مسکراتے ہوئے بتایا کہ وہ میری ہی منتظر تھی۔ میرے کپڑے دُھل کر تیار ہیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور صحن سے ہوتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ خالہ سبزی لینے بازار گئی ہوئی تھیں۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف جانے لگی تو میں نے منع کر دیا۔ میں جلد از جلد جان چھڑا کر گھر جانا چاہتا تھا لیکن اس نے بتایا کہ خالہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے پاس ہماری شادی کے سوا اور کوئی موضوع نہیں تھا لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے مستقبل کے متعلق بہت کچھ سوچتا تھا۔ میں نے بیزاری کے ساتھ ساجدہ کی طرف دیکھا۔ اس نے وہی گلابی جوڑا پہنا ہوا تھا جو دو سال قبل عید پر سلوایا تھا۔ ہاتھ کے ناخن سہانا کی طرح بڑے تھے لیکن ان میں میل پھنسی ہوئی تھی۔ پاؤں کی ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ سہانا کے پاؤں دودھ کی طرح سفید اور نازک تھے۔ میں انہیں دیکھ کر اکثر سوچتا تھا کہ کیا وہ انہیں زمین پر رکھتی تھی۔ اگر رکھتی تھی تو پھر اس کے پاؤں اتنے سفید کیوں تھے۔ بلاشبہ انہیں دن میں دو تین دفعہ امپورٹڈ صابن سے دھوتی تھی۔

ساجدہ کے بال لمبے تھے۔ لیکن اتنے اُلجھے ہوئے تھے کہ انہیں مسئلہ کشمیر کی طرح سلجھانا ممکن نہیں تھا۔ شاید کنگھی کیے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ سہانا کے بال شولڈر کٹ تھے۔ لیکن اتنے نرم و ملائم اور سلکی تھے کہ اگر ان میں انگلیاں ڈال دی جاتیں تو وہ پھسل کر نیچے آ جاتیں۔ کتنی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ میرے قریب سے گزری تو مست کر دینے والے ہوا کے جھونکے نے مجھے بے خود کر کے رکھ دیا۔

دروازہ کھلنے کی آواز نے مجھے سوچوں سے بیدار کر دیا۔ خالہ پالک کا تھیلا تھامے کمرے میں داخل ہوئیں۔ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے شفقت بھرے انداز میں میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ساجدہ سے کہا تھا کہ تمہیں روک لے، مجھے معلوم ہے کہ تم آج کل بہت مصروف ہو لیکن میں زیادہ لمبی بات نہیں کروں گی اور زیادہ کرنے کے لیے کچھ ہے بھی نہیں۔ ساجدہ کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ جلد از جلد اسے اپنے گھر کا ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ ماشاء اللہ تم برسرِ روزگار ہو چکے ہو، تنخواہ بھی معقول ہے تو پھر دیر کس بات کی؟ میری طرف سے تیاری مکمل ہے اور تم سے مجھے کچھ چاہیے نہیں۔ بس تاریخ دے دو۔''

میں نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرا روزگار مستقل نہیں ہے۔ میں سر ہاشم کی جگہ سہانا کو ٹیوشن دے رہا ہوں۔ ان کے واپس آنے کے بعد مجھے ٹیوشن کو چھوڑ دینا ہو گا۔ تب میرے پاس پندرہ ہزار ماہوار والی نوکری کے سوا اور کچھ باقی نہیں بچے گا۔''

خالہ نے پوچھا۔ ''سہانا اس لڑکی کا نام ہے جسے تم ٹیوشن پڑھا رہے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تاہم آپ جو سوچ رہی ہیں بات وہ نہیں ہے۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑی ہے۔ میں اس کی دل سے عزت کرتا ہوں لیکن شادی نہ کرنا میری مجبوری ہے۔ پندرہ ہزار مہینا میں، میں گھر کا خرچ کیسے چلاؤں گا۔ پچاس ہزار مہینا تو وقتی ہے تاہم مزید ٹیوشنز تلاش کر رہا ہوں، امید ہے کہ جلد مل جائیں گی۔''

خالہ نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے ٹیوشن کے متعلق نہیں بتایا۔ اگر سر ہاشم واپس آنے والے ہیں تو پھر تمہیں کمیٹی نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔ ٹیوشن ختم ہونے

کے بعد اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤ گے؟''
میں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''پندرہ ہزار میں سے...... اسی لیے ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ دس ہزار کمیٹی کے دینے کے بعد پانچ ہزار میں میرا گزارہ بہ آسانی ہو جائے گا؟'' میں نے خالہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔
''بس ایک سال کی بات ہے۔ کمیٹی ختم ہونے کے فوراً بعد میں ساجدہ سے شادی کرلوں گا۔''
وہ موم ہوتے ہوئے بولیں۔ ''لیکن ایک سال کی کمیٹی سے بھلا گاڑی کہاں آتی ہے۔ تم یونہی وقت برباد کررہے ہو۔''
میں نے بتایا۔ ''ایک لاکھ بیس ہزار ایڈوانس دینے کے بعد باقی کی رقم قسطوں میں دینا ہوگی۔ وہ میں بہ آسانی کرلوں گا۔ بس آپ ہاں کردیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے بعد پس وپیش سے کام نہیں لوں گا۔''
خالہ چپ ہوگئیں اور میں چند منٹ وہاں بیٹھنے کے بعد اٹھ کر گھر آ گیا۔

☆☆☆

اُس رات میں نے کھانا نہیں کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میرے سامنے دو محاذ تھے۔ ایک جانب خاندان کی عزت اور دوسری طرف بہتر مستقبل...... میں دونوں محاذوں پر اکیلا نہیں لڑسکتا تھا۔ مجھے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اگر آپ سے چھپاؤں نہیں تو میری دلچسپی بہتر مستقبل میں تھی لیکن ساجدہ ماں جی کی پسند تھی۔ میں اسے بھی رد نہیں کرسکتا تھا اور سہانا، ٹھہریے میں آپ کو اس کے متعلق کھل کر بتاتا ہوں۔ ٹیوشن پڑھانے کے دوران میں نے کئی دفعہ محسوس کیا تھا کہ وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی تھی۔ پہلے پہل میں نے اسے اپنا وہم جان کر نظرانداز کردیا۔ کہاں وہ اور کہاں میں۔ وہ سابقہ وزیر کی لڑکی تھی اور میں سڑک چھاپ...... لیکن کچھ دنوں کے بعد جب میں نے اس کے بازو پر انگریزی حرف ایچ لکھا ہوا دیکھا تو میں چونک گیا۔ میں آپ کو اپنا نام بتانا بھول گیا۔ میرا نام حمزہ علی ہے اور ایچ میرے نام کا پہلا حرف ہے۔ اُس دن کے بعد میں نے اس پر خصوصی توجہ دینا شروع کردی۔ لیکن اس سے بات چیت کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ تب اس نے میری سالگرہ کے موقع پر مجھے سونے کی انگوٹھی دے کر شدید حیرت میں مبتلا کردیا۔ انگوٹھی پر ایس لکھا ہوا تھا اور ایس سے سہانا بنتا تھا۔ ہم کمرے میں کوئی بات نہیں کرسکتے تھے۔ وہاں کیمرے نصب تھے۔ انگوٹھی اُس نے کب میرے بیگ میں ڈالی مجھے معلوم نہیں۔ گھر جاکر جب میں نے بیگ کھولا تو اندر انگوٹھی کے علاوہ برتھ ڈے کا کارڈ اور مختصر خط موجود تھا۔ میں نے خوشی کے احساس سے مغلوب ہوکر خط کھولا۔ وہ ٹائپ شدہ تھا۔ میں نے نگاہ ڈالی، لکھا تھا۔
''میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں، معاملہ میری برداشت سے باہر ہورہا ہے کیونکہ بابا میری جلد از جلد شادی کردینا چاہتے ہیں اور میں اپنی پسند کے سوا شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میری پسند تم ہو۔ پہلی نظر میں ہی تم نے مجھے متاثر کردیا تھا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بابا اس بات کو کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ مجھے ٹیوشن پڑھانے والا ان کا داماد بن سکے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں نے جس طرح انگوٹھی پر اپنے نام کا پہلا حرف لکھ کر تمہیں دیا ہے اسی طرح اپنے دل پر بھی تمہارا نام لکھ دیا ہے۔ تم یقین مانو بازو پر ایچ کھدواتے ہوئے مجھے بہت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ اب میری محبت کی طرح انمٹ ہے۔ یہ تمام زندگی میرے بازو پر موجود رہے گا۔ کاش اسی طرح تم بھی ہمیشہ میرے پاس رہو۔ میں تم سے بڑی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تم انکار کردو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم اس تضاد کو نظرانداز کردو۔ مجھے سب منظور ہے۔ لیکن تمہاری خاموشی کو میں برداشت نہیں کروں گی۔ اس لیے جواب ضرور دینا۔''
میں نے خط... پڑھا اور متعدد بار پڑھا۔ پھر اسے احتیاط کے ساتھ سرہانے رکھ دیا۔ دوپہر کو اسکول سے واپس آنے کے بعد میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور جواب تحریر کیا۔
''عمروں کا تضاد محبتوں کے درمیان کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تمہاری خوب صورتی اس فرق پر پردہ ڈال دیتی ہے لیکن جب تمہارے والد ہمارے رشتے کے لیے تیار ہی نہیں تو پھر بات کو آگے بڑھانے کا کیا فائدہ...... اگر فرار ہونے کے متعلق سوچ رہی ہو تو بھی یہ ممکن نہیں۔ تمہارے والد کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اگر تمہاری نگاہوں میں اس مسئلے کا کوئی بہتر حل موجود ہے تو میں بلا تامل تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ انگوٹھی بھیجنے کا شکریہ۔ میں اس پر لکھے ہوئے حرف کو اپنے دل پر نقش ہوتا دیکھ سکتا ہوں لیکن ایک دفعہ پھر اچھی طرح سوچ لو، مجھے بعد میں پچھتانے والے لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے۔''
خط لکھنے کے بعد میں نے اس پر پرفیوم لگایا اور نفیس سے لفافے میں ڈال کر ٹیوشن پڑھانے کے لیے کوٹھی آ گیا۔ لفافے کو میں نے ایک کتاب کے اندر رکھ دیا تھا۔ وہ کتاب

میں نے سہانا کے ہاتھوں میں تھما دی۔ اس شام ٹیوشن پڑھتے ہوئے پہلی دفعہ وہ نظریں چُراتی رہی اور ہمارے درمیان موضوع سے ہٹ کر کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ لیکن خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا۔ میں سچ بتاؤں تو شش و پنج میں مبتلا تھا۔ یہ معاملہ سراسر آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ اگر کسی کو خبر ہو جاتی، تو سہانا کا کچھ نہیں جاتا لیکن میرے جسم کو گولیوں سے داغ دیا جاتا۔ اس کے علاوہ بچپن کے رشتے کو نظر انداز کرنے میں مجھے بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ ساجدہ میری خالہ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اُسے یوں بیچ دوراہے میں چھوڑ دینا میرے لیے معمولی بات نہیں تھی۔ میں دن رات اس مسئلے پر غور کرنے لگا۔ میں نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ سگریٹ نوشی کی عادت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ رات کو ڈھنگ سے نیند نہیں آتی تھی۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے نمودار ہونے لگے۔ لیکن مسئلے کا کوئی بہتر حل مجھے سُجھائی نہیں دیا۔

سہانا انتہا پسندی کی حد تک جذباتی ہو کر مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس نے مجھے بہت تحفے تحائف دیے اور حد آخر جب ایگزام میں اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تو مجھے کھانا کھلانے کے لیے ساحلی ریسٹورنٹ لے گئی۔ یہ وہی دن تھے جب ملک صاحب نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں سہانا کو شادی کے لیے آمادہ کروں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریسٹورنٹ میں ہمارے درمیان کھل کر بات چیت ہوئی۔ موسم بہت سہانا ہو رہا تھا۔ آسمان گہرے بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ کسی بھی وقت بارش ہونے والی تھی۔ بادل گرج چمک رہے تھے۔ ہماری میز سے کچھ دور سہانا کا باڈی گارڈ بالکل مستعد بیٹھا تھا۔ تاہم ہماری گفتگو کو سننا اس کے بس سے باہر تھا۔ خوشگوار موسم کو مدِنظر رکھتے ہوئے میری طبیعت میں شرارت کا عنصر پیدا ہونے لگا اور میں نے بے اختیار ہو کر سہانا کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ اس کے ہاتھ کتنے نرم ملائم تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے روئی کے گالے کو تھام لیا ہو۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ ہاتھ چھڑاتے ہوئے مجھے تنبیہ کی۔ ”اگر گارڈ کو شک ہو گیا تو ہم دونوں کی جانوں کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہماری نہیں......صرف میری......تمہاری شاید جان خلاصی کر دی جائے لیکن مجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا اور میں تمہارے لیے جان دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”تو پھر بلاؤں گارڈ کو......؟ وہ پستول چلانے کے لیے بے چین ہے۔“

میں نے گارڈ کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں ہم دونوں پر مرکوز تھیں لیکن ہاتھ پکڑنے کی جسارت کو وہ اس لیے نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس کے اور میرے درمیان میں سہانا حائل تھی۔ میں نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔ ”اگر مرنے کا خوف ہوتا تو معاملے کو آگے بڑھانے کے لیے یہاں کیوں آتا؟“

سہانا سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”یہ کسی تھرڈ کلاس فلم کے گھسے پٹے ڈائیلاگ سے کم نہیں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ معاملے پر بات چیت کر لیں تو دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس نے میری پلیٹ میں چاول اور قورمہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے فرار ہو کر بیرونِ ملک جانا ہو گا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ اندرونِ ملک بابا کی اجارہ داری ہے۔ ہم جہاں بھی ہوں گے، ان کی دسترس میں ہوں گے لیکن ملک سے باہر وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

میں نے پوچھا۔ ”لیکن تمہارے باپ کی اجارہ داری سے نکل کر ہم فرار کیسے ہوں گے؟ ان کے آدمی ہر جگہ موجود ہیں؟“

سہانا نے گلاس میں پانی ڈالا اور گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔ ”ہم علیحدہ علیحدہ سفر کریں گے۔ تم اپنے نام سے اور میں اپنے نام سے۔ چونکہ ایک وزیر کی لڑکی ہونے کے ناتے میں نے کبھی اکیلے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اس لیے باہر کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے بابا کے پرسنل سیکریٹری کو ساتھ ملا لیا ہے۔ مجھے اس کے لیے تگڑی رقم کا نذرانہ اسے دینا پڑا ہے۔ وہ میرا ٹکٹ فرسٹ کلاس میں کروا دے گا۔ تم سیکنڈ کلاس میں سفر کرو گے۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو سکے۔ ملک سے باہر جانے کے فوراً بعد ہم شادی کر لیں گے اور حالات بہتر ہو جانے کے بعد ملک واپس آجائیں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”حالات مناسب کیسے ہوں گے؟“

”گفت و شنید سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں بابا سے بات چیت کروں گی، مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے۔ میں ان کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہوں‘ بالفرض اگر انہوں نے انکار کیا تو احتیاط کے طور پر میں نے اتنی رقم محفوظ

کر لی ہے جو وہاں ہمیں کام آسکے گی۔ یہ ڈالرز میں ہے۔ ہمیں ایک سال تک کوئی بھی کام نہیں کرنا ہوگا۔''

باہر بادل زور سے گرجا اور بارش کا آغاز ہوگیا۔ میں نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''اور یہ رقم ہم بیرونِ ملک کیسے لے جائیں گے؟ یقیناً ساتھ تو نہیں لے جاسکتے۔ یہیں سے وہاں منتقل کرنا ہوگی۔''

سہانا نے کولڈ ڈرنکس گلاس میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کی تم فکر نہ کرو۔ بابا کے سیکریٹری نے اپنے اکاؤنٹ کے ذریعے رقم میرے نئے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی ہے جس کے متعلق بابا نہیں جانتے۔ ہمیں صرف گھر سے نکل کر ائرپورٹ تک جانا ہے۔ میں اکیلے سفر نہیں کرسکتی۔ اس لیے مجھے تمہارے ساتھ کی اشد ضرورت ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ معاملہ گمبھیر تھا۔ پھنسنے کے چانسز زیادہ تھے۔ تاہم ایک دفعہ اگر ہم باہر نکل جاتے تو اس کے باپ کی حیثیت بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ مجھے سوچ میں پڑتا دیکھ کر وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''بس...... ہوا نکل گئی، مجھے معلوم تھا کہ تم عملی قدم اٹھانے سے پہلے ہچکچاؤ گے لیکن تم تو سوچ میں ہی پڑ گئے، تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں علیحدہ علیحدہ سفر کریں گے۔ اس لیے تم معاملے میں براہِ راست ملوث نہیں ہوگے۔ بیرونِ ملک پہنچنے کے بعد ہم آزاد ہوجائیں گے۔ اس کے بعد کوئی بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی۔ ہمیں سفر علیحدہ ہوکر کرنا تھا اور ملک سے باہر ہم دونوں کو تلاش کرنا ممکن نہیں تھا لیکن اس کے باوجود بھی خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ میں سہانا کا ٹیوٹر تھا اور اسی فلائٹ میں میری سیٹ بھی ریزرو تھی جس میں سہانا سفر کرنے والی تھی۔ تھوڑی سی تحقیقات کے بعد اس کے باپ کو بہ آسانی معلوم ہوجاتا کہ وہ میرے ساتھ فرار ہوئی ہے۔ اس کے بعد بات بیرونِ ملک تلاش کی رہ جاتی۔ اگر تھوڑی سی عقل استعمال کی جاتی تو انہیں بہ آسانی معلوم ہوجاتا کہ سہانا کے اکاؤنٹ میں رقم پرسنل سیکریٹری نے منتقل کی تھی اور سیکریٹری کے ذریعے ہم تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ میرے حلق میں نوالہ پھنس گیا۔ میں نے کولڈ ڈرنک کا پورا گلاس حلق میں انڈیل کر اسے نیچے دھکیلا۔ باہر دوبارہ بجلی چمکی۔ گارڈ نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

سہانا بولی۔ ''تم بلاوجہ پریشان ہورہے ہو، یقین جانو کچھ نہیں ہوگا اور اگر ہوا تو میں سنبھال لوں گی۔''

میں نے سوچنے کے لیے وقت طلب کیا۔ اُس نے اگلے ہفتے تک کا دے دیا اور ہم کھانا کھانے کے بعد ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ بارش طوفانی انداز میں برس رہی تھی۔ سمندر کی بپھری ہوئی لہریں ساحل پر سر پٹختے ہوئے خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہمارے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ اس لیے گاڑی میں گمبھیر خاموشی طاری ہوگئی۔ سہانا نے مجھے گھر کے پاس ڈراپ کردیا۔ میری موٹر سائیکل کوٹھی میں ہی رہ گئی لیکن میں اسے دوسرے دن گھر لا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے بات نہیں کی۔

☆☆☆

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو ان حالات میں کیا فیصلہ کرتے؟ ساجدہ یا سہانا...... محبت یا مستقبل...... غربت یا امارت...... اگر مجھ سے پوچھیں تو میں ساجدہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میری کزن ہونے کے علاوہ میری پہلی محبت بھی تھی لیکن اگر میں سہانا کو انکار کردیتا تو مجھے ٹیوشن سے برطرف کردیا جاتا اور ٹیوشن ختم ہونے کے بعد میرے پاس پندرہ ہزار ماہوار والی جاب باقی رہ جاتی۔ نوکری ملنے کی مجھے کوئی امید نہیں تھی۔ سر ہاشم بھی ابھی تک بیرونِ ملک سے واپس نہیں آئے تھے اور نہ ہی ان کے آنے کی توقع تھی۔ میں نے یونیورسٹی سے معلوم کیا تھا۔ انہوں نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے موبائل میں سینڈ کی ہوئی سہانا کی تصویر پر نگاہ ڈالی۔ وہ ساجدہ کی نسبت بہت خوب صورت اور پُرکشش تھی۔ میری سوچ بدلنے لگی۔ اگر میں باہر چلا جاتا تو میری زندگی بدل کر رہ جاتی۔ میرے پاس دولت، رتبہ اور پُرکشش بیوی کے علاوہ اچھا مستقبل بھی ہوتا۔ اس کی نسبت یہاں رہنے کے بعد میں دوڑ دھوپ کر کے کتنا کما لیتا۔ بیس ہزار، پچیس ہزار یا پھر تیس ہزار اس سے اوپر جانا ممکن نہیں تھا اور مہنگائی کے اس دور میں اتنی کمائی مناسب نہیں تھی۔ جب بچے ہوجاتے تو اخراجات بڑھ جاتے اور میں جلد ہی زندگی سے دلبرداشتہ ہو کر رہ جاتا۔ میں تمام رات شش و پنج میں مبتلا رہا لیکن کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر پایا۔ تاہم میرے پاس ایک ہفتے کا وقت ابھی باقی تھا۔ میں اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرسکتا تھا لیکن دو دن مزید گزر گئے اور میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ کوئی مناسب فیصلہ نہ کرسکا۔ تاہم اب بھی برملا اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ میرا جھکاؤ کافی حد تک ساجدہ کی طرف تھا۔ میں کسی لحاظ سے بھی سہانا کے ساتھ مناسب دکھائی نہیں

دیتا تھا۔ سابقہ وزیر کی وہ لڑکی نہ جانے مجھ پر کیوں فدا ہوگئی تھی۔ میرے اندر کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ میں واجبی شکل وصورت کا معمولی انسان تھا۔ اگر بیرونِ ملک جانے کے بعد اس کا دل مجھ سے بھر جاتا تو وہ بیچ راہ میں مجھے تنہا چھوڑ کر فرار ہوسکتی تھی۔ تب میں دھوبی کے کُتے کی طرح نہ گھر کا رہتا اور نہ ہی گھاٹ کا۔

بہرحال کافی سوچ بچار کے بعد میں نے دل میں تہیہ کیا کہ میں سہانا کے ساتھ بیرونِ ملک ضرور جاؤں گا اور اگر اس نے شادی کرنے پر اصرار کیا تو میں وہ بھی کرلوں گا۔ رہی ساجدہ کی بات...... تو میں اُسے کانوں کان خبر نہیں ہونے دوں گا کہ میں اُس سے بے وفائی کرنے والا ہوں۔ اگر اس دوران سہانا میرے ساتھ ٹھیک رہی تو میں کسی بہانے ملک آنے کے بعد ساجدہ سے بھی شادی کرلوں گا۔ اب مجھے بیرونِ ملک جانے کا کوئی مناسب بہانہ سوچنا تھا جسے بتا کر میں خالہ کو مطمئن کرسکتا۔ آپ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دو محاذوں پر لڑنے کے لیے مجھے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا لیکن مجھے زیادہ تردد اور کوشش نہیں کرنا پڑی۔ چند دنوں کے بعد ساجدہ نے میرے موبائل میں سہانا کی تصویر دیکھ لی۔ خالہ نے ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ مجبوراً مجھے بتانا پڑا کہ میں سہانا کے ساتھ شادی کرکے بیرون ملک جانے والا ہوں۔ خالہ بہت چیخیں چلاّئیں۔ انہوں نے میری منت سماجت کی لیکن میں اپنی بات پر اڑ گیا۔

ساجدہ بے ہوش ہوگئی اور میں اس مجبور و لاچار گھرانے کو روتا دھوتا چھوڑ کر گھر سے باہر آگیا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھے لعنت ملامت کررہے ہوں گے۔ میرا اپنا ضمیر بھی مطمئن نہیں تھا۔ میں ساجدہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے انجانے میں سب کچھ معلوم ہوگیا تھا ورنہ میں ملک آنے کے بعد اس سے شادی کرلیتا۔ تاہم اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے اپنے ضمیر کو یہ سوچ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ اچھے مستقبل کے لیے تو لوگ اپنے بچوں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ تو میری خالہ زاد تھی۔ میں یہاں یہ بتانا بھول گیا کہ ٹیوشن کے دوران میں یہ موبائل ساتھ لے جانے سے احتراز کرتا تھا۔ اس کے اندر سہانا کی بہت سی تصاویر تھیں جو اس نے مجھے وقتاً فوقتاً بھجوائی تھیں۔ بہرحال چند دنوں کی سوچ بچار کے بعد میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کردیا۔ سہانا بہت خوش ہوئی اور اس نے مجھے اپنے اگلے لائحہ عمل کے متعلق بتایا۔ میں آپ کو اس کی زبانی بتاتا ہوں۔ یہ سب مجھے ایک خط کی صورت میں دستیاب ہوا، لکھا تھا۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے میرے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہم وہاں بہت خوش رہیں گے۔ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ میں تمہاری پوجا کروں گی اور تمہیں کبھی بھی اداس نہیں ہونے دوں گی۔ بابا کی بالکل فکر نہ کرنا۔ انہیں منانا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے بس تم خوش رہنا۔ اب میں تمہیں اپنے اگلے لائحہ عمل کے متعلق بتاتی ہوں۔ تم کل بابا سے بات چیت کرو گے اور انہیں بتاؤ گے کہ تم ٹیوشن چھوڑ رہے ہو۔ کیونکہ تمہیں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے باہر جانا ہے۔ ٹیوشن کو خیرباد کہنے کے بعد تم پاسپورٹ اور ویزے کے لیے اپلائی کرو گے۔ اس میں کچھ وقت لگے گا اور اس معاملے میں بابا کا سیکریٹری تمہاری مدد کرے گا۔ اس کی جان پہچان پاسپورٹ آفس میں قابلِ رشک ہے۔ جب تمہیں ویزا مل گیا تب میں تمہیں بتاؤں گی کہ کس دن اور کس ائرلائن سے ہمیں بیرونِ ملک جانا ہے۔ تمہیں اپنے لیے سیٹ خود ریزرو کروانا ہوگی۔ ہم دونوں دورانِ سفر ایک دوسرے سے لاتعلق رہیں گے۔ یہ لاتعلقی صرف سفر کی حد تک محدود ہوگی۔ امریکا پہنچنے کے بعد ہم اپنے مخصوص کردہ فلیٹ میں آجائیں گے اور دوسرے دن ہی شادی کرلیں گے۔ یہاں میں یہ بتادوں کہ فلیٹ کرائے کا ہے جس کی مہینے بھر کی ادائیگی کی جاچکی ہے اور یہ سب کام بابا کے سیکریٹری نے کیے ہیں کل جب تم ٹیوشن کو چھوڑنے کے بعد رخصت ہو رہے ہوگے تب میں ٹکٹ کی رقم کتاب کے درمیان رکھ کر تمہارے حوالے کردوں گی۔ یہ رقم بڑے نوٹوں پر مشتمل ہوگی۔ اس لیے کتاب میں یہ آسانی آجائے گی۔ اس آخری ملاقات کے بعد ہم دوبارہ نہیں ملیں گے۔ ہماری اگلی ملاقات امریکا میں ہوگی۔

سہانا

میں نے وارفتگی کے عالم میں خط کو چوم لیا اور خیالوں کے دوران امریکا کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ میں نے ساجدہ اور خالہ زینب کو بھی فراموش کردیا۔ اُن دونوں نے متعدد بار مجھ سے ملنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اُن کے آنے سے قبل راہِ فرار اختیار کرلی تھی۔ میں اب اس موضوع پر بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک سابقہ وزیر کی لڑکی میرے ساتھ کی منتظر تھی۔ یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم بات نہیں تھی۔ لیکن میں اتنا بے حس بھی نہیں تھا کہ بیرونِ ملک جانے کے بعد اپنوں کو بُھلا دیتا۔ میں نے دل میں پکا تہیہ کرلیا کہ وہاں پہنچنے کے بعد خالہ کو معذرت کا خط لکھوں گا اور ہر ماہ کچھ رقم بھی انہیں بھجوادیا کروں گا۔ تاکہ وہ ساجدہ

کی شادی دھوم دھام سے کر سکیں۔ اگر انہوں نے مجھے معاف کر دیا تو میں رشتہ تلاش کرنے میں بھی اُن کی مدد کروں گا۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ اب مجھے ایک محاذ پر لڑنا تھا۔ دوسرے سے میں دستبردار ہو گیا تھا۔ اگلے دن سے میں نے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ مجھے اب بہت کچھ کرنا تھا اور سب تنہا کرنا تھا۔ ملک صاحب سے ملاقات چند منٹوں پر مشتمل ثابت ہوئی۔ ان کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ اس لیے وقت کی کمی کی وجہ سے انہوں نے لمبی بات کرنے سے احتراز کیا پھر بھی جب میں نے انہیں بتایا کہ میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے بیرونِ ملک جانے والا ہوں تو انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اچھے مستقبل کے لیے جانا چاہتے ہو تو میں روکوں گا نہیں۔ لیکن مشورہ ضرور دوں گا۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد بھی تمہیں یہاں معقول نوکری نہیں ملے گی۔ تم اپنا وقت اور رقم دونوں برباد کر رہے ہو۔ میری مانو تو سہانا کو ٹیوشن پڑھاتے رہو۔ وہ تم سے مانوس ہو گئی ہے۔ میں فیس میں اضافہ کیے دیتا ہوں۔''

میں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے سہانا کی شادی والے معاملے کے متعلق پوچھا۔ میں نے بتایا۔ ''وہ اس کے لیے راضی نہیں ہے۔ اپنی پڑھائی مکمل کرنا چاہتی ہے اور چند سال مزید شادی نہیں کرے گی۔''

ملک صاحب خاموش ہو گئے۔ میں فیس لینے کے بعد کمرے سے باہر آ گیا۔ وہاں سہانا میری منتظر تھی۔ اس نے کتابوں کا بیگ مجھے تھما دیا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ بیگ کو کاندھے کے ساتھ لٹکایا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر آ گیا۔ کتابوں کے درمیان پانچ پانچ ہزار کے متعدد نوٹ تھے۔ میری رال ٹپکنے لگی۔ میں نے اتنی رقم اپنی زندگی میں پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ میرے دل میں آیا۔ انہیں لے کر فرار ہو جاؤں۔ لیکن ایسے مزید نوٹ امریکا میں میرے منتظر تھے۔ اس لیے میں نے ارادہ ملتوی کر دیا اور نوٹوں کو اٹیچی کیس میں رکھ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ تمام رات امریکا کے خواب مجھے دکھائی دیتے رہے۔ صبح آنکھ تاخیر سے کھلی اور ناشتا کرنے کے بعد میں نے چھٹی کی درخواست اسکول بھیج دی۔ پھر تیار ہونے کے بعد پاسپورٹ بنوانے کا آغاز کر دیا۔ ملک صاحب کے سیکریٹری کا نام حشمت خان تھا۔ اس نے مجھے فون کر کے چند آدمیوں کے متعلق بتایا جو رقم لے کر پاسپورٹ بنانے میں مدد کرتے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ مجھے ایک دو دفعہ کے علاوہ پاسپورٹ آفس نہیں جانا پڑا۔ اس کے باوجود بھی پاسپورٹ بننے میں بیس دن لگ گئے۔ اصل اور مشکل مرحلہ امریکا کا ویزا حاصل کرنا تھا۔ یہاں بھی حشمت خان کی جان پہچان کام آئی۔ مجھے خدشہ لاحق ہو گیا کہ وہ تمام معاملے میں اچھی طرح ملوث ہو چکا تھا اگر پولیس تفتیش کا آغاز اس سے کرتی تو انہیں معلوم کرنے میں رتی برابر بھی دشواری نہ ہوتی کہ اُس کی جان پہچان کی بدولت میں ملک سے باہر جانے میں کامیاب ہوا تھا اور جس فلائٹ کے ذریعے سہانا ملک سے فرار ہوئی تھی، اس فلائٹ میں، میں بھی موجود تھا۔ میں نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا کہ جب اوکھلی میں سر دیا تو پھر موسلوں کا کیا ڈر...... کچھ عرصے کے بعد ویزا بھی مل گیا۔ اس دوران میں نے اور سہانا نے ملاقات نہیں کی۔ مجھے حشمت خان نے بتایا کہ کس دن اور کس تاریخ کو سیٹ بک کروائی ہے۔ میں نے ایسے کام کبھی نہیں کیے تھے اور جہاز میں سفر کرنا میرے لیے کسی ایڈونچر سے کم نہیں تھا۔ میں بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔ سیٹ بھی بخیر و خوبی ریزرو ہو گئی اور میں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ سہانا کے کہنے کے مطابق مجھے زیادہ سامان ساتھ نہیں لے جانا تھا۔ میں نے چند کپڑے اور ضروری سامان کا ایک بیگ تیار کر لیا۔ مکان کا کرایہ ادا کرتے ہوئے میں نے مالک مکان کو بیرونِ ملک جانے کے متعلق بتایا۔ اس نے حیرت زدہ لہجے میں رقم کے متعلق پوچھا۔

میں نے ہنستے ہوئے بتایا۔ ''مجھے گورنمنٹ وظیفے پر باہر بھجوا رہی ہے۔ وہ مطمئن نہیں ہوا۔ مجھے اسے مطمئن کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لیے دوسرے دن اسکول آ گیا۔ میں نے نوکری سے استعفیٰ دیا اور پرنسپل سے سر ہاشم کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جلد ملک واپس آنے والے ہیں۔ میں نے صدقِ دل سے دعا کی کہ وہ میری روانگی سے قبل آ جائیں۔ ان کا مشورہ میرے لیے بہت اہمیت کا...... رکھتا تھا۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد میں گھر آ گیا۔ خالہ زینب کے محلے میں ڈالی ہوئی کمیٹی کا میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم رقم اتنی زیادہ نہیں تھی کہ کسی پریشانی کا سبب بنتی۔ اس لیے میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ میری جان ان دونوں ماں بیٹی سے چھوٹ رہی تھی، اس کے لیے رقم سے قربانی دینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں، مجھے یقین تھا کہ سہانا بھی تیاریاں کر رہی ہو گی۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ سی سی ٹی وی لگے ہوئے ماحول سے فرار کیسے ہو گی۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں۔ ملک صاحب کی کوٹھی میں جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے

تھے۔ اندر آنے اور باہر جانے کے لیے دروازے پر سیکیورٹی کا عملہ متعین تھا۔ وہ اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار کیسے ہوسکتی تھی۔ تاہم یہ اس کی دردسری تھی۔ مجھے اس میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے سوچ کو منتشر کر دیا۔ اگلے دن میں نے سر ہاشم سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ملک واپس نہیں آئے تھے۔ میں نے اُن کے نمبر کے بارے میں پوچھا لیکن کامیابی نہیں ہوئی، مجبور ولاچار گھر آ گیا۔

☆☆☆

روانگی والے دن میں نے بہت سا سامان محلے والوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ میرے احسان تلے دب کر رہ گئے اور مجھے الوداع کہنے کے لیے گھر کے سامنے جمع ہونے لگے۔ ان میں سب سے آگے مالک مکان تھا۔ وہ اس بات پر بضد تھا کہ مجھے اپنی گاڑی میں بہ آسانی ائرپورٹ چھوڑ کر آسکتا ہے۔ تھوڑی سی پس وپیش کے بعد میں تیار ہوگیا۔ دو تین اور محلے والے بھی ساتھ جانے کی ضد کرنے لگے۔ لیکن جگہ کی کمی کی وجہ سے انہیں انکار کر دیا گیا اور یوں میری روانگی ہوئی۔

ہائے ری قسمت...... آج بھی یاد کرتا ہوں تو دل میں اک ٹیس سی اٹھ کر رہ جاتی ہے۔ کاش میں نے ٹیوشن پڑھانے سے ہی انکار کر دیا ہوتا تو آج خوش وخرم زندگی گزار رہا ہوتا۔ میں آپ سب کو نصیحت کرتا ہوں خدارا کسی وزیر کی لڑکی کو ٹیوشن پڑھانے سے اجتناب کیجیے گا۔ اب چاہے وہ لڑکی خوب صورت ہو یا نہ ہو۔ ان باتوں سے قطع نظر آپ بس فوراً انکار کر دیجیے گا۔ ورنہ حال میرے جیسا ہوگا۔ میں دوبارہ تحریر کی طرف آتا ہوں۔ ائرپورٹ جاتے ہوئے مالک مکان مجھے برابر یاد دہانی کرواتا رہا کہ میں بیرونِ ملک جا کر اسے فراموش نہ کردوں اور جتنی جلدی ہوسکے اسے باہر بلانے کی کوشش کروں۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ میں اس کی ہدایات پر پوری طرح عمل کروں گا۔ اگر کچھ وقت لگ گیا تو وہ مایوس نہ ہو۔ تاہم وہ پھر بھی بضد رہا کہ میں اسے امریکا میں اپنی رہائش کے متعلق تفصیل سے بتادوں تاکہ رابطہ آسانی سے ہوسکے۔ میں نے بتایا رہائش کے متعلق ابھی تک مجھے کچھ معلوم نہیں، جیسے ہی پتا چلا میں اسے مطلع کردوں گا۔ بمشکل تمام ائرپورٹ پر اس سے جان خلاصی ہوئی اور میں جہاز میں داخل ہونے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں کچھ پریشان تھا۔ مجھے ائرپورٹ پر سہانا دکھائی نہیں دی تھی۔ دورانِ سفر بھی میں اسی پریشانی میں مبتلا رہا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ مجھے بے وقوف بنا گئی ہے۔ لیکن

اب کیا ہوسکتا تھا۔ جہاز رن وے کو چھوڑنے والا تھا اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ امریکا تو مجھے جانا ہی تھا۔ مجھے وہاں جاننے والا کوئی نہیں تھا اور میرے پاس رقم بھی کم تھی۔ دل کو تقویت صرف اس بات سے پہنچتی تھی کہ میں انگلش اچھی بول لیتا تھا۔ اگر میرے ساتھ دھوکا ہوتا تو میں وہاں کی پولیس کو حالات سے آگاہی کے بعد مدد کی اپیل کرسکتا تھا۔ باقی کا سفر کیسے گزرا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا ہوں۔ بس آپ اندازہ لگا لیجیے کہ یہ سفر کانٹوں پر ننگے پاؤں چل کر طے ہوا اور پھر ائرپورٹ پر اترنے کے بعد میرے خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ متعدد فلائٹس آرہی تھیں اور متعدد جارہی تھیں۔ ان سب کے درمیان میں، میں تنہا تھا۔ مجھے اپنے اگلے لائحہ عمل کے متعلق سوچنا تھا اور اس کے لیے مجھے تنہائی کی ضرورت تھی جو وہاں نہیں تھی۔ میں پریشان قدموں کے ساتھ ائرپورٹ سے باہر کی طرف چل دیا۔ تب وہ مجھے مایوسی کے گمبھیر اندھیرے میں امید کی کرن بن کر ابھرتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں ایسے بچے کی طرح اس کی طرف بھاگ کھڑا ہوا جیسے لوگوں کے ہجوم میں غیر متوقع طور پر اپنی ماں دکھائی دے گئی ہو۔ یہ صرف ایک اصطلاح ہے۔ اسے حقیقت نہ سمجھ لیجیے گا۔ میں بے اختیار ہوکر اس سے لپٹ ہی جاتا۔ اگر حشمت خان درمیان میں نہ آجاتا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے حشمت خان معاملے میں مکمل طور پر ملوث ہو۔ میری غلط فہمی کی ابتدا سہانا کے بازو پر لکھے ہوئے حروف ایچ سے ہوئی تھی۔ اور ایچ سے حشمت خان بھی بنتا تھا۔ ان دونوں کی عمروں میں اتنا ہی فرق تھا جتنا میری اور سہانا کی عمروں میں تھا۔ اس کے قریب پہنچنے کے بعد میں نے پھنسی، پھنسی آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی جانب متوجہ کیا، اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا پھر غصیلے لہجے میں بولی۔

''تم کہاں مر گئے تھے۔ میں کب سے تمہیں ائرپورٹ پر تلاش کررہی ہوں۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ لیکن حشمت خان خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مرا نہیں ابھی زندہ ہے۔ اس لیے میری مانو تو جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں تم دونوں کو فلیٹ پر چھوڑ کر ملک واپس جانا چاہتا ہوں۔''

سہانا نے نہایت بے دردی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے ائرپورٹ سے باہر کھڑی سیاہ گاڑی کی طرف لے آئی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر انگریز لڑکی

براجمان تھی۔ ہمارے بیٹھتے ہی اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ حشمت خان اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ہم ایک وسیع و عریض عمارت تک پہنچ گئے۔ سہانا کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا اور نہایت شاندار تھا۔ لیکن اس کے رویّے نے میرے دماغ کو تقریباً ماؤف کر دیا تھا۔ اگر مجھ سے شادی سے انکاری ہو جاتی تو دیارِ غیر میں، میں اس کا کیا بگاڑ لیتا۔ جو بھی تھا ابھی تک معاملہ کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ مجھے کچھ اور انتظار کرنا تھا۔ فلیٹ دو کمروں اور مختصر ٹی وی لاؤنج پر مشتمل تھا۔ حشمت خان نے کچھ دیر فلیٹ میں بیٹھے رہنے کے بعد ہم سے اجازت طلب کی۔ میں روانی میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔ اس نے مجھے نظرانداز کرتے ہوئے سہانا سے اجازت طلب کی اور رخصت ہو گیا۔ اب فلیٹ میں، میں اور سہانا اکیلے تھے۔ میں اگر چاہتا تو اس کے ساتھ وہ سب کچھ کر سکتا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ آپ شاید میری سوچ کو غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں اُس پر بہیمانہ تشدد کر کے فلیٹ سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں جاتا کہاں؟ وہاں مجھے جاننے والا کوئی نہیں تھا اس لیے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ حشمت خان کے جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''یہ سامنے والا کمرا تمہارا ہے۔ نہا دھو کر فارغ ہو جاؤ۔ ہم ٹیرس پر بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بیڈ روم میں آ گیا۔ امریکن روایت کے مطابق کمرے میں کپڑوں کی الماری اور بیڈ کے علاوہ مزید سامان نہیں تھا۔ باتھ روم بھی مختصر تھا۔ میں نے اچھی طرح غسل کیا۔ اور نئے کپڑے زیبِ تن کرنے کے بعد ٹیرس کی طرف آ گیا۔ وہ نیلی شرٹ اور سفید نیکر پہنے ہوئے غضب ڈھا رہی تھی۔ میں نے اس لباس میں اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اس کی سڈول پنڈلیاں اور متناسب ٹانگیں دودھ کے مانند سفید تھیں۔ سیاہ بال بکھرنے کے بعد ماتھے کو گھیرے میں لے رہے تھے۔ میں کتنی دیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا پھر ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ شام کے چھ بجنے والے تھے۔ اس کے ننگے بازو پر ایچ لکھا ہوا تھا۔ لیکن بہت ہی بے معنی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بالکل بدل چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا برانڈ وہی ہے لیکن اندر سے مال تبدیل کر دیا گیا ہو۔ مجھ پر اداسی کا غلبہ طاری ہونے لگا۔ تنہائی کا احساس بھی شدت اختیار کرنے لگا۔ میں نے بے دلی کے ساتھ چائے پینی شروع کر دی۔ وہ نہایت بدذائقہ تھی۔ یقیناً اس نے خود بنائی تھی اور شاید پہلی دفعہ بنائی تھی۔ میں نے بمشکل تمام زہر مار کی۔ چائے پینے کے دوران سردمہری اور اجنبیت کی فضا طاری رہی۔ نہ اُس نے کوئی بات کی اور نہ ہی میں نے کوئی سوال کیا۔ چائے پینے کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ ''کل صبح ہم شادی کر لیں گے اور شاید ہنی مون منانے کے لیے جلد ہی سوئٹزرلینڈ چلے جائیں گے۔ چند دنوں کی بات ہے۔ پھر ہم دوبارہ اسی فلیٹ میں واپس آ جائیں گے۔ تاہم ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔ بابا کے آدمیوں نے ہمیں تلاش کرنا شروع کر دیا ہوگا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ دوبارہ ہم کلام ہوئی۔ ''معاملہ ٹھنڈا ہونے کے بعد میں بابا سے بات چیت کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے۔ لیکن اگر انہوں نے انکار کیا تو ہم امریکا کو چھوڑ کر کسی اور ملک شفٹ ہو جائیں گے۔ میرے پاس ڈالرز کی کمی نہیں ہے اور یہ ڈالر جس اکاؤنٹ میں محفوظ ہیں، اس کے متعلق میرے اور حشمت خان کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔''

میں نے پہلی دفعہ منہ کھولا۔ ''اگر تمہارے والد کو حشمت خان پر شک ہوا تو معاملہ کھل کر سامنے آ جائے گا۔ اس کے بعد ہم جہاں بھی ہوں گے بہ آسانی پکڑے جائیں گے۔''

''نہیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ حشمت خان جلد نوکری چھوڑ کر اپنے بچوں کے پاس افغانستان جانے والا ہے۔ وہ وہیں کا رہائشی ہے۔ اس کے جانے کے بعد ہمارے فرار کا کوئی سراغ باقی نہیں رہے گا۔ بس میں جیسا کہہ رہی ہوں، ویسا ہی کرتے جاؤ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات کا کھانا ہم نے سرسری کھایا۔ تمام دن کے تھکے ہونے کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی نیند کی وادیوں میں گم ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح معاملہ کھلنے کا آغاز ہو گیا۔ وہ رات کے کسی پہر فلیٹ سے فرار ہو گئی۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا جو حشمت خان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے تو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ صبح آنکھ کھلی تو میں نے سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس دو آدمیوں کو اپنے سرہانے کھڑے پایا۔ ان میں سے ایک نے ریوالور پکڑا ہوا تھا اور نال کا رخ میری جانب تھا۔ تاہم وہ دونوں شکل و صورت سے پڑھے لکھے دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے بیدار ہوتا دیکھ کر اُن میں سے ایک نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''سہانا کہاں ہے؟''

میں نے پریشان لہجے میں بتایا۔ ''اگر وہ ساتھ والے کمرے میں نہیں ہے تو پھر مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔''

ان دونوں نے مزید بات چیت کیے بغیر مجھے سامان پیک کرنے کے لیے کہا۔ میں اب تک پیش آنے والے واقعات سے دلبرداشتہ ہو کر اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ چکا تھا۔ اس لیے چون چرا کیے بغیر سامان باندھنے لگا جو کہ زیادہ نہیں تھا۔ آپ اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ مجھے اس کیچوے کی طرح استعمال کیا گیا تھا جسے کانٹے پر باندھ کر مچھلیوں کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اب مجھے اپنے انجام کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ میں نے دل میں تہیہ کیا کہ ان سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ لیکن انہوں نے ملک واپسی تک کچھ پوچھا ہی نہیں۔ ائرپورٹ پر اترنے کے فوراً بعد مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ مجھ سے مختصر پوچھ گچھ ہوئی۔ میں نے سب کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔ وہ معاملے میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ اس لیے مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ میرا سب کچھ تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ نوکری کو میں نے خود خیرباد کہہ دیا تھا اور منگیتر کو سہانا کے ورغلانے پر چھوڑ دیا تھا۔ میرے آگے پیچھے تاریکیوں کے سوا اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ساجدہ کی بددعا نے مجھے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔ اگر میں جیل سے رہا ہو جاتا تو اُس سے معافی مانگنے ضرور اس کے گھر جاتا۔ لیکن مجھے رہائی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے چاروں جانب گھپ اندھیرا تھا لیکن دوسرے دن غیر متوقع طور پر مجھے خوش خبری موصول ہوئی اور ایک سپاہی نے مجھے بتایا کہ سر ہاشم مجھ سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ میں بے صبری کے ساتھ پولیس اہلکار کے پیچھے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں آ گیا۔ وہاں میز پر فون رکھا ہوا تھا جس کا ریسیور ایک سائڈ پر پڑا تھا۔ میں کچھ مایوس ہوا۔ سر ہاشم مجھ سے ملنے کے لیے تھانے نہیں آئے تھے۔ میں نے ریسیور اٹھایا، اُن کی نرم گرم آواز سنائی دی۔

''برخوردار میری چند باتیں غور سے سنو۔ بات کو درمیان سے کاٹنا نہیں۔'' چند سیکنڈ دوسری جانب خاموشی طاری ہوئی۔ پھر اُن کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''کل میں نے اور سہانا نے شادی کر لی ہے۔'' مجھے اپنے سر پر بم پھٹتا ہوا محسوس ہوا اور مجھے یاد آیا کہ ایچ سے ہاشم بھی بنتا تھا۔

وہ بولے جا رہے تھے۔ ''یقیناً تمہیں حیرت محسوس ہوئی ہوگی۔ ہونی بھی چاہیے۔ وہ تم سے محبت کرتی تھی لیکن شادی اُس نے مجھ سے کی۔ میں کھل کر تمہیں معاملے کے متعلق بتاتا ہوں۔ جب میں اسے ٹیوشن پڑھاتا تھا تب ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو گئے۔ میں نے ملک صاحب سے بات چیت کی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اب اگر ہم دونوں ملک سے فرار ہونے کی کوشش کرتے تو درمیان میں ہی دھر لیے جاتے۔ اس لیے بحالتِ مجبوری تمہیں ڈمی کے طور پر استعمال کیا گیا تاکہ تلاش کرنے والوں کا دھیان تمہاری جانب لگا رہے اور وہ ہمیں نظرانداز کر دیں۔ امریکا میں فلیٹ کا بندوبست حشمت خان نے کیا اور وہاں پر رات گزارنے کے بعد صبح ملک صاحب کے آدمیوں کو فون سہانا نے کیا۔ تمہاری گرفتاری کے بعد ہم دونوں کینیڈا چلے گئے۔ اب ملک صاحب کے آدمیوں کی پہنچ امریکا کے اس فلیٹ کی حد تک ہے۔ جہاں تم دونوں نے چند لمحات بتائے۔ اس کے بعد میں اور سہانا کہاں گئے۔ وہ تمام زندگی بھی سر پٹختے رہیں تو انہیں معلوم نہیں ہوگا۔ چونکہ اس تمام معاملے میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ اس لیے میں نے انسپکٹر سے گزارش کر دی ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے۔ وہ میرا شاگرد ہے۔ ملک صاحب کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ سہانا نے چند منٹ پہلے ان سے بات چیت کی ہے۔ وہ ہمارے رشتے سے اب بھی انکاری ہیں۔ اس لیے ہم کچھ دیر میں کینیڈا کو بھی خیرباد کہہ دینے والے ہیں اور کہاں جانے کا ارادہ ہے، اس کے متعلق میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ اپنا خیال رکھنا اور مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف اٹھانا پڑی۔''

فون بند ہو گیا۔ میں ہکا بکا ریسیور کو تھامے کتنی دیر ساکت و جامد کھڑا رہا۔ پولیس اہلکار نے ریسیور میرے ہاتھوں سے لے کر کریڈل پر رکھ دیا اور مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے دن مجھے رہا کر دیا گیا۔ میں حوالات سے نکلنے کے بعد خالہ زینب کے گھر آیا۔ وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ محلے والوں نے بتایا۔ خالہ زینب نے ساجدہ کی شادی کر دی ہے۔ انہیں داماد اتنا اچھا اور شریف ملا ہے کہ اس نے خالہ زینب کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھ لیا ہے۔ میں دونوں محاذوں پر بُری طرح ہار چکا تھا۔ اس لیے تھکے قدموں کے ساتھ محلے سے باہر آ گیا۔ اب مجھے نئے سرے سے اپنی منزل کا تعین کرنا تھا اور میں اس کے لیے تیار تھا۔

❖❖❖

چٹے پٹے

سیرینا راض

سلمان سلیم

پُرآلام حالات کم وقت میں انسان کو وہ کچھ سکھا دیتے ہیں... جو طویل پُرآسائش زندگی کبھی نہیں سکھا سکتی... جنگی ماحول کسی کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں ہوتا... خصوصاً عام خاندان سے تعلق رکھنے والے ناگہانی... کسمپرسی اور خوفناک مصائب کے شکنجے میں آجاتے ہیں... دوسری جنگِ عظیم کے پس منظر میں ڈوبتی اُبھرتی کہانی کے دل گداز پیچ و خم...

رنگ بدلتے مختلف روپ اختیار کرتے دل نگاروں کی تصویریں......

دُھند نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ موسمِ سرما کی ایک برف زاد شام تھی۔ سورج قریب الغروب تھا۔ اس لیے بھی ''ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے'' والا سماں تھا۔ اس پر مستزاد، جنگِ عظیم دوم کا پُرآشوب دور...... ہر کوئی اپنے گھر میں یا پھر کسی محفوظ مقام پر دبکا بیٹھا تھا۔ ایسے میں وینکوور (کینیڈا) اور پورا مغربی ساحل ویرانی کا منظر پیش کررہا تھا مگر وہ دونوں فرض شناس پولیس آفیسرز خوش اسلوبی سے اپنی ذمّے داری نبھا رہے تھے۔ وہ اس وقت معمول کے گشت پر

تھے کہ انہیں مطلوبہ مشکوک شخص نظر آ گیا۔

بلیک نامی آفیسر نے کار کا اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا اور سارجنٹ ڈونووین اس کے پہلو میں پسنجر سیٹ پر براجمان تھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا اور اس کے قدموں کی تیزی ایسی تھی جیسے ابھی ''بلیک آؤٹ'' کا سائرن بجنے والا ہو اور اسے اس سے پہلے اپنے گھر پہنچنا ہو۔

بلیک آؤٹ کا سائرن بجتے ہی چہار سُو اندھیرا چھا جاتا تھا۔ مجال ہے کہ روشنی کی کوئی ننھی سی کرن بھی کسی گھر سے فرار ہونے کی کوشش کرے۔ جنگ کے زمانے میں یہ سب ہوتا ہے اور وہ تو ایک عالم گیر جنگ تھی۔ انسان کو اپنی جان سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

''وہ ایک لڑکا ہے۔'' جیولر نے اپنے بیان میں بتایا تھا۔ ''بالکل ایک چھوٹا سا شیطان، غصے سے بھرا ہوا۔''

اس جیولر کی دکان کو ایک نوجوان نے لوٹ لیا تھا۔ گن دکھا کر وہ لڑکا سب کچھ لے گیا تھا۔ تمام زیورات، قیمتی پتھر اور کیش۔ وہ اس کی دکان کا صفایا کر گیا تھا۔ اپنی بپتا سناتے ہوئے اس بدنصیب جیولر کی آواز کپکپا رہی تھی۔ احساسِ زیاں اور خوف نے اسے عجیب سا بنا دیا تھا اور خوف تو ایک ایسی بلا تھی جس نے وینکوور کے ہر باسی کے ذہن کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، خصوصاً جاپانی طیاروں کے، پرل ہاربر پر حملے کے بعد......!

''پرل ہاربر'' جزائر ہوائی کا ایک نہایت ہی حساس اور اہم فضائی فوجی اڈا تھا جو مکمل طور پر امریکی فضائیہ کے کنٹرول میں تھا۔ اس جاپانی ائر اٹیک نے بقول شخصے، پرل ہاربر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔ اسی تباہی اور بربادی کا بدلہ لینے کے لیے بعد ازاں امریکا نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے تھے۔

وینکوور کے باسی ''پرل ہاربر'' والے اندوہناک واقعے کو لے کر اس لیے بھی بہت زیادہ ڈرے ہوئے تھے کہ جاپان کا اگلا متوقع نشانہ وینکوور کا مغربی ساحل ہو سکتا تھا۔ جنگ کی ہلاکت خیزی تو اپنی جگہ ایک سفاک حقیقت تھی ہی لیکن ڈونووین اور اس کے ساتھی بلیک کی پریشانی کا سبب چوری کی تیزی سے بڑھتی ہوئی وہ وارداتیں تھیں جنہوں نے وینکوور کے دکانداروں، ہوٹل مالکان اور پیٹرول پمپ وغیرہ چلانے والوں کی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔ ان چوروں میں غالب تعداد نوجوانوں کی تھی۔

غدر کے دنوں میں لوٹ مار اور چوری چکاری ایک عام سی بات ہے۔ عوام اس قدر ڈرے اور سہمے ہوتے ہیں کہ چوروں اور ڈکیتوں کو گن کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی مگر اس جیولر کی دکان کا صفایا کرنے والا لٹیرا دوسروں سے بہت مختلف تھا۔

''وہ اپنے خال وخد سے زیادہ عمر کا نہیں لگتا تھا۔'' جیولر نے اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے پولیس کو بتایا تھا۔ ''اس کا چہرہ کلین شیو تھا، بالکل کسی بچے کے مانند معصوم اور چکنا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے خوب گھس کر شیو بنائی ہو۔ اس نے ایک لمبا کوٹ بھی پہن رکھا تھا جو اس کے سائز سے کافی بڑا تھا جیسا کہ اس کے باپ کا ہو اور...... اس نے اپنی خطرناک گن کو مجھ پر تان رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی، بےخوفی اور بےپروائی تھی۔''

اس جیولر کی فراہم کردہ یہ تفصیلات دوسرے لٹیروں پر بھی فٹ بیٹھتی تھیں۔ اس کے مطابق، وہ گن کے سامنے مجبور ہو گیا تھا۔ ''مجھے سب سے زیادہ فکر اپنی جان کی تھی۔'' اس نے سراسیمگی کے عالم میں بتایا۔ ''اس لیے میں نے اس کی گن کے سامنے مزاحمت کی کوشش نہیں کی، اسے من مانی کرنے کے لیے میں نے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اس کمینے نے میری شاپ کے کیش رجسٹر کی ساری رقم اپنے اوورکوٹ کی بڑی بڑی جیبوں میں منتقل کی۔ یہی سلوک اس نے قیمتی زیورات اور نایاب اسٹونز کے ساتھ بھی کیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بدذات مجھے کنگال کر گیا۔''

اس جیولر کی بیان کردہ ''لٹیرے'' کی تفصیلات سارجنٹ ڈونووین کے ذہن میں محفوظ تھیں اسی لیے جب اُس نے اس مشکوک بندے کو دیکھا تو اس کے دماغ میں شناسائی کی بتی جل اٹھی۔ اگرچہ اس کا چہرہ ڈونووین کی طرف نہیں تھا پھر بھی اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ وہی لٹیرا ہے جس نے گن دکھا کر اس جیولر کا خانہ خراب کیا تھا۔

اس نے اپنے سائز سے کہیں بڑا اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر فیڈورا ہیٹ تھا جس کا مرکزی حصہ کسی بند پائپ کے مانند اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک گلی سے نکل کر آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ بہت جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کے قدموں کی تیز روی نے جلد ہی اسے گہری دھند کا حصہ بنا دیا۔

''گاڑی روکو......'' ڈونووین نے اپنے ساتھی بلیک سے کہا۔ ''میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ تم گاڑی کو ایک بلاک آگے لے جا کر واپس مڑو اور کسی جگہ پر ٹھہر جاؤ۔ اگر یہ عیار مجھے چکما دینے میں کامیاب ہو گیا تو تم اسے چھاپ لینا۔''

''سمجھ گیا۔'' بلیک نے توانا لہجے میں کہا اور کار روک

دی۔

ڈونووین کار سے باہر نکل آیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ اپنے مطلوبہ مشکوک بندے کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے اپنی رفتار اتنی زیادہ رکھی تھی کہ جلد ہی ٹارگٹ اسے دھند میں لپٹا ہوا دکھائی دے گیا۔ ڈونووین نے اپنی رفتار میں حتیٰ الامکان اضافہ کر دیا۔

سورج غروب ہوتے ہی رہی سہی روشنی بھی جاتی رہی تھی اور ٹھنڈ کے ساتھ ہی دُھند میں بھی کا تی ... اضافہ ہو گیا تھا۔ ڈونووین کا ٹارگٹ وہ نوعمر اوورکوٹ پوش مشکوک شخص دیکھتے ہی دیکھتے ایک گھر کے عقبی حصے میں کود کر اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

ڈونووین نے ایک گہری سانس خارج کی اور اس لڑکے کا تعاقب جاری رکھنے کے لیے بنگلے کے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ درحقیقت کسی بنگلے کا اُجڑا ہوا مزار تھا۔ اس گھر کو بنگلا کہنا مناسب نہیں تھا۔ مذکورہ باڑ کی اونچائی زیادہ نہیں تھی لیکن ڈونووین کی عمر اور وزن اس کے فیصلے کی رکاوٹ بن گئے تھے۔

''کاش میں نے بلیک کو اس منحوس لڑکے کے پیچھے بھگایا ہوتا۔'' ڈونووین نے خود کو کوسا۔ ''وہ مجھ سے خاصا کم وزن اور دُبلا پتلا ہے اور اس کے زخم بھی پوری طرح بھر چکے ہیں۔ وہ زیادہ بہتر انداز میں اس لٹیرے کا تعاقب کر سکتا تھا۔''

ڈونووین اور بلیک اپنی ریٹائرمنٹ کے بہت قریب پہنچ چکے تھے مگر اس جنگ نے ان کے کام کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔ انہیں پولیس والی ڈیوٹی کے علاوہ بھی مختلف نوعیت کی فوجی ذمّے داریاں نبھانا پڑتی تھیں جس میں چوٹیں لگنا تو معمول کی بات تھی۔ چند روز قبل ایسے ہی ایک معرکے میں وہ دونوں زخمی ہو گئے تھے۔ بلیک اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا لیکن ڈونووین کے بعض زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔

اس نے چند گہری سانسیں لیں اور باڑ کے اوپر سے اس گھر کے عقبی حصے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوشش اس لیے کہ اب دھند نے ہر چیز کو اپنا ہی حصہ بنا لیا تھا۔ ڈونووین یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا ٹارگٹ ابھی تک مکان کے بیک یارڈ ہی میں ہے یا وہ آگے کہیں دور نکل گیا ہے۔ اگر وہ فربہ اور گھائل نہ ہوتا تو اس باڑ کو پھلانگنا اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے کسی کیک کا ایک ٹکڑا اٹھا کر کھا لینا۔

ایک فوری خیال کے تحت وہ مذکورہ باڑ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے ذہن میں یہی تھا کہ مکان میں عقبی جانب سے داخل ہونے کے لیے اس باڑ میں کوئی گیٹ ضرور ہوگا۔

جلد ہی اسے کامیابی حاصل ہو گئی۔ وہ عقبی گیٹ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد گیٹ کھول کر مکان کے عقبی حصے (بیک یارڈ) میں داخل ہونا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ وہ اندر پہنچا اور آنکھیں پھاڑ کر دھند کی دبیز تہ میں اپنے ٹارگٹ کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ شاطر لڑکا تو اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تاہم دھند اتنی گہری تھی کہ اس نے خود کو ایک بھیگے ہوئے کمبل میں لپٹے ہوئے پایا۔

حقیقت حالات چشم زدن میں اس پر کھل گئی۔ اس کا چہرہ ایک گیلی بیڈ شیٹ سے ٹکرا گیا تھا۔ وہاں قطار در قطار الگنیوں پر دھلے ہوئے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ وہ بیک یارڈ مربع شکل کا تھا۔ جس کے ایک حصے کو لانڈری کے کپڑے سکھانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ ڈونووین اپنے ٹارگٹ کی تلاش میں ان گیلے کپڑوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

ڈونووین کو کسی زیرِزمین کمرے کے دروازے یا کسی بڑی جھاڑی کی تلاش تھی جہاں اس بدمعاش لڑکے کے چھپنے کا امکان ہو مگر ایسی کوئی بھی جگہ اسے کہیں نظر نہ آئی۔ موسم بہار اور موسم گرما میں یقیناً اس وسیع و عریض مربع احاطے میں پھل اور سبزیاں بافراط اگتی ہوں گی مگر اس سخت ترین سرد موسم میں وہاں کی حالت غیر تھی۔ اِکّادُکّا آلو کے ماخذات کے علاوہ وہاں مٹی کے ڈھیر ہی باقی رہ گئے تھے۔

وہ مایوس قدموں سے چلتے ہوئے، واپسی کے سفر کے لیے باڑ والے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس امید کے ساتھ کہ بلیک نے اس نوجوان لوفر لٹیرے کو قابو کر لیا ہوگا، ڈونووین تقریباً دوڑتے ہوئے عقبی گلی میں پہنچ گیا۔

''کیا وہ اِدھر آیا تھا؟'' بلیک پر نگاہ پڑتے ہی ڈونووین نے پوچھا۔

''میں نے تو کسی کو اس طرف آتے نہیں دیکھا۔'' بلیک نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''تم اس کے تعاقب میں گئے تھے.. بتاؤ، وہ کہاں گیا؟''

''افسوس کہ میں نے اسے کھو دیا ہے۔'' ڈونووین نے اپنی شکست کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دھند کا فائدہ اٹھا کر کہیں غائب ہو گیا ہے لیکن میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔''

''کیسا آئیڈیا؟'' بلیک پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ وہ شیطان ہے کون......''

بلیک نے سوچتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''وہ

کیسے؟''

''یہاں قریب ہی میں ایک معزز فیملی رہتی ہے۔'' ڈلووین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ان لوگوں کو کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ مصیبت زدہ اور بھلے انسان ہیں مگر ان کا ایک لڑکا غیر ذمّے دار اور لاابالی سا ہے۔ ہمارا مشکوک بندہ اسی علاقے میں غائب ہوا ہے۔ ہم کار کو یہیں چھوڑ کر اس فیملی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ میں نے ابھی جس غیر ذمّے دار لڑکے کا ذکر کیا ہے، اس سے پوچھ تاچھ پر کوئی مفید بات معلوم ہوسکتی ہے۔''

''میرا خیال ہے، گاڑی کو یہاں چھوڑنا ٹھیک نہیں ہوگا۔'' بلیک نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی چور ''بلیک آؤٹ'' کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس میں گھس سکتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ جب ہم واپس آئیں تو اس گاڑی کے آدھے پرزے غائب ہوں۔ ایک لٹیرے کی تلاش میں ہم خود بھی کسی لٹیرے کا نشانہ بن سکتے ہیں۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے بلیک۔'' ڈلووین نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''چلو کوئی محفوظ جگہ ڈھونڈتے ہیں۔''

جلد ہی انہیں ایک ڈھنگ کی جگہ مل گئی۔ بلیک نے ایک بغلی گلی میں کار کو پارک کر دیا۔ ڈلووین نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''یہاں ہماری گاڑی کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''اور یہ دھند میں ڈرائیونگ کرنے سے کہیں زیادہ محفوظ بھی ہے۔'' بلیک نے کہا۔ ''فی الحال ہمیں اس سے زیادہ بہتر جگہ نہیں مل سکتی۔''

وہ سبک قدموں سے آگے بڑھنے لگے تو بلیک نے پوچھا۔ ''تم اس فیملی کو کیسے جانتے ہو؟ اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بھی بتاؤ۔''

''کوئی حرج نہیں ہے۔'' ڈلووین نے معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ فیملی بھی اسی چرچ میں جاتی ہے جہاں میرا باقاعدگی سے جانا ہوتا ہے۔ بہت ہی سلجھے ہوئے اور بااخلاق لوگ ہیں۔ خصوصاً بچے انتہائی تمیز دار اور خوش لباس۔ ان سے بات کرکے مزہ آتا ہے۔ اتوار کی صبح والی عبادت میں وہ سب لازمی حاضر ہوتے ہیں۔ ان کا باپ جنگ کی ابتدا ہی میں اپنے ملک کی حفاظت اور خدمت کے لیے چلا گیا تھا۔ ابھی اسی سال ان کی ماں کا انتقال ہوا ہے جس کے بعد یہ فیملی بہت ہی ڈسٹرب رہنے لگی ہے، ان کی گزر بسر بہت مشکل ہوگئی ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے ان پر بڑا ترس آتا ہے۔''

''اور تمہارا خیال ہے کہ چوری اور ڈکیتی کی ان پُراسرار وارداتوں میں یہ لوگ ملوث ہو سکتے ہیں؟'' ڈلووین کے خاموش ہونے پر بلیک نے استفسار کیا۔

''میں ایسا نہیں سوچتا۔'' ڈلووین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس فیملی میں پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا بھی ہے۔ میں اس کے لیے بہت فکرمند ہوں۔ وہ چرچ میں حمدیہ کلام پڑھتا ہے۔ اس کی آواز میں بڑی تاثیر ہے۔ اس نے سالہا سال سے خود کو اس کام کے لیے وقف کر رکھا ہے لیکن جب سے اس کی ماں کا انتقال ہوا ہے، وہ بہت جذباتی اور جنونی ہوگیا ہے۔ اس کے رویّے میں شدت پسندی اور بے رواہ روی آگئی ہے۔ میں نے کئی بار اسے لوگوں کی گاڑیوں میں سے پیٹرول چُراتے ہوئے پکڑا ہے مگر اچھی بات یہ کہ اس نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کرنے کا مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ وہ بے وقوف بالکل نہیں جانتا کہ اپنی ناسمجھی میں وہ کون سا خطرناک کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس راہ پر چل کر وہ اپنے ہاتھوں خود ہی کو ختم کر بیٹھے گا۔''

بلیک نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد ڈلووین نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بوجھل تھا۔

''حال ہی میں اس نے اپنی نوکری کھو دی ہے۔ وہ ایک گروسری شاپ پر ڈیلیوری بوائے کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس پر ڈیلیوریز میں سے چند چیزیں چُرانے کا الزام تھا۔ اس کی کمائی گھر میں آرہی تھی تو ان لوگوں کے حالات قدرے بہتر تھے مگر اب تو کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔''

''یہ تو ایک طرح سے لمبی چھلانگ ہے۔'' بلیک نے معنی خیز انداز میں خود کلامی کی۔ ''سیب، مسالے اور پیٹرول جیسی معمولی چیزیں چُراتے چُراتے ایک دم مسلح ڈکیتی......؟''

''میرے ایسا سمجھنے کی صرف ایک ہی وجہ ہے۔'' ڈلووین نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اس جیولر نے ڈاکو کا جو حلیہ بیان کیا ہے، یہ لڑکا اس پر فٹ بیٹھتا ہے۔ قد و قامت، بچوں والا معصومیت بھرا چہرہ، فیڈورا ہیٹ کے اندر سے جھانکتے ہوئے سنہری بال۔ وہ اس لٹیرے کو جس حد تک دیکھ پایا، اس نے پولیس کو اس کے بارے میں بتا دیا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ یہ لڑکا نہ ہو مگر میں اس حلیے کے کسی اور چور کو جانتا بھی نہیں۔''

بلیک کے چہرے سے بے یقینی اور تذبذب جھلک رہا تھا۔ ڈلووین اپنی ہی دُھن میں بولتا چلا گیا۔

''ان بچوں کی ماں کے انتقال کے بعد، ایک بیوہ خاتون ان کی دیکھ بھال کے لیے انہی کے ساتھ گھر میں آکر

رہنے لگی تھی۔ اسے سب آنٹی کہتے ہیں۔ آنٹی کا نام آئرین ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک اور لڑکی بھی کافی عرصے سے رہ رہی ہے جس کا نام میبل ہے۔ وہ بچوں کی نگہداشت کے بجائے کھانا پکانے اور گھر سے باہر کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے۔''

بلیک چپ چاپ ڈونووین کی باتیں سنتے ہوئے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا۔

☆☆☆

وہ تاریکی میں ڈوبی ہوئی ایک کہنہ سال دومنزلہ عمارت تھی۔ اندھیرا ہونے کے باوجود بھی اس کے دیوار و در کی بدحالی کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ ان کی دستک کے جواب میں ایک چھوٹے بچّے نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟''

''پولیس۔'' بلیک نے جواب دیا اور اُسے اپنا بیج دکھایا۔

اس بچّے کی عمر اتنی نہیں تھی کہ وہ بیج کو آسانی سے پڑھ کر سمجھ سکتا ہو اور پھر وہاں اس قدر تاریکی تھی کہ پڑھنے پڑھانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

''کیا کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے؟'' اس بچّے نے پریشان نظر سے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔ ''کیا ڈیڈی کے بارے میں کوئی بُری خبر ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں بچّے۔'' ڈونووین نے نرم لہجے میں کہا۔ ''پھر پوچھا۔ ''تم بِلی (Billy) ہونا؟ میں نے تمہیں کئی بار چرچ میں دیکھا ہے۔''

اس معصوم بچّے کا باپ محاذ پر لڑنے گیا ہوا تھا اسی لیے وہ پولیس کو اپنے دروازے پر دیکھ کر ڈیڈی کے لیے فکرمند ہو گیا تھا۔ ڈونووین کے استفسار کے جواب میں اس نے کہا۔

''ہاں...... میں بِلی ہوں۔''

''کیا تمہارا بڑا بھائی فرینک گھر پر ہے؟'' ڈونووین نے پوچھا۔

راستے بھر ڈونووین اپنے ساتھ بلیک کو اسی نوجوان فرینک کے بارے میں بتاتا آیا تھا۔ ڈونووین صحیح معنوں میں فرینک کے مستقبل کو لے کر بہت زیادہ فکرمند تھا۔

''نہیں!'' بِلی نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''گیت کی تیاری کے لیے چرچ گیا ہوا ہے۔ کیا تم میبل سے بات کرنا چاہو گے؟ وہ کچن میں موجود ہے۔''

ننھا بِلی ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا تھا۔ اس کی آخری تجویز ڈونووین کو پسند آئی اور اس نے میبل سے ملاقات کے لیے ہامی بھر دی۔ بِلی نے کہا۔ ''آئیں میرے ساتھ۔''

بلیک اور ڈونووین بِلی کی تقلید میں چل پڑے۔ ہال وے تاریک اور یخ بستہ تھا۔ بالآخر وہ دونوں کچن میں پہنچ گئے۔ یہ گھر کی سب سے آرام دہ جگہ تھی کیونکہ وہاں مناسب گرمائش موجود تھی۔ کچن میں بڑے سائز کا ایک سیاہ چولہا روشن تھا اور میبل ایک برتن میں کچھ پھینٹ رہی تھی۔ اس برتن میں تازہ تیار کی ہوئی کوئی اشتہا انگیز شے تھی جس کی خوشبو نے ڈونووین کے منہ میں پانی بھر دیا۔

میبل اتوار کی صبح چرچ میں بہت تروتازہ اور نکھری ہوئی دکھائی دیا کرتی تھی۔ اس کا لباس ہمیشہ اُجلا اور سلیقے کا ہوتا تھا اور ہیٹ کے نیچے سنہری بال بھی سنبھلے اور سلجھے ہوئے ہوتے تھے۔ دیکھنے والے کو وہ ایک فرشتہ ہی نظر آتی تھی لیکن اس وقت وہ بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی۔

کچن میں کام کرتے ہوئے اس کا حال ہی بدل گیا تھا۔ اس کا حُسن اور خوب صورتی اپنی جگہ مگر اس کے چمک دار سنہری بال اس وقت عرق آلود پیشانی پر بے ترتیب پھیلے ہوئے پیلے دھاگوں کے مانند نظر آرہے تھے۔ اس نے اُجلے لباس کے بجائے رنگ اُڑا ہوا عام سا نیلا ڈریس پہن رکھا تھا اور پاؤں میں پرانی طرز کے تسموں والے جوتے تھے۔

ان پر نگاہ پڑتے ہی وہ چولھے کے پاس سے مڑی تو اس کے چہرے پر وہی ملکوتی مسکراہٹ تھی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ اس نے پہلی ہی نظر میں ڈونووین کو پہچان لیا تھا۔ اس نے ڈونووین کی بیوی روز کے ساتھ کافی وقت گزارا تھا مگر اب روز اور اس کی بیٹی اس دنیا میں نہیں تھیں۔ یہ ڈونووین کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی۔

''اوہ ڈونووین! یہ تم ہو۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''کئی سال کے بعد...... میرا مطلب ہے، تم نے مجھے اس حالت میں تو کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔'' اس کی پیشانی پر جھولتی ہوئی بالوں کی پیلی لٹیں اِدھر اُدھر ہو رہی تھیں۔ اس نے خاصے محتاط انداز میں اضافہ کیا۔ ''مجھے امید ہے، کوئی گڑبڑ تمہیں یہاں نہیں لے کر آئی ہوگی۔''

''میں ریٹائر ہونے ہی والا تھا کہ اس منحوس جنگ نے مجھے واپس گھسیٹ لیا ہے۔'' ڈونووین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''سمجھ لو، میں دوبارہ پولیس میں آگیا ہوں۔''

''بہت خوب۔'' اس کے رخساروں کے گڑھے نمایاں ہوگئے۔ ''ہم پچھلے کچھ عرصے سے تمہیں چرچ میں نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں تو یہی سمجھی تھی کہ تم اپنی ریٹائرمنٹ کو انجوائے کررہے ہوگے، اپنے کسی پسندیدہ فشنگ پوائنٹ پر۔''

''بس یہی زندگی ہے۔ اس میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔'' ڈونووین نے کہا۔ ''نوجوانوں کو محاذ پر لڑنے کے لیے بھیج دیا گیا ہے اور ہم جیسے بڑھے ٹھڈے شہری نظام کو سنبھالنے کی کوشش میں لگا دیے گئے ہیں۔ ویسے اس وقت میں کسی خاص مقصد سے یہاں آیا ہوں۔''

میبل نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا پھر اضطراری لہجے میں بولی۔ ''ہاں، بولو...... میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''میں تمہارے بھائی فرینک سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔'' ڈونووین اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بلی نے مجھے بتایا ہے کہ فرینک گھر پر نہیں ہے۔ کیا تم جانتی ہو کہ وہ اس وقت کہاں ملے گا؟''

''فرینک!'' میبل نے شک زدہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''تم فرینک سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ سب خیریت تو ہے نا سارجنٹ......؟''

کوئی جواب دینے کے بجائے سارجنٹ ڈونووین یک ٹک میبل کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش میں مصروف رہا۔

ڈونووین کی پُراسرار خاموشی نے میبل کو بے چین کر دیا۔ اس نے ٹیبل پر رکھی ہوئی گھڑی پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر ڈونووین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ فرینک نے گروسری کی ڈیلیوری والی جاب چھوڑ دی ہے۔'' بات ختم کرنے کے بعد وہ گہری نظر سے اسے گھورنے لگی۔

ڈونووین اس سے نگاہ ملانے کے بجائے فرش کو تکنے لگا۔ وہ اس حقیقت کو سمجھتا تھا کہ ایک بھوکا شخص کھانے پینے کی اشیا کو چُرانے پر مجبور ہو سکتا ہے اور اس جرم کے لیے اسے سزا دینا سراسر ناانصافی تھی مگر طلائی زیورات اور قیمتی نگینوں کو گن دکھا کر لوٹ کر لے جانا ایک سنگین جرم تھا اور قانون کی کتابوں میں کہیں بھی ایسے شخص کے لیے معافی کی گنجائش نہیں تھی۔

''فرینک اس وقت چرچ میں حمد یہ گیت کی پریکٹس کرنے گیا ہوا ہے۔'' میبل نے ڈونووین کے سوال کا بالآخر سیدھا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''تم چاہو تو چرچ جا کر اس سے مل سکتے ہو۔ آنٹی آئرین بھی وہیں پر ہے۔'' اس نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ دونوں ایک ڈیڑھ گھنٹے تک گھر آ جائیں گے۔''

ڈونووین نے ایک بار پھر میبل کے چہرے پر اپنی نگاہ گاڑ دی اور بڑے تحمل سے اس کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ میبل کی باتوں کے جواب میں اس نے کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ میبل کی نفسیات سے کھیل کر اسے توڑنا چاہتا تھا۔

''تم چاہو تو ان کا انتظار کر سکتے ہو۔'' میبل نے زیرِلب مسکراتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے چائے بنائی تھی۔ دو کپ چائے کیتلی میں موجود ہے۔ وہ میں تم لوگوں کو پیش کر سکتی ہوں اور...... میں سمجھتی ہوں، آنٹی آئرین بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔''

ڈونووین جانتا تھا کہ آنٹی آئرین بھی اپنی بھتیجی میبل کی طرح سنہری بالوں والی ایک دلکش عورت ہے لیکن وہ اپنی مرحوم بیوی روز کی یادوں کے ساتھ خوش رہنا سیکھ گیا تھا۔ اسے کسی بھی اور عورت کے ساتھ وقت گزارنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ابھی میبل سے اس کی گفتگو کا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا اور اپنی قانونی ذمّے داری نبھا رہا تھا۔

''ہم انتظار نہیں کر سکتے۔'' ڈونووین نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''ہماری کار ایک تاریک گلی کا حصہ ہے۔ کوئی چور اُچکا اگر بلیک آؤٹ کا فائدہ اٹھا کر ہماری کار کے ساتھ ہاتھ کر گیا تو ہمارے لیے ڈیپارٹمنٹ کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ تم فرینک کو ہمارا یہ پیغام دے دینا کہ کل اسکول کے بعد سیدھا پولیس اسٹیشن آ جائے۔ اس سے وہیں پر بات ہو جائے گی۔''

''یہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔'' میبل نے دوٹوک انداز میں کہا۔

ڈونووین نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

''آنٹی آئرین نے فرینک کو شپ یارڈ میں جاب دلا دی ہے۔ وہ کل سے وہاں جائے گا۔'' میبل نے بتایا۔ ''یہ ایک فل ٹائم جاب ہے جس کی وجہ سے اس کا اسکول چھوٹ جائے گا مگر فرینک کی یہ جاب ہم سب کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔ وہ جوان ہے۔ خوب کام کرے گا اور ڈھیروں پیسا کما کر گھر میں لائے گا۔ اس گھر میں رہنے والوں کے دن پھر جائیں گے۔''

بات کے اختتام پر وہ اپنے جوتوں کو تکنے لگی تھی۔ ڈونووین نے میبل کی نگاہ کا تعاقب کیا تو اسے اس کے ایک جوتے کے کنارے پر گیلی مٹی لگی دکھائی دی۔

''سارجنٹ ڈونووین!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''فرینک کا خیال ہے کہ گروسری شاپ کے مالک نے اس پر چوری کا جو الزام لگایا تھا، وہ معاملہ نمٹ چکا ہے۔ میں تم

ے یہ پوچھنا چاہوں گی کہ کیا ابھی تم اسی سلسلے میں فریک کو تلاشتے پھر رہے ہو؟''

''سیب، گاجریں، مسالہ جات اور اسی نوعیت کی چھوٹی موٹی چیزیں چرانا ایسے سنگین جرائم نہیں ہیں کہ جن کی سزا کے طور پر ایک نوجوان لڑکے کا مستقبل تاریک کر دیا جائے لیکن......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن گن کے بل بوتے پر کسی جیولری شاپ کو، اس کے کیش رجسٹر سمیت لوٹ کر لے جانا ہرگز قابلِ معافی جرم نہیں ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو سارجنٹ؟'' وہ کمزور سی آواز میں بولی۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''سب سمجھ میں آجائے گا۔'' وہ معنی خیز نظر سے میبل کو تکتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت فریک کی قسمت اچھی تھی جب وہ چھوٹی موٹی اشیا چُراتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور اس خیال سے اُسے چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ سمجھ اور سنبھل جائے گا لیکن جیولری شاپ والا معاملہ گمبھیر ہے۔'' اس نے چند لمحات کا توقف کیا پھر سرسراتی آواز میں بولا۔

''میں کل چرچ جا کر فادر سے ملوں گا اور چرچ کی انتظامیہ سے بھی بات کروں گا۔ دعا کرو کہ اس بات کی تصدیق ہوجائے کہ فریک اُس وقت چرچ کے اندر موجود تھا جب اس جیولری شاپ......!'' ڈونووین نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑی پھر عام سے لہجے میں بولا۔ ''امید کرتا ہوں، فریک کی شپ یارڈ والی نئی جاب اس کے لیے لکی ثابت ہو گی۔''

اس کے بعد وہ دونوں وہاں ایک لمحے بھی نہیں رکے۔ میبل گہری اور متفکر سوچوں میں گم انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

اپنی کار کی جانب جاتے ہوئے وہ دونوں خاموش تھے۔ جب وہ کار کے اندر بیٹھ چکے تو بلیک نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''ڈونووین! ہمیں واپس جا کر میبل سے کچھ اور سوالات کرنا چاہئیں۔''

''وہ کس لیے؟'' ڈونووین نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''مجھے شک ہے کہ فریک گھر کے اندر ہی کہیں چھپا بیٹھا ہے۔''

''اس شک کا کوئی خاص سبب؟'' ڈونووین کی سوالیہ نظر اس پر ٹک گئی۔

''میں نے اس گھر میں کچھ عجیب دیکھا ہے۔''

''عجیب دیکھنے کے بعد بھی خاموش رہے۔'' ڈونووین نے اپنے ساتھی کو گھورا۔ ''خیر بتاؤ، وہاں ایسا کیا عجیب تھا جو تمہیں نظر آیا مگر میں نہ دیکھ سکا؟''

''ایک بھیگا ہوا اوورکوٹ۔'' بلیک انکشاف کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ ہال وے کی ایک دیوار پر ٹنگا ہوا تھا۔ جب ہم وہاں سے گزر کر کچن کی طرف گئے تھے تو میرا چہرہ اس کوٹ سے ٹکرایا تھا۔''

''ایسے کوٹ ہر گھر میں ہوتے ہیں بلیک۔'' ڈونووین نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تم نے دیکھا نہیں، جب ہم کچن میں پہنچے تو میبل کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ ہوسکتا ہے، کچھ دیر پہلے وہ اوورکوٹ پہن کر گھر سے نکلی ہو...... چولھے میں جلانے والی لکڑیاں لینے یا کچھ آلو اور سبزیاں وغیرہ۔ باہر ایسی دھند ہے کہ اس نے ہر شے کو بھگو کر رکھ دیا ہے۔ ہمارے کوٹوں کا بھی یہی حال ہے، چاہو تو تم اپنے کوٹ کو چھو کر دیکھ لو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' ڈونووین کی وضاحت سے بلیک کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ ''مگر میں جس بھیگے ہوئے کوٹ کی بات کر رہا ہوں وہ بہت ہی پرانا اور خاصے بڑے سائز کا تھا جیسا کہ اس لُٹنے والے جیولر نے اپنے بیان میں بتایا تھا۔ ایک بات اور......'' وہ لمحے بھر کو تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس لڑکی میبل کے ایک جوتے پر کیچڑ بھی لگی دیکھی تھی۔''

''وہ میں نے بھی دیکھی تھی۔'' ڈونووین اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کہا نا، میبل اپنی فیملی کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔ وہ کسی بھی ضرورت کے لیے باہر نکل سکتی ہے اور اس کے جوتوں پر مٹی بھی لگ سکتی ہے اور جہاں تک اس کوٹ کی بات ہے تو میں میبل کے باپ کو جانتا ہوں۔ وہ ایک دراز قامت اور صحت مند شخص ہے۔ وہ کوٹ یقیناً اسی کا ہو گا۔''

بلیک اس کی وضاحت سے مطمئن تو نہیں ہوا تاہم اُس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور کار کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔

اس دُھند زدہ اور ٹھنڈے ٹھار ماحول میں ڈونووین اپنی بیوی روز اور بچی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ دونوں اس دنیا

سے جا چکی تھیں۔ ان کی یاد نے ڈونو وین کو حد درجہ افسردہ کر دیا۔ وہ حسرت بھرے انداز میں خود سے کہنے لگا۔

"ڈونو وین! کتنا ہی اچھا ہوتا، وہ دونوں اس وقت گھر پر ہوتیں۔" اس نے بہ زبان خاموشی خود کلامی کی۔ "روز میرے لیے کھانا گرم کرتی اور میں اپنی بیٹی کے ساتھ کھیلتا۔"

انسان جن لوگوں کو کھو دیتا ہے، ان اپنوں کی یادیں بہت اذیت دیتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، کلیجا پھٹ جائے گا اور دل سینے کے پنجرے کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ڈونو وین خود کو بہلانے کے لیے دوبارہ بلیک کی جانب متوجہ ہو گیا اور پوچھا۔ "تم کیوں اتنے خاموش ہو؟"

"میں ابھی تک اسی پرانے اوورکوٹ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" بلیک نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے جانے بھی دو یار۔" ڈونو وین نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں کل چرچ جا رہا ہوں نا۔ وہاں فادر سے لے کر منسٹر تک سب میرے جاننے والے ہیں۔ میں اس امر کی تصدیق کر لوں گا کہ جیولر کی شاپ میں ہونے والی ڈکیتی کے وقت فرینک چرچ میں موجود تھا یا نہیں۔ کل دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ اگر چرچ کی انتظامیہ اور ذمّے دار دیگر افراد نے فرینک کی چرچ میں موجودگی کی تصدیق کر دی تو ہم اپنی تفتیش میں سے اس کا نام خارج کر دیں گے۔"

"اور اگر......" بلیک نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ "جیولری شاپ والی ڈکیتی کے اوقات میں فرینک چرچ کے اندر نہ پایا گیا تو......؟"

"تو ہم قانون کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے کام کو آگے بڑھائیں گے۔" ڈونو وین نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔ "اور میں بالکل بھول جاؤں گا کہ فرینک کون سی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو گرفتار کرنے میں، میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ پھر سب کھل کر سامنے آ جائے گا کہ وہ معصوم ہے یا اُس نے اپنے چہرے کی معصومیت کی آڑ میں ایک شیطان کا روپ دھار لیا ہے۔"

ڈونو وین کے اس مدلل جواب کے بعد بلیک کے پاس پوچھنے کے لیے اور کچھ نہیں بچا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ڈونو وین فرینک کی فیملی کی طرف داری کرتے ہوئے دیرینہ مراسم کو نبھانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن ڈونو وین کے اس ٹھوس جواب نے اس کا ذہن صاف کر دیا تھا۔

☆☆☆

گھر کے باہر قیامت کی سردی تھی لیکن ان کے کچن کا ماحول خاصا خوشگوار تھا۔ جلتے ہوئے چولھے نے فضا کو گرما رکھا تھا۔ آنٹی آئرین اور فرینک چرچ سے واپس آ گئے تھے اور وہ سب لوگ مل کر میبل کا تیار کیا ہوا ڈنر کر رہے تھے۔ کھانے کے دوران میں انتہائی سنجیدہ گفتگو کا عمل بھی جاری تھا۔ ان لمحات میں وہ فیملی ایک جُٹ نظر آ رہی تھی۔

"تھوڑی دیر پہلے پولیس یہاں آئی تھی۔" میبل نے تشویش بھرے لہجے میں بتایا۔ "وہ فرینک کا پوچھ رہے تھے۔"

"میرا...... وہ کس لیے؟" فرینک اُچھل پڑا۔

"جیولر شاپ والی ڈکیتی کے سلسلے میں۔" میبل نے کہا۔ "میں نے سارجنٹ ڈونو وین کو بتا دیا ہے کہ تم اس وقت چرچ میں تھے۔ وہ کل چرچ جا کر فادر اور منسٹر سے ملے گا تاکہ میرے بیان کی تصدیق کر سکے۔"

"میں اس منحوس سارجنٹ سے نفرت کرنے لگا ہوں۔" فرینک نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "میں نے دو چار معمولی چیزیں کیا چُرا لیں کہ چوری اور ڈکیتی کی ہر واردات میں اسے مجھ پر ہی شک ہونے لگا ہے۔ وہ بڑے شوق سے چرچ جا کر انویسٹی گیٹ کرے۔ اسے میرے خلاف کچھ بھی نہیں ملے گا۔ فادر، منسٹر اور ریورینڈ سب میرے حق میں گواہی دیں گے۔ میں تمام وقت ریورینڈ کے ساتھ رہا تھا۔"

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس ہمارے گھر تک کیسے پہنچ گئی۔" آنٹی آئرین نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر میبل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ "کیا تم نے کوئی غلطی کر دی؟"

"ہرگز نہیں۔" میبل صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ "اسے ایک بُرا اتفاق کہہ سکتے ہیں۔ خیر، میں نے سب سنبھال لیا ہے۔"

"تم کس بُرے اتفاق کی بات کر رہی ہو میبل۔" آئرین نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ "اور تم نے صورتِ حال کو کیسے سنبھال لیا۔ میں سب جاننا چاہوں گی۔"

"ساری خرابی اُس مردود جیولر کی پیدا کردہ ہے۔" میبل طنزیہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اس نے ڈکیت گن بردار لڑکے کے بارے میں پولیس کو بہت کچھ بتا دیا ہے۔ اگرچہ میں ہر مشن میں بہت زیادہ احتیاط کرتی ہوں کہ میرا چہرہ پوری طرح کسی کو نظر نہ آئے۔ اسی مقصد کے لیے میں نے فیڈورا ہیٹ کے چھجے کو اپنے چہرے اور آنکھوں پر جھکایا

ہوتا ہے میری آنکھیں چھپ جانے کے بعد میں معصوم صورت والا ایک ٹین ایجر لڑکا ہی دکھائی دیتی ہوں۔ جسمانی خال وخط اور نشیب وفراز کو لمبا اوورکوٹ اپنے اندر چھپا لیتا ہے مگر آج شام اس بُرے اتفاق سے ڈونووین کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''میں چرچ سے نکلی ہی تھی کہ ڈونووین اپنے ساتھی پولیس والے کے ہمراہ مجھے ایک کار میں نظر آیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا مگر میرے چہرے پر اس کی نگاہ نہیں پڑی۔ تاہم میرے قد کاٹھ اور پرانے اوورکوٹ کی وجہ سے اسے مجھ پر شک گزرا اور وہ میرے تعاقب میں لگ گیا۔ سارجنٹ خاصا بوڑھا ہو چکا ہے اور کمزور بھی۔ میں بھلا کہاں اس کے ہاتھ آنے والی تھی۔ میں نے گہری دھند کا سہارا لے کر اسے اِدھر اُدھر گھمایا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر گھر آ گئی۔ گھر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے اپنا لباس تبدیل کیا اور کچن میں مصروف ہو گئی۔ میرے لباس اور حالت سے یہی لگتا تھا کہ میں پچھلے دو تین گھنٹوں سے کچن میں کوکنگ کر رہی تھی۔ ڈونووین اور اس کا ساتھی بلیک یہاں آئے اور ڈونووین نے فرینک کے حوالے سے چند سوالات کیے جن کے میں نے تسلی بخش اور پُراعتماد جواب دیے۔ اس دوران میں بلیک بالکل خاموش رہا تھا تاہم اُس نے میرے ایک جوتے پر گیلی مٹی لگی دیکھ لی تھی۔ خیریت گزری اور اس نے مجھ سے میرے جوتے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اگر وہ پوچھتا بھی تو میرے پاس اس کے ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ میں لکڑیاں لینے بیک یارڈ میں گئی تھی اور وہیں سے یہ مٹی میرے جوتے پر لگ گئی۔''

''یہ پولیس والے کسی ہٹیلی بلّی کے مانند ہوتے ہیں۔'' آنٹی نے میبل کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''یہ لوگ جس گھر کا دروازہ دیکھ لیں، وہاں بار بار آتے ہیں۔ قبل اس کے کہ سارجنٹ دوبارہ اِدھر کا رخ کرے، ہمیں اپنے ''اثاثے'' کو محفوظ کر لینا چاہیے۔ تم مجھے بتاؤ گی کہ تازہ ترین صورتِ حال کیا ہے؟''

لوٹ کے مال کے لیے آئرین نے ''اثاثے'' کا لفظ اس دھڑلّے سے استعمال کیا تھا جیسے وہ اس کی زندگی بھر کی جمع پونجی یا پشتینی جائداد ہو۔

میبل کے جواب دینے سے پہلے ہی فرینک بول اٹھا۔

''کیا ہمارے پاس بہت زیادہ مال جمع ہو گیا ہے؟''

''ہاں، بہت زیادہ۔'' میبل نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''بہت ساری دولت اور لاتعداد قیمتی اشیا کو میں نے تہ خانے کے ایک محفوظ خفیہ مقام پر دبا رکھا ہے اور میں سمجھتی ہوں، وہ سب کچھ ادھر ہی محفوظ ہے۔ اسے چھیڑنا ٹھیک نہیں۔ گھر کے اندر صرف طلائی زیورات اور قیمتی نگینے ہیں۔''

''وہ سب تم میرے حوالے کر دو۔'' آنٹی آئرین نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں کل صبح ہی ان چیزوں کو اپنے ایک پرانے جاننے والے کے ہاتھ فروخت کر دوں گی۔ وہ بندہ اگرچہ قیمت مارکیٹ ریٹ سے کافی کم دیتا ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مال خریدتے ہوئے کوئی سوال نہیں کرتا۔''

''سارجنٹ ڈونووین کل فرینک کی انکوائری کے چکر میں چرچ جائے گا لہٰذا کل دوپہر سے پہلے تو اس کی آمد کا کوئی امکان نہیں ہے اور تب تک یہ ساری جیولری ٹھکانے لگ جائے گی...... ہیں نا؟'' میبل نے بات کے اختتام پر سوالیہ نظر سے آنٹی آئرین کو دیکھا۔

''بالکل۔ میں اس معاملے کو خوش اسلوبی سے نمٹا دوں گی۔'' آنٹی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''میبل! کچھ عرصے کے لیے تمہیں یہ سب روکنا ہوگا۔ ہمارے پاس اتنا کچھ جمع ہو گیا ہے کہ جب تک تمہارا باپ جنگ سے واپس نہیں آتا، ہماری گزر بسر کے لیے یہ کافی سے زیادہ ہے اور تم اس نقل بہ مطابق اصل گن کو بھی کہیں دفن کر دو۔ بعد میں بھی بھی اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے اور فرینک......'' وہ فرینک کی جانب مڑی اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''تم باقاعدگی سے روزانہ شپ یارڈ والی جاب پر جاؤ گے اور میں اپنے لیے بھی کوئی چھوٹا موٹا کام تلاش کرتی ہوں تاکہ ہماری زندگی کی بقا کا کوئی ٹھوس جواز اور ثبوت موجود ہو۔ گھر کے معاملات کو میبل سنبھال لے گی۔''

میبل نے شاکی نظر سے آنٹی آئرین کی طرف دیکھا جیسے اُسے وزیر خارجہ کے عہدے سے ہٹا کر وزیر داخلہ بنا دیا جانا پسند نہ آیا ہو۔

اور بے چارہ سارجنٹ ڈونووین...... اس سادہ دل اور انسان دوست شخص کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ جن لوگوں کو ایک وضع دار اور مصیبت زدہ فیملی سمجھ رہا تھا، وہ تو سرے سے فیملی تھے ہی نہیں۔ ان کی مثال ایک تھیلی جیسی تھی اور وہ سب اسی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔

❖❖❖

قسط :16

شعلہ زن

سلمان سلیم

روبینہ رشید

وہ شعلہ زن تھی یا جوالا مکھی... اس کے وجود میں ایک آتش فشاں دہک رہا تھا... اپنوں کی خودغرضی، دھوکے اور دل و جاں پر گزر جانے والی ناگہانی اس کے وجود کو تہ و بالا کر دینے والے لاوے کے مانند رقصاں تھی... رسوائی کی موت کو اس کا انجام ٹھہرایا گیا مگر مقدر اسے اپنے ساتھ لے اُڑا... اس کے راستے میں رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہمالیہ حائل تھے مگر وہ حاتم طائی کی طرح زندگی کی حسن آرا کے مشکل سوالات کے جواب تلاشتی رہی... ہر قیامت نے اس کے حوصلے کو مہمیز کیا... ہر اُفتاد اسے مضبوط بناتی گئی... پناہ اور بقا کی تلاش اسے مسلسل دوڑا رہی تھی... موت روپ بدل بدل کر اس کے تعاقب میں تھی... وہ اپنی طاقت سے خود ناآشنا تھی... راہ میں آنے والے ہر پتھر کو وہ اپنے راستے سے ہٹا رہی تھی... اس کے باوجود اس بار آنے والا طوفان شدید تھا... اس میں ناکامی قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی... ایک ایسی قیامت جو کروڑوں افراد کے قدموں سے زمین کھینچ لیتی ہے...

ایک سادہ و معصوم نازک اندام دوشیزہ کی سنسنی خیز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں سارہ احمد چھوٹے سے گاؤں کی ایک نہایت عام سی لڑکی تھی جسے تین بہنوں میں سب چھوٹی ہونے کی وجہ سے ماں باپ کا لاڈ پیار نہ ہونے کے برابر ہی ملا۔ گھر میں بھائی کی حکومت تھی۔ میرے پیروں سے گھر کی زمین اس وقت سرک گئی جب اسی بھائی نے غصے میں کسی کو قتل کر دیا اور غیرت کے نام پر قتل کا بہانہ بنا کر سزا سے بچنے کے لیے مجھے بدنامی اور الزام کی کالک لگا کر موت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور میرے ماں باپ نے بیٹے کو بچانے کی خاطر اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ اس شام میں نے گھر، گاؤں اور سب کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور ٹرین میں سوار ہوگئی۔ ٹرین میں ایک شیطان ملا۔ میں نے اس کا مقابلہ کیا اور کچھ پیسے لے کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوئی مگر اس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا، جان بچانے کی دوڑ میں، میں ایک کچی بستی میں پہنچی جہاں گندے نالے میں ایک چھوٹی بچی ڈوب رہی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اس بچی کو بچانے کے لیے نالے میں کود گئی۔ اس کی جان بچانے کے انعام کے طور پر مجھے اس کے گھر میں پناہ ملی۔ اس بستی میں منشیات کا دھندا زوروں پر تھا۔ مجھے پناہ تو ملی مگر میری تقدیر کی گردش میرے ساتھ تھی۔ پہلے مجھ پر اس بچی کے باپ کے قتل کا الزام لگا اور پھر وہاں پر خوف و ہراس پھیلاتی کالے جادو کی ماہر اماں سے میری جھڑپ ہوگئی۔ وہ اس بچی کے خون سے ایک خاص طاقت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ بچی کو بچانے کی کوشش میں وہ جادوگرنی جل کر مر گئی۔ جس کے بدلے بستی کے بڑے بدمعاش نے مجھے وہیں قتل کرنے کا حکم سنایا۔ علاقے کے دوسرے ڈان نے اچانک کارروائی کر کے مجھے بچا لیا۔ اس نے مجھے اپنے اڈے پر قید کیا جہاں ہر طرف منشیات ہی منشیات تھی۔ میں اسے اس کے تمام تر برے ارادوں کے ساتھ ختم کرنے اور اس کے منشیات کے ذخیرے کو آگ لگا کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو ہی رہی تھی کہ ایک افسر کے ہتھے چڑھ گئی۔ جہاں اس کے کرپٹ افسر نے مجھے آپا جی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ وہ آپا جی مجھے ٹرین میں ملی تھیں اور مجھے بہت اچھی لگی تھیں مگر درحقیقت آپا جی عصمتوں کی سوداگر تھیں۔ مجھے ان کے بنگلے پر ہر قسم کی تربیت فراہم کر کے امیروں کا دل خوش کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ آپا جی نے ایک رات مجھے ایک بارسوخ شخص کے محل پہنچا دیا۔ جہاں بڑی مشکلات اور جان لیوا کوشش کے بعد میں اسے چھری مار کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ میں جان بچانے کے لیے اندھا دھند دوڑ رہی تھی کہ بڑی سڑک پر دوڑ لگا دی جہاں سامنے سے آنے والی کار کی ٹکر نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ یہ حادثہ میرے لیے زندگی کی نوید بن گیا۔ وہ گاڑی ڈاکٹر علی چلا رہے تھے۔ جو مجھے پہلے اسپتال اور پھر بابا کے پاس لے گئے۔ بابا
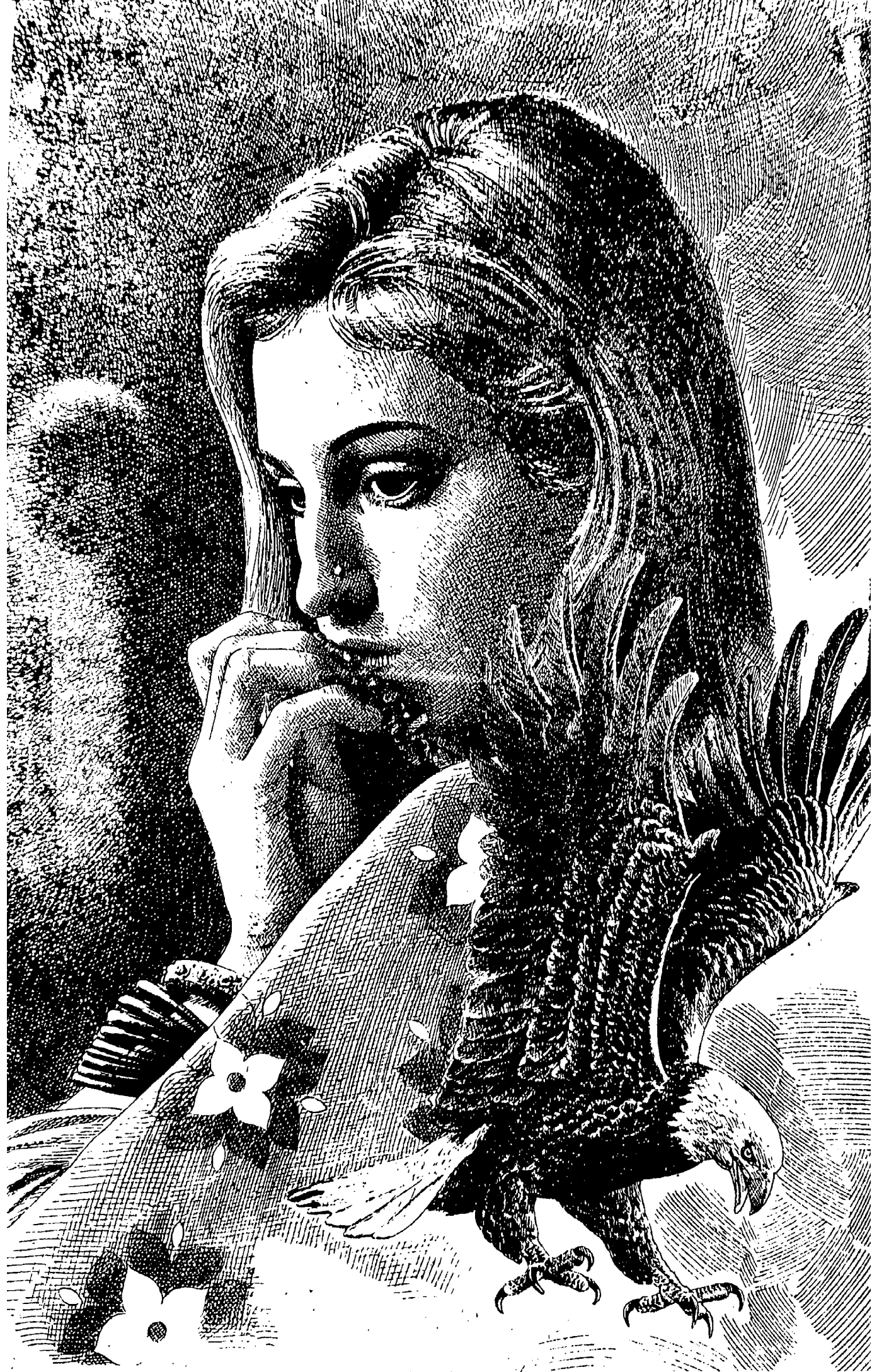
کے گھر آ کر میری زندگی بدل گئی۔ ان پر ہونے والے قاتلانہ حملے میں میری کوشش اور بہادری نے ان کی جان بچانے میں مدد کی۔ یہی ان سے میرا پہلا تعارف تھا جس کے بعد انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنالیا، ان کی زندگی کی کہانی مجھ سے کچھ عجیب نہیں تھی۔ لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران انہیں وہاں ایک کروڑ پتی یہودی ابراہام کی بیٹی سے محبت ہوگئی تھی۔ اس محبت نے بالآخر شادی کا روپ دھارا، ابراہام مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کے نہ ماننے اور مسلسل دھمکیوں کی وجہ سے وہ دونوں پاکستان آ گئے۔ یہاں ان کی زندگی بہت شاندار اور خوشیوں سے بھرپور تھی۔ اللہ نے انہیں ایک بیٹی سونیا عطا کی مگر اسی دوران ابراہام کے غنڈے ان کے گھر پہنچ گئے۔ جہاں ان کی جان بچانے کی کوشش میں مریم نے اپنی جان دے دی اور وہ لوگ سونیا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بابا بمشکل اس غم سے کھڑے ہوئے اور اپنی بیٹی کی تلاش میں لندن پہنچے۔ کسی طرح وہ ابراہام کے محل میں گھسنے اور سونیا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اسے لے کر باہر آ گئے تھے مگر آخری لمحوں پر ابراہام اور اس کے لوگوں نے انہیں شدید زخمی کر کے سونیا کو ان سے چھین لیا۔ وہ ان کو مار ہی ڈالتے مگر ان کے دوست نے کسی طرح انہیں بچایا اور پاکستان بھیج دیا۔ ابراہام کے محل سے انہیں دو خفیہ فائلیں ملی تھیں جس سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ ابراہام کے پاس موجود تمام دولت مریم کی ماں کی ملکیت تھی اور اس نے اس دولت کو مریم یا اس کی اولاد کے نام کر رکھا تھا۔ سونیا کے 25 سال کی ہونے تک وہ اس کا ولی تھا مگر اسے یہ ثابت کرتے رہنا تھا کہ مریم یا سونیا میں سے کوئی ایک اس کے پاس موجود ہے۔ ابراہام سونیا کو اسرائیل میں کسی نامعلوم مقام پر لے گیا مگر بابا سے اس کا جھگڑا جاری تھا۔ بابا نے مجھے تعلیم و تربیت سے نکھارا، وہاں ان کے علاوہ ڈاکٹر علی اور کریم موجود تھے۔ کریم ایک فلسطینی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے پورے خاندان کو یہودیوں نے مار ڈالا تھا اور بابا اسے کیمپ سے ساتھ لائے تھے۔ وہ فوج میں میجر رہا تھا۔ مارشل آرٹ کا ماہر تھا اور اب فوجی ٹریننگ کی ایجنسی چلا رہا تھا۔ ڈاکٹر علی بابا کے دوست کا بیٹا تھا۔ ماں باپ کے حادثے میں انتقال کے بعد اس کی ذمے داری بابا نے لے لی تھی۔ اب ان دونوں کے ساتھ میں بھی اس گھر کا فرد بن چکی تھی۔ ابراہام کے بابا کو ایک فون نے ہم سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے بابا کو بتایا کہ اب وہ جلد ہی پاکستان کو تباہ و برباد کرنے والا ہے اور یہ سب کرنے کے لیے اس نے ان کی بیٹی سونیا کو (جسے وہ مریم کہہ رہا تھا) تیار کیا ہے یہ سب وہی کرے گی۔ کریم اس معاملے کو فوراً مقتدر حلقوں تک لے گیا تھا انہی دنوں سڑک پر ایک بھکارن کے مشکوک انداز پر میں نے اس کا پیچھا کیا وہاں سے ملنے والا ایک سکہ مجھے فخرالدین کے دفتر لے گیا۔ وہ اور وہ بھکارن تاشی موساد کے لیے کام کر رہے تھے۔ ہم نے ان کے کئی منصوبے ناکام کیے۔ اس دوران تاشی نے زہریلی گیس کے ذریعے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی مگر آخری لمحے پر کریم اور علی نے مجھے بچالیا۔ پھر کریم کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب ہماری ان سے کھلی جنگ تھی۔ فخرالدین پکڑا گیا مگر غضنفر نے دلاور کے ذریعے اس کو قتل کرا دیا۔ ہم تینوں کو اس معاملے سے ہٹانے کے لیے غضنفر نے بابا کو بگو استاد کے ذریعے اغوا کروایا مگر ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ اور بابا کو چھڑا لیا گیا۔ اس دوران ہم نے ایک سراغ پر محنت کر کے تاشی کو پکڑ لیا اور اسے خفیہ ایجنسی کے دفتر پہنچا دیا۔ تب ہی مجھے معلوم ہوا کہ کریم بظاہر فوجی ٹریننگ ایجنسی چلا رہا ہے مگر وہ انڈر کور فوجی ہے اور خصوصی خفیہ مشنز پر کام کرتا ہے۔ تاشی کے غائب ہونے پر زورین اور غضنفر نے میرے اغوا کا فیصلہ کیا۔ ہمارے گھر کے باہر کیمرا لگایا گیا۔ اغوا کی اس کوشش میں وہ ناکام رہے اور سب کے سب کریم کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ ایک منصوبے کے تحت تاشی کو فرار ہونے میں مدد دی گئی۔ وہ ایک منچلے سے لفٹ لے کر اس کے گھر پہنچی جہاں غضنفر نے اسے ختم کرنے کے لیے دلاور کو بھیجا۔ تاشی وہاں ماری گئی، مقامی ٹیم کی مسلسل ناکامی کی وجہ سے ابراہام نے سونیا کو پاکستان بھیجا۔ شینا ایٹمی ہتھیاروں کی جانکاری کے لیے وہاں کے ایک اعلیٰ ترین افسر سے دوستی کرتی ہے بالآخر پکڑی جاتی ہے۔ تلاشی کے دوران اس کا فون پھٹ جاتا ہے اور وہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ ابراہام کی ٹیم بھی جونز کی سرکردگی میں شہر میں موجود ہے وہ اس کی مدد سے پورٹ پر کیمیکل کے ذریعے سیکڑوں لوگوں کی موت کا باعث بنتے ہیں۔ اس پر ابراہام سے جھگڑے کے بعد سونیا گھر سے نکلی اور میری گاڑی سے اس کا حادثہ ہوگیا۔ میں اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے گئی۔ چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ وقتی طور پر یادداشت کھو چکی تھی۔ دوسری طرف ابراہام نے خفیہ ایجنسیوں کی وجہ سے اس کی تلاش رکوا دی اور پہلی ٹیم نے تمام کام کرنے والوں کو گراؤنڈ کر دیا۔ دوسری جانب ابراہام کے لیے کام کرنے والا ڈیوڈ بابا جی بن کر ہزاروں افراد کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ انہوں نے 8 دہشت گردوں کی مدد سے بڑی، فوجی چھاؤنی میں گھس کر اسلحہ خانہ، ائربیس پر قبضہ کر لیا اور اسٹاف کو یرغمال بنا کر ایٹمی ہتھیار حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ وہاں مجھے دلاور اور غضنفر نے اغوا کر لیا مگر اپنی خاص صلاحیت کی وجہ سے مجھے بہت جلد ہوش آ گیا اور میں غضنفر کو اٹھا لانے میں کامیاب رہی۔ فوجی چھاؤنی کے معاملے میں کریم کو بھی طلب کر لیا گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں دیوانوں کی طرح دوڑے جا رہی تھی۔
سڑک کے ساتھ کئی ذیلی سڑکیں اور گلیاں موجود تھیں۔
میں نہیں جانتی تھی کہ بابا کس طرف ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اس بارے میں کچھ زیادہ تفصیل بتائی تھی نہ ہی میں نے غور سے سنی تھی۔ طے تو یہ ہوا تھا کہ میں وہاں پہنچ کر ان کو کال کروں گی۔ اگر انہوں نے کچھ بتایا بھی تھا تو مجھے اس حالت میں شاید یاد بھی نہیں ہوتا۔
میرے اردگرد قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ آگ، بارود کی بُو، دھوئیں اور تباہی موت بن کر رقصاں تھے۔ مُردہ اور زخمی افراد کے جسم سڑک پر بکھرے پڑے تھے جو کم زخمی تھے یا موت کی سرخ لکیر میں آنے سے بچ گئے تھے، وہ پاگلوں کی طرح اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا مگر مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت میں صرف اور صرف بابا کو دیکھنا چاہتی تھی۔ زندہ سلامت، بخیر، باتیں کرتے، ہنستے مسکراتے ہوئے...... خوف اور ٹینشن سے میرے اعصاب جن کی مضبوطی پر مجھے فخر تھا، اس وقت جواب دے رہے تھے۔ میرا دل میرے کانوں میں ڈھول کے مانند بج رہا تھا۔
میں تیزی سے دوڑتی، لوگوں سے ٹکراتی، انہیں ہٹاتی پہلی ذیلی سڑک پر مڑی، دھماکے کے اثرات یہاں بھی نمایاں تھے، شروع میں موجود گاڑیوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ افراتفری کا عالم تھا، ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ میں بھی بابا کا نام پکارتے ہوئے بھاگے جا رہی تھی۔ ایک ایک گاڑی کو دیکھتے ہوئے میں تیزی سے مڑی، ہماری گاڑی سکندر یا بابا کوئی بھی اس سڑک پر نہیں تھا۔ میں اسی تیزی سے دوسری ذیلی سڑک کی جانب بڑھی۔ اندر مڑتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں کسی تندور میں داخل ہو گئی ہوں۔
''اوہ......'' میرے منہ سے بے اختیار ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ وہ کوئی بڑی گاڑی تھی جس میں لگی آگ نے اندر داخل ہونے والے پورے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کی وجہ سے سڑک کے کنارے پر موجود کئی کھوکھے بھی آگ پکڑ چکے تھے۔
''ارے ارے میڈم......'' کسی مضبوط ہاتھ نے مجھے کھینچ کر آگ کی دلدل میں گرنے سے بچا لیا۔ ''وہاں آگ لگی ہوئی ہے...... ہٹ جائیں یہاں سے......''
''وہاں...... وہاں...... مم...... میرے بابا...... شاید وہ وہاں نہ ہوں......'' میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔
''دوسری جانب سے گاڑیاں لوگ ہٹا رہے ہیں...... یہاں سے اندر جانا ممکن نہیں ہے۔ مدد آ رہی ہے۔'' اس نے تاسف سے کہا۔ اتنے میں پیچھے سے کچھ آوازیں سنائی دیں اور پھر اندر موجود کسی گاڑی میں ہلکا سا دھماکا ہوا جس نے سب کی توجہ اس طرف مبذول کرا دی۔ میں ایک لحہ وہیں کھڑی سوچتی رہی پھر تیزی سے تیسری سڑک کی جانب لپکی۔ وہ اس علاقے میں آخری ذیلی سڑک تھی۔ اگر بابا وہاں بھی نہ ہوئے...... اس تصور نے میری آنکھوں کو دھندلا دیا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے میرے فون کال کا انتظار کیا ہو، اس سوچ کے آتے ہی میں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس ساری بھاگ دوڑ میں میرے ذہن سے موبائل کا خیال ہی نکل گیا تھا۔ اس لڑکے سے ہونے والے جھگڑے اور پھر اس سانحے کے باوجود میرے گلے میں لٹکے بیگ کا موجود رہ جانا غنیمت ہے۔ شاید اس کے بچ جانے کی وجہ اس کا نیا اور جدید انداز تھا جس میں بیگ ایک بازو سے ترچھا کر کے گلے میں پہنا جاتا ہے۔ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے بیگ سے موبائل نکالا۔ اسے اس اٹھا پٹخ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا، وہ صرف بند ہو گیا تھا۔ موبائل آن ہونے میں لگنے والے چند سیکنڈز مجھے گھنٹوں کے برابر لگ رہے تھے۔ موبائل آن ہوتے ہی فوراً بج اٹھا تھا۔ اسکرین پر نظر پڑتے ہی میرا دل اپنے رب کے حضور سجدے میں گر پڑا تھا۔
اسکرین پر بابا کا نام چمک رہا تھا۔
یقیناً وہ بھی میری طرح مجھے تلاش کر رہے ہوں گے اور مسلسل کال کر رہے ہوں گے تب ہی فون کھلتے ہی ان کا فون آ گیا تھا اور اس سب کا مطلب یہی تھا کہ وہ ٹھیک ہیں۔
''بابا......'' میں کال ریسیو کر کے دل کی گہرائی سے بولی۔
''سارہ...... سارہ بیٹا......'' بابا کی آواز سن کر میرے دل کو قرار سا آ گیا تھا مگر ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔ ''تم کہاں ہو بیٹا...... خیریت سے ہونا...... تم، تم اس طرف مت آؤ بیٹا......''
''آپ...... آپ کہاں ہیں بابا؟'' میں نے بمشکل پوچھا۔
''میں یہاں تیسری سائڈ لائن کی دوسری جانب ہوں بیٹا...... گاڑی وہیں رہ گئی ہے...... یہاں تو قیامتِ صغریٰ گزر گئی ہے بٹیا۔'' ان کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔
''جی بابا...... آپ وہاں سے نکلیں بابا اور مین روڈ کی

طرف چلے جائیں، میں وہیں آرہی ہوں۔"
"ٹھیک ہے بٹیا۔" بابا نے کہا۔
"آپ ٹھیک ہیں نا؟" میں نے فون کو کان کے بالکل قریب کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں بٹیا...... معجزاتی طور پر خراش بھی نہیں آئی ہے ہمیں...... اصل میں کار کو پارکنگ نہ ملنے کی وجہ سے سڑک کے آخری کونے تک دھکا لگا کر لانا پڑا تھا۔ اس وقت تو بہت بُرا لگا تھا مگر اب اس کی مصلحت سمجھ میں آرہی ہے۔ میرے پروردگار کا شکر ہے۔"
"ٹھیک ہے بابا...... میں آرہی ہوں۔" میں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا اور کال کاٹ دی۔ اردگرد مچنے والے کہرام میں بات سمجھ میں آنا مشکل تھا مگر ان کی آواز سن پانا ہی بہت بڑا اطمینان تھا۔ میں نے فون بند کر کے بیگ میں ڈالا اور گلی میں مڑنے کا سوچا اتنے میں میری نظر سروس روڈ کے کنارے پر پڑی...... وہاں موجود منظر نے مجھے ایک لمحے کو ساکت کر دیا...... اس کے بعد میں آگے بڑھی...... میری آنکھوں میں غصے کی آگ دہک رہی تھی اور دل نفرت سے بھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا مگر اس کے ہاتھ پیر اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ اس کا ذہن سن سا ہو رہا تھا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ چل رہا تھا یا بھاگ رہا تھا۔ سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ اس نے اور امجد نے کیا کیا سوچا تھا مگر اس میں سے تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا مگر اسے پہلے ہی کسی گڑبڑ کا خدشہ تھا۔ اس کی عمر بھلے صرف سترہ سال کی تھی مگر روزی روٹی کے چکر میں سڑک سڑک گھومنے نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ ان دونوں آدمیوں سے ملتے ہی اس کو لگا تھا کہ یہ بہت غلط چکر ہے...... اس نے امجد سے کہا بھی تھا مگر اس نے کہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے اصرار اور پھر سب سے بڑھ کر ضرورت نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ اس کی ماں بیمار تھی...... بہت بیمار، اور اسے علاج کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور یہ لوگ انہیں منہ مانگا سے بھی زیادہ معاوضہ دے رہے تھے۔ جب اس ڈاکٹر نے انہیں وہ ٹیکے لگانے کی بات کی اور کام صرف موبائل لے کر جلوس میں جانا اور فون سننا بتایا تب بھی وہ ٹھٹکا تھا مگر پھر وہی ضرورت آڑے آگئی...... ماں کی بیماری اور فری جیسے کام سے ملنے والے ڈھیر سارے روپوں کے خیال نے سوچ کے دروازے بند کر دیے۔ اس نے دل نہ ماننے کے باوجود وہ ٹیکا لگوا لیا۔ وہ ٹیکا...... یوں تھا جیسے اس کی ہر رگ میں آگ سی بھر گئی ہو جیسے دنیا بھر کو تباہ کرنے کے لیے وہ اکیلا کافی ہو...... جیسے سب کچھ مٹا دینا ایک لمحے کا کھیل ہو...... تب ہی تو جب اس لڑکی نے اسے روکا تو وہ اس سے بھڑ گیا...... دل سے ہر بات کا خوف نکل گیا...... وہ تو اسے ضرور مار ہی ڈالتا مگر وہ بھی جیکی چن سے کم نہیں تھی...... اس نے سر جھٹکا۔ اس وقت اتنے بڑے جھٹکے سے گزرنے کے بعد بھی وہ ٹیکا اس کے خون میں دوڑ رہا تھا اور لمحے لمحے بعد اپنا اثر دکھا رہا تھا مگر جو کچھ اس کے گرد ہو رہا تھا، وہ بھی کم نہیں تھا اور جو ہو سکتا تھا اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی وہ لرز جاتا۔

وہ ان سب کو چکما دے کر فون لے کر امجد کی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ اس سے خاصے فاصلے پر تھا جب اس نے امجد کو دھماکے کے ساتھ اُڑتے دیکھا۔ اور پھر اسی لمحے اس کے ہاتھ میں موجود فون بج اٹھا۔ اس نے بے اختیار فون کو دور پھینکا تھا جہاں وہ مسلسل بج رہا تھا پھر شاید بھاگتے ہوئے لوگوں میں سے کسی کا پیر لگا یا کسی جسم کا کوئی حصہ اُڑ کر اس پر گرا...... جس کے بعد گھنٹی کی آواز بند ہو گئی اور ایک زوردار دھماکے کے ساتھ آگ اور خون کا بازار گرم ہو گیا۔

اُس نے مڑ کر نہیں دیکھا کہ اس دھماکے نے کس کس کی دیکھتی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے نابینا کر دیا اور کتنوں کے سہارے موت کے اندھیرے میں جا ڈوبے۔ وہ تو بس اس تپش سے اپنے جسم اور چہرے کو بچا کر بھاگ رہا تھا۔

لوگوں کے رش، بھگدڑ سے بچ بچا کر وہ بمشکل باہر نکل پایا تھا۔ وہ سڑک کے کونے پر پہنچا ہی تھا کہ یکدم موت اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی...... لمحے بھر کے لیے وہ ڈر سا گیا مگر پھر اس کے وجود میں گھومتے ٹیکے نے اسے تھام لیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا مگر اس نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔

اس وقت وہ پہلے کی طرح بہت امیر میم صاحب نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر دھوئیں کے اثرات تھے، بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھوں، پیروں پر خراشیں تھیں، کپڑوں پر اپنے یا دوسروں کے خون کے چھینٹے موجود تھے مگر اس کی آنکھوں میں سخت نفرت اور غصہ موجود تھا۔ اس کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اسی کی طرف آرہی تھی۔

☆☆☆

وہ یقیناً وہی تھا۔

اس وقت اُس کی حالت پہلے سے زیادہ تباہ تھی۔ اس کے کپڑوں پر خون تھا اور چہرے پر گرد، خون اور دھوئیں

نے تصویر کشی کر رکھی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں پہلے ٹھٹکی پھر اس کی جانب بڑھی۔ یہ جو کچھ ہوا تھا، اس میں اس کا ضرور کچھ نہ کچھ کردار ضرور تھا اور اب جب مقدر اسے میرے سامنے لے ہی آیا تھا تو اسے چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔

''رک جاؤ..... تم اس بار بھاگنے میں کامیاب نہیں ہو گے۔'' میں نے آگے بڑھ کر سختی سے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کو یوں لگا جیسے وہ ڈر گیا ہو مگر پھر اس کے تاثرات میں ڈرامائی سی تبدیلی آگئی۔

''ہاتھ چھوڑو.....'' وہ غرایا اور جھٹکا مار کر بازو چھڑانا چاہا مگر اس بار میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو سختی سے جکڑا اور پھر تیزی سے اس کو موڑ دیا۔

''اوغ..... تو تو نہیں سمجھے گی ایسے.....'' اس نے عجیب سے مشینی انداز میں کہا اور اچانک اچھل کر ڈبکی سی لگائی۔ اس کی وجہ سے وہ اپنا بازو تو نہیں چھڑا پایا البتہ پہلے سے بہتر اور حملہ کرنے کی پوزیشن میں ضرور آگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا، میں نے کراٹے کے کھڑے ہاتھ سے اس کی گردن پر ضرب لگائی۔ عام حالت میں یہ چوٹ سامنے والے اچھے خاصے فائٹر کو بھی زمین چٹانے کے لیے کافی تھی مگر وہ صرف لڑکھڑایا تھا اور پھر اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کی تمام تر کوشش میری گردن پکڑنے کی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرارے سے نکل رہے تھے۔ میں اس کی کوششوں کو مسلسل ناکام بنا رہی تھی جس سے اس کے طیش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر سینے پر پڑنے والی میری زوردار کک نے اس کے پیر اُکھیڑ دیے اور وہ زمین پر آرہا جس کے بعد میں نے اسے ککس پر رکھ لیا، مجھے یہ تکنیک کریم نے ہی سکھائی تھی۔ بقول اس کے دشمن کو دوبارہ کھڑے ہونے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ جس وقت مجھے یہ لگا کہ اب وہ ڈھے گیا ہے عین اسی وقت وہ پلٹا اور اس نے میری داہنی ٹانگ کو اپنی گرفت میں لے کر پوری قوت سے موڑ دیا۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ میں توازن قائم نہیں رکھ سکی اور اس پر جا گری۔ وہ تیزی سے اُچھلا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے میری گردن کو جکڑ لیا۔ میں اس کے ہاتھوں سے گردن چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس میں بلا کی وحشیانہ طاقت آگئی تھی۔ دوسری جانب ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں دوسری بار گردن پر پڑنے والا شدید دباؤ لحہ بہ لحہ میری سانسیں اکھاڑ رہا تھا۔ ہمارے اردگرد ایسی بھگدڑ تھی کہ کوئی اب تک اس جانب متوجہ ہی نہیں ہو پایا تھا۔ فضا میں البتہ اب ایمبولینسوں اور پولیس کی گاڑیوں کے سائرن بج رہے تھے۔

''اے کیا ہو رہا ہے یہ.....؟'' اچانک ایک بھاری سی آواز فضا میں گونجی۔ اس پر اس آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا جبکہ میں کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔

''چھوڑو اسے ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' وہی آواز پھر دہاڑی جس کے ساتھ ہی کچھ لوگوں نے اس کو پکڑ کر الگ کرنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ گویا میری گردن پر جم سے گئے تھے۔ میری سانسیں رکتی جا رہی تھیں۔ اس طرح کے انجام کے بارے میں، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا مگر یہ بھی ضروری تو نہیں کہ جو آپ سوچیں یا چاہیں وہی آپ کے ساتھ ہو، اکثر سب کچھ اس کے برعکس ہی ہوتا ہے اور میرے ساتھ تو یہ بہت بار ہو چکا تھا۔ گاؤں کی اس شام جب بھائی میرے قتل کی فرمائش لے کر آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اماں اور ابا اسے نہ صرف انکار کر دیں گے بلکہ شاید سخت الفاظ میں ڈانٹ ڈپٹ کریں گے مگر ایسا نہیں ہوا تھا اور پھر بابا کے گھر آنے تک مقدر کی ساری چالیں میرے خلاف ہی رہی تھیں۔

''سارہ..... سارہ..... یہ کیا ہو رہا ہے..... بچاؤ میری بیٹی کو.....'' بابا کے خیال کے ساتھ ہی ان کی آواز میری ڈولتی سماعت سے ٹکرائی اور مجھے جیسے واپس لے آئی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر اپنے ناخن گاڑنے کی کوشش کی۔ پیچھے سے کئی ہاتھ اسے کھینچ رہے تھے مگر وہ کسی وحشی جانور کے مانند کسی کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ بالآخر ایک ہلکا سا دھماکا ہوا، اس کے ہاتھوں کی گرفت ہلکی پڑی اور پھر وہ اپنا کندھا پکڑ کر زمین پر دہرا ہو گیا۔ میں دونوں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ کر بمشکل سانس لے پا رہی تھی۔ اس کے گرتے ہی میرے سامنے جو چہرہ آیا، وہ جانا پہچانا سا تھا۔

''آپ..... آپ ٹھیک ہیں؟'' اس نے تیزی سے میرے قریب آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پوچھا جبکہ میں کھانستے ہوئے مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔

''ارے..... آپ تو وہی ہیں نا جو کچھ دیر پہلے آگ میں کودنے کی کوشش کر رہی تھیں؟'' اس کے ان الفاظ نے میری اُلجھن ختم کر دی۔

''شکریہ۔'' میں نے بمشکل کہا اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

''آیئے۔'' اس نے مدد کے لیے میری طرف ہاتھ

بڑھایا۔ میں ایک لمحے کو رکی پھر میں نے اُس کا پھیلا ہوا ہاتھ تھاما اور کھڑی ہوگئی۔ میری گردن کسی پھوڑے کے مانند دکھ رہی تھی اور بولتے ہوئے آواز بھی قدرے موٹی اور بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کو زیادہ تکلیف ہو رہی ہے...... یہاں ایمبولینسز موجود ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں...... شکریہ...... میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' میں بولی اور پلٹ کر اس لڑکے کی جانب دیکھا۔ اسے اسٹریچر پر لٹایا جا رہا تھا۔ اس کے کندھے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش نظر آ رہا تھا۔

''اِسے دیکھیں...... یہ زخمی ہے...... اسے کچھ ہونا نہیں چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب...... کیا آپ کا جاننے والا ہے یہ؟'' اس نے نہ سمجھ پانے والے انداز میں مجھے گھورا۔

''یہ...... یہ اس سارے دھماکے اور گڑبڑ کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکتا ہے۔'' الفاظ میرے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ ''میں نے پہلے بھی اُسے پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک موبائل تھا اور یہ عجیب روبوٹ کے انداز میں چل رہا تھا۔ میرے روکنے پر یہ مجھ سے اُلجھ پڑا تھا...... یہ اُس وقت بھی نارمل نہیں لگ رہا تھا، یہ بھاگا تب اس کا فون بج رہا تھا اور چند لمحوں بعد دھماکا ہوا......''

''آپ کا مطلب ہے کہ یہ اس دھماکے بارے میں جانتا ہے؟''

''ہاں...... بالکل۔'' میں نے سر ہلایا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا تعلق پولیس یا کسی قانون نافذ کرنے والے ادارے سے ہے۔

''بٹیا...... سارہ...... تم ٹھیک ہو......؟'' بابا نے قریب آ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ''اسٹارٹس ہو گیا تھا کہ میں ان کے پیچھے پھنس گیا تھا مجھے گولی کی آواز آئی تھی۔''

''جی بابا......'' میں بھی اُن سے لپٹ گئی۔

''چلو بٹیا......'' وہ ایک لمحے بعد بولے پھر اس شخص کی طرف مڑے جو کسی کو اس لڑکے کے بارے میں ہدایات جاری کر رہا تھا۔ ''بہت شکریہ آفیسر......''

''یہ ہمارا فرض ہے سر۔'' وہ بولا اور دوسری جانب مڑا۔

''خیال رکھیے......'' میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''کیسا...... کس چیز کا؟'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''اس کا...... یہ کسی نہ کسی کا آلۂ کار بنا ہے جانے یا انجانے میں...... اور اگر ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ زندہ ہے تو وہ اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑیں گے۔'' میں رک رک کر بول رہی تھی۔ ''آپ...... آپ کا نام کیا ہے؟''

''یہ تعارف اور تفصیل کا موقع نہیں ہے میڈم۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھنے لگا۔ ''ویسے میں آپ کی کہی ہوئی بات کا خود خیال رکھوں گا۔''

''مجھے بھی تعارف کا شوق نہیں...... مگر مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسے یہاں سے کون لے کر جا رہا ہے۔'' اس بار میں نے دو قدم آگے بڑھ کر سختی سے پوچھا۔

''کمال ہے...... ابھی میں نے آپ کی جان بچائی اور آپ مجھ پر ہی شک کر رہی ہیں؟'' اس نے مجھے گھورا۔

''اس کا بہت شکریہ مگر مجھے آپ کا نام اور رینک جاننا ہے؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''شمشیر...... شمشیر علی شاہ...... ڈی آئی جی اسپیشل انویسٹی گیشن۔'' وہ ایک لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔ ''میں یہاں اس جلسے اور ریلی پر نظر رکھنے آیا تھا اور یہ سب دیکھنے کو ملا......'' اس نے دکھ اور افسوس سے چاروں طرف دیکھا۔ ''اب آپ مطمئن ہیں؟ میں اپنے کام پر جا سکتا ہوں اور ہاں ایک سوال میں بھی آپ سے کر سکتا ہوں۔''

''ضرور۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کون ہیں؟ کیا آپ کا تعلق کسی ادارے سے ہے؟''

''نہیں...... میں صرف ایک عام پاکستانی شہری ہوں جسے اپنے ملک کی فکر ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کا بہت شکریہ......'' وہ چند لمحے بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔

''آؤ بٹیا۔'' بابا مجھے سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھے۔ ''تم نے گاڑی کہاں کھڑی کی تھی؟''

''وہ......'' میں تو گاڑی کے بارے میں بھول ہی گئی تھی۔ ''جلسے کی وجہ سے مجھے تھوڑا پیچھے پارکنگ ملی تھی۔''

''ٹھیک ہے سکندر راسے اور ہماری گاڑی کو دیکھ لے گا اور منگوا لے گا گھر......''

''پھر ہم گھر کیسے جائیں گے؟''

''میں نے اسپتال سے گاڑی منگوا لی ہے۔ علی آپریشن میں مصروف تھا۔ اس سے بات نہیں ہو سکی مگر گاڑی

آ گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے بابا۔''

''سارہ اسپتال چلیں؟ تمہیں زیادہ تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

''نہیں بابا ایسا کچھ نہیں ہے تھوڑی بہت تکلیف ہے، گھر جا کر دوا لے کر سو جاؤں گی۔ شام تک بہتر ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔ یہ سچ بھی تھا اللہ پاک کی جانب سے مجھے یہ خاص عنایت ہوئی تھی کہ میرے زخم چوٹیں وغیرہ جلد ہی خود بخود بھر جاتے تھے اور یہ بات بابا، کریم علی سب جانتے تھے۔

''انشاء اللہ!'' وہ بولے اور کار سڑک پر موجود بھیڑ میں اپنی جگہ بناتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

غضنفر اس چھوٹے سے کمرے اور اس کی تنہائی سے تنگ آ چکا تھا۔

اس ٹیسٹ کو گزرے آج تیسرا دن تھا اور اس دوران کسی نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے وقت پر کھانا اور پانی وغیرہ مل جاتا تھا کمرے میں باتھ روم کی سہولت موجود تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے وہاں ڈال کر بھول گئے ہوں۔ اس نے کھانا پہنچانے اور برتن لے جانے والوں سے بھی بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس کی ہر بات کا جواب ایک جامد خاموشی یا ہلکی سی مسکراہٹ سے دیتے تھے۔

اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟

اور کوئی اس سے گفتگو، بات چیت، تفتیش کیوں نہیں کر رہا، یہ سوال اسے پاگل بنائے دے رہا تھا، ایسا تو نہیں کہ کہیں انہوں نے اس پر واقعی کسی دھماکے کی واردات میں لوے افراد کے قتل کا مقدمہ بنا دیا ہو؟

وہ جتنا سوچ رہا تھا، اس کی الجھن اتنی ہی بڑھ رہی تھی۔

دوسری طرف کسی نے اس کی خبر گیری نہیں کی تھی۔ یوں تو وہ جانتا تھا کہ ان کے دھندے میں کام کی رشتے داری ہوتی ہے، ہاتھ لگ جانے والے ساتھی کو بھی دشمن ہی گردانا جاتا تھا کیونکہ وہ بچنے والوں کے حق میں دشمن سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

آج اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی سے بات کر کے رہے گا چاہے اس کے لیے اسے کھانا لانے والے کے پیر ہی کیوں نہ پکڑنا پڑیں مگر اس سب کی نوبت ہی نہیں آئی

یہاں کتاب پڑھنے آئی ہو...... احمق عورت!

تھی۔ وہ کھانے والے کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور میجر عدنان اور اس کے پیچھے کیپٹن شفیق اندر داخل ہوئے۔

''سر......'' وہ انہیں دیکھ کر بے اختیار بولا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''ہاں تو بولو غضنفر۔ کچھ عقل ٹھکانے آئی یا ابھی بھی یادداشت کھوئی ہوئی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ''ویسے اگر اب بھی تمہیں کچھ یاد نہیں آ رہا تو پھر کیپٹن شفیق کا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''کیپٹن کا طریقہ......'' غضنفر نے دہرایا۔

''ہاں، ہاں...... بہت آسان ہے اگر کسی کی یادداشت واپس نہ آ رہی ہو تو یہاں ہم اسے بجلی کے تیز رفتار جھٹکے فراہم کرتے ہیں اور وہ بھی بالکل فری، اس سے ہمیشہ ہی سو فیصد رزلٹ ملتا ہے البتہ کبھی کبھار کوئی کمزور دل اور جسم والا انتقال کر جاتا ہے مگر ایسا سب کے ساتھ نہیں ہوتا۔''

''م...... میں......'' غضنفر بولتے بولتے رکا۔

''ہاں بولو کیا تم؟''

''میں گواہ بننا چاہتا ہوں۔'' وہ بمشکل بولا۔ ''اگر آپ لوگ مجھے ان سے بچا لیں اور معافی دے دیں تو میں سب سچ سچ بتانے کو تیار ہوں۔''

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ اب تمہارے پاس یہ آفر موجود

ہے؟'' کیپٹن شفیق غرایا۔
''پلیز...... میں اُن سے بہت ڈرتا ہوں بہت زیادہ سفاک ہیں وہ۔'' وہ لرز کر بولا۔
''تو کم تو تم بھی نہیں رہے ہو گے۔'' کیپٹن نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ جواب میں غضنفر نے سر جھکا لیا تھا۔
''تو تم سلطانی گواہ بننا چاہتے ہو۔'' میجر عدنان اس دوران پہلی بار بولا۔
''جی سر...... میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا جو کچھ مجھے معلوم ہے بس مجھے آپ کی پناہ درکار ہوگی...... میں آپ کو یہ بھی بتاؤں گا کہ یہاں ان کے کتنے لوگ کام کر رہے ہیں؟ کہاں ہیں؟ اور کیا کر رہے ہیں؟''
''اور اس کے عوض تمہیں کیا چاہیے؟'' میجر نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔
''کچھ خاص نہیں وہی جو سلطانی گواہ کو حاصل ہوتا ہے۔ معافی، پناہ اور سیف ایگزٹ (حفاظت سے نکل جانے)'' غضنفر نے بڑی امید سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''او کے۔'' میجر نے چند لمحوں بعد کہا۔ ''اگر تم واقعی ہمارے کام آ سکے تو میری پوری کوشش ہوگی کہ تمہیں یہ ساری مراعات مل سکیں مگر اس کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ غیر مشروط تعاون کرنا ہوگا تم کب سے یہ کام کر رہے ہو؟ یہ کون لوگ ہیں؟ ان کا گروہ کتنا بڑا ہے؟ ان کی سرپرستی کون کر رہا ہے؟ اور ان کے لوگ کہاں چھپ سکتے ہیں اگر تم ہمارے کام آؤ گے تو ہم تمہیں سلطانی گواہ بنا دیں گے۔''
''میں کروں گا سر...... میں خود تنگ آ چکا ہوں اشاروں پر ناچ ناچ کے۔'' غضنفر بولا۔
''تو چلو ابتدا حالیہ واقعے سے کرتے ہیں۔ سارہ بی بی کے اغوا میں تمہارے ساتھ موجود وہ دوسرا شخص کون تھا؟ تم اسے کب سے جانتے ہو؟ اور وہ کہاں مل سکتا ہے؟''
''وہ...... وہ دلاور ہے۔'' وہ بے ساختہ انداز میں بولا۔ ''اس کا اس تنظیم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، وہ تو پیسے لے کر کام کرنے والا پروفیشنل ہے اور یہی اس نے اپنا نام بھی بنا رکھا ہے...... جو کام اس کے سپرد کیا جائے، اسے کامیابی سے نمٹانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔''
''یہ تو تم کہہ رہے ہو...... یوں بھی وہ اور تم دونوں اس مشن میں ناکام رہے اور اس کے نتیجے میں ہی تو تم یہاں ہو۔'' کیپٹن شفیق نے کہا۔ ''پھر سارہ بی بی نہ صرف خود وہاں سے نکلیں بلکہ تمہیں بھی اٹھا کر لے آئیں اور وہ ''پروفیشنل'' کچھ نہیں کر سکا۔''
''اس نے مجھے منع کیا تھا مگر میں اس کے کمرے میں گیا۔'' غضنفر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں وہ سب کیسے ہو گیا۔''
''مجھے تو یہ دلاور بھی کچھ خاص نہیں لگتا۔'' کیپٹن شفیق ہونٹ سکیڑ کر بولا۔
''نہیں، وہ اس سے پہلے ناممکن کام تنہا کر چکا ہے۔''
غضنفر کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا۔ اتنے دنوں کی خاموشی اور مرتعش اعصاب اس کو مسلسل گفتگو پر اکسا رہے تھے۔
''کیسے کام؟ اس سے پہلے بھی لوگوں کو اغوا کیا ہو گا...... لوٹ مار چوری چکاری؟''
''نہیں، وہ خفیہ کے بڑے دفتر میں سیف الرحمن کا قتل یاد ہے آپ کو...... کتنا مشکل کام تھا۔'' غضنفر اپنی بات ثابت کرنے کے لیے بولتا چلا گیا۔
''وہ دلاور نے کیا تھا؟'' میجر عدنان نے سوال کیا۔
''تم نے کروایا تھا؟''
''نہیں، اُس وقت یہ معاملات سردار صاحب دیکھ رہے تھے۔''
''کون سردار...... پورا نام بتاؤ۔''
غضنفر نے جواب میں اس کا پورا نام بتایا، اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور وہ کسی کو بچانے کے لیے خود کو کسی پریشانی میں ڈالنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا یوں بھی اسے ان پر اپنی اہمیت واضح کرنی تھی تا کہ وہ اسے سلطانی گواہ بنا لیں۔
''مجھے پوری تفصیل بتاؤ۔''
''میں آپ کو سب بتا دوں گا مگر آپ مجھے سلطانی گواہ بنا لیں گے نا...... میں خود اس چکر سے نکلنا چاہتا ہوں۔''
''غضنفر اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے، یہ یاد رکھو کہ تم بارگیننگ کی پوزیشن میں نہیں ہو۔'' میجر عدنان نے کہا۔ ''پھر تم ایک بار جھوٹا ڈراما کر چکے ہو۔''
''میں جانتا ہوں سر۔'' غضنفر بولا۔ ''وہ مجبوری تھی، اگر انہیں یہ بھنک بھی مل گئی کہ میں نے زبان کھول دی ہے تو وہ مجھے مروا دیں گے۔''
''اس بات سے مطمئن رہو تم۔'' کیپٹن شفیق نے کہا۔ ''وہ تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکیں گے مگر تمہیں ہر سوال کا مکمل جواب دینا ہوگا۔ یہی اب تمہاری بقا کے لیے ضروری ہے۔''
''میں جانتا ہوں۔'' غضنفر نے کہا۔ ''آپ جو پوچھیں گے میں بتانے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میجر نے کہا۔ اس کی نگاہیں غضنفر کے چہرے پر جمی تھیں۔

☆☆☆

اسے ہوش آیا تو وہ بستر پر تھا، وہ چند لمحے چھت پر گھومتے پنکھے کو دیکھتا رہا۔

یہ کون سی جگہ ہے؟ وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ اس سوچ کے آتے ہی اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر تیزی سے حرکت نے اس کے کندھے میں آگ سی لگا دی تھی۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ دوبارہ لیٹ گیا۔ اس کے کندھے اور سینے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے واقعے کی فلم سی چل رہی تھی۔ اس کا دوست دھماکے میں اڑ کر ہلاک ہو گیا تھا۔ ہر طرف لوگوں کی لاشیں تھیں۔ خون، آگ، دھواں اور چیخ و پکار تھی...... پھر اس کے فون کا دوبارہ بجنا...... اس نے خوف زدہ ہو کر فون دور اچھال دیا تھا اور بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ چند منٹوں بعد دوسرا دھماکا ہوا اس کے بعد موت کا اندھا ناچ...... اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ''یہ ان سے کیا ہو گیا تھا؟'' اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں...... اب اس کے سامنے وہ لڑکی تھی۔ خوب صورت...... بہت مضبوط...... وہ اس کا گلا دبا رہا تھا۔

''یہ میں نے کیا کیا؟ وہ تصور میں خود اپنے آپ کو اور اپنی حرکت کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ یہ سب کیسے کر گزرا تھا؟ اس میں اتنی ہمت کیسے آئی؟ اتنی طاقت؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ کیا اس نے اسے مار ڈالا تھا؟

''کوئی...... کک کوئی ہے؟'' وہ بالآخر گڑبڑا کر چیخ پڑا۔ ''کوئی آؤ...... کوئی ہے؟''

''کیا بات ہے؟ کیا تمہیں تکلیف ہو رہی ہے؟'' ایک نرم آواز نے اس کی ہمت بندھائی۔

اس نے غور سے اس کی جانب دیکھا، وہ سفید لباس میں ملبوس تھی اور غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کک...... کیا میں مر گیا ہوں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نہیں تم زندہ ہو...... جو مر جاتے ہیں، ان کا اسپتالوں میں علاج نہیں ہو سکتا۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''میں...... میں اسپتال میں ہوں؟ مجھے گولی لگی تھی۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''میں اس لڑکی کو مار رہا تھا مجھے...... مجھے کچھ ہو گیا تھا...... میرا دوست خالد...... وہ مر گیا...... دھماکا ہو گیا تھا...... میں بھی مر جاتا...... انہوں نے پھنسایا ہمیں......'' وہ بے ترتیب انداز میں بولے جا رہا تھا۔ ''خون تھا سب مر گئے...... آگ تھی آگ...... خالد مر گیا۔'' کہتے کہتے اس کے جسم کو جھٹکے سے لگنے شروع ہو گئے۔

''ماں...... ماں......''

''ارے...... پُرسکون رہیں...... اس طرح آپ کا زخم خراب ہو جائے گا...... ارے......'' نرس نے اسے گرنے سے بچانے کے لیے بستر کے ساتھ موجود گارڈ ریل کو کھڑا کیا اور تیزی سے دروازے کی جانب لپکی۔

''ڈاکٹر...... ڈاکٹر پیشنٹ کو فٹس آ رہے ہیں۔'' اس نے کاؤنٹر پر جا کر کہا اور پھر کمرے کی جانب مڑی۔ دو لمحوں میں ڈاکٹر کمرے کے اندر موجود تھے۔ اس کی حالت ویسی ہی تھی مگر اب اس کے منہ سے الفاظ کے بجائے عجیب سی آواز برآمد ہو رہی تھی۔

''نرس...... انجکشن ریڈی کرو۔'' ڈاکٹر نے انجکشن کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

''انجکشن لگتے ہی وہ پُرسکون سا ہو گیا اور پھر اس کی تیزی سے حرکت کرتی پتلیوں نے پلکوں میں پناہ لے لی۔

☆☆☆

''تم نے اُسے چھوڑ کیسے دیا؟'' علی میرے گلے کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے تو تم نے کافی ہیل (بہتر) کر لیا ہے مگر یہ نشان اتنی جلد نہیں جائیں گے...... شکر ہے کہ اندرونی چوٹوں کے آثار نظر نہیں آ رہے، تم کو کچھ نگلتے یا بولتے ہوئے تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

''نہیں اب تو نہیں...... جب ہم واپس آئے تب ہو رہی تھی...... اب تو میں بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''شکر ہے مگر اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، اگر تمہاری جگہ کوئی عام نارمل انسان ہوتا تو دو دن تک بول نہیں پاتا۔''

''یعنی...... میں ایب نارمل ہوں؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''مطلب اچھے سینس میں ''ایب نارمل'' جیسے مارول کے کردار ہوتے ہیں۔'' وہ گڑبڑانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔ ''دیو مالائی...... سُپر ہیرو۔''

''ہوں...... پھر ٹھیک ہے۔'' میں مسکرائی۔

''وہ اب کہاں ہے؟''

''پولیس کی تحویل میں ہے، وہاں کوئی شمشیر علی شاہ نام کا آفیسر ہے اس کے پاس ہے۔ میں نے اسے محتاط

رہنے کو کہا تو ہے مگر اب ہمیں نہیں معلوم کہ وہ خود کیسا آدمی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ وہ اس سب کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں معلوم کرتا ہوں کہ کیا چل رہا ہے؟'' علی نے جواب دیا۔ ''ویسے اس بم دھماکے نے بلکہ دھماکوں نے بہت جانی نقصان کیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے پیچھے ڈوری ہلانے والے ہاتھوں کو لالچی کٹھ پتلیاں ہم میں سے ہی مل جاتی ہیں۔''

''مگر وہ بہت کم عمر تھا، مشکل سے سولہ سترہ کا ہوگا۔'' میں نے افسوس سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اسے کوئی استعمال کر رہا ہوگا۔''

''وہ تو ہے ہی مگر سولہ سترہ سالہ لڑکے میں اتنی طاقت......''

''علی اس بات پر میں خود حیران ہوں۔ اسے لڑنا نہیں آتا تھا میرا مطلب ہے کہ وہ تربیت یافتہ نہیں تھا مگر اس کے باوجود ایک عجیب سی غیر انسانی طاقت اور روبوٹ جیسا انداز تھا اُس کا۔ اسی چیز نے تو مجھے اس کی جانب متوجہ کیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی خاص دوا یا نشہ دیا گیا ہو، اگر اس کا بروقت ٹیسٹ ہو جائے تو یہ معلوم ہو سکتا ہے۔''

''تو معلوم کرو پلیز...... کسی نہ کسی سے وہ ملا ہوگا۔ اگر ایسا معاملہ ہے تو وہ اُس جگہ یا اُس بندے تک لے جا سکتا ہے۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''عین ممکن ہے...... مگر تمہیں صرف آرام کرنا ہے۔ میں معلومات کر کے تمہیں خود بتاؤں گا، آج کریم سے بات نہیں ہوئی اب وہ بھی واپس آنے والا ہوگا۔''

''ہاں، میرا ذہن اُس لڑکے اور جو حالات میں سڑک پر دیکھ آئی تھی وہیں اٹکا ہوا تھا۔''

''بابا کی بھی طبیعت کچھ بہتر نہیں لگ رہی تھی۔'' علی بلڈ پریشر کے آلے کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

''ظاہر ہے ایک تو اتنی بھاگ دوڑ ہوئی پھر اتنا بڑا سانحہ اور پھر یہ لڑائی۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بابا کی فکر ہو رہی تھی کہ کہیں انہیں کچھ نہ ہو جائے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' علی نے کہا۔ ''ویسے میں نے انہیں سکون آور دوا دی ہے۔ آرام کریں گے تو طبیعت بہتر ہو جائے گی۔''

''تم معلوم کر رہے ہو نا؟'' میں نے اس کے باہر نکلنے سے پہلے پوچھا۔

''ہاں، ہاں بالکل...... بتاؤں گا تمہیں...... تم فی الحال صرف آرام کرو۔''

''اوکے۔'' میں مسکرا کر بولی۔

میری گردن پر اس کے ہاتھوں کے نشان موجود تھے جن میں ہلکی سی جلن موجود تھی۔ جسم پر بھی کچھ چوٹیں لگی تھیں مگر میں خود کو بالکل بہتر محسوس کر رہی تھی۔ علی کے جانے کے بعد میں نے اٹھ کر پانی پیا اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ چند لمحوں بعد میں دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی اور سامنے موجود ایل ای ڈی کو آن کیا۔ ''نیوز چینل پر بریکنگ نیوز آ رہی تھی۔

''شہر میں ہنگامے...... فرقہ ورانہ فسادات پھوٹ پڑے...... مختلف علاقوں میں کئی افراد کو چاقو گھونپنے کی وارداتیں......''

اسکرین پر سرخ رنگ میں ڈوبے سفید الفاظ اور اینکر کی تیز کانوں کو چبھتی ہوئی آواز میری سماعت و بصارت دونوں کو زخمی کر رہی تھی۔

''کیسے لوگ ہیں ہم......؟ کتنا آسان ہے ہمارے جذبات سے کھیلنا...... کوئی بھی شخص، ادارہ، تنظیم بڑی آسانی سے ہمیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔'' میں نے افسوس سے سوچا۔ ''یہ جو کچھ ہوا تھا، اس کے یقیناً وہی لوگ ذمے دار تھے جو اس ملک کو، یہاں کے لوگوں کو ختم کرنے کا مشن لے کر آئے تھے مگر ہم ان کا مقابلہ کرنے کے بجائے آپس میں لڑ لڑ کر ختم ہو رہے تھے۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا اور بستر پر دراز ہو گئی۔

گزشتہ کافی عرصے سے زندگی اتنی فاسٹ فارورڈ میں چل رہی تھی کہ کچھ سوچنے کا وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ مجھے اپنے دفتر گئے اپنے کام پر توجہ دیے شاید مہینے ہو گئے تھے۔ اس گھر میں شفٹنگ کے بعد کچھ عرصے احتیاط کے طور پر میں اپنے کام سے دور رہی تھی پھر کچھ نہ کچھ مسلسل ہو رہا تھا۔ اتنے عرصے میں، میں بابا کا پرانا گھر بھی دیکھنے نہیں جا سکی تھی۔ اُس گھر سے میری بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس گھر سے ہی میرا نیا جنم ہوا تھا۔ ایک خوف زدہ، ڈری سہمی اور نا امید سارہ کی جگہ ایک پُرعزم...... فیصلے کی طاقت رکھنے والی اور باشعور سارہ نے لی تھی۔ باقاعدہ تربیت نے مجھے اپنی حفاظت کرنا بلکہ دوسروں کی حفاظت کرنا بھی سکھا دیا تھا۔ بابا کے دشمنوں نے ہمیں اپنی زمین کا رکھوالا بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ کبھی کبھی دشمن بھی سیدھی راہ دکھا دیتے ہیں۔ اگر ابراہام بابا کو

دھمکیاں نہ دیا کرتا، ان پر حملے نہ کرواتا رہتا تو شاید ہم تینوں اور بالخصوص میں آج اس راستے پر نہ ہوتے۔ اب کافی عرصے سے اس کی جانب سے مکمل خاموشی تھی۔ حتیٰ کہ کوئی فون بھی نہیں آرہا تھا۔

''حالات بہتر ہوتے ہی میں اس گھر کا چکر لگاؤں گی۔'' میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ گھر کے بارے میں سوچتے سوچتے میری ذہنی رو گاؤں کے اس گھر کی طرف چلی گئی جہاں میں نے جنم لیا تھا اور جہاں سے مجھے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا تھا۔ اسٹیشن پر مجھے ڈھونڈتے ہوئے بھائی کی وہ آخری جھلک آج بھی میرے ذہن میں تازہ تھی۔ اُس کے چہرے پر سفاکی، غصہ اور نفرت کندہ تھی۔ میں نے اس کے منصوبے کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔ نہ جانے اس دن اس شام کے بعد وہاں کیا ہوا ہوگا۔ اب میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس نے میرے جان بچا کر بھاگنے کو فرار کا نام دیا ہوگا اور گاؤں والوں نے اس کی غیرت کو سراہا ہوگا۔ پتا نہیں اماں ابا اب زندہ بھی ہوں گے کہ نہیں...... میرے لیے تو وہ اسی دن مر گئے تھے جب انہوں نے بھائی کے کہنے پر میرے قتل پر اتفاق رائے کر لیا تھا اور وہ جسے اس عمر میں، میں نے اپنی زندگی مان لیا تھا نہ جانے اُس نے اس سب پر کیا سوچا ہوگا؟ ذہن میں ایک خیال نے چٹکی لی...... جو بھی سوچا ہو، میرے دل نے اس سوال کا جواب خود ہی دے دیا مگر مجھے میرے مالک نے ایک نئی زندگی دی، مشکلات سے گزار کر مجھے بابا کے پاس پہنچایا جہاں مجھے سب کچھ ملا اور کریم بھی......

کریم کا نام مسکراہٹ بن کر میرے ہونٹوں پر پھیل گیا اور پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

جیمز بہت خوش نظر آرہا تھا۔

اس کا مشن انتہائی کامیاب رہا تھا۔ ان دھماکوں کی بازگشت پوری دنیا میں سنی جا چکی تھی۔ کتنے ہی ممالک نے ایک ہی دن میں اس ملک میں جانے کو خطرناک قرار دے دیا تھا۔ جونز نے اسے شاباشی کا پیغام بھی بھیجا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا بونس پکا تھا۔

وہ مکمل طور پر محفوظ بھی تھا۔ وہ لڑکے دھماکے میں اُڑ چکے تھے صرف وہ ڈاکٹر اس سے واقف تھا مگر وہ جونز کا آدمی تھا اس لیے اسے اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

وہ اپنے پسندیدہ مشروب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے جونز کی کال کا انتظار تھا جس کے بعد وہ اپنے تیار کردہ من پسند ڈنر کا مزہ لینے والا تھا۔

جونز کی کال کچھ تاخیر سے آہی گئی۔

''حکم جونز......'' جیمز نے رسمی گفتگو کے بعد مدعے پر آتے ہوئے پوچھا۔

''حکم یہ ہے کہ اب آرام کا موقع نہیں ہے، تمہیں فوراً دوسرے ٹارگٹ پر کام شروع کرنا ہے۔'' وہ بولا۔

''فوراً......''

''ہاں فوراً...... باس کا تو تمہیں علم ہے، اُکھڑا ہوا ہے چھاؤنی والے چکر میں۔'' وہ بولا۔ ''ویسے تو یہاں اس وقت ہمارے لوگ کافی کم ہیں ٹیم بھی انڈر گراؤنڈ ہے مگر باس کا حکم یہ ہے کہ یہاں مسلسل شو جاری رہے۔''

''اوکے...... باس کا حکم ہے اور ہمارا حکم کی تعمیل...... پروگرام بتا دیں۔'' جیمز نے سادگی سے کہا۔

''مشہور سوشل ورکر سجاد احمد شیرانی کو اُڑانا ہے۔''

''سجاد احمد؟'' جیمز نے اس کا نام دہرایا۔

''یہاں کا مشہور بندہ ہے، دولت مند، بزنس مین بھی ہے اور ایک فرقے میں، بہت پسند کیا جاتا ہے، اس کی موت بڑا دنگل کھڑا کرے گی۔''

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس کی سیکورٹی بہت ٹائٹ رہتی ہے۔''

''بالکل وہی ہے۔'' جونز کی آواز سنائی دی۔

''کیا مجھے اسی ڈاکٹر سے رابطہ کرنا ہوگا؟'' جیمز نے پوچھا۔

''نہیں، وہ اس میں مدد نہیں کر سکتا مگر میرے ذہن میں ایک شخص ہے اگر تم اس تک پہنچ گئے تو وہ یہ کام بہ آسانی کر دے گا۔'' جونز بولا۔

''کس طرح رابطہ ہو سکتا ہے اُس سے؟''

''اس کا نمبر میرے پاس تو ہے تم اگر زورین سے رابطہ کر سکو تو وہ تمہیں اس معاملے میں بہت عمدگی سے گائڈ کر سکے گی۔''

''مگر اسے تو انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا تھا، وہ اب یہاں موجود ہے؟''

''بالکل موجود ہے اُسے صرف کام سے روکا گیا تھا فی الحال واپس نہیں بھیجا گیا ہے اور ہاں اس کا فون تبدیل کر دیا گیا تھا، وہ فون کہاں ہے؟''

''وہ موجود ہے میں نے ہدایات کے مطابق اسے آن نہیں کیا۔''

''گڈ...... فی الحال اسے استعمال نہیں کرنا ہاں

زورین سے رابطے کی اجازت ملی ہے، اُس سے رابطہ کرو، وہ تمہیں اس شخص کا نمبر وغیرہ فراہم کر دے گی۔“

”کس شخص کا؟“ جیمز نے روانی میں پوچھا۔

”جیمز فوکس کرنا سیکھو۔“ جونز غرایا۔

”اوہ ہاں، سوری، میں مکس کر گیا تھا چیزوں کو...... اس شخص کا نام کیا ہے؟“

”اس کا نام دلاور ہے۔“ جونز نے کہا۔ ”اس مشن میں تمہیں اُس کی ضرورت پڑے گی۔“ جونز نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مگر اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔

اسے چھپتے پھرتے کئی دن ہو گئے تھے۔ یہ اس کے مزاج اور سوچ کے خلاف تھا مگر اس لڑکی کے حیرت انگیز طریقے سے فرار اور غضنفر کے اغوا نے اسے اس پر مجبور کر دیا تھا۔

غضنفر اگر منہ کھول دیتا تو اس کے لیے خطرہ ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے اپنا گھر چھوڑ کر اس فضول سے ریسٹ ہاؤس میں رہنا پڑ رہا تھا۔

وہ ہر چیز میں بہترین کا شوقین تھا۔ اس کا اپارٹمنٹ چھوٹا تھا مگر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک مہنگی اور بہترین عمارت کی سب سے اونچی منزل پر واقع تھا۔ اسے اینٹیک اور آرٹ کا شوق بھی تھا اور اس کا گھر کسی چھوٹے موٹے میوزیم اور گیلری سے کم نہیں تھا۔

وہ ایک وقت میں ایک ہی ”پروجیکٹ“ پر کام کرتا تھا اس لیے اس کے پاس غضنفر کے کام کے سوا اس وقت کوئی اور کام بھی نہیں تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ وہ بچت کا عادی تھا۔ لہٰذا اس کے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ وہ بہ آسانی پورا سال سکون سے بیٹھ کر بھی گزار سکتا تھا۔

”نہ جانے غضنفر کہاں اور کس حال میں ہوگا؟“ اس نے سوچا۔ اس کے منع کرنے کے باوجود وہ اسے چیک کرے گا۔ ویسے تو دلاور کو خود بھی اس میں کوئی بڑا خطرہ نظر نہیں آیا تھا مگر جب وہ غضنفر سمیت اس کی گاڑی میں ہی بیٹھ کر غائب ہو گئی تو اسے کافی دیر تک خود بھی اس بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ ایسی شکست اسے زندگی میں پہلی بار ہوئی تھی اور وہ اسے آسانی سے بھول نہیں سکتا۔ یہاں سے نکلتے ہی اس کا پہلا کام اس کو تلاش کرنا تھا۔ وہ اس ہار کا انتقام ضرور لینا چاہتا تھا مگر فی الحال یہ اس کے لیے بہترین موقع نہیں تھا۔

”کافی کی طلب نے اسے کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا وہ ابھی کافی میکر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر ایک نمبر چمک رہا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو دلاور......“ دوسری طرف ایک غیر ملکی نسوانی آواز نے اسے حیران کر دیا۔

”جی میں دلاور بول رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”دلاور میں زورین ہوں شاید غضنفر نے تم سے میرا ذکر کیا ہو...... وہ ہمارے لیے کام کرتا ہے...... میں کچھ عرصے سے ملک سے باہر ہوں...... ایک کام کے سلسلے میں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

”میڈم کیا آپ کا غضنفر سے کوئی رابطہ نہیں ہے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”نہیں، کچھ عرصے سے نہیں ہے...... مگر میں اُس سے رابطہ کر لوں گی۔“

”مت کیجیے گا۔“ وہ بے اختیار بولا۔

”کیا مطلب؟ تم یہ کیوں کہہ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ وہ یہاں کے خفیہ ادارے کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔“ وہ بولا۔ یہ خبر سن کر زورین چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

”کیسے؟ کیا تم بتا سکتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں، میں ہی بتا سکتا ہوں۔“ دلاور نے کہا۔ ”آپ نے ایک لڑکی کے حوالے سے اسے کوئی اسائنمنٹ دیا تھا۔ ہم اسے اٹھانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ آپ سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے غضنفر نے اسے کہیں اور رکھا، ہوش میں آنے کے بعد اس نے کسی طرح خود کو آزاد کیا، غضنفر پر قابو پایا اور اس کی گاڑی میں ڈال کر اپنے ساتھ لے گئی۔“

”کیا...... تم کہاں تھے اس وقت......؟“ زورین نے تڑخ کر پوچھا۔

”وہیں تھا مگر اپنے کمرے میں تھا، مجھے علم نہیں ہو سکا اور جب شک ہوا تو گاڑی نکل چکی تھی۔ اس کے بعد میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔“

”اوہ......“ یہ تو بُرا ہوا۔“

”بالکل۔“ دلاور بولا۔

”یوں تو تم بھی خطرے میں ہو گے؟“

”نہیں، میں اس کے بعد گھر نہیں گیا ویسے میری

معلومات کے مطابق وہاں کوئی مسئلہ ہوا بھی نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غضنفر نے انہیں کچھ نہیں بتایا ہے۔''

''ہوسکتا ہے مگر یہ بہت رسکی (خطرناک) ہے تمہیں وہاں فی الحال بالکل نہیں جانا چاہیے خصوصاً اس صورت میں جبکہ تم ہمارے لیے کام بھی کر رہے ہو۔''

''ٹھیک ہے آپ کام بتایئے۔'' وہ یوں بھی بہت بوریت محسوس کر رہا تھا۔

''وہ تم کو کل بتا دیا جائے گا، تم اس کے لیے خود کو تیار کرو۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟'' زورین نے پوچھا۔

''میں......'' دلاور ایک لمحے کو ہچکچایا۔ وہ اس عورت کا ذکر سن چکا تھا مگر اس سے کبھی ملا نہیں تھا اور اس وقت کسی پر بھروسا کرنا خطرناک ہوسکتا تھا۔

''گھبراؤ نہیں ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں......اس سوال کا مقصد ہے، اسی لیے پوچھا ہے اور اگر تم بتانا نہیں چاہتے تو کل لوکل ٹرین کے اسٹیشن نمبر 3 پر پہنچ جانا۔''

''یہ زیادہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے وہاں ایک شخص تم سے ملے گا، وہ اسٹیشن پر موجود بینچز میں سے نمبر 2 پر بیٹھا ہوگا اور اس کے پاس ایک کالا بریف کیس ہوگا۔ تمہیں دوپہر دو بجے وہاں موجود ہونا چاہیے۔''

''میں آجاؤں گا۔'' دلاور بولا۔ ''مگر وہ مجھے کیسے پہچانے گا؟''

''ویری سمپل، اپنی ایک سیلفی بنا کر اس نمبر پر بھیج دو، امید ہے کہ تم اس سے خوف زدہ نہیں ہوگے؟'' زورین نے پوچھا۔

''دلاور خوف زدہ نہیں ہوتا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''گڈ تو پھر سیلفی بھیج دو...... گڈ نائٹ۔'' زورین نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ دلاور چند لمحے فون کو دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی سیلفی بنائی اور اس نمبر پر واٹس ایپ کر دی۔

اُسے اب کل دوپہر کا انتظار تھا۔

☆☆☆

شہر کی صورت حال لحہ بہ لحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ دھماکوں میں ستر سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے جن میں کئی رہنما بھی شامل تھے۔ جن کے پرستار غم و غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ بے شمار زخمیوں کی وجہ سے اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ تھی۔ کئی زخمیوں کی حالت نازک تھی۔

ایک طرف تو یہ حالات تھے، دوسری جانب شہر میں کئی جگہ فرقہ ورانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ بالخصوص جہاں سے یہ سب شروع ہوا تھا وہاں تو غیر اعلانیہ کرفیو سا لگانا پڑ گیا تھا۔ اس کے باوجود کئی افراد پر چاقوؤں سے شدید حملے ہوئے تھے۔ کئی جگہ بات جھگڑے مار پیٹ اور فائرنگ تک جا پہنچی تھی۔

ڈی آئی جی انویسٹی گیشن شمشیر علی شاہ مسلسل ڈیوٹی پر تھا۔ اب وہ اسپتال کی جانب جا رہا تھا۔ ابتدائی رپورٹس کے مطابق دونوں دھماکے خودکش تھے اور کسی موبائل کے ذریعے کیے گئے تھے جن میں ایک خودکش بمبار ان کا شکار ہوا تھا جس کی عمر لگ بھگ سولہ سترہ سال بتائی جا رہی تھی جبکہ دوسرے کے معاملے میں خاص تفصیلات نہیں تھیں۔

اس کے ذہن میں اس خوب صورت لڑکی کے الفاظ بار بار گونج رہے تھے جس میں وہ اس لڑکے کے بارے میں اسے متنبہ کر رہی تھی۔

اس کے اسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹرز نے اسے اس زخمی لڑکے کے لیے مخصوص کمرے میں پہنچا دیا۔ سیکیورٹی کے نقطہ نظر سے اسے ایک الگ تھلگ کمرا دیا گیا تھا جہاں پولیس کا سخت پہرا تھا۔ مخصوص نرس اور ڈاکٹرز کے سوا کوئی کمرے میں داخل نہیں ہوسکتا تھا اور یہ سب شمشیر کے حکم کے مطابق ہو رہا تھا۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں بھی چند ہی لوگوں کو اس لڑکے کے زندہ یہاں ہونے کا علم تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ لڑکا ہوش میں تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کچھ سہم سا گیا۔

''شاید اس نے اسے گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہو۔'' اس نے سوچا۔

''آپ لوگ باہر جائیں۔'' اس نے کمرے میں موجود ڈاکٹر اور نرس سے کہا جو فوراً ہی کمرے سے نکل گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ سال کی عمر کا لڑکا تھا۔ اس کا چہرہ غذائی کمی کا شکار نظر آ رہا تھا۔ اب تو خون بہنے اور اس ساری اُفتاد نے اسے پیلیا کا مریض بنا دیا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' چند لمحے اس کا جائزہ لینے کے بعد اس نے پہلا سوال کیا۔ یہاں آتے ہوئے وہ سخت طیش میں تھا مگر اس کی حالت اور شکل دیکھ کر اب وہ خود عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔

''پپ پرویز......'' وہ ہکلا کر بولا۔

''تو پرویز تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟'' اس کی آواز کچھ بلند ہوگئی تھی۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔'' وہ بمشکل بولا۔ ''سچ، سچ بول رہا ہوں اماں کی قسم......'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''سر ڈراما کررہا ہے...... مجھے اجازت دیں ابھی سچ نکلواتا ہوں۔'' دروازے پر کھڑے اے ایس آئی نے کہا۔

''نن، نہیں جھوٹ نہیں بول رہا سر......''

''تم خاموش رہو شہباز اور کمرے سے باہر جاؤ......'' شمشیر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا، اس کی نگاہیں پرویز پر جمی ہوئی تھیں۔

''سر میں آپ کے لیے یہاں کھڑا تھا۔'' وہ بولا۔

''تو میں ہی تمہیں باہر جانے کو کہہ رہا ہوں۔'' شمشیر نے نرمی سے کہا۔ اس کے باہر جانے کے بعد وہ پرویز کی جانب دوبارہ متوجہ ہوا۔ ''تو کیا کہہ رہے تھے تم......؟ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم کیا کرنے جارہے ہو؟''

''جی سر...... مم میں آپ کو پوری بات بتاتا ہوں۔''

''ہاں بولو......'' وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مگر سچ بولنا ورنہ اس بار گولی کندھے میں نہیں لگے گی۔''

''جج جی سر...... مجھے اور امجد کو کام کی ضرورت تھی۔''

''یہ امجد کون ہے؟'' شمشیر نے پوچھا۔ اس نے موبائل کا طاقتور ٹیپ ریکارڈر آن کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''امجد میرا دوست تھا...... بچپن کا دوست، محلے دار۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''ہمیں رفیق بھائی نے بتایا کہ ایک چھوٹا سا کام مل رہا ہے اس کے اچھے پیسے مل جائیں گے، رفیق بھائی بھی محلے میں رہتے ہیں۔ ہم نے ہاں کہہ دی...... اگلے دن ایک آدمی نے ہمیں سڑک پر آنے کو کہا اور پھر اپنے ساتھ ایک بنگلے میں لے گیا...... وہاں...... وہاں ایک اور آدمی بھی تھا وہ ڈاکٹر تھا صاب......''

''یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟'' شمشیر نے پوچھا۔

''اس نے مجھے اور امجد کو ٹیکے لگائے تھے۔''

''ٹیکے......؟''

''جی ٹیکے...... انجکشن...... ہم دونوں لگانے سے ڈر رہے تھے میں تو بہت ڈر رہا تھا مگر انہوں نے کہا کہ کورونا کا بوسٹر ہے، ضروری لگوانا پڑے گا ورنہ کام نہیں ملے گا...... میری ماں بیمار ہے، مجھے کام کی پیسے کی بہت ضرورت تھی۔ تو ہم راضی ہوگئے۔'' وہ کھانسی کی وجہ سے رکا۔

شمشیر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اس نے ہمیں دو موبائل بھی دیے تھے اور جگہ بتائی تھی۔ جہاں ہمیں کھڑا ہونا تھا۔''

''کون سی جگہ؟''

''بڑے ٹرک کے پاس جس پر سارے لوگ تقریر کررہے تھے...... امجد کو الگ راستے سے بھیجا تھا اور مجھے الگ...... ہمارا کام صرف یہ تھا کہ اس جگہ پر پہنچنا تھا اور موبائل پر آنے والی کال کو سننا تھا بس...... اس کام کے ایک لاکھ روپے ملنے والے تھے۔ میں جارہا تھا تو اُس لڑکی نے روک لیا...... اب سوچتا ہوں تو شرم آتی ہے اپنے آپ پر......''

''کس بات پر؟''

''اس نے تو میری جان بچائی۔'' وہ رو کر بولا۔

''جان بچائی؟ وہ کیسے؟''

''اس نے مجھے پکڑ لیا اور مجھ سے موبائل مانگنے لگی۔ میرے اندر تو آگ لگی ہوئی تھی جو ٹیکے انہوں نے لگائے تھے نا اس کے بعد سے ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کو مٹا دینے کی طاقت آگئی ہو، میں ڈان بن گیا تھا، اس کے روکنے کے بعد ہمارا جھگڑا ہوگیا، پولیس آگئی...... میں پھر بھی بھاگا مگر فون میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اتنے میں دھماکا ہوگیا...... میں نے امجد کو آگ کے گولے کے ساتھ ہوا میں اُڑتے ہوئے دیکھا صاب وہ تو صرف سبزی کا ٹھیلا لگانا چاہتا تھا۔'' وہ مسلسل رو رہا تھا۔ ''تب میری سمجھ میں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ اسی وقت زمین پر پڑا موبائل بجا میں اس سے دور بھاگا پتا نہیں کس طرح وہ ریسیو ہوا اور دوسرا دھماکا ہوگیا...... میں ڈر کر بھاگ رہا تھا کہ پھر اس لڑکی نے مجھے روک لیا اور پھر آپ آگئے۔''

''پرویز اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو تمہیں صرف اتنی ہی سزا ملے گی جتنا تمہارا قصور ہے اور یہ میرا وعدہ ہے۔'' شمشیر نے بھاری آواز میں کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں صاب۔''

''تمہیں، ہمیں اس مکان تک لے جانا ہوگا جہاں تمہیں لے جایا گیا تھا، راستہ یاد ہے؟''

''ہاں صاب میں لے جاؤں گا...... مجھے وہ گھر اور راستہ دونوں یاد ہیں۔''

''اور اس رفیق سے بھی ملواؤ گے تم۔''

''جی صاب......'' پرویز نے جواب دیا۔

''مگر اس سب سے پہلے ایک ضروری کام......'' شمشیر نے دروازہ کھول کر شہباز کو پکارا۔

''ڈاکٹر کو بلاؤ۔''

''یس سر۔'' وہ سیلوٹ مار کر سیدھا نکل گیا۔

''ڈاکٹر صاحب اسے ایک انجکشن لگایا گیا تھا آپ اس کے وہ ٹیسٹ کیجیے جن سے معلوم ہو سکے کہ اس کے سسٹم میں کون سی دوا داخل ہوئی تھی، کیا یہ ممکن ہے؟'' ڈاکٹر کے آتے ہی شمشیر نے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ممکن ہے مگر ڈاکٹر سے یہ جاننا ضروری تھا۔

''بالکل ممکن ہے سر۔ میں ابھی ٹیسٹ کرواتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، اس کی رپورٹ جتنی جلد ممکن ہو، نکلوائیے اور اپنے مریض کا خیال رکھیے، یہ ہمارے لیے قیمتی ہے، آپ کے ضروری اسٹاف کو آپ نے متنبہ کر دیا ہوگا یقیناً۔''

''بالکل ڈی آئی جی صاحب...... اس بارے میں ایک حرف بھی اس کمرے اور فلور سے باہر نہیں جائے گا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''او کے...... پرویز...... میں تھوڑی دیر میں آرہا ہوں تمہیں ہمیں اس مکان تک لے جانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے سر......'' وہ بولا۔ شمشیر سے گفتگو کے بعد اس کا خوف قدرے کم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دلاور وقت سے پہلے ہی لوکل ٹرین کے اسٹیشن پر پہنچ گیا تھا۔ وہ دو نمبر کی بینچ سے کچھ ہی فاصلے پر موجود چائے والے کے ٹھیلے کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا، اس کی نگاہیں بینچ پر جمی ہوئی تھیں۔ ٹھیک دو بجے ایک نوجوان اس بینچ پر آکر بیٹھا، اس کے ہاتھ میں ایک کالا بریف کیس موجود تھا۔ دلاور چند لمحے اس کا جائزہ لیتا رہا پھر چائے والے کو پیسے کی ادائیگی کر کے بینچ نمبر دو کی جانب بڑھا۔

اس کے قریب پہنچتے ہی وہ نوجوان کھڑا ہو گیا۔ ''میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس آپ کی امانت ہے۔ وہ آپ لے لیں۔''

''میری امانت......'' دلاور نے حیرت سے پوچھا۔
''جی، جی......'' وہ دوبارہ مسکرایا اور بریف کیس کھول کر اس میں سے ایک تھیلا نکال کر دلاور کی جانب بڑھا دیا۔
''اس میں کیا ہے؟'' دلاور نے تھیلا لیے بغیر پوچھا۔
''اسے آپ کے لیے بھجوایا گیا ہے یقیناً اس میں کچھ تفصیلات اور کوئی ضروری سامان ہوگا۔'' وہ بولا۔ ''اگر آپ چاہیں تو میڈم سے بات کرلیں۔''
''مگر مجھے یہ بتایا نہیں گیا تھا۔'' دلاور ہچکچا کر بولا۔
''خیر تم اسے دے دو مجھے۔''
''شکریہ، آپ نے میرا کام آسان کردیا۔'' وہ یہ کہہ کر کھڑا ہوگیا اور خالی پلیٹ فارم سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔ دلاور چند لمحے تھیلے کو گھورتا رہا پھر وہ بھی پلیٹ فارم سے باہر نکل گیا۔ اس نے سیدھا ریسٹ ہاؤس میں موجود اپنے کمرے میں آکر دم لیا تھا...... وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس تھیلے میں کیا تھا۔ حالات کی وجہ سے اُس کے ذہن میں بہت سے منفی خیالات بھی آرہے تھے ورنہ عام دنوں میں شاید اس کے لیے یہ سب کچھ زیادہ اہم نہ ہوتا۔
اس تھیلے میں مزید دو تھیلے موجود تھے جن میں سے ایک میں ایک موبائل تھا جس میں سم بھی موجود تھی اور دوسرے تھیلے میں پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں۔
اس نے فون آن کیا تو چند لمحوں بعد ہی اس کی بیل بجنا شروع ہوگئی۔ اس نے نمبر کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔
''ہیلو...... دلاور میں جیمز بات کررہا ہوں۔'' دوسری جانب اس کی امید کے برعکس مردانہ آواز سنائی دی۔ ''زورین تمہیں پروجیکٹ کے بارے میں بتا چکی ہے۔ اس کو علم تھا کہ تم ایڈوانس وصول کیے بغیر کام شروع نہیں کرتے اس لیے تمہیں آدھی رقم ایڈوانس کے طور پر بھجوادی گئی ہے باقی آدھی کام مکمل ہونے کے بعد پہنچ جائے گی۔''
''گڈ، یہ تو اچھا ہے کہ آپ لوگوں کو میرے اصول معلوم ہیں اور جب آپ اتنا جانتے ہیں تو یقیناً یہ بھی جانتے ہوں گے کہ یہ قاعدہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جنہیں میں بذاتِ خود جانتا ہوں جیسے غضنفر...... اب آپ کو میں نہیں جانتا، نہ چہرہ نہ علاقہ، نہ گھر نہ پتا...... ایسے میں کام کی مکمل فیس مجھے ایڈوانس میں درکار ہے، بعد میں آپ کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔''
''غضنفر ہمارے لیے کام کرتا تھا دلاور...... ویسے رقم کوئی مسئلہ نہیں ہے تمہیں جہاں کہو بھجوادی جائے گی۔''
''یہ بہتر رہے گا، اس سے مجھے کام کرنے کے لیے کک ملتی ہے۔ کام میں نے سمجھ لیا ہے، ہوجائے گا۔''
''تم ہم سے اسی فون کے ذریعے رابطہ کرو گے...... یہ ڈی ٹیکٹ نہیں ہوتا نہ ہی اسے ریکارڈ وغیرہ کیا جاسکتا ہے۔'' جیمز نے کہا۔
''ٹھیک ہے جیمز، میں یہی کروں گا۔'' اس نے جواب دیا۔
''کام بہت تیزی سے ہونا چاہیے۔'' وہ بولا۔
''اس کا دارومدار آپ پر ہے، پوری رقم مجھے مل جائے، اگلے دن کام ہوجائے گا۔''
''ٹھیک ہے، رقم رات تک تمہیں کس طرح پہنچائی جائے یہ بتادو......''
''میں ایک اکاؤنٹ نمبر بھیج رہا ہوں۔ یہ ڈالر اکاؤنٹ ہے رقم کو اس میں ٹرانسفر کردیں۔'' دلاور نے جواب دیا۔ ''سجاد احمد شیرانی کے قتل کا یہ معاوضہ ویسے کم ہے۔ جانتے ہوں گے آپ کہ اس کی کس قدر سخت سیکیورٹی ہے۔''
''کام اگر ٹھیک ہوا تو انعام اور پھر مسلسل کام ملتا رہے گا۔'' جیمز نے جواب دیا۔
''اگر مگر دلاور کی ڈکشنری میں نہیں ہے، میں یقین سے کام کرتا ہوں جیمز اور یہ کام ہوجائے گا۔''
''یہ اچھی بات ہوگی بہت اچھی بات......'' جیمز نے کہا اور کال بند کردی۔ اُسے دلاور کی سودے بازی بالکل پسند نہیں آئی تھی لیکن اس وقت اُس سے کام لینا تھا اس لیے اس نے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

☆☆☆

سجاد احمد شیرانی کا آج کا شیڈول بہت سخت تھا مگر یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ ہفتے کے ساتوں روز اتنا ہی مصروف رہتا تھا۔ اتوار والے دن البتہ دوپہر ایک سے چار بجے تک وہ خود کو ہر مصروفیت سے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔ پہلے تو اس کی وجہ بہت ہی کم افراد کے علم میں تھی مگر جب اس پر چہ میگوئیاں ہونا شروع ہوئیں تو پھر سجاد احمد نے اس ''راز'' پر سے پردہ اٹھادیا تھا۔ اس نے شہر میں اپنی ایک بڑی بلڈنگ میں ستّر ایسے بچوں کو گود لے رکھا تھا جن کے ماں باپ یا تو انتقال کرچکے تھے یا پھر وہ ان بچوں کی ذمّے داری اٹھانے سے قاصر تھے۔ یہ بچے یہاں

رہتے، بہتر اسکولوں میں تعلیم حاصل کررہے تھے۔ انہیں ایک اچھی زندگی کی تمام سہولیات حاصل تھیں۔ سجاد احمد ہر اتوار کو ان کے ساتھ کھانا کھایا کرتا تھا۔ اس کے بعد گپ شپ اور تحفے تحائف دیے جاتے۔ اسے اس سب سے بہت اطمینان اور خوشی میسر ہوتی تھی۔ آج بھی اتوار ہی تھا اور وہ بچوں کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزار کر نکلا تھا۔

"سر! آپ ان بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں نا؟" اس کے اسسٹنٹ مدثر نے راستے میں پوچھا۔

"ہاں بالکل...... یقین جانو کہ ان کے ساتھ وقت گزار کر سکون ملتا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں اچھے کام کا سکون ہی الگ ہوتا ہے، اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے، آپ یہ کر بھی سکتے ہیں۔"

"یہ مت کہو، اللہ نے ہر ایک کو موقع دیا ہوا ہے۔ تم اگر ستر بچوں کو گود نہیں لے سکتے مگر کسی یتیم بچے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا سکتے ہو تو یہ بھی بڑی بات ہے۔ اچھے کام کے لیے صرف پیسوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نیت دیکھی جاتی ہے چاہے چھوٹی سی مدد ہو۔" وہ مسکرایا۔

"درست کہا آپ نے۔" وہ بھی جواباً مسکرایا۔ "کیا اب فاؤنڈیشن کے دفتر جائیں گے؟"

"ہاں، وہیں جانا ہے۔" اس نے جواب دے کر آنکھیں بند کرلیں، سفر کے دوران نیند کی جھپکی لے لینا اس کی روز کی عادت تھی۔

سجاد احمد ایک نامور صنعت کار تھا۔ شہر کا سب سے زیادہ امیر ترین نہیں تو بھی سب سے زیادہ امیر ترین افراد میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اب کاروبار کی جانب اس کی توجہ کم تھی۔ اپنا زیادہ تر وقت وہ فاؤنڈیشن کے کاموں میں صرف کرتا تھا۔ اس فاؤنڈیشن کے بنیادی کاموں میں لوگوں کی مدد اور روزگار کی فراہمی کی کوششیں شامل تھیں۔ لوگ اس کے اخلاص اور کاموں پر یقین رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ ہر سال اسے بے حد ڈونیشن ملا کرتا جسے وہ کارِ خیر میں صرف کر دیتا تھا مگر یہی بڑھتا ہوا ڈونیشن اس کے حریفوں اور دشمنوں میں اضافہ کرتا جارہا تھا۔ ایک ناکام قاتلانہ حملے کے بعد سے اس کے خاندان نے اس کی سیکیورٹی کے لیے کئی گارڈز متعین کیے تھے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ ہفتے میں دو دن فاؤنڈیشن میں عام لوگوں سے ملا کرتا تھا اور یہ دو دن اس کے گارڈز کے لیے بہت سخت ثابت ہوتے تھے۔ انہیں ہر آتے جاتے شخص پر نظر رکھنی ہوتی تھی۔ کسی بھی قسم کے ہتھیار کے ساتھ اندر جانے پر پابندی تھی اور اس کے لیے خصوصی اسکینر موجود تھے جو فوراً ہتھیار کی موجودگی کا اعلان کر دیتے تھے۔

فاؤنڈیشن کی میٹنگ کے بعد سجاد احمد جلد ہی وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ آج اس کی بیٹی کی سالگرہ تھی اور اسے جلد گھر پہنچنا تھا۔ وہ راستے میں آن لائن اس کے لیے خریداری کرنا چاہ رہا تھا۔ ساتھ ہی مدثر کو احکامات بھی جاری ہورہے تھے۔

"مدثر صبح فاؤنڈیشن میں کچہری ہے۔ کل کچھ زیادہ لوگ بلائے گئے ہیں۔ ہمارے پاس اس بار فنڈ زیادہ ہے اس لیے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے گا۔ ہمیں صبح دس بجے فاؤنڈیشن پہنچ جانا ہوگا تم ڈرائیور، گارڈز وغیرہ کو مطلع کر دینا' کل میں دفتر نہیں جاؤں گا، ہم سیدھا فاؤنڈیشن جائیں گے وہاں سے واپسی پر مجھے گورنر ہاؤس جانا ہے۔ وہاں سے فراغت کے بعد ہم اسکول کا دورہ کریں گے...... تم نے لکھ لیا نا۔ اس کے سوا اور کوئی مصروفیت تو نہیں ہے میری؟"

"ہے سر...... آپ نے بین الاقوامی ادارے کو انٹرویو بھی دینا ہے کل...... شام کے بعد کا سر...... مجھے اندازہ تھا کہ آپ چھ بجے تک ہی فارغ ہو پائیں گے۔"

"اوکے، ٹھیک کیا، مگر اس کا مطلب ہے کہ ہمیں دوبارہ فاؤنڈیشن جانا ہوگا۔"

"جی سر...... آپ کہیں تو میں اس پروگرام کو اگلے دن پر لے جاؤں، ان کو منع کردوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، نہیں...... کسی کو وقت دے کر منع کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہم کل ہی ان سے مل لیں گے اور انٹرویو بھی ہو جائے گا۔" وہ یہ کہہ کر موبائل کی جانب متوجہ ہوگیا۔ کار سڑک پر بے آواز تیرتی ہوئی اس کے خوب صورت گھر کی جانب جارہی تھی۔ اس نے اپنا اگلے روز کا شیڈول فائنل کر لیا تھا۔ اس پر کس قدر عمل ممکن تھا، یہ البتہ وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ تو صرف مقدر کے علم میں ہی تھا۔ آنے والے کل کو پلان کرنے کی صرف کوشش کی جاسکتی ہے، وہ آئے گا یا نہیں؟ اور اگر آئے گا تو بنائے گئے منصوبے پورے ہوں گے بھی کہ نہیں...... یہ کون بتا سکتا تھا؟

☆☆☆

پرویز کے ٹیسٹ کے نتائج نے شمشیر کا شک درست ثابت کر دیا تھا۔ اس کے خون میں ایک انتہائی زوداثر اور خطرناک نشے کی آمیزش پائی گئی تھی جس کو استعمال کرنے کے بعد چوہا بھی شیر بن سکتا تھا۔ دنیا میں بدترین دہشت گرد

لوگوں کو استعمال کرنے کے لیے اسی کا سہارا لیتے تھے۔
''یہی یقین تھا مجھے۔'' اس نے رپورٹ دیکھ کر کہا۔
''ان غریب لڑکوں کو آلہ کار بنا کر یہ دہشت گردی کی گئی ہے، افسوسناک بات یہ ہے کہ انہیں یہ بتایا بھی نہیں گیا کہ اس کام میں ان کی جانیں جائیں گی...... کام کے بعد پیسا دینے کا وعدہ کیا گیا یعنی مفت میں ان کا خون بہایا گیا اور وہ ایک لڑکا اپنی جان سے بھی گیا۔'' وہ چند لمحوں بعد کھڑا ہو گیا۔
''ہمیں آج ہی اُس مکان تک پہنچنا ہے اس وقت وہ بے پروا ہوں گے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ دونوں لڑکے مارے جا چکے ہوں گے لہٰذا ان تک پہنچنے کے سارے دروازے بند ہیں اور وہ محفوظ ہیں۔''
''جی سر...... پرویز کو کیسے لے جایا جا سکے گا؟'' سینئر انسپکٹر ندیم نے پوچھا۔
''ڈاکٹرز نے اسے لے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ اسے ویسے بھی سامنے نہیں آنا ہے۔ وہ جس ویں میں ہوگا ہمیں وہ مکان دکھا دے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کی شناخت کے لیے اس کی ضرورت پڑے گی۔''
''جی بالکل ٹھیک ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔
پرویز اُن کے ساتھ جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ شمشیر اس کے ساتھ ہی ویں میں موجود تھا۔ اس کی گاڑی کو ایک آفیسر لے کر آ رہا تھا۔ ان کے پہنچنے اور مطلع کرنے کے چند منٹوں بعد ہی موبائل بھی وہاں پہنچ جاتی تا کہ کسی حادثے سے پہلے کی احتیاطی تدابیر مکمل رہیں۔
''تمہیں وہ مکان یاد ہے نا؟'' شمشیر نے ویں میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔
''بالکل یاد ہے سر...... میں اس تک آپ کو بہ آسانی لے جاؤں گا۔'' پرویز نے اعتماد سے کہا اور وہ واقعی ان کو درست مکان تک لے گیا تھا۔
سادہ کپڑوں میں ملبوس شہباز نے مکان کی کال بیل بجائی۔ جواب میں جو چہرہ سامنے آیا، اسے دیکھ کر پرویز نے شمشیر کو دیکھ کر گردن ہلائی۔ اس کا اشارہ پاتے ہی شمشیر بھی گاڑی سے اتر آیا۔
''کیا چاہیے آپ کو؟ کس سے ملنا ہے؟'' گھر سے برآمد ہونے والا اب قدرے بدتہذیبی سے شہباز سے سوال کر رہا تھا۔
''آپ...... آپ درکار ہیں ڈاکٹر صاحب۔'' شمشیر نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔
''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔'' وہ بولا۔
''حالانکہ بات مشکل نہیں تھی۔'' شمشیر نے کہا۔
''آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''
''مگر کیوں؟ کہاں؟ میں نے کیا کیا ہے؟'' اس نے بگڑ کر پوچھا۔
''سوال اب آپ نہیں کریں گے...... یہ ہمارا اسکرپٹ ہے، آپ کو اس کے جواب دینے ہوں گے۔'' وہ مسکرا کر متانت سے بولا۔
''میں ابھی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں، یہ ہراسمنٹ پھیلانے کا طریقہ ہے مگر مجھ سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''
''بکواس بالکل بند۔'' اے ایس آئی شہباز نے آگے بڑھ کر اسے اپنی جانب کھینچا اور پھر وہ اسے موبائل تک لے گئے۔
''یہ آپ نہیں کر سکتے؟ آخر میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ مسلسل بول رہا تھا۔
''آپ نے کیا کیا ہے؟ آپ یہ کیسے پوچھ پاتے ہیں۔ ستّر افراد کی جان لی ہے تم نے، ان کے خاندانوں کو زندہ درگور کر دیا ہے۔'' شمشیر نے دانت پر دانت جما کر کہا۔
اسے انہوں نے موبائل میں ڈالا اور پھر ان کا کارواں تھانے کی جانب بڑھ گیا۔ اے ایس آئی اور وہاں موجود ایک انسپکٹر کے ذمّے ڈاکٹر کے گھر کی تلاشی کا کام تھا۔ شمشیر کو یقین تھا کہ وہاں سے کافی ثبوت حاصل کیے جا سکتے تھے۔
''دیکھیے آپ کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں ایک ذمّے دار شہری ہوں، ڈاکٹر ہوں، اپنے فرائض سمجھتا ہوں۔ میرا اتنے لوگوں کی موت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کسی نے آپ کو غلط انفارمیشن دی ہے، آپ کم از کم مجھے میرے وکیل سے بات تو کرنے دیں۔''
''بالکل کرنے دیں گے...... مگر سب کچھ اب تھانے پہنچ کر ہی ہوگا اور اب اگر آپ خاموشی سے جو کہا جا رہا ہے، وہ کریں تو ہم سب کے لیے آسانی ہوگی۔''
ڈاکٹر کے روانہ ہونے کے بعد شمشیر ویں میں موجود پرویز کی طرف آیا۔ ''پرویز یہ وہی آدمی ہے؟''
''جی سر...... اس نے ہی مجھے اور امجد کو ٹیکے لگائے تھے۔'' پرویز نے پورے یقین سے کہا۔
''ٹھیک ہے، پرویز کو اسپتال لے جاؤ واپس اور احتیاط رکھنا۔'' شمشیر نے ڈرائیور سے کہا اور پھر اپنی گاڑی

کی طرف بڑھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کیس کی تفصیلات کو جاننے کے بعد شہر میں کچھ امن قائم ہو سکے گا۔
انہیں فی الحال اس گرفتاری کو بھی صیغۂ راز میں رکھنا تھا اسی لیے انہوں نے تمام تر کارروائی نہایت خاموشی سے کی تھی۔ شمشیر کی گاڑی کا رخ تھانے کی طرف تھا۔ وہ اس ڈاکٹر سے تمام باتیں جلد از جلد اُگلوا لینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

دلاور شیشے کے سامنے کھڑا تھا مگر شیشے میں نظر آنے والا عکس اس کا نہیں تھا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر پریشان حال شخص نظر آ رہا تھا جس کے سر کے اکثر بال سفید ہو چکے تھے۔ جس کی رنگت جھلسی ہوئی تھی حتیٰ کہ دلاور کی بھوری آنکھیں بھی اس وقت گہرے سیاہ رنگ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اس نے غور سے اپنے عکس کی جانب دیکھا اور پھر ڈبے سے نقلی مونچھوں کو نکالا اور اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ اس ایک مزید تبدیلی کے بعد تو وہ خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔
اس کا منصوبہ بالکل تیار تھا، اس کے لیے ضروری ریسرچ وہ مکمل کر چکا تھا۔ سب سے پہلے اس نے سجاد احمد کے معمولات کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ ہفتے میں دو دن اس تک پہنچنا آسان تھا مگر اس کے لیے بھی کم از کم دو ہفتے قبل ملاقات کا اپائنٹمنٹ لیا جاتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ ضرورت مند فاؤنڈیشن کے دفتر میں رجسٹریشن کراتے تھے اور پھر باری کے مطابق انہیں بلایا جاتا تھا۔ یہی بہترین موقع ہوتا تھا جب خاص طور پر کسی کی آنکھوں میں آئے بغیر اس کے قریب جایا جا سکتا تھا۔ سجاد احمد صبح دس بجے لوگوں سے ملنا شروع کرتا تھا مگر ضرورت مند سات بجے سے ہی وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتے تھے۔
دلاور کا بقیہ منصوبہ بھی بالکل تیار تھا۔ اسے صرف چند لمحوں کے لیے سجاد احمد کے قریب جانا تھا اور اپنا کام کر گزرنا تھا۔ اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر اس میں جھانکا، اس میں روئی اور ٹشو میں لپٹی ایک باریک سوئی موجود تھی، یہ عام سوئی نہیں تھی۔ اس کے سرے پر عام اسکارف پن کے مانند ایک موتی لگا ہوا تھا جو ہلکے سے دباؤ سے دب جاتا تھا اور سوئی سے نکلنے والا خطرناک زہر دوسرے شخص کے جسم میں سرایت کر جاتا۔ اس زہر کی خاص بات یہ تھی کہ یہ اپنے شکار پر فوراً اثر نہیں کرتا۔ سوئی جسم میں لگنے کے کم از کم دس منٹ بعد اس کا اثر شروع ہوتا تھا اور لمحوں میں شکار کی موت واقع ہو جاتی تھی۔ یہ زہر اور سوئی اس کے خاص سامان میں بہت اہمیت کی حامل تھی جسے اس نے ہزاروں روپے کے عوض حاصل کیا تھا۔ اس نے ڈبیا بند کی اور کرتے کی جیب میں ڈال لی۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔ اس وقت یہاں بھی سب گہری نیند سو رہے ہوتے تھے۔ ایسے میں اس کا گیٹ اپ اس کے لیے کوئی پریشانی کھڑی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پتلے کھیس کی بکل بنائی اور سر اور چہرے کو اس میں چھپا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔
گیٹ پر اسے چوکیدار کی موجودگی اور سوال و جواب کی فکر تھی مگر اس وقت وہ گیٹ پر موجود ہی نہیں تھا شاید کسی ضرورت کی وجہ سے وہ اندر گیا تھا۔
دلاور نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اب اس کی منزل فاؤنڈیشن کا دفتر تھا۔ وہ وہاں اپنی کار میں نہیں جا سکتا تھا اس لیے اس نے گزشتہ شام ہی ایک پرانی سی موٹر سائیکل خرید لی تھی۔ وہ کہیں بھی کوئی سراغ نہیں چھوڑتا تھا۔ اسی لیے اس نے کسی دکان پر جانے کے بجائے راہ چلتے ایک پریشان حال شخص کی موٹر سائیکل کا انتخاب کیا تھا۔
''موٹر سائیکل بیچو گے؟'' اس نے اس سے سوال کیا۔
''کیوں بھائی! اس پر تو روزی روٹی چلاتے ہیں بیچ دیا تو کھائیں گے کیا؟'' اس نے بگڑ کر پوچھا۔
''اگر میں دگنے پیسے دوں تب بھی نہیں۔'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔
''دگنے پیسے؟ مگر وہ آپ کیوں دیں گے، یہ تو ایک پرانی سی موٹر سائیکل ہے عام سی۔'' وہ اس بار آرام سے بولا۔
''اصل میں میرے چھوٹے بھائی کے پاس بالکل یہی موٹر سائیکل تھی۔ وہ تو اب دنیا میں نہیں مگر اسے دیکھ کر اس کی یاد آ گئی۔ میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔'' دلاور نے اداسی سے کہا۔
''ارے ارے بھائی...... اللہ تمہاری مدد کرے صبر دے...... میں خود غریب آدمی ہوں ورنہ یہ تمہیں ایسے ہی دے دیتا۔''
''نہیں اس کی ضرورت نہیں...... یہ کتنے کی ہوگی؟''
''بیس بائیس میں نکل جائے گی پرانا ماڈل ہے، باڈی اتنی اچھی نہیں مگر انجن بریک سب بالکل ٹھیک ہیں۔''
وہ اب بیچنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ ''تم نے دگنی قیمت کہا تھا تو چوالیس ہزار بنیں گے، اس سے میں دوسری موٹر سائیکل

لے لوں گا اور بچوں کے اسکول کی فیس بھی ادا ہو جائے گی۔‘‘ اس نے امید بھرے انداز میں کہا۔

’’فیس......؟‘‘

’’ہاں صاحب تین بچے اسکول جاتے ہیں۔ تین ماہ سے فیس ادا نہیں کر پایا...... اسکول والے روز سزا دیتے ہیں۔‘‘ اس نے سر جھکا کر کہا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ دلاور نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالا اور پانچ پانچ ہزار کے دس نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

’’صاحب چھٹا نہیں ہے میرے پاس۔‘‘ وہ نوٹ گنتے ہوئے بولا۔ ’’یہ پانچ ہزار شاید غلطی سے زیادہ آ گئے ہیں۔‘‘

’’نہیں تم یہ رکھ لو۔‘‘ دلاور نے سخاوت دکھائی۔

’’جیتے رہو صاحب، رب بھائی کی مغفرت کرے۔‘‘ وہ دعائیں دیتا رخصت ہو گیا۔

دلاور نے وہ موٹر سائیکل ریسٹ ہاؤس سے کچھ فاصلے پر ایک دکان کے پاس کھڑی کر دی تھی۔ وہ سات بجے فاؤنڈیشن کے دفتر کے باہر پہنچ گیا تھا۔ اس سے قبل وہ ایک ڈھابے پر رکا تھا، جہاں اس نے ناشتا تناول کیا تھا۔ اپنی طرف سے اس نے ہر کام خوب وقت لگا کر کیا تھا۔ چائے کی پیالی ختم کرنے میں بیس منٹ لگائے تھے پھر دھیرے دھیرے موٹر سائیکل چلا کر فاؤنڈیشن پہنچا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے موٹر سائیکل شیڈ کے بیرونی حصے میں کھڑی کی تاکہ واپسی پر اسے کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس سے قبل وہاں ایک نوجوان پہنچ چکا تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے دلاور سے گفتگو کے آغاز کی کوشش کی مگر اس نے چڑچڑے پن سے جواب دے کر اسے ناکام بنا دیا اور خود شیڈ میں موجود بینچ پر جا بیٹھا۔ تقریباً نو بجے کے قریب دفتر کھل گیا تھا۔ اس وقت تک وہاں چالیس سے زیادہ افراد جمع ہو چکے تھے۔ فاؤنڈیشن کے قواعد کے مطابق گھر کا ایک ہی شخص مسئلہ لے کر آ سکتا تھا اسی وجہ سے وہاں عورتوں، بچوں کا رش نہیں تھا۔ پونے دس بجے کے قریب چار گاڑیاں آگے پیچھے وہاں پہنچیں، بڑا گیٹ اُن کے وہاں پہنچنے سے چند منٹ قبل کھول دیا گیا تھا۔ دو گاڑیوں کے بعد والی بڑی گاڑی میں یقیناً اس کا شکار موجود تھا۔ وہ وہاں موجود تمام لوگوں کی طرح گاڑیوں کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور محبت بھرے انداز میں ان گاڑیوں کو اندر جاتے دیکھ رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد اُس کی باری آ گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا اور سجاد احمد کے ملاقات والے کمرے میں داخل ہوا وہاں اس کے علاوہ پانچ چھ افراد اور بھی موجود تھے جن میں سے دو اس کے باڈی گارڈ تھے۔

’’آئیے بابا جی۔‘‘ اس نے ہاتھ کے اشارے سے دلاور کو اپنے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

’’بولیے...... کیا خدمت ہو سکتی ہے آپ کی...... آپ کا رجسٹریشن فارم نظر نہیں آ رہا ہے مجھے......‘‘

’’بیٹا اللہ تمہیں خوش رکھے...... میں کل آیا تھا یہاں...... پتا چلا کہ دو تین ہفتوں بعد میری باری آئے گی، وہاں ایک نوجوان تھا میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو اس نے اپنا ٹوکن نمبر مجھے دے دیا۔‘‘

’’اچھا، اچھا چلیے بتائیے کیا کر سکتے ہیں ہم آپ کے لیے؟‘‘ اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

’’سب کا ایک ہی مسئلہ ہے دو وقت کی روٹی اور عزت کی چھت...... اب کیا بتاؤں بیٹا بہت پریشانی ہے، رکشا چلا سکتا ہوں اگر رکشا مل جائے تو کرایہ بھی دینے کو تیار ہوں۔‘‘ دلاور بہت شاندار اداکاری کر رہا تھا۔ اسے خود اپنے اس ٹیلنٹ کا اندازہ نہیں تھا۔

’’او کے، آپ کے پاس لائسنس ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’نہیں ہے بیٹا مگر بنوا لوں گا۔‘‘ دلاور بولا۔

’’ادریس، بابا جی کا مسئلہ حل ہونا چاہیے۔ لائسنس بنوانے میں بھی جو مدد ہو سکے، وہ کرو میں چاہتا ہوں کہ بابا چند دن میں رکشا چلا رہے ہوں۔‘‘

’’ضرور سر...... میں اس پر کام کرتا ہوں، بابا جی آپ کل دوپہر میں آ کر مجھ سے مل سکتے ہیں۔‘‘ ادریس نامی شخص نے پوچھا۔

’’کیوں نہیں مل سکتا...... میرا تو کام ہے...... زندہ رہا تو ضرور آؤں گا۔‘‘ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اس دوران اس کی انگلیوں نے جیب میں رکھی ڈبیا سے سوئی نکال کر اسے مخصوص انداز میں تھام لیا تھا۔

’’ٹھیک ہے پھر آپ آ جائیں کل...... باس نے کہہ دیا ہے آپ کا کام ہو جائے گا۔‘‘

’’ایک...... ایک درخواست اور ہے؟‘‘ دلاور نے لجاجت سے کہا۔

’’بولیے......‘‘ سجاد احمد اُس کی جانب متوجہ تھا۔

’’میں ایک بار آپ سے گلے ملنا چاہتا ہوں......

بہت تمنا ہے اِس کی...... سب کو بتا سکوں گا کہ ایک فرشتے کو گلے لگا کر آرہا ہوں۔''

''ارے باباجی کیوں شرمندہ کررہے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔ ''آجایئے۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''سر یہ آپ کے سیکیورٹی رولز کے خلاف ہے سر۔'' ایک باڈی گارڈ نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر سجاد احمد نے اسے سرد نگاہوں سے گھور کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''میں صاف ستھرا ہوں بس رنگ ایسا ہوگیا ہے۔'' دلاور نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''آیئے باباجی۔'' سجاد احمد ایک نفیس اور بہت اچھے دل کا مالک تھا، اس جملے کو سننے کے بعد وہ خود آگے آگیا تھا۔ دلاور نے نہایت محبت سے اسے گلے لگا لیا اس دوران اس نے ہاتھ میں پکڑی سوئی اس کے بازو میں چبھودی اور پھر فوراً نیچے گرادی۔

''اوف......'' اس کے منہ سے ایک ہلکی سی کراہ نکلی۔

''کک کیا ہوا بیٹا۔'' دلاور نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''کیا ہوا سر۔'' اس کے ملازمین نے اسے گھیر لیا تھا جس سے وہ سوئی زمین سے غائب ہی ہوگئی تھی۔

''کچھ چبھا تھا مجھے ہلکا سا...... بس ٹھیک ہے اب۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔

''ہائے ہائے میری عقل پر پردہ پڑ گیا خوشی میں......'' دلاور نے فوراً کہا۔

''کیا مطلب......؟'' ان سب کی نظریں اب اس کی جانب تھیں۔ اس نے بوسیدہ کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ٹوٹا ہوا سن گلاسز برآمد کیا جس کی ڈنڈی ٹوٹ کر نکیلی ہوگئی تھی۔

''یہ...... یہ رہ گیا تھا جیب میں...... یہ چبھ گیا ہوگا...... معاف کردیں۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''ارے کیا کررہے ہیں آپ...... کوئی مسئلہ نہیں...... بس آپ کل آکر ادریس سے مل لیجیے گا اور پھر نیا چشمہ بھی خرید لیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جیتے رہیں آپ لوگ۔'' وہ اسی مخصوص چال میں آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے باہر آگیا تھا۔ اس کے حساب کے مطابق اس کے پاس اس منظر سے غائب ہونے کے لیے اب چھ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ باہر پہنچ کر اس نے رفتار تیز کردی اور گیٹ سے نکلنے کے بعد وہ بجلی کی سی تیزی سے موٹر سائیکل کی جانب لپکا۔ چند ہی لمحوں میں وہ اس علاقے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

دلاور کے بعد سجاد احمد بمشکل ایک ملاقات اور کر پایا تھا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، شدید پیاس محسوس ہورہی تھی۔ وہ خود اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''میں ٹھیک محسوس نہیں کررہا ہوں۔'' بالآخر وہ بولا۔

''ڈاکٹر کو بلواؤ۔''

''اوکے سر آپ یہاں لیٹ جایئے۔'' مدثر اُسے صوفے پر لٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے دو باڈی گارڈ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑے تھے۔ باقی لوگ وہیں موجود تھے۔ ملاقات کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا گیا تھا۔

''آپ کیا محسوس کررہے ہیں؟'' مدثر نے اُس کے ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے پوچھا۔

''میرے پورے جسم میں آگ سی لگی ہوئی ہے مدثر...... ایسا مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا۔'' وہ مشکل سے بولا۔

''ہوسکتا ہے کہ بی پی شوٹ کر گیا ہو...... ڈاکٹر صاحب بس پہنچ رہے ہیں۔''

''یہ...... یہ کیا چیز ہے......؟'' ایک باڈی گارڈ نے جھک کر زمین سے کچھ اٹھایا اور اسے غور سے دیکھنے لگا...... سجاد احمد کو صفائی فومینیا تھا اس کے کمرے میں یا راستے میں کسی کچرے یا گند خواہ وہ ذرہ برابر بھی کیوں نہ ہو رہ جانے کا مطلب اس کے غصے کو دعوت دینے کے برابر تھا پھر ایسے میں وہاں سے کچھ ملنا حیران کن بات تھی۔

''کیا ہے مجھے دکھاؤ۔'' مدثر نے آگے بڑھ کر کہا اور غور سے سوئی کی جانب دیکھا۔ جو باڈی گارڈ کو زمین سے ملی تھی۔ اسے اس کو دیکھ کر عجیب سا خیال آرہا تھا۔

''ڈاکٹر کو جلد بلاؤ......'' وہ زور سے چلایا۔ ''باہر ایمبولینس بھی لگادو۔''

اس دوران سجاد کی حالت پہلے سے بہت زیادہ بگڑ چکی تھی۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑتا جارہا تھا اور آنکھیں سکڑ سی رہی تھیں۔ وہ کوشش کرکے بھی کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔

''کیا ہوگیا ہے سجاد صاحب کو...... خیر تو ہے؟'' ڈاکٹر شمس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ ایک بہترین اور تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ سجاد احمد پر نظر پڑتے ہی وہ ساکت سے رہ گئے پھر تیزی سے اس کی جانب بڑھے۔ ابتدائی معائنے کے بعد اس نے مدثر کی جانب دیکھا۔

''کیا ہوا ہے سر کو؟'' مدثر نے پوچھا۔

''مجھے جو اندازہ ہوا ہے، وہ کوئی اچھی اطلاع نہیں ہے۔ ہمیں سر کو فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔'' وہ اپنے بیگ

سے انجکشن نکال کر تیزی سے سرنج میں بھرتے ہوئے بولا۔
''ایمبولینس لگوادی ہے، اسپتال میں تیاری کے لیے فون کر دیتا ہوں میں۔'' مدثر نے کہا۔ ''آپ کی رائے میں کیا ہوا ہے سر کو...... اور یہ دیکھیے یہ سوئی یہاں سے ملی ہے۔''
''اوہ مائی گاڈ......'' وہ چند لمحے سوئی کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''تیزی سے حرکت کریں مدثر...... صاحب کو زہر دیا گیا ہے۔''
''کیا؟'' مدثر چیخ پڑا تھا۔
سجاد احمد اس دوران بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے باڈی گارڈز اسے ایمبولینس تک لے گئے اور اگلے لمحے ایمبولینس تیزی سے اسپتال کی جانب روانہ ہو گئی تھی۔
باہر موجود لوگ سجاد احمد کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔ ایسے میں نہ جانے کس کے ہونٹوں سے یہ بات باہر نکلی اور کچھ ہی دیر میں سوشل میڈیا کی سب سے اہم خبر بن گئی۔
''صاحب کو زہر دیا گیا ہے۔'' باہر موجود لوگوں میں مسلسل چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ لوگ باقاعدہ رو رہے تھے۔ دعائیں کر رہے تھے۔ سجاد احمد پر اس طرح قاتلانہ حملے کی خبر نے پہلے سے غصے میں بھرے لوگوں کو غم و غصے کی تازہ بارش میں بھگو ڈالا تھا۔ ماحول میں ایک نئی تلخی پھیلنے لگی تھی۔
اسپتال میں ڈاکٹرز اس کی جان بچانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ سجاد کے خاندان کے افراد، فاؤنڈیشن کے بورڈ کے ممبران جو کہ خود بھی بہت اعلیٰ سطح کے افراد تھے۔ اسپتال میں موجود تھے۔ اسپتال کے باہر لوگوں کا جمِ غفیر تھا جسے پولیس بڑی مشکل سے کنٹرول کر پا رہی تھی۔
''جی ڈاکٹر میرے بھائی کی حالت کچھ بہتر ہوئی؟'' سجاد احمد کے بڑے بھائی افتخار نے ڈاکٹر کو آئی سی یو سے باہر نکلتا دیکھ کر پوچھا۔
''ہم پوری کوشش کر رہے ہیں' بہترین وسائل استعمال کیے جا رہے ہیں، زہر کا اثر ختم کرنے والی دنیا کی سب سے بہترین دوا انہیں دی جا رہی ہے مگر اب تک کوئی واضح مثبت تبدیلی نظر نہیں آئی۔ ہمیں ایک خوف اور بھی ہے۔ انہیں جو زہر دیا گیا ہے وہ دماغ پر خاص انداز میں حملہ کرتا ہے جس سے یادداشت کے متاثر ہونے کا خطرہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ دماغ کے دوسرے حصوں پر اثر سے کسی بھی قسم کی مستقل معذوری بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سب آپ کے علم میں ہونا چاہیے اس لیے میں آپ کو بتا رہا ہوں۔''
''تم سجاد کے لیے کتنے فیصد صحت یابی دیکھ رہے ہو؟'' انہوں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔
''سوری مگر بمشکل 5 فیصد۔'' اس نے سچائی سے کہا۔
''اوہ میرے خدا۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ''یہ کس ظالم نے ہمیں تباہ کر ڈالا۔ میرا بھائی تو سب کے لیے اچھا سوچتا تھا۔ میں نے کتنی بار اسے سمجھایا بھی کہ زندگی کو کس قدر مشکل بنا رکھا ہے، بزنس پہ توجہ دے اور جس کی مدد کرنا ہے اس کو پیسا بھیج دے خود تو سکون سے رہ مگر اسے خدمت کرنے میں لطف آتا تھا ہمیشہ ایک بات کہتا تھا کہ عبادت کی قضا ہے مگر خدمت کی قضا نہیں ہے، جسے آج کسی چیز کی ضرورت ہے اور ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں کل ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس وہ سب ہم سے بہتر ہو اس لیے خدمت میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ کہے جا رہے تھے۔
''آپ دعا کریں، دعا سب کچھ بدل سکتی ہے۔'' ڈاکٹر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ان کے کندھے کو تھپتھپایا اور دوبارہ آئی سی یو میں داخل ہو گیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں دوبارہ باہر آ گیا۔ اس بار اس کے چہرے پر مایوسی لکھی تھی۔
''کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟'' افتخار احمد نے آگے بڑھ کر پوچھا۔
''ہم انہیں بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔'' اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم سب ایک عظیم انسان سے محروم ہو گئے۔ ہم نے اپنی پوری کوشش کی مگر اس خطرناک زہر پر کسی تریاق نے اثر نہیں کیا۔''
لمحے بھر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ سوشل میڈیا، اخبارات، ٹیلی وژن شوز ہر جگہ اس کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ سجاد احمد کے چاہنے والوں نے شہر میں توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کا صرف ایک مطالبہ تھا انہیں سجاد احمد کا قاتل درکار تھا۔ شہر میں جاری فسادات میں تیزی سے اضافہ ہو گیا تھا۔ سجاد احمد کی بیوی' بھائی اور دفتر سے متعلقہ افراد مسلسل لوگوں کو پُرسکون ہونے کے پیغامات دے رہے تھے مگر عوامی غصے کا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جانے والا ہے۔

☆☆☆

''اگرچہ تم کسی موقع یا رعایت کے قابل نہیں ہو پھر

بھی میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں، شرافت سے سچ بولنے کا۔'' شمشیر نے ڈاکٹر سلمان کو گھورتے ہوئے کہا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ تم کیا چاہتے ہو، دیکھو میں ایک ڈاکٹر ہوں اور میری پہنچ کافی دور تک ہے۔ بہتر ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو۔'' ڈاکٹر سلمان نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ورنہ یہ ساری کارروائی تمہیں اور تمہارے ان ساتھیوں کو مہنگی پڑ جائے گی۔''

''یعنی تم سیدھی طرح سے سچ نہیں بولو گے؟''

''سچ تو بول رہا ہوں، تم شاید اپنی مرضی کا بیان چاہتے ہو...... دیکھو میں صرف یہاں کا شہری نہیں ہوں...... میرے ساتھ دھونس زبردستی نہیں کر سکتے...... مجھے فون کرنے کی اجازت دو، میں اپنے وکیل کو بلوانا چاہتا ہوں......'' وہ بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم سفارشوں کا تانتا باندھ سکتے ہو مگر یہاں تمہیں اس کا موقع نہیں ملے گا...... کسی کو نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو یا کہاں گئے اور ہم جانتے ہیں کہ تم یہاں کیا کررہے ہو۔'' شمشیر غرایا۔

''رحمت ...... لے جاؤ اس کو اور اس کی خاطر تواضع کرو...... تاکہ اس کی حقیقی یادداشت واپس آجائے...... میں سچ سننا چاہتا ہوں اس کے منہ سے۔''

''تم...... تم لوگ یہ نہیں کر سکتے......'' سلمان کے چہرے پر پہلی بار ہلکی سی گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے تھے۔ ''میں تم سے اکیلے میں کچھ بات کر سکتا ہوں......'' وہ دونوں پولیس والوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر بولا۔

''کیسی بات؟ کہو......'' شمشیر کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر اس نے دونوں اے ایس آئی کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ''بولو......''

''دیکھیے آفیسر...... آپ جوان آدمی ہیں، اپنے اچھے مستقبل کا سوچیے...... آپ جو اماؤنٹ کہیں گے میں وہ ادا کرنے کو تیار ہوں آپ اس معاملے کو یہیں ختم کردیں۔''

''کتنی اماؤنٹ دے سکتے ہیں آپ مجھے؟''

''جو آپ کو درکار ہو؟'' وہ تھوڑا مطمئن ہو کر بولا۔

''مجھے ڈالرز میں چاہیے اور پھر میرے اسٹاف کے لیے بھی...... کیونکہ بہرحال یہ معاملہ ان کی معلومات میں بھی ہے۔''

''ڈن...... آپ کے لیے دس ہزار ڈالرز اور اسٹاف کے لیے ایک ہزار ڈالرز کافی ہوں گے۔''

''دس ہزار ڈالرز...... اتنی بڑی رقم آسانی سے بندوبست ہوجائے گا؟''

''بالکل ہوجائے گا اور یہ تو کچھ نہیں۔ اگر ہم ہاتھ ملاتے ہیں تو پھر جو آپ کہیں ہوجائے گا......'' وہ مسکرایا۔

''تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ جو سچ ہے وہ سننا چاہتا ہوں...... اس آفر سے اپنی اصل حقیقت خود کھول دی ہے تم نے...... ایک بات یاد رکھو، ہر شخص بکاؤ مال نہیں ہوتا......''

شمشیر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''رحمت......'' وہ دہاڑا۔

''جی جی سر......'' وہ شاید دروازے کے ساتھ ہی لگا کھڑا تھا۔

''لے جاؤ اِس دولت کی کان کو...... جب یہ سچ بولنے لگے تو مجھے بتا دینا......''

''یہ آپ غلط کررہے ہیں...... میری بات تو سنیے......'' سلمان نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر دونوں اے ایس آئی اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

دو گھنٹوں بعد جب شمشیر نے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا تھا، وہ اسے واپس لے آئے تھے۔ اس کی حالت ان دو گھنٹوں میں ہی تباہ ہوچکی تھی۔ اس کی ناک سوجی ہوئی تھی اور چہرے پر سرخ نشان نظر آرہے تھے۔

''کیا ہوا؟ کچھ بتایا صاحب نے؟'' شمشیر نے بے پروائی سے پوچھا۔

''جی سر، کچھ نہیں کافی کچھ بتا دیا۔'' رحمت نے کہا۔ ''ابھی آپ کو بھی بتائے گا۔''

''ٹھیک ہے...... بیٹھو ڈاکٹر صاحب! اگرچہ کہ ڈاکٹر کہنا اس عظیم پیشے کی توہین ہے، کس کے لیے کام کررہے ہو اور کب سے؟''

''پہلے را کے ساتھ کر رہا تھا مگر آج کل ایک اور ایجنٹ کے لیے کر رہا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں بھی کبھی کسی مشن میں کوئی خاص کام ہو تو کرتا ہوں......''

''آہم...... خاص آدمی جو ہو تم۔'' شمشیر نے کہا۔ ''اس دھماکے میں کیا کام کیا تھا؟''

جواب میں وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ ''بتاؤ۔'' شمشیر نے دوبارہ کہا۔

''یہ...... یہ دھماکا فون کے ذریعے ہوا تھا۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''اس میں دو لڑکوں کو فون دے کر بھیجا گیا تھا۔ لڑکے اور سامان جمہر لایا تھا، میں نے تو صرف انہیں انجکشن لگائے تھے۔''

''کیسے انجکشن؟'' شمشیر نے پھر پوچھا۔

''نشے کے...... خاص نشے کے۔ اس سے انسان کچھ

بھی کر جاتا ہے۔ اگر اُسے کسی کے قتل کا حکم دو تو وہ بھی کر آتا ہے۔''

''ان لڑکوں کو مشن کے بارے میں معلوم تھا...... جانتے تھے کہ وہ مرجائیں گے؟''

''نن...... نہیں...... ان کو نہیں بتایا تھا۔''

''تمہارے بچے ہیں؟'' شمشیر نے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''جی دو بچے ہیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔''

''خوب، یہاں ہیں یا باہر بھیج دیے؟''

''باہر ہیں، پڑھ رہے ہیں۔'' وہ بولا۔

''اگر انہیں پکڑ کر انہیں بھی کسی ایسی واردات میں استعمال کرلیا جائے تو...... وارداتیں تو وہاں بھی ہوتی ہیں اور میرے وہاں بہت دوست موجود ہیں پتا، یونیورسٹی وہ سب تم سے پوچھ لیں گے۔'' شمشیر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''نن نہیں، خدا کے لیے نہیں، ان کا اس سب سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو یہ سب جانتے تک نہیں ہیں، ان پر رحم کریں۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''سلمان صرف اس خیال سے اتنے پریشان ہوگئے اور کسی غریب کی اولاد کو مزے سے قربانی کا بکرا بنالیا۔'' اس جواب پر اس کا سر جھک گیا تھا۔

''یہ جیمز کون ہے؟ مجھے اس کا پتا، فون نمبر سب درکار ہے۔''

''مم میں دے دوں گا...... مگر میرے بچوں کو اس بارے میں معلوم نہ ہو۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔ ''میرا فون آپ کے لوگوں کے پاس ہے، اس میں نمبر موجود ہے۔''

''میں یہ گارنٹی نہیں دے سکتا ہاں تمہاری سطح تک گر نہیں سکتا۔'' شمشیر بولا اور رحمت کو فون لانے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں میں اس کا جدید آئی فون میز پر پڑا ہوا تھا۔

''اسے تم خود فون کرو گے اور اسے فوری طور پر ملنے کو کہو گے اس کی جگہ یا تمہارا گھر...... سمجھ گئے نا...... کہنا زیادہ تفصیل فون پر نہیں بتا سکتے۔'' شمشیر نے کہا۔ ''اور اگر تم نے ذرّہ بھر بھی چالاکی دکھائی تو پھر جو تمہارے اور تمہارے بچوں کے ساتھ ہوگا، تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' شمشیر نے سرد لہجے میں کہا۔

''میں سمجھتا ہوں۔ میں ایسا کچھ نہیں کروں گا...... آپ یقین کریں۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کا سارا غرور، اکڑ نکل چکی تھی۔

''چلو ملاؤ فون......'' اس نے فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' سلمان نے میز پر رکھا فون اٹھایا اور اس پر چڑھے قیمتی کور کو اتارنے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟'' شمشیر نے پوچھا۔

''اس کا نمبر یہاں چھپی ہوئی دوسری سم میں ہے اس کو نکال کر لگانا ہوگا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' شمشیر نے کہا۔ اس کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

سلمان نے کور کو کھولا تو فون پر ایک لمبی سی پٹی چپکی ہوئی تھی جس کے اندر ایک سم نظر آرہی تھی۔ اس نے اس پٹی کو فون سے کھینچا۔

''یہ دیکھیے اس میں ہے سم......'' اس نے شمشیر کے قریب کرکے اس پٹی کی تہ کو کھولا۔ تہ کھلتے ہی شمشیر کا دماغ گھوم گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اعصاب شل ہو رہے ہوں، اس نے سر جھٹک کر سلمان کی جانب دیکھا جو ناک کو دو انگلیوں سے دبائے تضحیک آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شمشیر نے رحمت اور دوسرے اے ایس آئی کی جانب دیکھا، وہ دونوں دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر لڑھک گئے تھے۔ خود شمشیر کا ذہن بھی کام نہیں کر رہا تھا مگر اس نے فوری طور پر سانس روک لی تھی۔ چند لمحوں بعد سلمان نے ناک سے ہاتھ ہٹا کر قدرے پیچھے ہو کر سانس لی اور کھانستے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کی باڈی لینگویج بالکل تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک اور نفرت اُمڈ رہی تھی۔ شمشیر کرسی پر گرا ہوا سا تھا اب اس کی طاقت قدرے بحال ہو رہی تھی، اگر وہ لمحے کے سوویں حصے میں سلمان کی جانب نہ دیکھ لیتا تو شاید وہ بھی سانس نہ روک پاتا اور اس وقت رحمت وغیرہ کے ساتھ بے ہوش پڑا ہوتا۔ رات کے اس پہر میں تھانے میں نفری بالکل کم تھی، ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سلمان آگے بڑھا اور اس نے رحمت کے ہولسٹر میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا اور اس کا رخ رحمت کی جانب کرنے ہی والا تھا کہ شمشیر اپنی جگہ سے ہلا اور بجلی کی طرح سلمان پر کودا۔ اس غیر متوقع حملے نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر رگڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا تھا جبکہ اس کی گردن شمشیر کے بازوؤں کی گرفت میں آگئی تھی۔ اس نے اس کی گردن پر گرفت کو مزید تنگ کیا تو سلمان نے تڑپنا

شروع کر دیا۔ یوں بھی وہ جسمانی طور پر مضبوط نہیں تھا ہاں مکاریوں میں یقیناً سرفہرست تھا۔

''تم ہمیں ہماری ہی جگہ پر احمق بناؤ گے...... ہمارے لوگوں کا خون بہاؤ گے اور ہم تمہیں چھوڑ دیں گے؟'' وہ غرایا۔ ''تم نے کیا سمجھا تھا خود کو؟'' اس نے اسے چھوڑا تو وہ زمین پر جا گرا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی گردن پر تھے۔ اب اس کی آنکھوں سے حقیقی خوف جھلک رہا تھا۔

☆☆☆

ابراہام اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس کا خصوصی ٹرانسمیٹر نما آلہ اس کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ یہ ایک مخصوص قسم کا کمیونیکیٹر تھا اس کی خاص خوبی اس کا کسی بھی آلے کے ذریعے ٹریس نہ ہونے کی خصوصیت تھی۔ دوسرے اس پر گفتگو کے دوران بھی اگر کوئی بیرونی آلہ خاموش مداخلت بھی کرتا تو یہ اس خطرے کا اعلان کر دیتا تھا۔ اس پر سے وہ ٹرانسمیٹرز، موبائل، لینڈ لائن، آن لائن ہر انداز سے گفتگو کر سکتا تھا۔

اس وقت وہ ٹرانسمیٹر پر زورین سے بات کر رہا تھا۔ اس کے ماتھے کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس گفتگو سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھا۔

''جی سر...... میں غضنفر کی بات کر رہی ہوں، سردار صاحب کے بعد ہم نے اسے ہائر کیا اور وہ یہاں ہمارا خاصا ذمے دار آدمی تھا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ غضنفر غائب ہے۔''

''غائب کہاں...... یعنی وہ خود کہیں چلا گیا ہے؟'' ابراہام نے پوچھا۔

''نہیں گیا نہیں ہے سر لے جایا گیا ہے۔'' وہ ڈرامائی انداز میں بولی۔ ''میڈم نے اُس لڑکی کو لانے کا حکم دیا تھا جس کی وجہ سے ہمارا یہاں کا سارا سیٹ اپ خراب ہوا تھا۔ تاشی اور بقیہ سب کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔''

''تو......''

''میڈم نے غضنفر کے ذمے اسے لانے کی ذمے داری لگائی تھی۔''

''اچھا۔''

''سر آپ سن رہے ہیں نا......؟'' زورین نے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ سن رہا ہوں اور اندازہ ہو رہا ہے کہ ہمارا کام وہاں اتنا سست کیوں ہے۔'' وہ غرایا۔ ''میں نے تم سے کہا ہے کہ مجھے پوری تفصیل سے آگاہ کرو۔''

''سر غضنفر اور دلاور کو وہ لڑکی کہیں مل گئی تھی اور انہوں نے اس پر قابو پا کر اسے اٹھا لیا تھا، یہ وہی دن تھا سر جب مجھے انڈر گراؤنڈ ہونے کا حکم ملا تھا اور مجھے انڈر گراؤنڈ کیا گیا تھا۔ میڈم کے غائب ہونے کی وجہ سے...... انہوں نے مجھے بہت فون کیے، ہمارے دفتر تک گئے مگر وہ بند تھا اس کے بعد وہ اسے کسی اور جگہ لے گئے۔''

''زورین میں تفصیل سننا چاہ رہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ کہیں کوئی کڑی میری نظروں سے پوشیدہ رہ گئی ہے تب ہی ہم مریم کو نہیں ڈھونڈ پا رہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم مجھے لمحہ بہ لمحہ رپورٹ دو، نتیجہ بتاؤ وہ لڑکی کہاں ہے اب؟''

''سر وہ اسی رات فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی، اس بات کا علم مجھے بھی آج ہی دلاور سے بات کر کے ہوا ہے۔ اس کے کامیاب اغوا کے بعد غضنفر نے میرے نمبر پر بہت کالز کیں مگر وہ بند تھا۔ میڈم بھی نہیں تھیں۔''

''فرار ہو گئی؟''

''جی سر، اس سے خراب بات یہ ہوئی کہ وہ غضنفر کو بھی اٹھا کر لے گئی۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ہماری ٹیم میں اس قدر نالائق افراد شامل ہیں۔'' ابراہام غرایا۔

''سر غضنفر اور دلاور دونوں تیز اور بہترین کام کرتے ہیں مگر وہ لڑکی شروع سے ہمارے لیے مسئلہ بنی ہے، تاشی اس کی وجہ سے نظروں میں آئی۔ اس کے بعد ہمارا دوسرا اہم آدمی خفیہ ایجنسی کے ہاتھ لگا جسے مجبوراً دلاور کو قتل کرنا پڑا...... میڈم اسی لیے اسے پکڑنا چاہتی تھیں۔''

''کیا تم کوئی فلم کی کہانی سنا رہی ہو مجھے...... اس وقت تو پوری ٹیم تھی اور تم اس ایک لڑکی پر قابو نہیں پا سکیں۔'' وہ دہاڑا۔

''تاشی کو اغوا کیا گیا تھا نا، کیا اس میں بھی اُس کا ہاتھ تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''جی سر...... مگر پھر وہ خفیہ ایجنسی کے قبضے میں تھی...... یعنی اس لڑکی کا خفیہ ایجنسی سے تعلق ہے۔''

''کسی سے بھی تعلق ہو، اگر اسے پہلی بار میں نشانِ عبرت بنا دیتے تو کوئی راستے میں نہ آتا۔'' وہ تیزی سے بولا۔ ''مجھے اس بارے میں کوئی رپورٹ نہیں کی گئی۔''

''سر میڈم نے کہا تھا کہ وہ دیکھ لیں گی۔''

''میں اسے تمہاری غلطی شمار کروں گا۔ تم لوگ اپنا کام ٹھیک سے نہیں کرتے، اس کی کوئی تصویر ہے تمہارے پاس؟''

''نن نہیں سر...... ہاں سر......''

''کیا بکواس ہے۔'' وہ چلّا اٹھا۔

''میرا مطلب ہے سر غضنفر نے اُس کی ایک ویڈیو بنائی تھی وہ اس نے مجھے اسی روز بھیجی تھی مگر میں دیکھ نہیں پائی تھی۔'' وہ ہکلا کر بولی۔

''یعنی وہ تمہارے فون میں ہے؟''

''جج جی سر۔''

''ٹھیک ہے، وہ فون تمہیں ابھی مل جائے گا، مجھے وہ ویڈیو فوراً چاہیے، ویڈیو بھجوا کر فون واپس بند ہو جانا چاہیے۔''

''مم میں ایسے ہی کروں گی سر۔'' الفاظ اس کے ہونٹوں پر ہی تھے کہ فون بند ہو گیا۔ زورین نے گہری سانس لے کر موبائل میز پر رکھا اور پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

☆☆☆

کریم ڈیوڈ عرف بابا کی گرفتاری کے بعد سے نہایت مصروف رہا تھا۔ ڈیوڈ کا پکڑا جانا ہی ایک بڑی کامیابی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اس سے بہت کچھ اُگلوا سکتے تھے مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ اس نے کسی بھی مرحلے سے گزرنے سے قبل ہی خودکشی کر لی تھی۔ گرفتاری کے بعد خفیہ مقام پر پہنچانے سے قبل اس کی اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی مگر تلاشی کے دوران ہی وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور چند ہی لمحوں میں اس کے ہونٹوں سے جھاگ نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ جب تک کریم وہاں پہنچا، وہ ختم ہو چکا تھا۔

''یہ ہوا کیسے؟'' ڈیوڈ کی موت سے اُسے کافی دھچکا لگا تھا۔ ان کی محنت ضائع ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس کی کسٹڈی میں موت ان کی کارکردگی کے لیے بھی سوال تھا۔

''سر معلوم نہیں...... وہ یہاں آیا تب سے موت تک اس نے صرف ایک ہی جملہ بولا تھا۔''

''وہ کیا؟'' کرنل جاوید نے بے اختیار پوچھا۔

''یہ کہ تم مجھ سے کچھ نہیں جان پاؤ گے...... میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا۔'' کیپٹن احمد نے مایوسی سے کہا۔

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے اس کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔'' وہ سر جھکا کر بولے۔ ''آپ جانتے ہیں کہ مجرم جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اس کی باتوں میں اتنا ہی جھوٹ ملتا ہے، میں نے سوچا کہ تفتیش سے بچنے کے لیے وہ یہ سب کہہ رہا ہے۔''

''سوال ایک اور بھی ہے، اس کی مکمل تلاشی لی گئی

اتنی بار کہا ہے کہ دفتر جاتے وقت پیچھے سے کچھ نہ کہا کرو
کتنا منحوس دن گزرے گا آج......

تھی۔ اس کے پاس زہر کہاں سے آیا؟'' کریم نے پوچھا۔

''سر معلوم نہیں، یہاں آنے کے بعد تو اس نے سوائے پانی کے کچھ نہیں پیا۔'' اس نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت سائنائڈ سے ہوئی تھی جو کہ نہایت تیزی سے اثر کرنے والا زہر تھا۔ جس کا ایک خصوصی کیپسول اس کی ڈاڑھ میں بنائی گئی ایک خصوصی درز میں موجود تھا۔ جو شاید اس قسم کی صورت میں استعمال کے لیے ہی اس کے منہ میں رکھا گیا تھا۔ جب اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ مکمل طور پر پھنس چکا ہے اور اب اس کے لیے یہاں سے فرار ممکن نہیں تو اس نے اس کا استعمال کیا۔''

ڈیوڈ کی موت کے بعد اس کے خاص کمرے اور فون سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں انہوں نے اردگرد کے کئی شہروں میں موجود موساد کی ٹیم کو توڑ ڈالا تھا۔ ان میں سے کچھ غائب ہو گئے تھے اور کچھ ان کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ انہیں یقین تھا انہیں دوبارہ ایسا سیٹ اَپ بنانے میں کئی سال لگ جائیں گے۔ ان کی ٹیم جانتی تھی کہ ان کارروائیوں کا کچھ نہ کچھ نتیجہ سامنے آئے گا مگر کب، کہاں اور کیسے کے جواب ان کے پاس نہیں تھے۔ یہ بم دھماکے گویا اس کا جواب تھے۔

انہیں پورے آپریشن کے دوران سب سے زیادہ مزاحمت ڈیوڈ کے علاقے سے ملی تھی۔ جہاں تمام تر تفصیلات جاننے کے بعد اکثر لوگ بابا جی کے پرستار تھے اور اس کی موت کے بعد بھی روزانہ اس کے گھر کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ وہاں فراہم کیے جانے والے مفت شربت میں اس محبت کی بنیادی وجہ موجود تھی۔ کرنل جاوید نے اس کا لیب میں ٹیسٹ کروایا تھا۔ تب ہی انہیں علم ہو پایا تھا کہ اس شربت کے ذریعے اس پورے علاقے کو نشے کا عادی بنایا جارہا تھا۔ اب جب وہ شربت نہیں مل رہا تھا تو ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

''کیوں شہزاد تم یہ خاص شربت تیار کراتے تھے اپنے لوگوں کو نشے کا عادی بنانے کے لیے......'' کریم نے ڈیوڈ کے منشی شہزاد سے پوچھا۔

وہ جواب میں بالکل خاموش رہا تھا۔ ڈیوڈ کی موت کے بعد اس سے ہی بہت سی اہم معلومات حاصل ہوئی تھیں اور اُسے کڑی نگرانی میں رکھا جارہا تھا۔

کرنل جاوید اور کریم وغیرہ نے علاقے میں فوری طور پر ایک طبی یونٹ کی تعیناتی کی درخواست دی تھی جس پر فوری عمل درآمد ہو گیا۔ اس کا کام نشے کے عادی ہو جانے والے افراد کا علاج تھا تا کہ کسی ممکنہ انسانی المیے کا شکار نہ ہونا پڑے۔

☆☆☆

''مم، میں جیمز کو فون کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' سلمان خوف زدہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''مجھے مت مارنا...... جو تم کہو گے وہی کروں گا میں۔''

''وہ تو تمہیں کرنا ہی ہے۔'' شمشیر غرایا اور اس کے پیٹ میں ایک ٹھوکر رسید کی جس کے جواب میں وہ اوغ کی کریہہ آواز نکال کر دہرا ہو گیا تھا۔

شمشیر نے اس کے بعد گھنٹی بجائی۔ جواب میں انسپکٹر رضوان اور ایک سپاہی ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

''اوہ...... یہ کیا ہو گیا سر......'' وہ کمرے میں آکر ٹھٹک سے گئے۔

''ان دونوں کو ہوش میں لاؤ۔'' شمشیر نے سرد لہجے میں کہا اور دوبارہ سلمان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''کھڑے ہو جاؤ سیدھے۔'' وہ دانت پر دانت جما کر بولا۔ ''اب تمہارے پاس کوئی دوسرا موقع نہیں ہوگا۔'' اس نے اپنی پسٹل نکالی اور سلمان کے سر پر رکھ دی۔

''جو آپ کہیں گے میں وہی کروں گا۔'' وہ بمشکل بولا۔ خوف نے لمحے بھر میں اُس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔

''رضوان ہمیں ٹریسنگ سسٹم سے جڑنا ہے فوراً انتظام کیجیے۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''او کے سر۔'' اس نے سیلیوٹ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ دونوں اے ایس آئی کو ہوش آگیا تھا۔

تھوڑی دیر میں سلمان کو کال ملا کر دے دی گئی تھی۔

''رضوان اس کے سر پر یہ گن رکھ دو، اگر یہ ذرّہ بھر بھی گڑبڑ کرے تو ٹریگر دبا دینا......'' اس نے انسپکٹر رضوان سے کہا اور پھر سلمان کی جانب چہرہ گھمایا۔

''ہیلو...... جی ڈاکٹر...... خیریت ہے؟'' دوسری جانب سے جیمز کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو کیسے ہیں آپ؟''

''جی میں ٹھیک ہوں میرے پاس ایک بڑی خبر ہے اور میں آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔''

''اس وقت...... کیا ہم صبح نہیں مل سکتے؟''

''مل سکتے ہیں مگر اس سے نقصان ہو سکتا ہے اسی وقت ملنا ضروری ہے۔''

''او کے تو تم کیا چاہتے ہو، میں تمہارے پاس آؤں؟'' اس نے بادلِ ناخواستہ پوچھا۔

''جیسا مناسب ہو...... ورنہ میں آجاتا ہوں۔'' سلمان نے شمشیر کے اشارے کے مطابق کہا۔

''نہیں، میرا خیال ہے کہ میں آجاتا ہوں...... بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔'' ان الفاظ کے ساتھ اس نے کال کاٹ دی تھی۔

''کچھ معلوم ہوا؟'' شمشیر نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

''نن نہیں سر...... یوں لگ رہا ہے جیسے وہ کوئی خاص ڈیوائس ہے کیونکہ اسے ٹریس نہیں کیا جاسکا ہے۔'' اس جواب پر اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

''ہمیں فوراً اسی مکان پر واپس جانا ہے وہاں ہمارا ایک اور مہمان آنے والا ہے۔ اس کے سواگت کی تیاری مکمل ہونی چاہیے۔''

''یس سر......'' انسپکٹر نے اسے سیلیوٹ کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

پندرہ منٹ سے بھی کم وقت میں وہ سلمان کے مکان پر پہنچ گئے تھے۔ سلمان ان کے ہمراہ تھا۔ گاڑیوں کو عقبی سڑک پر پہنچا دیا گیا انہیں اب جیمز کی آمد کا انتظار تھا۔

جیمز وقت پر پہنچ گیا تھا۔ سلمان اُسے دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''آؤ جیمز بیٹھو......'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''موضوع پر آیئے آپ نے مجھے اس وقت اتنی ایمرجنسی میں صرف بیٹھنے کے لیے تو نہیں بلایا ہوگا۔''

''نہیں...... ایسا نہیں ہے، آپ کو یہاں ملنے کے لیے بلایا گیا تھا اور وہ بھی ہم سے۔'' کریم کی آواز پر وہ اچھل سا پڑا تھا۔

''یہ کیا ہے......تم نے میرے لیے جال بچھایا؟'' اس نے سلمان کو گھورا۔

جواباً وہ اُسے مجبوری بھرے انداز میں دیکھ کر خاموش رہا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس جارہے تھے۔ اس بار اُن کے ساتھ جیمز بھی موجود تھا۔ شمشیر نے اس سے اس کے ہتھیار، فون وغیرہ لے لیا تھا۔ اس کے اور سلمان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں موجود تھیں اور ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔

☆☆☆

سونیا کی آنکھ سویرے ہی کھل گئی تھی۔

وہ آج خاصی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں مسلسل کچھ تصویریں بن اور مٹ رہی تھیں۔ کچھ الفاظ اور مناظر بار بار آ اور جا رہے ہیں الجھن یہ تھی کہ ان میں سے کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ سب کچھ ایک دھند کے میں لپٹا ہوا تھا اور یہ ادھوری سوچ یا خیال اسے مسلسل پریشان کر رہا تھا۔ یہاں اس گھر میں اس کا بہت خیال رکھا جارہا تھا۔ اتنے ملازمین کے باوجود وہ اولڈ مین دن میں کئی بار اس کی طبیعت پوچھنا نہیں بھولتا تھا۔ اسے ہر چیز دستیاب تھی۔ اسے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ وہ اسے کوئی اور سمجھ رہے تھے اور اس سے پہلے کہ انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کا خیال غلط تھا، وہ اس سے قبل ہی وہ سب کچھ یاد کر لینا چاہتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ اس کے اپنے ہاتھ میں بھی نہیں تھا۔

کافی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ ڈائننگ ایریا سے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ لوگ شاید ناشتا کر رہے تھے۔ لاؤنج کی جانب جانے سے قبل اسے بابا کا کمرا نظر آیا اور وہ غیر شعوری طور پر اس کی طرف بڑھ گئی۔ کمرا خالی تھا، وہ اندر چلتی چلی گئی۔ کمرا سادہ مگر خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ ماحول میں دھیمی دھیمی سی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ بابا کے بیڈ سائڈ پر ایک کتاب رکھی تھی۔ اس نے کتاب اٹھا کر دیکھا، وہ تصوف کے موضوع پر تھی۔ اس نے کچھ صفحات پلٹے اور پھر کتاب کو اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ دوسری جانب والی بیڈ سائڈ کی دراز تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے دراز میں جھانکا تو وہاں ایک ریوالور نظر آیا۔ اس نے بے ساختہ اسے باہر نکال لیا۔ یہ روگر ایل سی آر تھا۔ خوب صورت کمیاب اور بہترین کارکردگی کا حامل......اس نے اس کا جائزہ لیا اس میں پوری آٹھ گولیاں بھی موجود تھیں۔

''وہ یہ سب کیسے جانتی ہے؟'' اس سوال نے اس کے بکھرے ذہن کو اور اُلجھا دیا تھا۔ یقیناً وہ ہتھیاروں کے بارے میں بہت جانتی تھی۔ اس نے ریوالور کو ہاتھ میں پکڑا اور نشانہ لگانے والی پوزیشن بنائی۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر سا لہرایا۔ منظر میں ایک لڑکی شیشے کے ایک کھلے باکس میں کھڑی تھی۔ اس کے کانوں پر ہیڈ سیٹ تھا اور وہ داہنی ہاتھ میں ریوالور تھامے دور ایک نشانے پر گولیاں چلا رہی تھی۔ منظر میں اب اس کا نشانہ تھا۔ یہ ایک شخص کی تصویر کا کٹ آؤٹ تھا۔ وہاں صرف ایک یہ ہی کٹ آؤٹ نہیں تھا۔ بلکہ وہاں موجود پانچوں کٹ آؤٹ پر وہی ایک تصویر تھی۔ اس نے غور سے تصویر کو گھورا۔ اسے یہ چہرہ بہت جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ اچانک اسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ چونک کر حال میں واپس آگئی۔ اس نے ریوالور کو بیڈ سائڈ پر رکھا بستر کے اسی جانب تکیے کے پاس ایک چھوٹا سا فریم الٹا پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فریم اٹھایا۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ فریز سی ہو گئی تھی۔ اس تصویر میں وہ نشانے والا چہرہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک انتہائی خوب صورت عورت تھی جس کی گود میں ایک بہت چھوٹی سی بچی تھی۔ اس عورت کا چہرہ خود اس سے بہت زیادہ مل رہا تھا، اسے تو پہلی نظر میں لگا جیسے وہ، وہی ہو مگر وہ اس کی تصویر نہیں تھی۔ اس تصویر میں وہ دونوں بہت پیار سے مسکرا رہے تھے جبکہ بچی اپنی دنیا میں مگن اپنی ماں کے بالوں سے کھیل رہی تھی۔

''شاید یہ لوگ مجھے یہ سمجھ رہے ہیں۔'' اس کے ذہن میں آنے والا پہلا خیال یہی تھا مگر اس خیال کے بعد اس کے ذہن کی اسکرین پر پھر نئے منظر چلنے لگے تھے۔ تصویر والی اس عورت کی اس نے اور تصویریں بھی دیکھی تھیں' کہاں؟ یہی وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی، یہ عورت اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ بس وہ اسے یاد نہیں کر پا رہی تھی اور یہی چیز اسے پاگل بنا رہی تھی۔ اسے اس عورت کی ایک اور تصویر یاد آگئی جو اس نے کہیں دیکھی تھی مگر اس تصویر میں وہ اس طرح، اس قدر پیار سے مسکرا نہیں رہی تھی۔ اب وہ

دوسری تصویر اس کے سامنے تھی۔ وہ تصویر اس نے کب اور کہاں دیکھی تھی، یہ سوال اسے چکرا رہا تھا۔ ”یہ بچی......“ اس نے پہلی بار بچی کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ غور سے دیکھنے پر اسے وہ بھی بہت جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ ”یہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا؟“

”سب کچھ ایسے لگ رہا تھا جیسے اُس کے سامنے ہو۔“

”جیسے وہ ہر چیز کو جانتی ہو۔“

مگر کچھ بھی صاف نظر نہ آ رہا ہو۔ جیسے وہ گہرے پانی میں غوطے کھا رہی ہو، ہاتھ پیر مار کر باہر آنے پر اسے زندگی قریب لگتی تھی مگر پھر... وہ دھندلکا اسے گہرے پانی کا اسیر بنا دیتا تھا...... اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ تصویر اس کے ہاتھ سے پھسل کر بستر پر جا گری تھی مگر اس کی آنکھیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا ذہن مسلسل کام کر رہا تھا۔ اس بار اس کے تصور میں ایک میز آئی تھی۔ وہ ایک بہت خوب صورت اور قیمتی میز تھی، اس میز کی دوسری دراز میں اسی عورت کی وہ دوسری تصویر تھی۔ جس میں وہ خاموش اور افسردہ نظر آ رہی تھی۔ اسے دراز کھولے بغیر ہی یہ سب نظر آ رہا تھا اتنے میں دو ہاتھوں نے اس دراز کو کھولا، اس میں سے وہ تصویر نکال کر کسی کو دی، اب وہ ان دونوں کو دیکھ سکتی ہے، ایک پچاس سال کے لگ بھگ شفیق عورت اور دوسری ایک لڑکی...... اس نے لڑکی کو غور سے دیکھا...... وہ ان دونوں سے بھی واقف تھی۔ بس اسے وہ یاد نہیں آ رہے تھے، اس نے بے بسی سے سوچا۔

”دیکھو میری...... بیٹی یہ ہے ہماری مریم......“ وہ شفیق آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ”تمہاری ماں...... کتنا ملتی ہیں تم سے...... یوں لگتا ہے جیسے وہ تمہارے وجود میں واپس آ گئی ہو۔“

”ماں......“ اس کے ذہن نے اس لفظ کی گردان شروع کر دی۔ ”کیا یہ اس کی ماں کی تصویر ہے؟“ اب یہ سوال اس کے گرد رقص کر رہا تھا۔

اچانک دو بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں نے اس بچی کے ہاتھ سے وہ تصویر چھین لی۔

”یہ...... یہ کہاں سے آئی تمہارے پاس؟“ ایک درشت لہجہ اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا۔ وہ لمبا چوڑا، گوری رنگت اور بھاری جسامت والا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر شدید غصہ تھا اور وہ اپنی شرربار نگاہوں سے اس لڑکی کو گھور رہا تھا۔ سونیا کو لمحہ بھر کے لیے یہ محسوس ہوا جیسے وہ اسے ہی گھور رہا ہو۔

”سر...... یہ اس میز میں سے نکالی ہے بے بی نے......“ وہ عورت سر جھکا کر دھیرے سے بولی۔

”تم اس کا خیال نہیں رکھتیں۔ یہاں وہاں جانے کی ضرورت کیا ہے؟“ اس نے وہ تصویر میز پر ڈال دی۔ ”آئندہ مجھے یہ تصویر نظر نہ آئے...... میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

”ڈیڈ......“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ اس کیفیت میں بھی اس کے دل میں اس کے لیے اچھے جذبات نہیں تھے۔ وہ کبھی بستر پر گری تصویر کو دیکھ رہی تھی اور کبھی آنکھیں بند کر لیتی تھی جہاں تصور اسے ایک الگ ہی کہانی دکھا رہا تھا۔ اچانک اسے سب کچھ ڈولتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ تصور اور حقیقت ایک ہو گئے تھے۔ وہ شخص اس کے سامنے کھڑا دہاڑ رہا تھا پھر اس خوب صورت مسکراہٹ والے چہرے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ چند لمحوں بعد چاروں جانب اطمینان، سکون اور آشتی بھرا اندھیرا چھا گیا تھا۔

☆☆☆

جیمز، زورین کو فون دے کر روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے اس کے جانے کے بعد فون آن کیا اور اس ویڈیو کو کھولا۔ وہ لڑکی دیکھنے میں تو دبلی پتلی خوب صورت سی لڑکی تھی۔ اس ویڈیو میں وہ کسی شخص کے ساتھ کہیں جا رہی تھی اور واضح طور پر وہ اس شخص سے زیادہ حیثیت کی مالک تھی کیونکہ وہ اس کے ساتھ بہت ادب کے ساتھ پیش آ رہا تھا اُن کے گاڑی میں بیٹھنے تک اس تصویر میں ایک اور صاحب بھی موجود تھے جو شاید اس لڑکی کے والد ہو سکتے تھے۔ وہ اس عمر میں بھی نہایت اسمارٹ اور ہینڈسم نظر آ رہے تھے۔ اس نے ویڈیو دیکھی پھر اسے ابراہام کے نمبر پر سینڈ کر دیا ساتھ ہی وہ اسے خود اپنے نمبر پر بھیجنا نہیں بھولی تھی۔ ویڈیو روانہ کرنے کے بعد اس نے اس فون کو آف کر کے سم نکال دی تھی۔ یہ فون جیمز کے پاس تھا اور وہ اسے ہی واپس دینے والی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سکون سے اپنی آرام کرسی پر جا بیٹھی۔ گزشتہ روز سے اسے اپنی طبیعت کچھ بہتر محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ رات خواب میں بھی اسے کٹے پھٹے افراد چلتے ہوئے نظر آتے رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ زومبیوں میں پھنس گئی ہو۔

اسے خفیہ ایجنسی میں آئے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ اس سے پہلے وہ انٹرن کے طور پر کام کرتی رہی تھی اور اس سے قبل فوج کا حصہ تھی۔ اس کی زندگی دھماکوں اور خون،

غارتگری کو دیکھتے گزری تھی۔ یوں بھی موساد میں انہیں یہ بات بہت اچھی طرح سمجھائی جاتی تھی کہ دشمن صرف دشمن ہوتا ہے اور ان کا کام صرف اور صرف اس کا خاتمہ ہے۔ اب وہ کس طرح کرتے ہیں، یہ ان کی اپنی سوچ ہے اب تو اسے گراؤنڈ کیا گیا تھا مگر وہ فعال ایجنٹ کے طور پر بھی برسوں کام کر چکی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ہونے والے پہلے خون پر ان کے دفتر میں باقاعدہ دعوت منائی گئی تھی اور اسے بریو کلب (بہادروں کا کلب) میں خوش آمدید کہا گیا تھا۔ اسے کبھی یہ سب برا بھی نہیں لگا تھا اور اب صرف ٹیلی ویژن پر تصاویر دیکھ کر اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

''شاید میں تھک گئی ہوں۔'' وہ بڑبڑائی۔ اسے خود پر قابو پانا تھا ورنہ موساد میں اس کے لیے جگہ ختم ہو جاتی اور اسے باقی عمر کسی متعلقہ دفتر میں کلرک کی طرح کام کر کے گزارنا پڑتی۔

وہ یہی سب سوچ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اسکرین پر جیمو کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے فون آن کیا، اس کے دو بار ہیلو کہنے پر بھی کوئی جواب نہیں ملا البتہ پس منظر میں جیمو کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''تو ڈاکٹر سلمان...... تم نے یہاں اتنی رات گئے مجھے بیٹھنے کے لیے تو نہیں بلایا ہوگا نا...... بتاؤ کیا ایمرجنسی ہے؟''

''کام تو ہے تم سے اور وہ بھی بہت بڑا کام......'' اس بار ایک اجنبی بھاری آواز سنائی دی۔

''کون ہو تم؟'' جیمو نے گویا چونک کر پوچھا۔

''تمہاری اور تمہارے سب ساتھیوں کی موت...... تم لوگوں نے کیا سمجھا ہے کہ تم ہمارے لوگوں کا خون بہاؤ گے اور تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا جیمو۔'' زورین اب نہایت غور سے سن رہی تھی۔ ''غلط فہمی ہے تمہاری...... ہم غافل نہیں ہیں تم سے...... چلو کھڑے ہو جاؤ۔''

اس کے بعد وہاں لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بہت غور سے ہر آواز سننے کی کوشش کر رہی تھی پھر وہ فون بند ہو گیا۔

فون بند ہونے کے بعد بھی وہ چند لمحے اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی پھر ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور تیزی سے اپنا چھوٹا سوٹ کیس نکال کر اس میں کپڑے، ضرورت کا سامان پیک کرنے لگی۔ ایک قدرے بڑے ہینڈ بیگ میں اس نے ٹرانسمیٹر اور دوسری چیزیں جمع کیں۔ اس کے بعد اس نے اپنا ریوالور، کچھ اور چیزیں اپنے بیگ میں ڈالیں، گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑی تھی جس سے اس کی شناخت ہو پاتی۔ یوں بھی یہ کرائے کا گھر تھا اور اسے مکمل فرنشڈ صورت میں ملا تھا۔ یہاں اس کے اپنے سامان میں لیپ ٹاپ، موبائل، چھوٹے ٹرانسمیٹر، کپڑوں اور ضرورت کی چیزوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے گھر سے نکلی۔ گھر کو لاک کیا اور پارکنگ کی جانب بڑھ گئی۔ اسے فوری طور پر کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر ابراہام کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا تھا، ہوٹل میں ٹھہرنا قدرے غیر محفوظ لگ رہا تھا پھر اس نے شہر کے خوش حال مضافاتی علاقے میں بنے ایک ریسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا۔ اس کی وجہ اس کی یہاں کے حالات سے آگاہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اسے ہوٹل کا انتخاب کرنا ہی تھا تو پھر اسے چند بڑے ہوٹلز میں سے ایک میں ٹھہرنا پڑے گا جو جلد یا بدیر تفتیش کے دائرے میں آسکتے ہیں۔ چھوٹے ہوٹلز میں وہ محفوظ نہیں تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں البتہ مختلف این جی اوز سے متعلقہ خواتین کی رہائش تھی جن میں سے چند سے اس کی واقفیت بھی تھی۔ شہر میں اس قسم کے بے شمار ریسٹ ہاؤسز موجود تھے۔ ان کو چیک کرنا آسان نہیں تھا۔ اس نے جس ریسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا تھا وہاں وہ اپنی دوست یارتھا اینڈریو سے ملنے جا چکی تھی۔ اب وہ یہاں نہیں آتی تھی مگر اس کا حوالہ وہاں کام آگیا تھا۔ اس نے وہاں خود کو مسز جیکب کے نام سے متعارف کرایا تھا اور منہ مانگے داموں پر ایک ماہ کے لیے کمرا بک کرا لیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ ایک شاپنگ مال میں گئی تھی جہاں اس نے اپنے لیے کئی شلوار قمیص اور اسکارفس خریدے تھے۔ جن میں سے ایک اس وقت اس کے جسم پر تھا۔ شلوار قمیص، بندھے بالوں اور اسکارف میں وہ بہت مختلف نظر آرہی تھی۔ کچھ کسر نیلی آنکھوں میں لگے براؤن کنٹیکٹ لینسز نے پوری کر دی تھی۔ اسے اب زورین کی حیثیت سے شناخت کرنا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے سامنے لگے شیشے میں اپنا جائزہ لیا اور سامان الماری کے پاس رکھ کر بستر پر گر گئی۔ وہ جیمو کی سخت مشکور تھی۔ اس نے مشکل حالات میں بھی اعصاب پر قابو رکھ کر اسے بچانے کی کوشش کی تھی اور یہ بڑی بات تھی۔

رات ابھی باقی تھی۔ اس نے اپنے سوٹ کیس سے ایک خاص آلہ نکالا اور اسے آن کر کے کمرے میں رکھ دیا۔ جب کافی دیر تک اس کی ہلکی لائٹ ہی جلتی رہی تو وہ مطمئن ہو گئی۔ یہ آلہ کمرے میں موجود کسی مائیکروفون، کیمرا اور ٹیپ

ریکارڈر کو ڈیٹیکٹ کر دیتا تھا۔ اس کی خاموشی کا مطلب یہ تھا کہ یہ کمرا محفوظ تھا اور وہ وہاں سے ابراہام کو اس اَپ سیٹ (گڑبڑ) کی خبر دے سکتی تھی۔

اس نے اس کا نمبر ملایا۔ بیل کافی دیر بج کر بند ہو گئی تھی۔ ایسے میں ابراہام کی ہدایات کے مطابق انہیں کچھ دیر بعد فون کرنا چاہیے مگر اس وقت وہ ایمرجنسی میں تھی۔ ابراہام سے نئے اسٹیپ کے بارے میں فوری رابطہ کرنا ضروری تھا اس لیے اس نے دوبارہ کال ملائی۔

"زورین کیا زلزلہ آ گیا ہے؟" چوتھی بیل پر دوسری جانب سے سرد لہجے میں پوچھا گیا۔

"سر...... تقریباً۔" وہ بولی۔ "سر جیمز پکڑا گیا ہے اور اس کے ساتھ کوئی ڈاکٹر سلمان بھی سر......"

"جیمز......؟ وہ کیسے......؟"

"میرے پاس پوری تفصیل نہیں ہے سر، بس اتنا معلوم ہے کہ وہ گرفتار ہو چکا ہے، وہ بھی جیمز کی ذہانت کام آئی۔ اس نے گڑبڑ دیکھ کر میرا نمبر ملا دیا تھا یوں مجھے یہ خبر مل گئی ورنہ اگلی باری میری ہوتی۔ یہ لوگ نہایت تیزی سے کام کر رہے ہیں۔"

"میں نے تمہیں اُن کی تعریفیں کرنے کے لیے نہیں کہا ہے زورین......" وہ غرایا۔

"جی سر۔"

"اب تم کہاں ہو؟"

"سر میں نے لوکیشن، حلیہ سب بدل دیا ہے۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ جیمز کا یہاں اور کس سے رابطہ تھا؟"

"سر...... یہاں ہماری تنظیم فی الحال ہے نہیں...... ہم مارکیٹ سے بندے ہائر کر کے کام کروا رہے تھے اور ان میں سے کسی کا براہِ راست تعلق نہیں ہوتا ہم میں سے کسی سے......"

"ٹھیک ہے تم نئی لوکیشن پر رہو، میں دیکھتا ہوں کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"سر میں نے آپ کو ویڈیو بھیج دی ہے۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے میں میٹنگ کے بعد اس کو دیکھتا ہوں اور پھر اس معاملے کو بھی نمٹانا ہے۔"

"او کے سر......" وہ بولی۔ دوسری جانب سے رابطہ ختم ہو گیا۔

☆☆☆

ابراہام کا موڈ سخت خراب تھا۔

اس محاذ پر اُسے ہر طرف سے بُری خبریں سننے کو مل رہی تھیں۔ ابھی چھاؤنی والی شکست کا زخم تازہ تھا۔ اس وقت وہاں ان کی ٹیم تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ڈیوڈ کی گرفتاری اور موت نے موساد کو دھچکا پہنچایا تھا اور اب یہاں ان کے لوگ پکڑے گئے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں یہاں ان کی ٹیم اب نہ ہونے کے برابر تھی۔ اگر مریم موجود ہوتی تو وہ یہاں سے ٹیم سلیکٹ کر سکتی تھی۔ مریم کا خیال آتے ہی اس کی ذہنی رو اس کی جانب بھٹک گئی۔ اسے ہر قیمت پر اسے تلاش کرنا تھا۔

اس کا موڈ بدل چکا تھا اس لیے وہ میٹنگ برخاست کر کے دفتر سے باہر نکلا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ ڈرائیور کو اس نے گھر کی جانب چلنے کو کہا اور گاڑی چلنے کے بعد موبائل پر زورین کی بھیجی ہوئی ویڈیو آن کی، وہ اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے ایسے ہی لوگ وہاں اپنی ٹیم میں درکار تھے۔

ویڈیو شروع اس کے گھر کے دروازے سے ہوئی تھی۔ وہ کسی لڑکے کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے خود پر پورا اعتماد ہے۔ دروازے کے قریب آ کر وہ کسی سے ملی اور پھر گاڑی کی جانب چلی۔ وہیں ایک شخص اور موجود تھا۔

وہ اسے ایک نظر دیکھ کر لڑکی کی جانب متوجہ ہو گیا مگر پھر اگلے ہی لمحے اس نے پھر اسے دیکھا۔ اس بار اس نے ویڈیو کو سلو موشن میں کیا اور اس شخص پر آتے ہی اسے روک کر ان لارج کر دیا۔ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اسے شناخت کر لیا۔

یہ وہی تھا جس سے اُسے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت تھی۔

جس کی وجہ سے اُسے مریم کو جان سے مارنا پڑا تھا۔

جس نے اُس کے خاندان میں نقب لگائی تھی۔

جسے وہ کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا......

یہ وہی تھا......

اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے...... اور ذہن تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ اب یہ لڑکی اُس کے لیے نہایت اہم ہو گئی تھی۔

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

یہ جمعرات کی دوپہر تھی، جس کا مطلب تھا کہ لیلا اور میں سویٹ واٹر ٹورن میں لنچ کے لیے مل رہے ہیں۔ ہاں... ہمارا رشتہ تھوڑا سا پیچیدہ ہے لیکن کوئی انسان اتنی پیچیدگیاں لیے کیوں ہوتا ہے؟ ہم سب ایک ہی چوبیس عناصر اور چھیالیس کروموسوم سے بنے ہیں۔ یہ تنوّع کے لیے صرف اتنی گنجائش چھوڑتا ہے۔ لیلا کو دیر ہو چکی ہے اور میرا دماغ بھٹک رہا ہے۔

زندگی میں کیا اہم ہے...... وہ رشتے جو آپ بناتے

منفی اور مثبت ردِعمل میں معلق فیصلہ کن کٹھن گھڑی......

بلندی سے گر کر اٹھا جا سکتا ہے... مگر نظروں سے گرنے کے بعد اُٹھنے کی سکت اور ضرورت ختم ہو جاتی ہے... ہتھیاروں سے دوستی رکھنے والے ایک شخص کا المیہ... ہتھیاروں کی موجودگی نے اسے بے بس اور عاجز کر دیا تھا...

کمٹمنٹ

سلمان سلیم

عائشہ نصیر

ہیں اور ضروری نہیں کہ صرف لوگوں کے ساتھ ہوں۔ میں نے کچھ ہوشیار بندروں کو بھی دیکھا ہے۔ انسانوں کے پاس چھیالیس کروموسوم ہوتے ہیں، ایک چمپینزی کے پاس اڑتالیس ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بندر کو سمجھنا انسان کو سمجھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ لیکن لیلا کے معاملے میں مجھے اس بات سے اختلاف ہے۔ اس کی شخصیت کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہے۔ میں تصور کر سکتا ہوں کہ چمپینزی کے ساتھ رشتہ بہت آسان ہے بہ نسبت لیلا کے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں لیلا کے بدلے کوئی چمپینزی چاہتا ہوں کیونکہ لیلا بہر حال کسی چمپینزی سے لاکھوں گنا زیادہ حسین ہے۔

میں اسے کتنا سمجھتا ہوں میں نہیں جانتا...... میں بس اسے چاہتا ہوں۔ میری ٹیبل کے قریب بھٹکتی اس کی مانوس خوشبو نے مجھے چونکایا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ رہی تھی۔

''تم لیٹ ہو۔'' میں نے اپنی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' میں نے تمہیں بتایا تھا مجھے اپنے کچھ کام نمٹانے ہیں۔''

میری طرح، لیلا بھی ایک پولیس افسر ہے، ہومی سائڈ میں ڈیٹیکٹیو ہے۔ ہم پارٹنرز ہیں، اور ڈیٹنگ کرتے ہیں لیکن ہم ساتھ نہیں رہتے۔ آج صبح میں ڈی اے کے دفتر میں بیان دینے گیا تھا۔ لیلا نے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے کام ہیں، وہ بعد میں آئے گی۔ میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ کیا کام ہیں۔

اس نے ایک بہت ہی موزوں لباس پہنا ہوا تھا جو اس کے سڈول جسم کی دلکشی کو اور نمایاں کر رہا تھا۔ اپنے سنہرے بالوں کو اس نے بڑی خوبصورتی سے باندھ رکھا تھا۔

''تمہارا یہ لباس؟''

''مجھے آج دوپہر کورٹ میں پیش ہونا ہے۔''

''تم پر مقدمہ نہیں چل رہا ہے۔ پھر ایسا لباس کیوں؟''

''میں اچھی نظر آنا چاہتی ہوں۔''

''تم ایک کوپ ہو۔''

''میں اچھی نہیں لگ سکتی جیک؟'' اس کا لہجہ بلند اور تند ہوا جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجھے صرف اس کی طرف دیکھ کر لطف اندوز ہونا چاہیے اور ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے اس کا موڈ خراب ہو۔

''تم اچھی لگ رہی ہو۔''

''شکریہ۔''

''تم کس موڈ میں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی کو قتل کرنے کے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں اپنی لغت سے 'موڈ' کا لفظ نکالنے جا رہا ہوں...... مجھے لگا تم صرف کورٹ میں ایک خوب صورت کوپ کے طور پر نظر آنا چاہتی ہو۔''

''میں چاہتی ہوں کہ جیوری مجھ سے پیار کرے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر مرد مجھے چاہے اور ہر عورت حیران ہو کہ میں نے اپنا لباس کہاں سے خریدا ہے اور میں چاہتی ہوں اسے سزائے موت ہو۔ جب بھی میں سوچتی ہوں کہ اس نے اس لڑکی کے ساتھ کیا کیا تو میں پاگل ہو جاتی ہوں۔''

''اچھی گواہ بنو، پُرسکون رہو، اور توجہ مرکوز رکھو۔ اسے سزا مل جائے گی۔''

''میں اسے گولی مارنا پسند کروں گی۔''

''تم ایک ہومی سائڈ ڈیٹیکٹیو ہو۔''

''میرے پاس لائسنس ہے۔''

''تم 007 نہیں ہو۔''

''اس سے بھی بدتر۔ میں بیج اور بندوق کے ساتھ ایک بلونڈ ہوں۔ میں پہلے گولی مارتی ہوں اور پھر سوچتی ہوں۔''

میں ایک ڈیٹیکٹیو ہوں، اور تم میرے سامنے یہ بول رہی ہو۔ پُرسکون رہو اور ٹاپک چینج کرو۔'' میں نے ناراضی سے کہا۔

لیلا نے مینیو اٹھایا، ایک منٹ کے لیے اسے گھورتی رہی۔ اس کی سانسیں تیز ہو گئی تھیں۔ میں اس کے غصے کی شدت کو محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے ڈر ہوا کہ وہ جل ہی نہ جائے۔

ایسٹیل، ویٹریس ہماری ٹیبل پر آئی۔ ''کیا آپ لوگ آرڈر دینا چاہیں گے؟ یا آپ کو کچھ اور منٹ درکار ہیں؟''

میں نے دیکھا کہ ایسٹیل کے سامنے کا ایک دانت سونے کا ہے۔

''میں ونگز میک اور چیز منگوانا چاہوں گا۔''

لیلا نے مینیو کو پلٹا دیا۔ ''مجھے ریب آئی ریے۔''

''وہ بیچ میں سرخ ہو گی۔'' ایسٹیل نے کہا۔

''مجھے اس کی پروا نہیں...... مجھے وہی کھانا ہے۔''

اس سے پہلے میں اپنے اپارٹمنٹ میں لیلا سے ملاقات کے لیے کام ختم کرنے کا منتظر تھا۔ میرے دماغ میں آنے والے خوشگوار لمحات کی فلم سی چل رہی تھی...... میں بے حد پُرجوش تھا کیونکہ لیلا ہمیشہ سے ایک جارح مزاج محبوبہ رہی ہے، لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ایک کوڑے یا ہتھکڑیوں کے ساتھ دکھائی دے گی۔ شدت جذبات اور تشدد کے درمیان ایک بہت باریک سی لکیر ہے اور آج شاید

لیلا اس کے پار چلی جائے۔
''تم تو لنچ میں کھانے کے لیے کبھی اسٹیک کا آرڈر نہیں دیتیں۔''
''مجھے بس چبانے کے لیے کچھ چاہیے۔'' وہ اپنی کرسی پیچھے ہٹا کر کھڑی ہوگئی۔ ''میں پاؤڈر روم میں جا رہی ہوں۔''
''میں تمہارے لیے یہ سیٹ ریزرو رکھوں گا۔''
''اوہ...... تھینکس۔''
میں اس کی دلکش چال دور تک دیکھتا رہا۔ سچ تو یہ ہے مجھے اس عورت سے عشق تھا...... وہ خطرناک تھی اکثر مجھے ڈرا دیتی...... لیکن میں اس کے لیے پاگل تھا۔
سویٹ واٹر ٹیورن اپنے چکن ونگز کے لیے مشہور تھا۔ یہ ایسٹ کانگریس پر شہر ڈیٹرائٹ کے مرکز سے صرف ایک بلاک دور واقع تھا اور دوپہر کے کھانے کے وقت یہ بھرا ہوا ہوتا، آفس ورکرز اور بلیو کالر ورکرز دونوں کے لیے ایک ترجیحی اسپاٹ تھا۔ برتنوں کی کھنکھناہٹ، ہلچل مچانے والی ویٹریس، لوگوں کی گپ شپ...... کانٹوں اور چمچوں کی چھن چھن۔ اس وقت بھی یہ جگہ ان آوازوں سے گونج رہی تھی جب میں نے اس جھکے ہوئے کندھوں اور لنگڑاتے ہوئے شخص کو دیکھا۔ سر پر ہیٹ لیے لمبا سا کوٹ پہنے اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔
نجانے کیوں میرے دل کی دھڑکن اچانک ہی بڑھ گئی جب وہ کیش رجسٹر کے قریب پہنچا، جو سامنے کے دروازے کے قریب اور باتھ رومز کی راہداری کے ساتھ تھا۔ وہ ایک جوڑے کے پیچھے کھڑا تھا جو اپنا بل ادا کر رہے تھے، اپنے بائیں ہاتھ کو کوٹ میں لٹکائے ہوئے۔ جب وہ جانے کے لیے مڑے تو اس نے سائڈ پہ ہو کے انہیں راستہ دیا اور پھر کیشیئر کے پاس گیا۔ اس کا ہاتھ کوٹ کے نیچے سے نائن ایم ایم کے ساتھ باہر آیا تھا اور یہ دیکھتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔
جیسے ہی اس نے کیشیئر کی طرف اشارہ کیا، اسی وقت لیلا باتھ رومز والی راہداری سے باہر نکلی۔ اس نے بھانپ لیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ نہایت ہوشیاری سے اس نے اپنے پرس سے بائیس کیلیبر کا پسٹل نکالا...... اس لمبے کوٹ والے نے اسے شاید اپنی آنکھ کے کونے سے دیکھا ہوگا۔ وہ پھرتی سے پلٹا اور اپنی نائن ایم ایم اس پر تان لی۔
''اس بارے میں سوچنا بھی مت۔'' اس نے اپنی سیمی آٹومیٹک گن کی طرف اشارہ کیا۔
''بس اپنی گن نیچے رکھو اور کوئی فائر نہ ہو۔'' لیلا اپنی جگہ فریز ہوگئی، وہ اس کے پیچھے دیکھ رہی تھی ڈائننگ ایریا کی سمت...... ہماری نظر ملی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے ایکشن لینے کی تاکید کرنے لگی۔ میں اس کی آنکھیں پڑھ سکتا تھا۔
حملہ آور کوئی خطروں کا شوقین قسم کا کھلاڑی معلوم ہو رہا تھا۔ رش کے اوقات میں دوپہر کے کھانے کے ہجوم کے دوران ایک ریستوران کو لوٹنا کوئی مذاق نہیں تھا۔
اس کی آنکھیں لیلا پر گڑی ہوئی تھیں جب میں خاموشی سے کھڑا ہوا اور اپنی گلاک گن نکالی۔
وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے اور گن ابھی بھی لیلا کے ہاتھ میں تھی۔
''اسے نیچے پھینکو۔'' وہ پھر سے غرایا، نائن ایم ایم سے اس کے سر کا نشانہ لیے۔
''کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں گولی ماروں؟ میں تمہاری یہ خواہش پوری کروں گا۔''
میں نے اپنے گلاک کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور لیزر سائٹ سے اس پر نشانہ لیا۔
''میرا ساتھی تمہارے پیچھے گن لیے کھڑا ہے۔ اسے اور مشکل مت بناؤ۔'' لیلا کہہ رہی تھی۔
''اپنی گن نیچے پھینکو اور فرش پر لیٹ جاؤ۔'' وہ پیچھے نہیں مڑا، لیلا پر نائن ایم ایم تھامے رہا۔ شاید وہ شوقین نہیں پاگل تھا۔ اور نہ ہی وہ کوئی اناڑی لگ رہا تھا۔
''میں یہ بکواس نہیں سنوں گا بلونڈی۔ میں نے اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ بھی محسوس کی تو تم مریں۔ اب میں کیش لینے والا ہوں اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا، تم کوئی حرکت نہیں کرو گی۔ اور باقی سب وہیں رہیں جہاں ہیں۔'' وہ چلایا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ کیشیئر کی طرف بڑھایا۔ ''مجھے نقد رقم دو، بڑے نوٹ کوئی نہیں۔'' لیلا جمی ہوئی کھڑی تھی، اس نے پسٹل ہاتھ سے نہیں چھوڑا مگر اس کا رخ زمین کی طرف کر دیا۔
میں اس کا دماغ پڑھ سکتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ اسے اٹھا سکتی ہے اور گولی چلا سکتی ہے۔ مگر اس کی پوری توجہ اسی پر مرکوز تھی۔ وہ سیکنڈز میں اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔
''گن چھوڑ دو۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے، کتیا۔ میں تمہیں مار کر یہاں سے نکلوں گا۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''
''تم یہاں سے زندہ نکلنے والے نہیں ہو۔'' لیلا نے کہا۔

''وہ کیوں؟''
''کیونکہ میرا ساتھی تمہیں گولی مار دے گا۔''
اب میں حملہ آور کا دماغ پڑھ سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یا تو وہ کچھ زیادہ ہی دلیر ہے یا پھر بیوقوف ہے، یا واقعی اس کے پیچھے کوئی گن کے ساتھ کھڑا ہے۔ لیکن وہ مڑ کر دیکھنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔
میں چپ چاپ کھڑا شاید حیرت کا عنصر کھونا نہیں چاہتا تھا، یا پھر اسے چونکانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہڑبڑا کر لیلا کو گولی مار دے۔
میں نے اپنے گلاک کی لیزر سائٹ کو اس کے سر کے پچھلے حصے پر مرکوز رکھا تھا۔ میں چاہتا تو ایک لمحے میں اسے مردہ بنا دیتا۔
میں نے اپنی زندگی میں دو بار کسی کو گولی مار کر قتل کیا ہے۔ خلیجی جنگ میں ایک عراقی فوجی، اور 2003 میں نارتھ کنٹری بینک کے سامنے پولیس اہلکار کے طور پر کام کرتے ہوئے دو بینک ڈکیت۔ تب مجھے لوگوں کو گولی مارنا مشکل نہیں لگتا تھا۔
اب تو مجھے ایک رسیلے اسٹیک کو کاٹنے میں بھی دشواری ہوتی ہے تو قتل کا تو خیال ہی مجھے جامد کر دیتا ہے، کسی فالج زدہ وجود کی طرح۔ مجھے اپنے والد یاد ہیں، جو ایک شوقین شکاری تھے۔ جب انہوں نے ہرن کو پالنا اور کھلانا شروع کیا تو انہیں پتا چلا کہ وہ مزید اب انہیں گولی نہیں مار سکتے۔ شاید اسی لیے ہمیں بھوکوں کو کھانا کھلانے کی ہدایت کی گئی ہے۔
کلرک نے اسے نوٹوں کا ایک ڈھیر دیا۔ وہ انہیں مٹھی میں بھر بھر کر کوٹ کی جیبوں میں ڈالنے لگا۔
''ہنامت۔'' ساتھ ہی وہ لیلا کی جانب سے بھی غافل نہیں تھا۔ ''میں یہاں سے باہر نکلوں گا اور تم اپنے لنچ پر واپس جا سکتی ہو۔ یہاں کچھ بھی بُرا نہیں ہونا چاہیے۔'' لیلا پر نائن ایم ایم تھامے اس نے دروازے کی طرف اپنا راستہ بنانا شروع کیا۔
''اسے گولی مارو، جیک۔'' لیلا چلائی۔ ''اسے گولی مارو...... ابھی۔''
مجھے بس اپنی انگلی کو ایک ذرا حرکت دینی تھی اور اس کے سر میں سوراخ ہو جاتا......
میں نے پہلے بھی کیا ہے۔ اس میں کوئی مشکل نہیں تھی لیکن اس وقت نجانے کیوں میں ٹریگر نہیں دبا پا رہا تھا۔ میں اس ڈاکو کا قصہ ختم نہیں کر پا رہا تھا۔
مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اپنے ہی پہاڑ کے دامن میں ہوں اور چوٹی پر چڑھنے سے قاصر ہوں۔
میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا جب وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔
لیلا نہیں ہلی، اس کی گن کا رخ ابھی بھی زمین کی سمت تھا۔ وہ پہلا فائر ضائع ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔
''اسے گولی مارو، جیک۔ اس کمینے کو گولی مارو۔'' وہ چیخ رہی تھی۔
وہ دروازے کے اتنے قریب آچکا تھا کہ ہم دونوں کو دیکھ سکتا تھا لیکن شاید نہیں۔ ایک لمحے کے لیے، اس نے اپنی نظریں میری سمت موڑ لیں۔
ہم سب شکاری ہیں مگر لیلا ......وہ جانتی ہے کہ کس طرح مارنا ہے۔
اس لمحاتی مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے میں اپنی گن اوپر کی تھی اور اس سے نکلنے والی گولی نے چشم زدن میں اس کی کھوپڑی میں راستہ بنا لیا۔
وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا، اور اس کا نائن ایم ایم بغیر کسی نقصان کے ہدف سے دور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔
موت فوری طور پر واقع نہیں ہوتی۔ یہ کوئی کاؤبوائے فلم نہیں ہے۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اور اس کے سر کے آس پاس خون کا ایک تالاب سا بن گیا تھا، اور پھر کچھ ہی دیر میں اس نے دم توڑ دیا۔
مجھے حیرت ہے کہ اس نے کیا سوچا ہوگا جب اس نے آخری نظر ڈالی۔ فوٹون ہماری آنکھوں کے لینس سے دماغ تک جاتے ہیں جہاں نیوران معلومات کو ڈی کوڈ کرتے ہیں، لیکن ڈی کوڈنگ وہ چیز ہے جسے ہر کوئی مختلف طریقے سے دیکھتا ہے۔ جو چیز لینس سے گزرتی ہے، وہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہوتی ہے جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔
میڈیکل میکینیشنز آئے، مزید ڈیٹیکٹیو آئے اور اس جگہ کو ٹیپ لگا کر سیل کر دیا گیا۔
''مجھے کورٹ کے لیے نکلنا ہے۔'' لیلا نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ...... میں یہاں دیکھ لوں گا۔''
میں انہیں باڈی بیگ میں ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تو یہ تھا ہمارے اس لنچ کا اختتام۔
صرف ڈاکو کے لیے نہیں۔
لیلا نے اس دن ہم دونوں کو گولی مار دی تھی۔ اسے اپنی گن سے اور مجھے اپنی اس نظر سے...... وہ آخری نظر جو اس نے جاتے جاتے مجھ پر ڈالی تھی......

❖❖❖

جواباً

زہرا بتول

خوش قسمتی اور چالاکی میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی... لیکن دور اندیش دور سے ہی بھانپ لیتے ہیں کہ یہاں ان کی خوش نصیبی ساتھ نہیں دے رہی... ایک ایسے ہی منصوبہ ساز ذہن کی کارستانی... اس کے دماغ میں اپنی فنکاری دکھانے کا کیڑا شدت سے کلبلا رہا تھا...

دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی کہانی...... ایک اداکار کے فنکارانہ جوہر......

دوربین آنکھوں سے لگائے وہ سامنے والی عمارت کو دیکھ رہا تھا، وہ کھڑکی جس میں کرسٹل کلیئر شیشہ لگا ہوا تھا جس کے آر پار سب کچھ صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ مذکورہ کھڑکی ایک کمپنی کے آفس کی تھی جس میں کمپنی کا مالک بیٹھا کرتا تھا۔ ''تھرڈ پارٹی کارپوریشن'' کا ایم ڈی مسٹر انور شامی جو کمپنی میں ''چیف صاحب'' کے نام سے مشہور تھا۔

''تھرڈ پارٹی کارپوریشن'' کا آفس شہر کے ایک

سلمان سلیم

معروف اور مصروف کاروباری علاقے نیو چالی میں ایک نیو برانڈ بلڈنگ کے فورتھ فلور پر واقع تھا۔ اس وقت انور شامی اپنے کمرے میں موجود تھا جس کی پشت کو وہ دوربین کی مدد سے دیکھ رہا تھا اور اس کمرے کی ہر چیز کو بھی۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان ایک سڑک تھی جس پر ٹریفک رواں دواں تھا۔

''مجھے تھوڑا انتظار کرنا ہوگا......'' اس نے دوربین کو آنکھوں سے ہٹا کر خود کلامی کی۔ ''ابھی اس کے آفس میں زیادہ رش نہیں ہے۔ میں اس وقت اسے کال کروں گا جب ویٹنگ روم میں درجن بھر افراد جمع ہوں گے جو میرے منصوبے کا لازمی حصہ ہے!''

''تھرڈ پارٹی کارپوریشن'' کا آفس تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں انور شامی خود بیٹھا کرتا تھا۔ دوسرے کمرے میں اس کا اسٹاف اور تیسرا کمرا انتظارگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا جس میں پندرہ سے بیس افراد کے بہ یک وقت بیٹھنے کی گنجائش موجود تھی۔ انور شامی کی سیکریٹری شازیہ بھی اسی روم کے ایک کونے میں ریسپشن کے پیچھے موجود رہتی تھی۔ وہ کمپنی کے لیے دونوں طرح کے فرائض انجام دیا کرتی تھی یعنی وہ اپنے باس کو بھی اسسٹ کرتی تھی اور ضرورت مندوں کو بھی ڈیل کرتی تھی۔

انور شامی کے آفس کے تینوں کمروں کی اندرونی دیواریں مکمل طور پر شیشے کی تھیں یعنی نفیس قسم کے چوبی فریمز میں بڑے سائز کے گلاس اس طرح جڑے گئے تھے کہ شامی اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے آفس کے اسٹاف کی حرکات و سکنات پر نظر رکھ سکتا تھا۔

یہی سہولت اسے بھی حاصل تھی۔ وہ سامنے والی بلڈنگ کی ایک کھڑکی سے، دوربین کے ذریعے ''تھرڈ پارٹی کارپوریشن'' کی اندرونی سرگرمیوں کا بہ آسانی جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ آج اپنے جس منصوبے پر عمل کرنے والا تھا اس میں ظاہر ہے، اسے بھی فائدہ پہنچنے والا تھا لیکن اس کی ضرورت کسی اور مقصد سے پیش آئی تھی۔ وہ اپنے ایک دیرینہ دوست توصیف کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔

توصیف...... جو ایک ماہ پہلے تک ''تھرڈ پارٹی کارپوریشن'' کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ کا حصہ ہوا کرتا تھا۔

☆☆☆

دنیا میں انواع واقسام کے کیڑے پائے جاتے ہیں مگر ''ایکٹنگ'' کا کیڑا سب سے ڈھیٹ اور سخت جان ہوتا ہے۔ اگر یہ کیڑا کسی کے دماغ میں اپنے لیے جگہ بنالے تو پھر انسان تو گیا کام سے۔ شاکر کو بھی اسی کیڑے نے پریشان کر رکھا تھا۔

شاکر کا اداکاری کا شوق کوئی نیا نہیں تھا۔ اس نے ہر ٹی وی چینل اور ہر پرائیویٹ پروڈکشن ہاؤس میں قسمت آزمائی کر کے دیکھ لی تھی مگر اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو پائی تھی۔ کبھی کبھار اسے کسی ڈرامے میں انتہائی نچلے درجے کا چھوٹا موٹا رول مل جاتا تھا۔ اس کے بعد مہینوں کی چھٹی۔ اس فیلڈ سے متعلق لوگ اس کے کام کی تعریف تو کرتے تھے مگر اسے کام دینے میں کوئی کشادہ دلی سے کام نہیں لیتا تھا اور وہ تھا کہ اس پر خود کو منوانے کی دُھن سوار تھی۔ یہ اس کے دماغ میں بیٹھے ہوئے ایکٹنگ کے کیڑے کا اعجاز تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ کافی ضدی اور سرکش کیڑا تھا۔

یہ تو شاکر کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور شادی اس نے کی نہیں تھی۔ کافی عرصہ پہلے وہ یتیم بھی ہو چکا تھا۔ اب آ جا کر اسے خود ہی کو پالنا ہوتا تھا جس کے لیے وہ مختلف قسم کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتا رہتا تھا۔ لائٹ ہاؤس کے سگنل کے نزدیک ہی ایک پرانی سی عمارت میں اس کی رہائش تھی جس کے نیچے کھانے اور چائے کا ایک ہوٹل بھی تھا۔ شاکر اسی ہوٹل میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ اگر اس سے کوئی ملنے آجاتا تو وہ اپنے مہمان کی خاطر تواضع کے لیے بھی اسی ہوٹل میں جا بیٹھتا تھا۔

اس وقت شاکر اپنے ایک دیرینہ دوست توصیف کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ توصیف خاصا اَپ سیٹ دکھائی دیتا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد شاکر نے اس سے پوچھا۔

''یار! تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے، سب خیریت تو ہے نا؟''

''ابھی تازہ تازہ بے روزگار ہوا ہوں۔'' توصیف نے بددلی سے جواب دیا۔

''تم تو ایسے بتا رہے ہو جیسے تازہ تازہ بیوہ ہوئے ہو۔'' شاکر نے شوخی سے کہا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''مائنڈ نہیں کرنا یار، میں مذاق کر رہا تھا۔ مجھے بتاؤ، تم نے جاب کیوں چھوڑ دی؟''

''میں پاگل تو نہیں کہ جاب چھوڑ دوں گا؟'' وہ تلخی بھرے لہجے میں بولا۔ ''مجھے فائر کر دیا گیا ہے۔''

''اوہ!'' شاکر نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''کیا تم

طرح کی باتیں کر رہے ہو۔'' توصیف نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے اسکرپٹ پڑھ پڑھ کر تمہیں عام زندگی میں بھی ڈائیلاگ مارنے کی عادت ہوگئی ہے۔''

''کاش! یہ تمہاری ''اسکرپٹ پڑھ پڑھ کر'' والی بات درست ہوتی۔'' شاکر نے حسرت بھرے انداز میں کہا۔ ''مجھے تو مہینوں بعد کوئی مختصر سا کردار ملتا ہے اور وہ بھی اسکرپٹ کے بغیر ہی سمجھا دیا جاتا ہے کہ یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔ بس۔'' اس نے توصیف کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر گمبھیر انداز میں بولا۔ ''اگر تم چاہو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں؟''

''وہ کس طرح؟'' توصیف پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

شاکر کا دماغ اِن لمحات میں روشنی کی رفتار سے بھی کہیں زیادہ تیز کام کر رہا تھا اور اسی دماغ کے اندر موجود ایکٹنگ کا کیڑا خوشی کے عالم میں خوب اُچھل رہا تھا۔ توصیف کے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

''تمہیں اس آفس سے ماہانہ کتنی تنخواہ ملتی تھی؟''

''چالیس ہزار روپے۔'' توصیف نے بتایا۔

''حالانکہ میں کام اس سے کہیں زیادہ کا کرتا تھا۔''

''ایک سال کے کتنے ہوگئے؟''

''چار لاکھ اسّی ہزار روپے۔''

''میں تمہیں اس کمینے شخص سے پورے پانچ لاکھ روپے دلواؤں گا۔'' شاکر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اگر تم میرے ڈرامے کا حصہ بننے کے لیے تیار ہو جاؤ؟''

''کون سا ڈراما اور کون سا کردار؟''

''کردار کے بارے میں، میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب تم میرا ساتھ دینے کے لیے آمادگی ظاہر کر دو گے۔'' شاکر نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ڈراما میرے ذہن میں ابھی ابھی آیا ہے۔ اس کی جزئیات تم سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں طے کی جائیں گی۔''

شاکر روزانہ رات کو ہالی ووڈ کی ایک یا دو موویز ضرور دیکھا کرتا تھا، خاص طور پر وہ موویز جن میں مجرم کی جیت ہوتے دکھائی جاتی تھی اور یہ بھی واضح کیا جاتا تھا کہ مجرم نے دراصل وہ جرم اپنے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی کا بدلہ لینے کے لیے یا اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ گزشتہ رات دیکھی ہوئی ایسی ہی ایک مووی شاکر کے ذہن میں تازہ تھی اور توصیف کے موجودہ حالات سے لگا بھی کھاتی تھی۔ بس، اس میں اپنی ضرورت کے مطابق رنگ بھرنا تھے۔

پانچ لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ ''ٹھیک ہے۔'' لمحاتی تذبذب کے بعد توصیف نے کہا۔ ''میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں مگر میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کروں گا۔''

''کوئی غیر قانونی اقدام، نہ ہی کسی قسم کا رسک۔'' شاکر نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میرے اسکرپٹ کی یہی تو خوبی ہے کہ...... نہ ہینگ لگے، نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا...... لوگ مجھے اچھا اداکار مانیں یا نہ مانیں لیکن میں اپنے اس ڈرامے سے تم پر ضرور یہ ثابت کر دوں گا کہ...... آئی ایم دی کنگ آف ایکٹنگ۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' توصیف نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟''

''منصوبے کے بارے میں سب سے آخر میں بات ہوگی، پہلے میں ضروری معلومات جمع کر لوں۔ یہ بتاؤ، تمہارے آفس کی ٹائمنگ کیا ہیں؟''

''صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک۔''

''اور چھٹی؟''

''صرف اتوار کو......''

''اور کون سے دن آفس میں زیادہ رش ہوتا ہے؟''

توصیف نے جواب دیا۔ ''ہفتے اور پیر کے دن۔''

''فرسٹ ہاف میں یا سیکنڈ ہاف میں؟'' شاکر نے پوچھا۔

''ہفتے کے دن سیکنڈ ہاف میں اور پیر کے روز فرسٹ ہاف میں۔'' توصیف نے بتایا۔

''مجھے اس شیطان کے فون نمبرز بھی چاہیے ہوں گے۔''

''چیف کا سیل نمبر اور آفس کے لینڈ لائن نمبرز دے سکتا ہوں۔'' توصیف نے کہا۔ ''اس کے گھر کا کانٹیکٹ نمبر مجھے معلوم نہیں ہے۔ اگر تم کہو گے تو میں کہیں سے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا؟''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' شاکر نے سرسری انداز میں کہا پھر سوال کیا۔ ''شیطان رہتا کہاں ہے؟''

''ڈائمنڈ ہائٹس۔'' توصیف نے مختصر جواب دیا۔

''اوہ اچھا!'' شاکر نے کچھ ایسے انداز میں کہا جیسے ''ڈائمنڈ ہائٹس'' اس کی دیکھی بھالی عمارت ہو۔ ''اپارٹمنٹ نمبر؟'' اس نے سوالیہ نظر سے توصیف کی طرف دیکھا۔

''تھری زیرو فور۔'' توصیف نے بتایا۔ ''تھرڈ فلور پر کارنر کا اپارٹمنٹ۔''

"ٹھیک ہو گیا۔" شاکر مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ "اس کے فیملی ممبرز کی تعداد؟"

"صرف دو...... چیف اور اس کی بیوی نادرہ کنول۔"

"بچے؟" شاکر نے استفسار کیا۔

"نہیں، وہ بے اولاد ہیں۔" توصیف نے بتایا۔

شاکر کے چہرے پر سکون کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ وہ جس مووی کو ذہن میں رکھ کر توصیف سے سوالات کر رہا تھا، وہ بہت زیادہ قابلِ استعمال نظر آنے لگی تھی۔ اس نے ابھی تک توصیف کو اپنے مووی کے شوق کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور بتانے کا ارادہ بھی نہیں تھا کیونکہ یہ اس کا ایک سیکرٹ تھا۔

"مسز شیطان کی مصروفیات کے بارے میں کچھ بتاؤ؟" شاکر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ پورا دن گھر ہی میں گزارتی ہے۔" توصیف نے جواب دیا۔ "ٹی وی دیکھتے ہوئے یا پھر سو کر!"

"زبردست!" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔"

شاکر جس مووی کے بارے میں سوچ رہا تھا، وہ بنیادی طور پر ایک "ہارر اینڈ مسٹری" مووی تھی جو ایک سیریل کلر کی نفسیات کا احاطہ کرتی تھی۔ وہ سیریل کلر صرف ایسی عورتوں کو قتل کرتا تھا جو گھر میں بالکل اکیلی رہتی ہوں اور ان کے بچے وغیرہ نہ ہوں۔ اس لحاظ سے توصیف کے سابق باس انور شامی عرف چیف صاحب کی کہانی خاصی فٹ ان تھی۔

شاکر کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر توصیف نے کہا۔ "یار تم نے ابھی تک مجھے اپنے منصوبے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"بس، بتانے ہی والا ہوں۔" شاکر نے کہا پھر پوچھا۔ "شیطان کی گاڑی کا نمبر یاد ہے؟"

توصیف نے اسے انور شامی کی گاڑی کا نمبر بتانے کے بعد کہا۔ "وہائٹ ہونڈا سوک۔"

"اب مجھے تھرڈ پارٹی کارپوریشن کے بارے میں بتاؤ۔" شاکر نے کہا۔ "شیطان اس آفس میں کس قسم کا بزنس چلا رہا ہے؟"

"تم انور شامی کو مستقل "شیطان" کیوں کہہ رہے ہو؟" توصیف نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ وہ کسی شیطان سے کم نہیں۔" شاکر نے زور دے کر کہا۔ "اس نے تمہیں نہ صرف بے روزگار کیا ہے بلکہ تم پر ایک گھناؤنا الزام بھی عائد کیا ہے۔ اگر تم اپنی بے عزتی کو بھول چکے ہو تو اس معاملے کو یہیں پر ختم کر دیتے ہیں۔ چائے ختم، چیپٹر کلوز...... دی اینڈ!"

"میں اس ذلت اور رسوائی کو بھلا کیسے بُھلا سکتا ہوں یار......" توصیف نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "میں جب بھی اس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو میرا خون کھول اٹھتا ہے اور...... دماغ پھٹنے لگتا ہے۔"

"میں یہی تو چاہتا ہوں نہ تمہارا خون کھولے اور نہ ہی دماغ پھٹے۔" شاکر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس لیے میں نے جو پوچھا، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو، اس یقین کے ساتھ کہ میں تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لے کر تمہیں تمہارا حق دلاؤں گا اور اس انسان نما شیطان کو یادگار سبق بھی سکھاؤں گا۔"

"آن دی ریکارڈ، تھرڈ پارٹی کارپوریشن ایک ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی طرح کام کرتا ہے۔ بے روزگار لوگ اپنے "سی وی" یا پھر ضروری معلومات کے ساتھ آفس میں رجسٹریشن کراتے ہیں جس کی فیس ایک ہزار روپے ہوتی ہے۔" توصیف نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "آفس کے بہت سارے اداروں اور ملز وغیرہ کے ساتھ پروفیشنل تعلقات ہیں۔ وہ لوگوں کو مناسب جگہوں پر اُن کی فنی اور تعلیمی قابلیت کے مطابق جاب دلواتے ہیں۔ اس طرح آفس کا دوطرفہ فائدہ ہوتا ہے۔ جب کسی رجسٹرڈ شخص کی جاب کنفرم ہو جاتی ہے تو اسے اپنی پہلی سیلری کا پچیس فیصد کارپوریشن کو دینا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کسی ادارے کو اس کی مرضی کا ورکر مہیا کر دیا جاتا ہے تو وہ اس کی پہلی تنخواہ کے پچیس فیصد کے برابر رقم کارپوریشن کو بہ طور کمیشن دیتا ہے۔ اس طرح فرسٹ اینڈ سیکنڈ پارٹی کو ملانے کے بعد تھرڈ پارٹی یعنی کارپوریشن کی ذمّے داری پوری ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھو کہ انور شامی آجر اور مزدور کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے۔"

"یہ بزنس تو سمجھ میں آرہا ہے۔" شاکر نے تفہیمی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے "آن دی ریکارڈ" کے الفاظ سے بات شروع کر کے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ شیطان "تھرڈ پارٹی کارپوریشن" کی آڑ میں "آف دی ریکارڈ" بھی بہت کچھ کر رہا ہے؟"

"تم بالکل درست انداز میں سوچ رہے ہو۔" توصیف نے تصدیقی لہجے میں کہا۔ "انور شامی حوالے اور قرض کا کام بھی بڑی صفائی سے کر رہا ہے۔"

''حوالہ یعنی ہنڈی کا دھندا......'' شاکر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ قرض کا کیا معاملہ ہے؟''

''انور شامی ضرورت مند لوگوں کے طلائی زیورات اور پراپرٹی کے کاغذات وغیرہ اپنے پاس گروی رکھ کر انہیں سود پر قرضہ دیتا ہے۔'' توصیف نے بتایا۔ ''حوالہ اور قرض والا دھندا وہ صرف قابلِ بھروسا لوگوں کے ساتھ ہی کرتا ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ......'' شاکر نے توانا لہجے میں کہا۔ ''یہ آف دی ریکارڈ دھندا کرنے کے لیے اسے کیش سے کھیلنا پڑتا ہوگا۔ نائن الیون کے بعد دنیا بھر میں ہنڈی کے کام کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے لہٰذا اب جو لوگ بھی اس دھندے میں ہیں انہیں بہت زیادہ ہاتھ پاؤں اور اپنے بینک اکاؤنٹس کو بچا کر ڈیل کرنا پڑتی ہے جس کے لیے ''کیش ان ہینڈ'' ہونا ضروری ہے۔ تم شیطان کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے۔ تمہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ آفس میں کتنی رقم کرنسی کی شکل میں موجود رہتی ہو گی؟''

''کم و بیش بیس لاکھ......'' توصیف نے جواب دیا۔

''ویری گڈ......'' شاکر کی آنکھوں میں بڑی معنی خیز اور دل خوش کن چمک پیدا ہوئی۔ ''سمجھ لو کہ ہمارا کام آسانی سے ہو جائے گا۔ اب میں تمہیں اپنے منصوبے کے بارے میں بتاتا ہوں۔''

توصیف ہمہ تن گوش ہو گیا۔

☆☆☆

ویٹنگ روم میں بے روزگار افراد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ آج ہفتے کا دن تھا۔ توصیف سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق، ہفتے کے روز سیکنڈ ہاف میں وہاں ضرورت مندوں کا رش زیادہ ہوا کرتا تھا اور شاکر نے انہی اوقات میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔

توصیف سے ملاقات کے بعد شاکر نے ''سیریل کلر'' والی اس ہارر اینڈ مسٹری مووی کی روشنی میں دو اہم کام کیے تھے۔ نمبر ایک، وہ ایک فیک سی وی کے ساتھ اپنی رجسٹریشن کرانے ''تھرڈ پارٹی کارپوریشن'' کے آفس پہنچ گیا تھا۔ اس کے سی وی کے اندر درج معلومات تمام کی تمام فرضی تھیں۔ اس نے اپنے ''سی این آئی سی'' کی کاپی بعد میں دینے کا کہہ دیا تھا۔ ایک ہزار روپے رجسٹریشن فیس ادا کر کے اس نے اپنا مقصد پا لیا تھا۔ اسٹاف کہاں بیٹھتا ہے۔ انور شامی کا کمرا کیسا ہے۔ اس پر کہاں کہاں سے نگاہ رکھی جا سکتی ہے۔ یہ اس کے منصوبے کا سب سے نازک حصہ تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ انور شامی جس کمرے میں بیٹھتا تھا، اس کی عقبی کھڑکی میں ایک ٹرانسپیرنٹ گلاس نصب تھا جس کے آر پار بڑی وضاحت سے دیکھا جا سکتا تھا۔

شاکر نے اسی کھڑکی کے توسط سے ایک زیرِ تعمیر بلند و بالا عمارت دیکھ لی تھی جہاں فنشنگ وغیرہ کا کام چل رہا تھا۔ ابھی وہ بلڈنگ آباد نہیں ہوئی تھی۔ انور شامی کا آفس فورتھ فلور پر واقع تھا لہٰذا اس غیر آباد بلڈنگ کے چوتھے فلور سے انور شامی کی بھرپور نگرانی کی جا سکتی تھی، کسی ایسے کمرے میں بیٹھ کر جہاں سے انور شامی کا روم دِکھتا ہو......شاکر اس وقت ایک ایسے ہی غیر آباد کمرے کی کھڑکی کے ذریعے اپنے شکار پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ دوربین نے اس کا کام نہایت ہی سہل کر دیا تھا۔ اسے انور شامی اور اس کے آفس کا منظر کرسٹل کلیئر نظر آ رہا تھا۔ شاکر نے ایک بات نوٹ کی تھی۔ بے روزگار افراد کو شامی کا اسٹاف ہی ڈیل کر لیتا تھا۔ باس کے کمرے میں صرف وہی لوگ جاتے تھے جنہیں کوئی ضروری کام ہوتا تھا جیسا کہ ہنڈی کے ذریعے ملک سے باہر پیسا بھجوانا یا اپنی کوئی قیمتی شے گروی رکھوا کر قرضہ حاصل کرنا......وغیرہ۔

شاکر کے دوسرے اہم کام کا تعلق اس کے شکار کی بیوی نادرہ کنول سے تھا۔ بھلے ناکام ہی سہی مگر وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال سے متجاوز تھی۔ اس نے اپنے حلیے اور لباس میں کچھ ایسی تبدیلیاں کیں کہ وہ دیکھنے والوں کو ادھیڑ عمر نظر آئے۔ باقی کے مراحل اس نے اپنی ایکٹنگ سے طے کر لیے تھے۔ آج اس کے دماغ میں موجود ایکٹنگ کا کیڑا بہت خوش تھا۔

توصیف سے ملاقات کے اگلے ہی روز وہ صبح ساڑھے نو بجے ڈائمنڈ ہائٹس کے نزدیک موجود تھا۔ اس کی جیب میں ایک نقلی رسید بک بھی تھی جس پر کسی فلاحی ادارے کا نام بھی چھپا ہوا تھا۔ ایسا کوئی ادارہ شہر میں موجود نہیں تھا۔ پچھلی رات اس نے ایک کمپیوٹر ڈیزائنر سے، اے فور سائز کے پیپر پر ''مددگار ویلفیئر ٹرسٹ'' کے نام سے کچھ رسیدیں پرنٹ کروالی تھیں۔ ان رسیدوں کو اس نے مہارت سے کاٹ کر اسی سائز کے سادہ پیپرز پر اس طرح پیسٹ کر لیا تھا کہ بادی النظر میں وہ ایک رسید بک ہی دکھائی دیتی تھی۔ یہ محض نادرہ کنول کا اعتماد جیتنے کے لیے تھا۔

انور شامی کی وہائٹ ہونڈا سوک جب ڈائمنڈ ہائٹس سے روانہ ہوگئی تو شاکر نے بلڈنگ کے چوکیدار کو کھٹی میٹھی گولیاں کھلانے کے بعد اوپر کی راہ لی۔ جلد ہی وہ تھرڈ فلور پر، اپارٹمنٹ نمبر تین سو چار کے سامنے کھڑا تھا۔ کوریڈور بالکل سنسان پڑا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ ڈور بیل بجادی۔

اسے محض تیس سیکنڈ انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد اپارٹمنٹ کا دروازہ کھل گیا اور ایک پستہ قامت قبول صورت عورت نے جھانک کر باہر دیکھا۔ اپنے سامنے ایک ادھیڑ عمر شریف النفس شخص کو کھڑے پاکر اس کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔

''معاف کیجیے گا خاتون......'' نادرہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی شاکر بڑے شائستہ انداز میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام فیاض الدین ہے اور میں ''مددگار'' ویلفیئر ٹرسٹ کی جانب سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں......''

بات کے اختتام پر شاکر نے اپنی جیب سے رسید بک اور پین نکال لیا۔ نادرہ نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

''یہ نام میں نے پہلی بار سنا ہے۔ آپ کا ادارہ کس نوعیت کے فلاحی کام کرتا ہے؟''

''مددگار ویلفیئر ٹرسٹ پچھلے پانچ سال سے مصروفِ عمل ہے۔'' شاکر بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ''ہم اپنے ادارے کی تشہیر نہیں کرتے۔ شاید اسی لیے یہ نام آپ کو اجنبی سا محسوس ہورہا ہے۔ بہرکیف...... ہمارا ادارہ یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی کفالت کرتا ہے۔ بعض مخیر حضرات حسبِ توفیق ادارے کی خدمت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے نمائندے گھر گھر جاکر بھی لوگوں سے مدد کی اپیل کرتے ہیں۔ امید ہے، اس کارِخیر میں آپ بھی اپنا حصہ ڈالنا پسند فرمائیں گی۔ اس فی سبیل اللہ کے کام کا بڑا اجر ہے۔''

''آپ ایک منٹ ٹھہریں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ بند کرکے اندر چلی گئی۔

شاکر کا مقصد پورا ہوگیا۔ وہ درحقیقت، یہاں یہ دیکھنے آیا تھا کہ نادرہ کنول کا قد کاٹھ، حلیہ اور وضع قطع کیسی ہے۔ اس نے کیسا لباس پہن رکھا ہے اور کس نوعیت کی جیولری اس کے روزمرہ کے استعمال میں ہے۔ یہ سارے نکات اس کے منصوبے کی کامیابی کے لیے نہایت ہی اہم تھے۔

دروازہ دوبارہ کھلا اور نادرہ پانی کے ایک گلاس کے ساتھ نظر آئی۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ عقب میں چھپا رکھا تھا۔ وہ پانی سے بھرے ہوئے گلاس کو شاکر کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''آج موسم صبح ہی سے خاصا گرم ہے فیاض صاحب۔ آپ ٹھنڈا پانی لیں۔''

شاکر نے اپنے رچائے ہوئے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے، اکڑوں بیٹھ کر نہایت ہی تمیز کے ساتھ پانی پیا پھر تشکرانہ لہجے میں بولا۔ ''جزاک اللہ۔''

نادرہ نے اس کے ہاتھ سے پانی کا خالی گلاس لے لیا پھر اپنا دوسرا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ دو ہزار روپے ہیں۔ فی الحال، میں اتنا ہی کرسکتی ہوں۔''

''آپ کا اتنا تعاون بھی ہمارے ٹرسٹ کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔'' شاکر نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''قطرہ، قطرہ مل کر ہی دریا بنتا ہے۔'' پھر توقف کرکے رسید بک کھولتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''میں آپ کو اس عطیے کی رسید بنادیتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں فیاض صاحب......'' وہ چٹانی لہجے میں بولی۔ ''یہ معاملہ میرے اور اللہ کے بیچ ہے اور ایسے معاملات میں کاغذ کے اس پرزے کی کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی اہمیت۔''

''اس کم بخت شیطان کو کیسی صاحبِ عرفان بیوی ملی ہے۔'' شاکر نے بہ زبانِ خاموشی خود سے کہا۔

''جیسی آپ کی مرضی خاتون......'' شاکر نے نادرہ کنول کی طرف دیکھتے ہوئے سادگی سے کہا۔ ''بہرحال آپ کا شکریہ۔''

نادرہ نے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کرلیا تو شاکر تھرڈ فلور کے دوسرے اپارٹمنٹس کو بھی ٹرائی کرنے لگا۔ اس کا کام کماحقہ، ہوگیا تھا لیکن یہ فارمیلیٹی صرف اس مقصد کے لیے تھی کہ اگر نادرہ دروازے کی آڑ سے اسے دیکھ رہی ہو تو اسے یقین ہوجائے کہ وہ کوئی چلتا پھرتا فراڈیا نہیں بلکہ واقعتاً مددگار ویلفیئر ٹرسٹ کا نمائندہ ہے۔

آئندہ روز اس نے توصیف سے ملاقات کی اور بتایا۔ ''میں نے اپنے منصوبے کے حوالے سے ہوم ورک مکمل کرلیا ہے۔ اس ہفتے کی دوپہر ہم میدانِ عمل میں اتریں گے۔''

''ہم......؟'' توصیف نے شاکی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ابھی تک تم نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں

کہ اس کھٹ راگ میں میرا کیا کردار ہوگا۔''

''بہت ہی مختصر مگر دھانسو کردار۔'' شاکر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''مگر کیا......؟''

''جس بلڈنگ کے فورتھ فلور پر ''تھرڈ پارٹی کارپوریشن'' کا آفس ہے، اس کے داخلی گیٹ کے دائیں بائیں کیا ہے؟'' توصیف کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے سوال کرڈالا۔

''بائیں طرف ایک فوٹو کاپی والا بیٹھا ہے جس کے پاس پرنٹ آؤٹ وغیرہ کا بھی بندوبست ہے بلکہ کمپیوٹر سے متعلق وہ ہر نوعیت کا کام کرتا ہے......اور دائیں طرف ایک بینک کی آن لائن برانچ ہے۔''

''یس! بینک کی آن لائن برانچ!'' شاکر نے توانا لہجے میں کہا۔''اور اس کا ''اے ٹی ایم'' والا کیبن......''

شاکر نے ''اے ٹی ایم'' بوتھ کے لیے ''کیبن'' کا لفظ محض آسانی کے لیے بولا تھا تاکہ توصیف اس کی بات سمجھ لے۔ توصیف نے اثبات میں گردن ہلائی اور الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''اس سب کا کیا مطلب ہوا؟''

''تم اپنا کردار اچھی طرح ذہن نشین کرلو توصیف!'' شاکر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''ہفتے کی سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان تم اس اے ٹی ایم کے انتہائی نزدیک موجود رہو گے، اس طرح کہ اے ٹی ایم کے اندر داخل ہونے اور وہاں سے باہر نکلنے والے کسی بھی شخص کو تمہارا چہرہ نظر نہ آئے۔ یہ کیسے ممکن ہوگا، اس کے بارے میں سوچنا تمہارا کام ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

''اس دوران میں تمہاری نگاہ اے ٹی ایم پر جمی رہے گی۔ تین اور چار بجے کے درمیان تمہارا سابق باس اور میرا ٹارگٹ انور شامی بلڈنگ سے باہر نکلے گا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا لفافہ ہوگا۔ زیادہ امکان اے فور سائز والے براؤن یا وائٹ لفافے کا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی شاپنگ بیگ ہو۔ وہ چپ چاپ اے ٹی ایم والے بوتھ میں داخل ہوگا اور اس لفافے یا شاپنگ بیگ کو اے ٹی ایم مشین کے کی پیڈ پر رکھ کر فوراً ہی باہر نکل آئے گا اور کسی طرف دیکھے بغیر، تیزی سے چلتے ہوئے واپس بلڈنگ میں چلا جائے گا۔ یہاں سے تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔''

شاکر چند لمحات کے لیے خاموش ہوا۔ پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔''شیطان جیسے ہی اے ٹی ایم سے باہر نکلے، تم نے اندر داخل ہو کر اس کے چھوڑے ہوئے سامان کو اٹھانا ہے اور چپ چاپ کسی بھی سمت نکل جانا ہے...... سمجھ گئے نا؟''

''سمجھ تو گیا مگر یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ انور شامی وہاں کیا رکھ کر جائے گا؟'' توصیف کے ذہن کی الجھن اس کے ہونٹوں پر آگئی۔

''دس لاکھ روپے......!'' شاکر نے انکشاف کرتے ہوئے بتایا۔''پانچ لاکھ تمہارے اور پانچ لاکھ میرے۔''

توصیف کی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ اس نے اضطراری انداز میں پوچھا۔''اور انور شامی ایسا کیوں کرے گا؟''

''میں اس شیطان کو ایسا کرنے پر مجبور کردوں گا۔'' شاکر نے مضبوط لہجے میں کہا۔''تم اپنے کردار پر فوکس کرو......باقی سب مجھ پر چھوڑدو۔''

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی نا......؟'' توصیف نے متذبذب انداز میں پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔'' شاکر پُروثوق لہجے میں بولا۔''میری گارنٹی ہے اور اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو صاف انکار کردو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ہمارے راستے الگ ہوجائیں گے لیکن......''

شاکر نے سنسنی خیز موڑ پر بات ادھوری چھوڑی تو توصیف نے تڑپ کر پوچھا۔''لیکن کے بعد کیا؟''

''میں نے تو اس مہم کو سر کرنے کی ٹھان لی ہے۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔''اگر تم ساتھ چھوڑ جاؤ گے تو مجھے اس کردار کے لیے کسی اور پارٹ ٹائم آرٹسٹ کا بندوبست کرنا پڑے گا اور وہ بندہ یہ رول محض پانچ ہزار میں کرڈالے گا......''

''میرا وہ مطلب نہیں تھا جیسا تم سمجھ رہے ہو۔'' توصیف نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔''میں تمہارا ساتھ چھوڑنے کے بارے میں غلطی سے بھی نہیں سوچ سکتا۔ بس، ذہن میں الٹے سیدھے خیالات آرہے تھے اس لیے پوچھ لیا۔''

''ذہن انسان کو بہکانے میں بڑی مہارت رکھتا ہے اس لیے زندگی کے اہم معاملات میں ذہن کی نہیں، ہمیشہ دل کی سننا چاہیے۔'' شاکر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''اور یہ مشن ہم دونوں کی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل

ہے۔"

"میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔" توصیف نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تم جو کہو گے، میں کروں گا۔"

"ویری گڈ!" شاکر نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "اب میں تمہیں چند اہم نکات سمجھا دینا چاہتا ہوں۔"

توصیف نے کہا۔ "میں پوری توجہ سے سُن رہا ہوں۔"

"اے ٹی ایم بوتھ کے اندر خفیہ سیکیورٹی کیمراز نصب ہوتے ہیں۔" شاکر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جو وہاں ٹرانزیکشن کرنے والوں کی حرکات وسکنات کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ بعض کیمراز تو اوپن ہوتے ہیں اور بعض بالکل چھپے ہوئے لہٰذا تمہارا چہرہ کسی قسم کی ریکارڈنگ کا حصہ نہیں بننا چاہیے اور اس کے لیے تم چند چیزوں کا لازمی استعمال کرو گے۔"

"مثلاً کون سی چیزیں؟" توصیف نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"اگرچہ موسم خاصا گرم ہو رہا ہے لیکن پھر بھی تم ہڈی پہن کر وہاں جاؤ گے اور جب اے ٹی ایم بوتھ میں داخل ہونے لگو تو تم ہڈی کے بالائی حصے کا استعمال کرتے ہوئے اپنے چہرے کو مکمل طور پر چھپا لو گے۔" شاکر اسے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔ "اس کے علاوہ تم اپنی آنکھوں پر سن گلاسز اور ہاتھوں میں گلوز ضرور پہنو گے۔ یہ سب اہم احتیاطی تدابیر ہیں۔ اگر تم نے میری ہدایات پر من و عن عمل کیا تو اس واقعے کے بعد ہونے والی پولیس انکوائری کبھی بھی تمہاری سمت رخ نہیں کرے گی۔ جب کسی بھی ریکارڈ میں تمہارا چہرہ اور فنگر پرنٹس محفوظ نہیں ہوں گے تو کوئی تمہارا ایک بال بھی بانکا نہیں کر سکے گا۔"

"مجھے ایک بات کا سخت افسوس ہے یار......" توصیف نے دکھی لہجے میں کہا۔

شاکر نے ترنت دریافت کیا۔ "کون سی بات؟"

"شوبز نے تم جیسے عبقری کی قدر نہیں کی؟" توصیف نے کہا۔

"جو انسان خود اپنی قدر کرنا نہیں جانتا، دنیا میں کوئی اس کی قدر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور یہ راز میں نے سالہا سال کے تجربے سے پایا ہے۔" شاکر نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ہم ذرا اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیں۔ اس کے بعد اپنی قدر کرنے کا پروگرام شروع کیا جائے گا۔"

"انشاء اللہ!" توصیف نے ٹھوس انداز میں کہا۔

شاکر کے چہرے پر عزم و استقلال کے رنگ چمکنے لگے۔

☆☆☆

"تھرڈ پارٹی کارپوریشن" کے آفس میں اس وقت کافی رونق نظر آ رہی تھی۔ ویٹنگ روم میں ایک درجن سے زیادہ افراد اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب ضرورت مند تھے اور بڑی اُمیدیں لے کر وہاں پہنچے تھے۔ کاش! اس سے آدھی اُمیدیں بھی انہوں نے اللہ سے باندھی ہوتیں تو یقیناً ان کے دن پھر گئے ہوتے...... اے کاش!

اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔ انور شامی نے لنچ کر لیا تھا اور اپنے کمرے میں موجود تھا۔ شاکر دوربین کی مدد سے اس کے آفس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آج وہ ایک بوڑھے شخص کے گیٹ اَپ میں تھا اور خاصا چاق چوبند دکھائی دیتا تھا۔ یہ وہ گیٹ اپ نہیں تھا جس میں وہ نادرہ کنول سے ملنے گیا تھا۔ اب نادرہ اگر اسے اس روپ میں دیکھتی تو کبھی نہ پہچان پاتی کہ یہ وہی شخص ہے جو چند روز پہلے اپنے ٹرسٹ کے لیے اس سے عطیہ مانگنے آیا تھا۔ اداکاری کے ساتھ ہی شاکر سوانگ بدلنے کا بھی ماہر تھا۔

یہ ایکشن کا وقت تھا۔ وہ ایکشن جس کے لیے اس نے اچھی خاصی ریہرسل کی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے ڈائیلاگ مارے تھے اور آواز کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا تھا۔ پھر خود کو پرفیکٹ پا کر سراہا بھی تھا۔ عملی قدم اٹھانے سے پہلے اس نے توصیف کو فون کیا۔

"ہاں بھئی! کیا پوزیشن ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں ریڈی ہوں۔" توصیف نے جواب دیا۔

"اور میں تمہارے سابق باس کا ڈیڈی ہوں۔" شاکر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم آنکھیں اور کان کھول کر میرے بچے کا انتظار کرو۔"

"او کے باس...... میرے موجودہ باس!" توصیف نے فرمانبرداری سے کہا۔ "مجھے اپنا رول یاد ہے۔"

"شاباش!" شاکر نے یہ کہتے ہوئے لائن کاٹ دی۔ "آل دی بیسٹ!"

توصیف کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے ایک ایسے سیل فون سے انور شامی کے لینڈ لائن نمبر پر فون کیا جس کے اندر لگی ہوئی سم اس کے نام پر رجسٹرڈ نہیں

تھی۔ یہ سب حفظِ ماتقدم کے طور پر تھا تا کہ بعد میں اسے ٹریس یا ٹریک نہ کیا جاسکے۔

پہلی ہی گھنٹی پر انور شامی نے اس کی کال اٹینڈ کرلی۔ اس کے ''ہیلو'' کے جواب میں شاکر نے بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔

''میں ''ایس کے'' بول رہا ہوں۔ تمہاری بیوی اس وقت میرے قبضے میں ہے۔''

''ایس کے......!'' شامی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''کون ایس کے؟''

''سیریل کلر!'' شاکر نے دبنگ آواز میں کہا۔ ''اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں نادرہ کنول کو شوٹ کردوں گا۔ میں نے تمہاری بیوی کو ایک کرسی پر باندھ رکھا ہے۔ اس کے دونوں بازو، دونوں ٹانگیں اور کمر نائیلون کی رسیوں کی جکڑ میں ہیں۔ میں نے اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا ہے تا کہ یہ چیخ چلا کر میرے کام کو مشکل نہ بنا سکے۔ یہ پستہ قامت، پُرکشش عورت اس وقت مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر ہے۔ نادرہ نیلی پھول دار شرٹ اور بلیک شلوار میں غضب کی لگ رہی ہے۔ چاند کی شکل کے بُندے اس کے کانوں میں بہت اچھے لگتے ہیں اور اس کے بالائی ہونٹ کا مسّا تو میرا دماغ خراب کررہا ہے لیکن......'' شاکر نے ڈرامائی انداز میں توقف کرنے کے بعد خوف ناک لہجے میں کہا۔

''لیکن میں عورتوں کو پامال نہیں کرتا، صرف قتل کرتا ہوں اور وہ بھی ان عورتوں کو جن کے شوہر میرا مطالبہ پورا کرنے میں پس و پیش سے کام لیتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

شاکر کو خود اپنی پرفارمنس پر یقین نہیں آرہا تھا۔ آج وہ اپنی زندگی کی سب سے عمدہ اداکاری کررہا تھا۔ دوربین اس کی آنکھوں پر تھی اور سماعت انور شامی کی آواز پر فوکس تھی۔

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' انور شامی نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔

''صرف دس لاکھ روپے اور وہ بھی بڑے نوٹوں کی شکل میں۔'' شاکر نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میری مطلوبہ رقم کو کسی لفافے میں ڈالو اور چپ چاپ اپنے آفس سے باہر نکل آؤ۔ تمہارے آفس والی بلڈنگ کے دائیں طرف ایک بینک ہے۔ تم اس بینک کے اے ٹی ایم بوتھ میں جا کر رقم والا لفافہ اے ٹی ایم مشین کے کی پیڈ پر رکھ دینا اور پیچھے دیکھے بغیر واپس آجانا۔ جب تم اپنی کرسی پر آکر بیٹھو گے تو میں نادرہ سے تمہاری بات کرادوں گا اور ہاں......'' اس نے لمحاتی توقف کیا پھر دھمکی آمیز سفاکی سے بولا۔

''کوئی ہوشیاری اور چالاکی بالکل نہیں۔ میرا ایک شوٹر باہر تمہارے ویٹنگ روم میں بیٹھا، میرے حکم کا انتظار کررہا ہے۔ تم میرے بندے کو اپنے روم میں بیٹھے بیٹھے بھی دیکھ سکتے ہو۔ اس بندے نے دھاری دار شرٹ پہن رکھی ہے اور اس کے سَر پر سرخ رنگ کی پی کیپ ہے۔ اس نے کانوں میں ہینڈ فری لگا رکھا ہے اور وہ مسلسل میرے رابطے میں ہے۔ کیا تم نے میرے بندے کو دیکھ لیا......؟''

شاکر کے سوال کرنے سے پہلے ہی شامی ویٹنگ روم میں جھانک چکا تھا اور وہاں، شاکر کا بتایا ہوا شوٹر موجود تھا۔ اور وقفے وقفے سے وہ شامی کو دیکھ بھی رہا تھا۔ اس بندے کا درحقیقت شاکر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بے چارہ تو اپنے روزگار کے سلسلے میں وہاں آیا ہوا تھا مگر سیریل کلر (شاکر) کی اسٹوری کی روشنی میں وہ بندہ انور شامی کو کوئی پروفیشنل کلر ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس شوٹر کے بارے میں سوچ کر شامی کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

''میرا شوٹر مجھے بتارہا ہے کہ تم اپنی پیشانی سے پسینا پونچھ رہے ہو۔'' شاکر نے دوربین کی مہربانی سے شامی کو پسینا پونچھتے دیکھ کر سخت لہجے میں کہا۔ ''تم سوچ بچار میں پڑ کر اپنا اور میرا وقت برباد کررہے ہو۔ اگر تم نے آئندہ دس منٹ میں میرے حکم کی تعمیل نہیں کی تو میں نادرہ کی کھوپڑی اڑادوں گا اور اگر تم نے کوئی ایمرجنسی الارم بجانے یا پولیس کو فون کرنے کی حماقت کی تو میرا شوٹر تمہارے کمرے میں گھس کر اپنی سائیلنسر لگی گن کا پورا کلپ تمہارے سینے میں اتار دے گا۔ دس لاکھ بچانے کے چکر میں تم میاں بیوی حرام موت مرو گے۔''

''اور اگر...... میں تمہارا مطالبہ پورا نہ کروں...... تو؟'' شاکر کی سماعت سے شامی کی غیر متوقع آواز ٹکرائی۔

''تم کیا کرو گے مسٹر سیریل کلر......؟''

''کلر صرف کِل کرتا ہے۔'' شاکر نے سفاک لہجے میں جواب دیا۔ ''میں تمہاری بیوی کو بڑی عبرت ناک موت دوں گا۔''

''بولو نہیں، کر کے دکھاؤ......!'' شامی نے بے خوف آواز میں کہا۔

شاکر کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ شامی سے ایسے ردِّعمل کی توقع نہیں کررہا تھا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''کیا بک رہے ہو......؟''

شامی اس کے استفسار پر دھیان دیے بغیر بکتا چلا گیا۔ ''اس عورت نے میری زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ میں دن رات اس کے مرنے کی دعائیں کرتا ہوں کیونکہ میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کی جان لینے کی ہمت نہیں رکھتا۔ مسٹر سیریل کلر! اللہ نے تمہیں میرے لیے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ تم نادرہ کو ختم کر دو...... میں تمہارے اس عظیم احسان کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

شاکر نے لائن کاٹ دی اور دوربین کے توسط سے اس شیطان کو غصیلی نظر سے گھورتے ہوئے غرایا۔ ''حرام زادے! تم ایک ایسی نیک عورت کی موت کے لیے بددعائیں کرتے ہو جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے ایک لمحہ نہیں سوچتی۔ تم اس دنیا کے بدقسمت بلکہ غلیظ ترین انسان ہو۔ تم نے ہیرا پھیری سے جتنا بھی مال جمع کر رکھا ہے، اس پر تمہارا نہیں، نادرہ کا حق ہے اور یہ حق اسے میں دلاؤں گا، عین قانونی اور شرعی طریقے سے......!''

اس کے بعد شاکر نے توصیف کو کال کی۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ''ہمارے منصوبے میں تھوڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ تم فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔ شام کو ہوٹل میں ملاقات ہو گی۔''

''اور تم......؟'' توصیف نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں کام مکمل کرنے کے بعد ہی آؤں گا۔'' شاکر نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اور وہ بھی دس لاکھ روپے کے ساتھ......!''

قبل اس کے کہ توصیف کوئی اور سوال کرتا، شاکر نے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا اور اس غیر آباد عمارت سے نکل کر آباد عمارت کی جانب بڑھ گیا۔ وہ آباد عمارت جس کے فورتھ فلور پر ''تھرڈ پارٹی کارپوریشن'' کا آفس تھا۔

☆☆☆

شام کے چھ بجے تھے۔ شاکر اپنے گھر میں بیٹھا توصیف کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ توصیف کو بہت بڑی خوش خبری سنانے والا تھا اور عین ممکن تھا کہ توصیف کو اس کے کارنامے کی خبر ہو چکی ہو۔ یہ آج کی بریکنگ نیوز تھی۔ شاکر کی نگاہ بھی ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھی۔ ملک کے تمام نیوز چینلز اسی واقعے کی کوریج کر رہے تھے۔

''آج دن دہاڑے ایک عمر رسیدہ شخص نے کمال کر دیا۔'' ٹی وی پر بتایا جا رہا تھا۔ ''وہ شہر کے کاروباری علاقے میں واقع ''تھرڈ پارٹی کارپوریشن'' کے آفس میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے داخل ہوا۔ اس نے کارپوریشن کے ایم ڈی انور شامی کے کمرے میں گھس کر اسے بیدردی سے زدوکوب کیا اور گن پوائنٹ پر اس سے دس لاکھ روپے وصول کرنے کے بعد اسے اٹھا کر کھڑکی پر دے مارا۔ مذکورہ کھڑکی میں ایک ٹرانسپیرنٹ کنگ سائز گلاس جڑا ہوا تھا۔ اس خوفناک تصادم کے نتیجے میں کھڑکی کا شیشہ تیز چھناکے کی آواز سے ٹوٹا اور انور شامی کا جسم کھڑکی کے فریم سے گزرنے کے بعد چار منزل نیچے سڑک پر جا گرا۔ شامی کی بدقسمتی کہ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ کئی گاڑیاں اس کے اوپر سے گزر گئیں اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ اس لمبی سفید زلفوں والے بوڑھے کی شامی سے کیا دشمنی تھی تاہم پولیس یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے کہ وہ قاتل ڈاکو بوڑھا ہرگز نہیں تھا۔ پولیس کو بلڈنگ کے کوڑے دان سے ایک سفید بالوں والی وگ، ایک اوورکوٹ اور ایک چائنا میڈ ڈپلی کیٹ کھلونا گن ملی ہے۔ اور ان چیزوں کی شناخت ہو گئی ہے۔ مقتول کے آفس اسٹاف نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ یہ تمام چیزیں اسی غضب ناک ڈاکو سے تعلق رکھتی ہیں۔ پولیس نے میڈیا کو بہت نپا تلا اور انوکھا بیان دیا ہے......'' اس کے بعد پولیس آفیسر کی میڈیا سے ہونے والی گفتگو کا فوٹیج بھی دکھایا گیا۔

''ہم بہت جلد اس مجرم کو گرفتار کر لیں گے۔'' آفیسر کہہ رہا تھا۔ ''یہ ماننا پڑے گا کہ اس بندے نے بڑی مضبوط منصوبہ بندی کے بعد یہ کرائم کیا ہے۔ اس کی پرفارمنس اور ٹائمنگ کمال کی تھی۔ ایسا تو صرف ہالی ووڈ کی بلاک بسٹر ایکشن موویز ہی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔''

شاکر نے ٹی وی کو آف کرنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ان لمحات میں ملی جلی جذباتی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اسے انور شامی کی المناک موت کا ملال تھا اور نہ ہی دس لاکھ روپے پا لینے کی خوشی۔ اس کے رگ و پے میں صرف ایک ہی سرمستی دوڑ رہی تھی کہ...... اس وقت ملک بھر کے نیوز چینلز اس کی پرفارمنس کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے اور اسے ہالی ووڈ کی ٹکر کا ایکشن ہیرو بھی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہ اس کے نیچرل ٹیلنٹ کے لیے کسی اکیڈمی ایوارڈ سے کم نہیں تھا۔

اور...... اس کے دماغ میں قیام پذیر ایکٹنگ کا کیڑا...... اس کی مسرت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو ایسے کسی کیڑے کا حامل ہو......!

❖❖❖

قاتل سلاخیں

امجل بھٹی

زندگی اور موت کا رشتہ بڑا عجیب ہے... دونوں کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ زندگی کب ساتھ چھوڑ رہی ہے اور کب موت اپنی بانہوں میں لینے کو تیار ہے... قاتل و مقتول کے درمیان جاری خوں ناک آنکھ مچولی... قاتل کو معلوم تھا وہ کسی کی جان کیوں لے رہا ہے... مگر مقتول ہونے والے قطعی لاعلم تھے کہ ان کے حصے میں یہ اذیت ناک موت کیوں آرہی ہے کون دے رہا ہے...

سنسنی خیز لمحوں اور خونی واقعات میں ڈوبی پُرتجسس کہانی کے انوکھے تانے بانے

نئی دہلی سرما کی بارشوں میں نہا کر نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔ فضا میں چھائی آلودگی کی چادر اپنی کثافت سمیت باکھری نالے میں بہہ گئی تھی۔ ہلکی ہلکی رم جھم میں سرد ہوا کا راج تھا۔

شانتی نگر کے مہنگے ترین علاقے کی دو رُویہ ہموار سڑک پر دفتروں سے لوٹنے والوں کی گاڑیوں کا ایک ازدحام تھا۔

دہلی کے چند بڑے اور جدید ترین سہولیات سے آراستہ پرائیویٹ اسپتال "رام سرائے" کی سنگِ سرخ سے

بنی کثیر المنزلہ عمارت بارش میں دُھل کر بے حد اُجلی لگ رہی تھی۔

اسپتال کی عمارت سے متصل اسپتال کے مالکان ڈاکٹرز کی پُرتعیش رہائش گاہیں تھیں۔ایسی ہی ایک رہائش گاہ سے ایک بڑی سی گاڑی برآمد ہوئی اور اسپتال کے مین گیٹ سے نکل کر گاڑیوں کے ازدحام میں شامل ہوگئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور کی سفید براق وردی میں منحنی سا بنگالی ڈرائیور تھا۔عقبی نشست پر صحت کی سرخی سے چمکتے ہوئے چوڑے چہرے والا ڈاکٹر ونود پر بہار کر ٹریک سوٹ میں ملبوس پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔

محض پینتالیس سال کی عمر میں اس کا شمار دیش کے چند ماہر ترین دل کے امراض کے ڈاکٹرز میں ہوتا تھا۔بلاشبہ وہ اپنے شعبے کا قابل ترین ڈاکٹر تھا۔اس کے مریضوں میں لوک سبھا کے ممبران سمیت کئی وزیر، مشیر تھے۔دولت، شہرت اور عزت اس کے گھر کی لونڈی تھی۔

ڈاکٹر ونود نے اپنی طرف کے شیشے گرا رکھے تھے۔یخ ٹھنڈی ہوا گاڑی میں بھر گئی تھی۔ڈرائیور اپنی کپکپی پر بمشکل قابو پائے ہوئے تھا۔وہ، ڈاکٹر کے معمولات سے بخوبی واقف تھا۔اسی سبب اس نے پہلے ہی ہیٹر آن نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر ونود کی نظریں کھڑکی سے باہر دوڑتی گاڑیوں پر مرکوز تھیں۔وہ خود کو خالی الذہن رکھنے کی مشق میں مصروف تھا۔ہوا کے ساتھ کبھی کبھار بارش کے چھینٹے بھی اس کے چہرے سے آ٭ تے تھے اور وجود میں سرد ترین لہر دوڑا دیتے مگر وہ خود کو موسم سے ہم آہنگ کر رہا تھا۔

گزشتہ سات سال سے وہ روزانہ اسی وقت جم خانہ واک کے لیے جاتا تھا۔روزانہ ایک گھنٹے کی پُرسکون اور سرسبز و شاداب ٹریک پر واک اسے پُرسکون کر دیتی تھی۔اس کا خیال تھا کہ مصروف اور تناؤ بھری زندگی کا روزانہ کا یہ ایک گھنٹا جہاں اسے پُرسکون کر دیتا تھا۔وہیں اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بھی ابھارتا تھا اور اچھی صحت کے لیے تو ویسے ہی واک ضروری تھی۔اسی سبب انتہائی مجبوری یا شدید ترین موسمی کیفیت ہی اسے اس ایک گھنٹے کی پسندیدہ ترین مصروفیت سے دور رکھ سکتی تھی۔

آج کا موسم اسے روک نہیں پایا تھا۔

گاڑی سڑک پر درمیانی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔مسلسل مشق کے سبب وہ دماغ کو ہمہ قسم کے خیالات اور سوچوں سے آزاد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔سکون کی کیفیت نے اسے ڈھانپ لیا تھا۔

تھوڑی دیر میں گاڑی جم خانہ کی وسیع کار پارکنگ میں پہنچ گئی۔ڈرائیور مزاج آشنا تھا۔اس نے مہارت سے رفتار کم کرتے ہوئے بے حد آہستگی سے بریک لگایا اور اپنے برابر کی سیٹ پر پڑا چھاتا اٹھا کر گاڑی سے اتر آیا۔دروازہ بھی اس نے آہستگی سے بند کیا تھا۔

پارکنگ میں ابھی برائے نام ہی گاڑیاں تھیں۔ممبران کی آمد کا سلسلہ سورج غروب ہونے کے بعد شروع ہوتا تھا اور پھر شہر کے اس مہنگے ترین جم خانے کی رونقیں رات گئے تک رہتی تھیں۔

ڈرائیور نے عقبی دروازہ کھولا تو ڈاکٹر ونود گاڑی سے باہر نکل آیا۔وہ خاصی حد تک موسم سے ہم آہنگ ہو چکا تھا۔

ڈرائیور نے بند چھاتا اس کے ہاتھ میں تھما دیا تاکہ ضرورت محسوس ہونے پر وہ چھاتے کو کھول کر اوپر تان لے۔

واکنگ اور جاگنگ ٹریک کا گیٹ نمبر سات پارکنگ ایریا میں ہی تھا۔گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ڈاکٹر ونود اس دروازے سے ٹریک پر آ گیا۔

اس سمے ٹریک ویران پڑا تھا۔اس موسم میں جاگنگ وغیرہ کرنے والوں کو تو سنکی ہی سمجھا جا سکتا مگر ڈاکٹر ونود کو اس کی پروا نہیں تھی۔

جاگنگ ٹریک بے حد وسیع تھا اور اس کے کئی حصے تھے۔مصنوعی جنگل اور مصنوعی پہاڑیوں سے بھی یہ ٹریک گزرتا تھا۔کہیں کہیں مصنوعی جھرنے تھے اور ان کے پاس ستانے کے لیے سنگی بینچیں لگائی گئی تھیں۔

پرندوں کی چہچہاہٹ کے درمیان اس خوب صورت ترین ٹریک پر گزرنے والا وقت یادگار ہوتا تھا۔یہ اور بات کہ اس کی فیس بہت زیادہ تھی مگر جس طبقے کے لوگ یہاں آتے تھے، ان کے لیے یہ معمولی سی رقم تھی۔

ٹریک کی سرخ بھربھری مٹی پانی کو جذب کر چکی تھی اور اس پر قدم جمانا آسان تھا۔ڈاکٹر ونود ٹریک پر دھیمے قدموں سے چل پڑا۔بارش رک چکی تھی۔پرندوں کی ملی جلی آوازیں اور سکوت......مل کر انسانوں اور عمارتوں کے اس جنگل میں ایک بے حد فطری احساس لیے ہوئے تھا۔

درختوں کے پتوں سے ٹپکنے والے بارش کے قطرے اِکّادُکّا ڈاکٹر پر گر رہے تھے۔سردی کے باوجود ان قطروں کا گرنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

رفتہ رفتہ قدموں کی رفتار بڑھنے لگی اور ڈاکٹر ونود جیسے کیف آور رتہ در تہ بادلوں میں اترا جا رہا تھا۔

ایک مصنوعی پہاڑی پر ہرے پتوں والی بیل سے

ڈھکی سنگی بینچ پر اس کا دل بیٹھنے کو چاہا مگر ابھی تو صرف آغاز ہی تھا۔ ڈاکٹر ونود نے فیصلہ کیا کہ وہ دوسرے چکر پر جب تھکا ہوا ہو گا تو اس بینچ پر کچھ دیر ستائے گا۔ ٹریک، دائرے کی صورت میں پھیلا ہوا تھا۔

وہ آگے بڑھ گیا۔

اچانک ڈاکٹر ونود کو اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر گھمایا۔ قدموں کی دھپ...... دھپ سنائی دی اور ایک طویل القامت...... دُبلا پتلا سا شخص جو دھیمے انداز میں دوڑتا ہوا اس کے پاس سے ہو کر آگے بڑھ گیا۔

طویل القامت شخص نے ٹریک سوٹ پر برساتی اوڑھ رکھی تھی اور برساتی کا ہڈ اس کے سر پر تھا۔ ڈاکٹر، اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا البتہ عقب سے اس کے پیروں میں پرانے سے جوگرز دیکھ کر اس نے بُرا سا منہ ضرور بنایا۔ ڈاکٹر کے دماغ میں کچھ کھٹکنے لگا۔ سکون کے بادل دھیرے دھیرے دور کھسکنے لگے۔ دماغ میں جو کھٹکنے لگا تھا وہ پکڑ میں نہیں آ رہا تھا۔

ڈاکٹر کا دماغ اُلجھن کو پکڑنے میں لگ گیا جس کے سبب وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا۔

طویل القامت شخص درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ٹریک اسی جھنڈ کے اندر سے گزرتا تھا۔

ڈاکٹر ونود جھنڈ میں داخل ہونے لگا تو لاشعور میں اتھل پتھل مچاتی اُلجھن پکڑ میں آ گئی۔ طویل القامت شخص نے سخت بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کسی قسم کی رسمی علیک سلیک نہیں کی تھی جو یہاں آنے والی کمیونٹی کا وتیرہ تھا۔

یہی حرکت ڈاکٹر ونود کے لاشعور میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ اس بات کا احساس اسے فوراً ہی ہو جاتا مگر خاصی مشق کے سبب وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں تھا۔ اسی سبب یہ ناگوار احساس قدرے تاخیر سے ہوا تھا۔ ناپسندیدگی کے جذبات کے ساتھ اُس کے دماغ میں اس شخص کے حوالے سے تجسّس جاگ اٹھا کہ وہ کون تھا جس نے بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ظاہر ہے اس خاص الخاص جگہ پر جاگنگ کرنے والا کوئی عام شخص نہیں تھا۔ یہی سوچتا ہوا وہ جھنڈ میں داخل ہوا۔ یہ جگہ ٹریک کی خوب صورت ترین جگہوں میں سے ایک تھی۔ دونوں اطراف کے درختوں پر پرندوں کے لیے خوب صورت گھر بنائے گئے تھے۔ ایک مخصوص جگہ پر کبوتر اور دیگر پرندوں کو دانا وغیرہ کھلانے کا بھی اہتمام تھا۔ بارش رک چکی تھی جس کے سبب اس مخصوص جگہ پر کبوتر جمع ہو کر مخصوص آوازیں نکال رہے تھے۔

ڈاکٹر کو وہ ناپسندیدہ شخص کہیں نظر نہیں آیا۔ سامنے بھی ٹریک کا ایک طویل ٹکڑا ویران نظر آ رہا تھا۔ وہ شخص جتنا بھی تیز دوڑتا اتنی دیر میں وہ ٹکڑا عبور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کہاں غائب ہو گیا؟ ڈاکٹر نے رک کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ وہ شخص کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک نامعلوم احساس کے سبب ڈاکٹر کے وجود میں خوف سرایت کر گیا۔ اس نے پھریری سی لی اور قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ وہ جلد از جلد اس جُھنڈ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ رہنمائی کے بورڈ پر اس جھنڈ کا نام گوشۂ عافیت لکھا ہوا تھا۔ اچانک ڈاکٹر ونود کو لگا کہ وہ نگاہ کے دھوکے کا شکار ہو رہا ہے۔ سبزے کی ایک دیوار سی برق کے مانند اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

اس نگاہ کے دھوکے سے بچنے کے لیے اس نے آنکھیں جھپکانے کی کوشش کی مگر آنکھیں کھلنے سے پہلے سبزے کی وہ دیوار ڈاکٹر ونود کے وجود سے ٹکرا چکی تھی۔ اصولی طور پر تو اس تصادم کے نتیجے میں اسے دور جا گرنا چاہیے تھا مگر اس دیوار میں پوشیدہ لکڑی کے نکیلے ٹکڑے اس کے جسم میں اتر گئے تھے۔ حقیقی معنوں میں وہ لکڑی کے ٹکڑوں میں پرو گیا تھا۔ گردن میں اترنے والے ایک ٹکڑے نے اسے چیخنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ ناقابلِ بیان اذیت کے شکنجے میں کس کر وہ تڑپنے لگا۔ لمحوں میں اس کے قدموں میں خون کا دریا سا بہہ نکلا تھا۔

اسی وقت وہ طویل القامت برساتی پوش ایک درخت کے عقب سے برآمد ہوا اور ڈاکٹر ونود کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

نزع کی کیفیت میں تڑپتے ہوئے ڈاکٹر ونود نے اُس کی طرف دیکھا۔ استخوانی چہرے پر دو سرمئی آنکھیں...... جن میں موت کی سی ٹھنڈک جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

شانتی نگر کا پولیس اسٹیشن آج اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ نئی دہلی کا پولیس چیف بہ نفسِ نفیس وہاں براجمان تھا۔ مقتول ڈاکٹر ونود کے زیرِ علاج وزیرِ داخلہ یہاں آنے کے لیے اپنے آفس سے نکل چکا تھا۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ میڈیا اور دیگر بااختیار لوگ بھی پولیس اسٹیشن کو رونق بخشنے والے تھے۔ شانتی نگر تھانے کا انچارج انسپکٹر راج ملہوترا تھا۔ پینتالیس کے پیٹے کا وہ ایک قابل آفیسر تھا۔ وقوعہ کی اطلاع ملتے ہی وہ دستیاب نفری کے ساتھ فوراً جائے وقوعہ پہنچ گیا

تھا۔ مزید نفری کے لیے اس نے پولیس لائن ایمرجنسی کال کر دی تھی۔

انسپکٹر راج کی ہدایت کے مطابق اس کے نائب سب انسپکٹر وش سنگھ نے پولیس لائن سے آنے والی بھاری نفری کے ساتھ جم خانہ کو گھیر لیا تھا۔ کسی کو آنے اور جانے کی اجازت نہیں تھی۔

انسپکٹر راج نے ہیڈ کوارٹر سے کرائم سین کی ٹیم کے آنے سے پہلے جائے وقوعہ کے گرد سرخ پٹیاں لگوا دی تھیں اور جم خانہ کے سینئر منیجر سمیت وہاں موجود سبھی افراد کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا تھا۔ اکثریت ملازمین کی تھی۔ صرف چند ممبران تھے جو ایک لابی میں روک لیے گئے تھے۔

کرائم سین کی ٹیم نے ضروری شواہد اکٹھے کر لیے تھے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج کر انسپکٹر راج کو کچھ فراغت ملی تو جم خانہ کے توپ قسم کے ممبران کے زہریلے دباؤ کا اُسے سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح روکے جانے پر وہ لوگ سخت سیخ پا تھے۔

انسپکٹر راج نے بھی ماتھے پر بل ڈال لیے۔ ممبران سے تفتیشی سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ ظاہر ہے ان کے جم خانے میں موجودگی کے دوران دیش کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر کا بہیمانہ انداز سے قتل ہوا تھا۔ ان لوگوں سے تفتیش تو ہونی تھی۔

ان لوگوں کے بیانات ریکارڈ ہوتے ہی انسپکٹر راج نے ان لوگوں کو اجازت دے دی۔ ملازمین وغیرہ البتہ ایک طرح سے حراست ہی میں تھے۔

اس دوران میں جم خانہ کی مینجمنٹ کے دیگر افراد بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ سب انسپکٹر وش سنگھ نے انسپکٹر راج کی اجازت کے بعد انہیں جم خانے میں داخلے کی اجازت دی تھی۔ یہ لوگ بے حد متفکر اور پریشان نظر آرہے تھے۔ محفوظ اور پرائیویسی کے اعتبار سے سرفہرست جم خانے میں ڈاکٹر ونود کا قتل...... جم خانے کی ساکھ کو برباد کرنے کے لیے کافی تھا۔

مصروفیت کے سبب انسپکٹر راج، پولیس چیف کی کال نہیں سن سکا تھا۔ دوسری دفعہ کال آئی تو اس نے ریسیو کرتے ہوئے معذرت کی۔

پولیس چیف بھی سمجھ دار بندہ تھا۔ اس نے معذرت قبول کرتے ہوئے پوچھا۔ ''قاتل کا کوئی سراہاتھ آیا؟''

''آ ہی جائے گا سر۔'' انسپکٹر راج نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ ''اڑتالیس گھنٹے نہیں گزرنے دوں گا۔ قاتل حوالات میں ہوگا۔ قتل کے انداز سے ظاہر ہو رہا ہے، کوئی جنونی ہے جو ڈاکٹر سے انتہا درجے کی نفرت کرتا تھا۔''

''گڈ۔'' پولیس چیف اپنے آفیسر کے انداز سے متاثر ہوا۔ ''یہاں کب پہنچ رہے ہو؟ میں چاہتا ہوں میڈیا اور ڈاکٹر ونود کے لواحقین کا سامنا بھی تم ہی کرو۔'' پولیس چیف نے یہ فیصلہ ابھی ابھی کیا تھا۔

''آپ بے فکر ہو جائیں، میں دیکھ لوں گا۔''

پولیس چیف نے انداز بدل کر قدرے دبی آواز میں کہا۔ ''ہوم منسٹر آرہا ہے۔ اس کی دم کو آگ لگی ہوگی۔ اس کے بائی پاس سے پہلے ہی ڈاکٹر مارا گیا ہے۔ کوئی کڑوی بول جائے تو پی جانا۔''

انسپکٹر راج کا حلق کڑوا ہو گیا۔ دولت اور منفی جوڑ توڑ کے سبب نااہل سیاست دانوں کو کلیدی عہدوں پر براجمان دیکھ کر وہ پہلے ہی دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ میڈیا اور عام لوگوں کے سامنے ایسے سیاست داں جب انتظامی عہدے داروں کو لتاڑتے تھے تو انسپکٹر راج کا دل اُن کی گردن مروڑ دینے کو کرتا تھا۔

پولیس چیف، انسپکٹر راج کی دلی کیفیت سے بے خبر رابطہ منقطع کر چکا تھا۔

اگلے چند گھنٹے حقیقی معنوں میں انسپکٹر راج کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ مسلسل بجنے والا موبائل فون اس نے اپنی ایک اور اسسٹنٹ نینا اگروال کو سونپ دیا تھا۔ جو ہر کال کرنے والے کو ''صاحب بے حد مصروف ہیں'' کہہ رہی تھی۔

ڈاکٹر ونود کی لاش دریافت کرنے والے جم خانہ کے ملازمین میں سے کسی نے اپنے موبائل فون کے کیمرے سے لاش کی تصویر بنالی تھی۔ وہ تصویر اپنی تمام تر وحشت ناکی کے ساتھ سوشل میڈیا پر بے حد تیزی سے وائرل ہو رہی تھی۔ سوشل میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا پر ایک طوفان برپا تھا۔

بے حد سفاکی اور انتہائی تکلیف دہ طریقے سے ڈاکٹر ونود کو قتل کرنے والے قاتل سے انتہائی نفرت کے ساتھ ساتھ بے حد تجسس بھی ابھر رہا تھا۔ وہ کون تھا؟ اور اتنے تکلیف دہ طریقے سے ڈاکٹر ونود کو قتل کرنے کی وجہ کیا تھی؟

ڈاکٹر ونود کے لواحقین، ساتھی ڈاکٹرز اور ہوم منسٹر کے غم و غصے کا رخ پولیس کی طرف ہو گیا تھا۔ انسپکٹر راج نے بڑی تحمل مزاجی سے اس طوفان کو بند باندھا تھا اور ان لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ اس واقعے کو وقوع پذیر ہونے سے تو پولیس نہیں روک سکی تھی مگر قاتل بہت جلد قانون کے شکنجے میں ہوگا

ہوش وحواس بحال ہونے پر تینوں مذکورہ پارٹیوں کو احساس ہو گیا کہ پولیس ڈپارٹمنٹ پر غصہ فضول تھا۔ قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے انہیں وقت چاہیے تھا۔ تینوں پارٹیاں پسپا ہو گئیں۔

قاتل کی گرفتاری سے متعلق جلد ہی انسپکٹر راج کے اعتماد کا لیول خاصا نیچے آگیا۔ اُسے یقین تھا کہ جم خانے میں لگے سیکیورٹی کیمروں میں سے کسی نہ کسی کیمرے نے ڈاکٹر کی زندگی کے آخری لمحات اور مبینہ قاتل کی فوٹیج ضرور لی ہو گی مگر یہ جان کر سارے ارمانوں پر اوس پڑگئی کہ وی، آئی، پی ممبران کی پرائیویسی اور سیکیورٹی کیمروں کی موجودگی کے ذہنی دباؤ سے ممبران کو دور رکھنے کے لیے جم خانے کے اندر کہیں کیمرے لگائے ہی نہیں گئے تھے۔ باقاعدہ ممبران کی رائے شماری کے بعد ہی اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا تھا۔

البتہ جم خانے کے باہر کی جانب سیکیورٹی کیمروں کی بھرمار تھی۔ سیکیورٹی کیمروں کا سارا ڈیٹا اب پولیس تحویل میں تھا۔

انسپکٹر راج نے اپنے ماتحت عملے کے ساتھ جم خانے میں قتل کے وقت موجود ملازمین سے کڑی چھان بین کی تھی۔ تین ملازم شک کے دائرے میں آئے تھے۔ ڈاکٹر ونود کے قتل کے وقت وہ تینوں وقوعہ کے آس پاس ہی تھے۔

ان تینوں کو حوالات منتقل کر کے باقی ملازمین کو بنا اطلاع شہر چھوڑنے کی وارننگ کے بعد جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر ونود کے قتل کی رپورٹ مرتب کرواتے ہوئے بھوک سے بے حال انسپکٹر راج برگر کے ساتھ انصاف کر رہا تھا کہ اسسٹنٹ نینا نے دبی مسکراہٹ کے ساتھ اطلاع دی۔

”سر! گھر سے کال آئی ہے۔“

اس کال کا نہ سننا قیامت برپا کر سکتا تھا۔ انسپکٹر راج نے اشارے سے موبائل فون طلب کیا۔ دوسری طرف سے ریلوے انجن سا گرجا۔

”تمہارا فون کس کے پاس تھا؟ کون ہے یہ لڑکی؟“

انسپکٹر راج نے برگر کا ٹکڑا بمشکل حلق سے اتارا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ”میری اسسٹنٹ ہے نینا......“ اس کی بات کاٹ دی گئی۔

”واہ......کیا موسیقیت ہے جناب کے لہجے میں...... نیں......نا......“

انسپکٹر راج کا سر پیٹنے کو دل چاہا۔ ”مصروفیت اتنی تھی کہ فون اُسے پکڑوانا پڑا۔ مم...... میں تھوڑی دیر میں گھر آرہا ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں...... وہیں رہو...... نیں...... نا...... کے ساتھ۔“ ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

نینا سمیت سبھی ماتحتوں نے بمشکل سنجیدگی برقرار رکھی ہوئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ہر سیر کا سوا سیر اکثر اوقات اس کے گھر ہی میں پایا جاتا ہے۔

انسپکٹر راج نے واش روم کا رخ کیا تو دبی مسکراہٹیں اور ذومعنی جملے ان کے لبوں سے آزاد ہو گئے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ونود کی آخری رسومات کے اگلے روز ہی ”رام سرائے“ ٹرسٹ کا نمائندہ ایک قانونی اور ایک معاشی ماہر کے ساتھ آچکا۔ اس نے آنے کی باقاعدہ اطلاع دی تھی۔ اس لیے ”رام سرائے“ اسپتال کے باقی ماندہ تینوں مالکان پہلے سے ہی اس کے انتظار میں تھے۔ ان مالکان میں بالکل سفید بالوں والا ڈاکٹر جوشی...... خوب آگے نکلی توند والا سیاہ رُو ڈاکٹر منوج اور نازک اندام سی جواں سال ڈاکٹر دیا اوبرائے شامل تھے۔

دیا اوبرائے نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی جبکہ باقی دونوں بیوی، بچوں والے تھے۔

کانفرنس روم میں ٹرسٹ کی ٹیم اور تینوں اسپتال مالکان نشستیں سنبھال چکے تو ٹرسٹ کے نمائندے اجیت اگر وال نے ڈاکٹر ونود کی تعزیت کی۔ وہ بے تاثر آواز والا ایک دُبلا پتلا اور لمبا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ رام سرائے ٹرسٹ کا روحِ رواں بھی وہی تھا۔

اجیت اگروال نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”چونکہ ڈاکٹر ونود اب نہیں رہے اس لیے معاہدے کے مطابق ان کے حصے کی آمدنی کا حق دار ٹرسٹ بن گیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔“ آخر میں اس کے ہونٹوں پر غیر محسوس سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔ ان تینوں کو پہلے سے ہی اندازہ تھا کہ اجیت اگروال کی آمد کس سلسلے میں ہوئی ہے۔ تینوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر جوشی نے سپاٹ انداز میں کہا۔

”ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ایک قانونی معاہدہ ہے جس کے ہم پابند ہیں۔ آپ اکاؤنٹس منیجر سے مل کر مالی معاملات طے کر سکتے ہیں۔“

اجیت اگروال نے ایک ٹیم ممبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹرسٹ کے وکیل کی تو ضرورت ختم ہو گئی۔ آپ

اکاؤنٹس منیجر کو بلا کر ضروری ہدایت دے دیں۔ ویر کمار، اس کے ساتھ مل کر معاملات طے کر لے گا۔“

ویر کمار نامی مالیاتی ماہر نے سر کو ذرا سا خم دیا۔

تھوڑی دیر بعد ویر کمار، اکاؤنٹس منیجر کے ساتھ رخصت ہو چکا تھا۔ اس دوران چائے اور دیگر لوازمات آ چکے تھے۔

چائے سرو کرنے کی ذمّے داری ڈاکٹر دیا نے سنبھال لی تھی۔ باقی ماندہ دونوں مہمانوں سے شکر کی مقدار کا پوچھ کر اس کی دودھیا اور مخروطی انگلیاں سبک خرامی سے رواں ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر دیا کے ہاتھ سے چائے پکڑتے ہوئے اجیت اگروال نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کپ اپنے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

”اسپتال میں دستیاب جدید ترین سہولتوں سے ٹرسٹ کی خواہش ہے کہ نادار مریض بھی استفادہ کریں۔ خاص طور پر دل کے مریض......“ یہ کہہ کر اس نے جان بوجھ کر وقفہ دیا تو ڈاکٹر جوشی خود کو روک نہیں پایا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ اس بات کی وضاحت کریں۔“ اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں اُبھر آئی تھیں جبکہ ڈاکٹر منوج کی بھی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ ڈاکٹر دیا اضطرابی کیفیت میں چمچ چھوڑ کر انگلیاں مروڑنے لگی تھی۔

اجیت اگروال نے اطمینان سے کیک کا ٹکڑا اٹھایا۔

”آپ کی آمدنی پر کوئی دباؤ نہیں آئے گا جناب! یہ فلاحی کام ڈاکٹر ونود کا حصہ...... جو اَب ٹرسٹ کا ہو گیا ہے...... اس سے انجام دیا جائے گا۔“

ڈاکٹر دیا کے سپید چہرے پر جیسے علیٰحدہ سے رکھے گلابی ہونٹوں نے بے اختیار جنبش کی۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے......“ اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ساتھی ڈاکٹرز کی برمے کے مانند چھیدتی ہوئی نظریں اس پر جا رکیں تو گڑبڑا کر اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

اجیت اگروال کی تحسین آمیز نظریں ڈاکٹر دیا پر تھیں۔ ڈاکٹر منوج کی کاٹ دار آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

”قانونی معاہدے میں اس طرح کی کوئی شق نہیں ہے۔ اسپتال کا ایک اعلیٰ معیار اور کسٹمرز کا بھرپور اعتماد ہے۔ اسپتال کو رفاہی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے آپ کو ہم تینوں کی موت کا انتظار کرنا ہو گا۔“

یہ سنتے ہوئے ڈاکٹر دیا کی نگاہوں کے سامنے ڈاکٹر ونود کی چھلنی لاش آ گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔

اجیت اگروال نے کیک کا ٹکڑا اپنی آنکھوں کے سامنے گھمایا۔ ”جانتا ہوں۔ اس رفاہی کام کے لیے آپ لوگوں کی متفقہ رضامندی ضروری ہے۔“ اس نے ”متفقہ“ پر خاص زور دیا تھا۔ ”آپ رضامند نہیں ہوئے تو ٹرسٹ اپنے طور پر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“ اس نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا اور اسے چباتے ہوئے بولا۔ ”اگر شری متی ڈاکٹر دیا نے آپ لوگوں سے اختلاف کیا تو ووٹ برابر ہو جائیں گے۔“ اس کا انداز معنی خیز ہو گیا تھا۔ ”اس صورت میں ڈیڈ لاک پیدا ہو گا اور میں سمجھتا ہوں ایسی صورتِ حال ٹرسٹ اور آپ لوگوں کے لیے کچھ تسلی بخش نہیں ہو گی۔“

ڈاکٹر جوشی نے فوراً ہی معاملے کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ اس نے گرم مزاج...... ڈاکٹر منوج کے پاؤں پر پاؤں کا دباؤ ڈالا۔ ”ہمیں تھوڑا ٹائم دیں۔ ڈاکٹر ونود کے بعد کچھ سُجھائی نہیں دے رہا۔ ہم جلد ہی آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں گے۔“

اجیت اگروال نے چائے کا گھونٹ لیا۔ ”بالکل...... بالکل......ٹرسٹ کو کوئی جلدی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں ڈاکٹر دیا پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر ونود کی پوسٹ مارٹم اور کرائم سین کی مکمل رپورٹ بڑی سرعت سے مکمل کر لی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں تو صرف موت کی وجہ کا تعین تھا جو ظاہر ہے نکیلی لکڑیوں کے ٹکڑوں کے سبب ہوئی تھی۔ ان ٹکڑوں نے ڈاکٹر کے اندرونی اعضا کو بُری طرح سے گھائل کیا تھا۔

کرائم سین کی رپورٹ میں خاصا مواد تھا۔ بڑی مہارت سے سرسبز بیلوں اور تازہ توڑی گئی مضبوط شاخوں کی مدد سے چھ فٹ کے لگ بھگ اونچا اور آٹھ فٹ چوڑا ایک ٹکڑا تیار کیا گیا تھا جس میں درجنوں لکڑی کے نکیلے ٹکڑے نیزے کے مانند جوڑے گئے تھے۔ اس مقصد کے لیے بھی درختوں کی مضبوط شاخیں استعمال کی گئی تھیں۔ تیز دھار آلے سے چھیلے گئے ٹکڑے بھی جائے وقوعہ پر پائے گئے تھے۔

اس قاتل ٹکڑے کو جاگنگ ٹریک کے ساتھ ایک درخت کے برابر بڑی مہارت سے نصب کیا گیا تھا۔ اس ٹکڑے کے ساتھ اسپرنگوں کا استعمال کر کے میکنزم تیار کیا گیا تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر ونود اس قاتل ٹکڑے کی زد میں آیا۔ قاتل نے لمبی بیل کے ایک ٹکڑے کی مدد سے اس میکنزم کو حرکت

دی۔ اسپرنگوں نے بے پناہ تناؤ کو آزاد کیا تو وہ قاتل ٹکڑا برق رفتار داخلی دروازے کے مانند جیسے کھلا اور پل بھر سے بھی کم وقت میں نیزے کی انی جیسے لکڑی کے ٹکڑے چھ انچ سے بھی زیادہ ڈاکٹر ونود کے جسم میں اتر گئے اور وہ بڑی اذیت ناک موت کا شکار ہو گیا۔

بیل کا ٹکڑا گواہی دے رہا تھا کہ قاتل آخری لمحے تک ڈاکٹر ونود کے قریب تھا۔

انسپکٹر راج کا دماغ پیشہ ورانہ مہارت سے سوچ رہا تھا۔ قاتل نے جس اطمینان سے وہ قاتل ٹکڑا تیار کر کے استعمال کیا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ جم خانہ اور خاص طور پر جاگنگ ٹریک والے حصے میں اس کی آزادانہ نقل و حرکت تھی۔ شدید سردی اور بارش کا اس نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس حصے کی طرف کوئی آیا نہیں تھا اور وہ اپنے منصوبے کی تعمیل میں جُتا رہا۔

اس موقع پر ایک طاقتور خیال نے سر اٹھایا۔ قاتل...... ڈاکٹر ونود کے معمولات سے بھرپور آگاہی رکھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ موسم کی سختی ڈاکٹر ونود کو روک نہیں پائے گی۔

انسپکٹر راج نے فوراً یہ پوائنٹ نوٹ کر لیا۔ اس سے پہلے بھی اس نے چند پوائنٹس نوٹ کر رکھے تھے۔

کرائم سین کی رپورٹ پڑھتے ہوئے انسپکٹر راج کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ جائے وقوعہ پر کئی جگہوں سے کرائم سین والوں نے فنگر پرنٹس اٹھائے تھے۔ خاص طور پر ایک نیم تراشیدہ لکڑی کے ٹکڑے پر یہ نشان بے حد واضح تھے۔ اس ٹکڑے کو نیزے کی شکل دیتے ہوئے ادھورا ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ غالباً ٹیڑھا اور کمزور ہونے کی وجہ سے اسے مسترد کر دیا گیا تھا۔

انسپکٹر راج کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ انگلیوں کے نشانات قاتل ہی کے تھے۔ انسپکٹر راج تیزی سے حرکت میں آیا۔ نیشنل ڈیٹا بیس سے مدد لی گئی۔ فوراً ہی انگلیوں کے نشانات کی شناخت ہو گئی۔ مبینہ قاتل کا نام گروناتھ تھا۔ اس کی شناختی تصویر کے ساتھ دیگر کوائف بھی تھے۔

انسپکٹر راج نے تصویر پر نظر ڈالی۔ وہ استخوانی چہرے والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جس کے چہرے سے کینہ اور سخت گیری نمایاں تھی۔

گروناتھ کے کوائف پر نظر ڈالتے ہوئے انسپکٹر راج اچھل پڑا۔ اس کے پیشے کے خانے میں ”مالی“ لکھا ہوا تھا۔

”اسے جانتے ہو؟“

تینوں ملازم میز پر جھک گئے۔ اگلے ہی پل تینوں کے چہروں پر شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ ایک کھردرے اور مضبوط ہاتھوں والے بوڑھے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”سرکار! یہ گروناتھ ہے۔ میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔“

اس سے زیادہ سننے کا انسپکٹر راج کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ اسٹینڈ پر ٹنگی اپنی ٹوپی اتار کر کمرے سے باہر بھاگا تھا۔

تینوں ملازمین ہکا بکا اسے دیکھتے رہے تھے۔

دو گاڑیوں پر پولیس پارٹی تیز رفتاری سے جم خانے کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ گاڑیوں سے زیادہ تیز رفتاری سے انسپکٹر راج کا دماغ رواں تھا۔

ڈاکٹر ونود کے مزاج کے بارے میں تو وہ نہیں جانتا تھا مگر ایک خاکہ سا دماغ میں جگہ بنا رہا تھا۔ ڈاکٹر ونود نے جم خانہ آمد و رفت کے دوران غالباً گروناتھ کی کسی غلطی یا کوتاہی پر اسے اتنا بُرا بھلا اور پھٹکارا تھا کہ وہ سینے میں ڈاکٹر ونود کے لیے اتنا کینہ اور آگ جمع کر بیٹھا کہ بھیانک طریقے سے اس کی جان لینے پر تل گیا۔ اس کے علاوہ ایک جم خانے کے معمولی ملازم اور ڈاکٹر ونود جیسی قدآور شخصیت کے درمیان وجہ عناد کیا ہو سکتی تھی؟ قتل کے کیس میں سب سے اہم ”وجہ قتل“ ہوتی ہے اور انسپکٹر راج کے خیال میں وجہ قتل سامنے آ گئی تھی۔

گاڑیاں جم خانہ پہنچ گئی تھیں۔ گروناتھ کے ہاتھ آتے ہی ہر سوال کا جواب ملنے والا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوا کہ کبوتر جال میں پھنسنے سے پہلے ہی اُڑ چکا ہے۔ گروناتھ منظر سے غائب تھا۔

تھوڑی دیر کی تفتیش سے یہ بات تقریباً یقینی ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر ونود کا قاتل...... گروناتھ ہی ہے۔ اس کی ڈیوٹی جاگنگ ٹریک کے اطراف ہی تھی۔ ڈاکٹر ونود کے قتل کے وقت وہ ڈیوٹی پر تھا۔ ڈاکٹر ونود کے قتل کی خبر پھیلنے سے کچھ دیر پہلے اس کی ڈیوٹی آف ہوئی تھی اور وہ اپنے کوارٹر کی طرف واپس چلا گیا تھا۔

گروناتھ چھڑا چھانٹ تھا اور جم خانہ کے ملازمین کے لیے مخصوص کوارٹرز میں ہی رہائش پذیر تھا۔ پولیس پارٹی نے کوارٹر پر چھاپا مارا تو وہ بھی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

اگلے چند منٹ میں راجدھانی کی ساری پولیس فورس کو

گروناتھ کی گرفتاری کا ٹاسک مل چکا تھا۔ اپنے تجربے کی روشنی میں انسپکٹر راج نے جو وجۂ قتل اخذ کی تھی، اسے مزید تقویت مل گئی تھی۔

کوئی ایک ماہ پہلے ٹریک پر کچھ خشک ٹہنیاں گر گئی تھیں۔ جن پر بے خیالی میں ڈاکٹر ونود کا پاؤں آگیا تھا۔ جاگرز کا نرم سول انہیں روک نہیں پایا تھا اور ایک ٹہنی سول کو پھاڑتے ہوئے ڈاکٹر کے پاؤں کو معمولی زخمی کر گئی تھی۔

شومیٔ قسمت گروناتھ قریب ہی پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر کسی آتش فشاں کے مانند پھٹا اور اس کوتاہی کا ذمے دار گروناتھ کو جان کر اس پر چڑھ دوڑا۔

گروناتھ کو بُرا بھلا کہنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نے اسے تھپڑ بھی مارا تھا۔ بلاشبہ ڈاکٹر کا ردِعمل کچھ زیادہ ہی شدید تھا۔

دیکھنے والوں نے بتایا تھا کہ گروناتھ ہاتھ باندھے خاموش کھڑا رہا تھا۔ ڈاکٹر اسے نوکری سے بھی نکلوانے کے درپے تھا مگر یہاں جم خانہ کی انتظامیہ آڑے آئی۔ وہ اپنے تجربہ کار مالی سے کسی بھی صورت ہاتھ دھونا نہیں چاہتے تھے اور ٹریک کی صفائی وغیرہ کی ذمے داری بھی گروناتھ کی نہیں تھی۔ سو جس کی ذمے داری تھی، اسے اور ایک اسسٹنٹ منیجر کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔

گروناتھ کے دو چار قریبی جان پہچان والے ملازمین سے سوال و جواب کے بعد انسپکٹر راج نے گروناتھ کا شخصی خاکہ بنالیا۔

گروناتھ خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا۔ اسے شاعری میں دلچسپی تھی اور خود بھی شعر کہتا تھا۔ شاید کوئی عشق کی چوٹ تھی جو اس نے شادی نہیں کی تھی۔

ڈیوٹی سے آف ہو کر اس کا وقت اپنے کوارٹر اور پھر شام کو چند گھنٹے اپنے ہم مزاج لوگوں میں گزرتا تھا۔ شام کو لالہ جی کے چائے خانے پر لکھاریوں اور شاعروں کی بیٹھک ہوتی تھی۔ گروناتھ بھی وہیں چلا جاتا تھا۔ انسپکٹر راج کا اندازہ تھا کہ ڈاکٹر کی زیادتی نے اس حساس طبع شاعر کو جوالا مکھی بنا دیا تھا۔ اندر ہی اندر پکنے والا لاوا بڑی منصوبہ بندی سے ڈاکٹر ونود کی جان لے گیا۔ معمولی شاخ کا زخم برداشت نہ کر پانے والا کئی شاخوں میں پرو کر آتش فشاں کے مانند پھٹ نہیں سکا تھا۔

گروناتھ گدھے کے سر سے سینگوں کے مانند غائب تھا۔ اس کے موبائل فون نمبر کا ڈیٹا حاصل ہو چکا تھا۔ اس پر سر کھپایا جارہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے قریب کے کچھ لوگ اور رشتے دار شاملِ تفتیش تھے۔

گروناتھ کو اچانک چھاپ لینے کی خواہش و کوشش ناکام ہوگئی تو ڈاکٹر ونود کے قتل سے متعلق پہلا پریس ریلیز جاری کر دیا گیا۔ چند ہی منٹوں میں گروناتھ کو پورا دیش مبینہ قاتل کے طور پر جان چکا تھا۔

☆☆☆

سیاہ رُو اور درشت مزاج ڈاکٹر منوج...... رتنا اپارٹمنٹ کے ایک لگژری اپارٹمنٹ میں تھا۔ میڈیکل کی ایک طالبہ انجلی مہتا کو اس نے اپارٹمنٹ میں داشتہ کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ انجلی سے حاصل ہونے والی جسمانی آسودگی کے بدلے میں وہ، انجلی کے تعلیمی و دیگر اخراجات برداشت کر رہا تھا۔

انجلی......ڈاکٹر منوج کی زندگی کا ایک پُرکیف راز تھا۔ موقع میسر آتے ہی وہ ہفتے میں ایک رات تو ضرور انجلی کے ساتھ گزارتا تھا۔

یہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی جو تیزی کے ساتھ ڈھل رہی تھی۔ انجلی تھک ہار کر گہری نیند میں ڈوب چکی تھی۔ ڈاکٹر منوج کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ دراصل ایک پُرکیف رات کے سُرور کو دوبالا کرنے کے لیے ڈاکٹر منوج ایک خاص قسم کی ڈرگ قلیل مقدار میں لیتا تھا۔ جس کے ضمنی اثرات میں سے ایک نیند کا اُڑ جانا تھا۔

ڈاکٹر منوج کچھ دیر انجلی کے پہلو میں پڑا کسمساتا رہا۔ انجلی کے ہلکے خراٹے اس کی طبع پر ناگوار گزر رہے تھے۔ آخرکار اس نے بستر چھوڑ دیا۔ خوب بڑھی توند پر گاؤن ڈال کر اس نے کچن کا رخ کیا۔ نیم گرم دودھ میں ڈرائی فروٹ گرینڈ کر کے اس نے مگ بھرا اور شیشے کا دروازہ کھول کر باہر ٹیرس پر آگیا۔

نیم گرم فضا سے یخ بستہ فضا میں آیا تو ٹھٹھر سا گیا۔ جلدی سے اس نے خودساختہ انرجی ڈرنک کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور ریلنگ سے توند ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ نیچے دھند لکے میں لپٹا نئی دہلی خوابیدہ، خوابیدہ سا اسے اپنے قدموں میں بچھا نظر آرہا تھا۔ انجلی کے سونے کے بعد وہ ہمیشہ ہی ٹیرس پر آجاتا تھا۔ انرجی ڈرنک کے گھونٹ لیتے ہوئے ڈاکٹر منوج نے نیچے نظر ڈالی۔ رتنا اپارٹمنٹ کی باؤنڈری وال روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ باؤنڈری وال کے اوپر نیزے کی انی جیسی حفاظتی گرل تھی۔ گرل کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیسے اس کے دماغ میں یہ سوال چکرایا کہ اگر کوئی بلندی سے اس گرل پر گر جائے تو اس کا کیا حشر ہوگا؟

اس دفعہ وجود میں اٹھنے والی پھریری سردی کے سبب نہیں تھی۔ دماغ کی اسکرین پر ڈاکٹر ونود کی شبیہ ابھر آئی۔ خشک لکڑی کے نیزوں میں پرو کر وہ کتنا قابلِ رحم محسوس ہو رہا تھا۔ کتنی تکلیف دہ موت نصیب ہوئی تھی اسے۔

ذہنی رو اس طرف پلٹی تو طبیعت مکدر ہو گئی۔ اس نے بے دلی سے انرجی ڈرنک حلق سے اتارا اور غیر ارادی طور پر ریلنگ کے پاس سے ہٹ گیا۔

اچانک اسے محسوس ہوا کہ اسے نگاہوں کا دھوکا ہوا ہے۔ ٹیرس کے انتہائی کونے میں نصب گیزر کے عقب سے ایک تاریک سایہ سا نکل کر اس کی طرف لپکا تھا۔

جب تک ڈاکٹر منوج کو احساس ہوا کہ یہ نگاہوں کا دھوکا نہیں ہے...... سایہ اس پر جھپٹ چکا تھا۔ خوف کے سبب ڈاکٹر منوج سن سا ہو گیا۔ سائے نے برق کی سی پھرتی سے جھکائی دی۔ اگلے ہی پل ڈاکٹر منوج سائے کے کندھے پر تھا اور پھر اگلے پل کھلی فضا میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

ایک طویل چیخ کے ساتھ یہ لمحاتی سفر اختتام پذیر ہوا۔ بے پناہ درد و تکلیف کے ساتھ ہی ڈاکٹر منوج کا دماغ ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر منوج کی ہلاکت دہلی پولیس کے لیے ایک دھچکے کے مانند تھی۔ قتل سے زیادہ یہ حادثاتی موت معلوم ہوتی تھی مگر ڈاکٹر ونود کے قتل کے پس منظر میں اسے محض حادثہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ٹیرس پر حفاظتی ریلنگ اتنی بلند ضرور تھی کہ اس پر چڑھ کر چھلانگ تو لگائی جا سکتی تھی مگر حادثاتی طور پر اس سے الٹ کر نیچے گرنا ناممکن تھا۔

ڈاکٹر منوج کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار تھا کہ کہیں نیچے گرنے کے وقت وہ نشے میں تو نہیں تھا۔ ممکن تھا نشے کی زیادتی کے سبب وہ ریلنگ پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا ہو۔

ڈاکٹر منوج کے ساتھی ڈاکٹرز اور فیملی جہاں شدید صدمے کی کیفیت میں تھے...... وہاں شرمندگی آمیز حیرت بھی انہیں گھیرے ہوئے تھی۔

ڈاکٹر منوج کی زندگی کا ایک ''پُر کیف راز'' عیاں ہو گیا تھا۔

انجلی مہتا...... پولیس کی تحویل میں تھی اور اس نے رو، رو کر اپنا حال بُرا کر لیا تھا۔

انسپکٹر راج کے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ ڈاکٹر منوج کی حفاظتی ریلنگ میں پروئی ہوئی لاش اور ڈاکٹر ونود کی خشک ٹہنیوں میں پروئی ہوئی لاش...... اس کے دماغ کی اسکرین پر بار، بار گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ دونوں کی موت، حالات و واقعات مختلف ہونے کے باوجود ایک ہی جیسے بے حد تکلیف دہ انداز میں ہوئی تھی۔

انسپکٹر راج کا تجربہ دماغ میں شور برپا کر رہا تھا۔ ایک ہی انداز میں دونوں کی موت کے پیچھے کوئی وجہ ہے...... کوئی بہت بڑی وجہ......

یہ تجربہ کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر منوج کو بھی قتل کیا گیا ہے۔ یہ محض حادثہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال سر اٹھا رہا تھا۔ کیا ڈاکٹر منوج کو بھی گرو ناتھ نے قتل کیا تھا؟ اگر کیا تھا تو اس کی کیا وجہ تھی؟ ڈاکٹر ونود کے ساتھ گرو ناتھ کی دل چھلنی کر دینے والی پرخاش تھی۔ ڈاکٹر منوج کے ساتھ پرخاش کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ یہ بھی عین ممکن تھا کہ ڈاکٹر منوج اور گرو ناتھ کا زندگی میں کبھی سامنا بھی نہ ہوا ہو۔

انسپکٹر راج نے سر کو جھٹک کر گویا گرو ناتھ کو ڈاکٹر منوج کے قتل سے بری الذّمہ قرار دیا۔ یقیناً یہ کوئی اور سلسلہ تھا...... قتل کے انداز میں صرف مماثلت تھی۔

شاید یہ کوئی رقابت کا سلسلہ تھا۔ جو بھی تھا نتیجہ جلد ہی سامنے آنے والا تھا۔ اسسٹنٹ نینا...... انجلی مہتا کے ساتھ سر کھپا رہی تھی جبکہ انسپکٹر وش سنگھ...... رتنا اپارٹمنٹ میں مصروفِ تفتیش تھا۔ پہلی رپورٹ نینا کی طرف سے آئی۔ انجلی نے اعتراف کیا تھا کہ اس کے اپنے ایک ہم جماعت طالب علم کے ساتھ بھی تعلقات تھے۔ مانک نامی یہ طالب علم اپارٹمنٹ میں بھی اس سے ملنے آتا تھا۔ انجلی اور مانک نے مستقبل کے سنہری خواب ساتھ ہی دیکھ رکھے تھے۔

مانک کا تعلق بھی ایک غریب فیملی سے تھا۔ انجلی نے اعتراف کیا کہ مانک نہ صرف ڈاکٹر منوج کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے بلکہ وہ اکثر اوقات مانک کی مالی مدد بھی کرتی رہتی ہے۔

یہ جان کر انسپکٹر راج نے کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ مانک کو چپڑی روٹیوں کی لت لگ چکی تھی۔ رقابت کا شکار ہو کر ڈاکٹر منوج کو وہ قتل نہیں کر سکتا تھا پھر بھی اسے اٹھوانے کے لیے اس نے آرڈر جاری کر دیا۔

ڈاکٹر منوج کی پوسٹ مارٹم اور کرائم سین یونٹ کی رپورٹس موصول ہوئی ہی تھیں کہ سب انسپکٹر وش سنگھ کی کال آ گئی۔ دوسری طرف سے اس کی کامیابی کے احساس سے معمور آواز ابھری۔

''سر! آٹھ گھنٹے کی ٹرم میں ایک الیکٹریشن ہمہ وقت

رتنا اپارٹمنٹ میں کسی ایمرجنسی ضرورت کے لیے موجود ہوتا ہے۔ ڈاکٹر منوج کی ہلاکت کے وقت جس الیکٹریشن کی ڈیوٹی تھی...... وہ ڈیوٹی آف ہونے سے پہلے ہی غائب ہے۔"

انسپکٹر راج نے مداخلت کی۔ "اس کا پتا، ٹھکانا معلوم ہوا؟"

"یس سر! اس کا پورا ریکارڈ ہے۔ ادت چوپڑا اس کا نام ہے اور رہائش پاس ہی ایک جھونپڑپٹی میں ہے۔"

انسپکٹر راج ہیجان زدہ ہوا۔ "تم ساتھی عملے کے ساتھ فوراً چھاپا مارو، میں، تمہاری اگلی رپورٹ کا منتظر ہوں۔"

"میں پہلے ہی نکل چکا ہوں سر۔" سب انسپکٹر روش سنگھ نے مستعدی سے کہا۔

"بہت اچھے۔"

فون چھوڑ کر انسپکٹر راج پہلے کرائم سین کی رپورٹ پر جھپٹا۔ یہاں کامیابی ہی کامیابی اس کی منتظر تھی۔

اپارٹمنٹ میں تین مختلف افراد کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے۔ دو تو ممکنہ طور پر ڈاکٹر منوج اور انجلی کے تھے...... تیسرے ممکنہ قاتل کے ہوسکتے تھے۔

سب سے اہم رپورٹ یہ تھی کہ ڈاکٹر منوج کے گاؤن پر بھی کسی کے فنگر پرنٹ ملے تھے۔

انسپکٹر راج تیزی سے حرکت میں آیا۔ ڈیٹا بیس یونٹ سے مدد لیتے ہوئے درمیانی وقفے میں اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پر نظر ڈالی۔ اس رپورٹ میں کچھ خاص نہیں تھا۔ ماسوائے ڈرگ کی معمولی مقدار کے۔

انسپکٹر راج جانتا تھا کہ یہ ڈرگ کس مقصد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس کا استعمال آج کل عام سی بات ہوتی جارہی تھی۔

میز پر انگلیوں سے طبلہ سا بجاتے ہوئے اس کی نظریں فون پر تھیں۔ وہ...... سب انسپکٹر روش سنگھ کی کال کا منتظر تھا۔ فون سے پہلے ڈیٹا بیس یونٹ کی طرف سے فیکس رپورٹ آگئی۔ فوراً ہی ایک اردلی نے یہ رپورٹ اس کی میز پر لارکھی۔

انسپکٹر راج نے تیزی سے دو صفحوں پر مشتمل رپورٹ پر نظر ڈالی۔ فنگر پرنٹس کی شناخت ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر منوج اور انجلی کے علاوہ تیسرے فنگر پرنٹ کی بھی شناخت ہوگئی تھی۔ ان فنگر پرنٹس کے مالک کا نام ادت چوپڑا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ الیکٹریکل ٹیکنیشن تھا۔ ایڈریس ایک ماڈل جھونپڑپٹی کا تھا۔

انسپکٹر راج فون پر جھپٹا مگر اس سے پہلے ہی سب انسپکٹر روش سنگھ کی کال آگئی۔

"سر! ادت چوپڑا غائب ہے۔ اپنی کھولی میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔"

انسپکٹر راج نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ "ڈاکٹر منوج کا قاتل ادت ہی ہے۔ اس کے فنگر پرنٹ ملے ہیں۔ ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈو اُسے......" یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ دل و دماغ میں کھلبلی سی مچی تھی۔ اس نے ادت کی فائل فوٹو پر نظر ڈالی۔ استخوانی چہرہ، عمر پینتالیس سال، غیر شادی شدہ...... یہ پڑھتے ہوئے دماغ میں کوندا سا لپکا۔ ادت چوپڑا اور گرو ناتھ کی شکل و صورت میں قدرے مشابہت تھی۔ عمریں بھی یکساں تھیں اور دونوں ہی تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا یا پھر اس مماثلت میں کوئی بھید چھپا تھا؟ اس سوال کا سر دست جواب میسر نہیں تھا۔

انسپکٹر راج نے مزید مغز خوری کا ارادہ موخر کردیا۔ وہ ذہنی تھکاوٹ کا شکار ہو رہا تھا اور وہ جانتا تھا ذہنی تھکاوٹ کارکردگی کو بُری طرح سے متاثر کرتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر منوج کی ہلاکت نے ڈاکٹر جوشی اور ڈاکٹر دیا کو بے حد خوف زدہ کردیا تھا۔ وہ دونوں پولیس کی اس رائے سے متفق نہیں تھے کہ ڈاکٹر ونود کو ایک مالی نے محض معمولی سی بات پر بڑی منصوبہ بندی سے قتل کردیا ہے اور اب ڈاکٹر منوج کی ہلاکت...... جس کا ابھی تک کوئی سبب بھی سامنے نہیں آیا تھا۔

ڈاکٹر دیا نے خود کو ایک کمرے میں بند کرلیا تھا۔ وہ پیشہ ورانہ ذمے داریاں بھی نہیں نبھا رہی تھی۔ دو گارڈز اس نے ڈرائنگ روم میں اور دو بیرونی دروازے پر بٹھا رکھے تھے۔ ایک پرانی ملازمہ تھی جو گھریلو معاملات سنبھال رہی تھی۔

ڈاکٹر جوشی کے لیے اس نے بمشکل دروازہ کھولا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس کا باوقار حسن گہنا گیا تھا اور آنکھوں کے نیچے مدہم حلقے نمودار ہوگئے تھے۔

ڈاکٹر جوشی کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ سفید بال بے ترتیب تھے اور چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔

کمرے کے دروازے کو اچھی طرح سے لاک کر کے ڈاکٹر دیا پلٹی اور کپکپاتی آواز میں بولی۔ "ضرور کوئی جنونی قاتل ہمارے درپے ہے۔ لازماً وہ اب ہماری تاک میں ہو گا۔"

ہاتھوں کی کپکپی چھپانے کے لیے ڈاکٹر جوشی نے

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم ملالیں۔ ''میں بھی تم سے سو فیصد متفق ہوں مگر وہ کون ہوسکتا ہے؟ اور اِس میں اُس کا کیا فائدہ ہے؟''

ڈاکٹر دیا کے چہرے پر ہراس اُمڈ آیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''فائدے سے ہٹ کر اُس کا مقصد بدلہ لینا بھی تو ہوسکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کس چیز کا بدلہ؟''

ڈاکٹر دیا نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''ہمارے زیرِعلاج کسی مریض کی ہلاکت ہوئی ہو...... اس کا بھائی، باپ یا اور کوئی چاہنے والا...... اس ہلاکت کا ذمے دار ہمیں جان کر جنونی بن کر ہمارے درپے ہوگیا ہو۔ یہ عین ممکن ہے۔''

ڈاکٹر دیا کی خیال آرائی نے ڈاکٹر جوشی کو سوچنے پر مجبور کردیا۔ یہ قیاس حقیقت بھی ہوسکتا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اس نے کئی لوگوں کا بے حد جذباتی اور متشدد رویّہ دیکھا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس کے دماغ میں تازہ ہوگیا۔

وہ ابھی نوجوان تھا اور ہاؤس جاب کررہا تھا۔ غلط انجکشن کے سبب ایک سینئر ڈاکٹر کے ہاتھوں ایک بچّے کی ہلاکت ہوگئی تھی۔ بعد میں ہلاک ہونے والے بچّے کے باپ نے سینئر ڈاکٹر کو اس کے بچوں سمیت گاڑی میں زندہ جلادیا تھا اور خود بھی خودسوزی کرلی تھی۔

اس واقعے نے بہت عرصے تک ڈاکٹر جوشی کو پریشان رکھا تھا۔

سرد موسم کے باوجود ڈاکٹر جوشی کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔ اسے سانس گھٹتا سا محسوس ہوا۔ خود ہی اٹھ کر اس نے گلاس میں پانی انڈیلا۔ دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے پانی حلق میں انڈیل لیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر دیا، اسے خالی خالی سی نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔

پانی پینے سے ڈاکٹر جوشی کی گھبراہٹ قدرے کم ہوئی تو اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''ہمیں کام ساتھ کرتے ہوئے کئی سال ہوگئے ہیں۔ ہمارے پاس سارا ریکارڈ ہے۔ ہماری پیشہ ورانہ غفلت سے اب تک کتنی جانیں ضائع ہوئی ہیں...... اس کا پتا لگانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔''

ڈاکٹر دیا نے بے اختیار اپنے بے حد سفید ہاتھ سامنے پھیلائے۔ ''کم از کم میرے ہاتھوں سے تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔''

ڈاکٹر جوشی نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''صحیح کہہ رہی ہو...... بلکہ ہم چاروں کے ہاتھوں سے ایسا کچھ نہیں ہوا۔

کئی اموات ہوئی ہیں مگر اس میں ہماری پیشہ ورانہ غفلت نہیں تھی۔''

''یہ ہمارا نقطۂ نظر ہے...... جوشی صاحب! کسی اور کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ایسی ہی کسی موت کو کسی اور نے اپنے نقطۂ نظر سے لیا ہو۔''

ڈاکٹر جوشی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں رفتہ رفتہ اس خیال سے پیچھے ہٹ رہا ہوں کہ ڈاکٹر ونود اور ڈاکٹر منوج کا قاتل کوئی ایسا جنونی ہے جس کے پیارے کی موت ہمارے اسپتال میں ہوئی اور وہ جنونی اس موت کا ذمے دار ہمیں ٹھہراتے ہوئے ہمارے درپے ہے۔''

ڈاکٹر دیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

ڈاکٹر جوشی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''جذبات سے بھرے ہوئے لوگ زیادہ تر جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا تو ہمارے اسپتال میں گزر ہی نہیں ہے۔ تم ہی بتاؤ گزرے سالوں میں ایسا کتنی دفعہ ہوا ہے کہ کسی نے اپنے پیارے کی موت پر واویلا مچایا ہو اور اس موت کا ذمے دار ہمیں ٹھہرایا ہو؟'' یہ کہہ کر وہ سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر دیا کی طرف دیکھنے لگا۔

''آپ مانک رائے کو شاید بھول رہے ہیں۔ یہ کچھ زیادہ پرانی بات بھی نہیں ہے۔ آپریشن ٹیبل پر بیوی کی موت ہوجانے پر اس نے ایک طوفان اٹھادیا......''

ڈاکٹر جوشی نے اس کی بات کاٹی۔ ''مجھے یاد ہے مگر تم بھول رہی ہو کہ بعد میں اس نے ہاتھ جوڑ کر اپنے جذباتی پن پر معافی مانگی تھی۔''

''ممکن ہے یہ معافی محض دکھاوا ہو، وہ دل میں بدلے

کا طوفان چھپائے ہو۔ اس کی دھمکیاں مجھے آج بھی یاد ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر دیا کا ہراس اور بھی نمایاں ہوگیا۔

''آپ کو یاد ہوگا...... اس نے ہمیں چھلنی کر کے مارنے کی دھمکیاں دی تھیں اور ڈاکٹر منوج، ڈاکٹر ونود کو چھلنی کر کے مارا گیا ہے۔'' ڈاکٹر دیا کے چہرے پر جیسے موت کی زردی اتر آئی۔

ڈاکٹر جوشی کو دوبارہ سانس رکتا محسوس ہوا۔ ''ہمیں پولیس کی مدد لینی ہوگی۔ مانک رائے کے علاوہ ایک اور بندہ بھی ہے جو میری نظر میں بہت زیادہ مشکوک ہے۔''

ڈاکٹر دیا لرز اٹھی۔ ''کک...... کون ہے وہ؟''

ڈاکٹر جوشی نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''بدلے اور جنون سے ہٹ کر سوچیں تو ایک ہی شخص ہے جسے ہم چاروں کی موت سے فائدہ ہوسکتا ہے۔''

ڈاکٹر جوشی کے ڈرامائی وقفے نے ڈاکٹر دیا کے جسم سے جیسے جان نکال دی۔ ڈوبتے دل کے ساتھ اسے جسم بے جان پڑتا محسوس ہوا۔

ڈاکٹر جوشی نے اسی انداز میں بات جاری رکھی۔ ''ڈاکٹر منوج اور ڈاکٹر ونود کے بعد ان کے حصے کے شیئر خود بخود ٹرسٹ کو منتقل ہو گئے ہیں۔ ٹرسٹ اب برابر کا حصے دار ہے۔'' ڈاکٹر جوشی کا لہجہ زہریلا ہونے لگا۔ ''آج آیا تھا وہ...... کل چند نادار مریض ہمارے اسپتال آرہے ہیں۔ اُن میں سے کوئی نچلی ذات کا یا پھر مسلمان ہوا تو میں کل کو ڈاکٹر ونود کی روح کو کیا منہ دکھاؤں گا۔'' اس نے بے اختیار اپنے بال نوچے، ڈاکٹر دیا کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے تینوں ساتھی انتہائی متعصب ہندو تھے اور خود کو بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتے تھے۔ نچلی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تو وہ چھوت سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کو چھونا بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔

ڈاکٹر جوشی بڑبڑایا۔ ''وہ مخصوص معاہدہ ہمیں کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

اس بڑبڑاہٹ کی سمجھ ڈاکٹر دیا کو آگئی۔ وہ بولی۔

''معاہدہ ہماری مجبوری تھی۔ اُس وقت تو یہ ہمیں نہایت منافع بخش لگا تھا۔ انتہائی قیمتی ٹرسٹ کی ملکیتی زمین اور ٹرسٹ نے ہماری مرضی کی عمارت بھی کھڑی کر کے دی تھی۔ ہم نے صرف مشینری کے لیے انویسٹ کیا تھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ محض معاہدہ کے مطابق پورے اسپتال کو اپنے تصرف میں لانے کے لیے ٹرسٹ یا دوسرے لفظوں میں اجیت اگروال ہمارے درپے ہے۔ ڈاکٹر منوج اور ڈاکٹر ونود کی موت کا ذمے دار کوئی اور ہے۔'' ڈاکٹر دیا نے اس کی زبان پر مچلتا اجیت اگروال کا نام بنا کہے ہی جان لیا تھا۔ وہ مزید بولی۔

''پولیس کی مدد ہم ضرور لیں گے مگر ہمیں فوکس ادت چوپڑا پر ہی کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر جوشی کے جبڑے بھنچ گئے۔ کرسی چھوڑتے ہوئے وہ روکھے انداز میں بولا۔ ''تمہاری مرضی...... مجھے تو اجیت اگروال سے ہی اپنی جان کا خطرہ ہے۔''

اس کے بعد دیا کے روکنے کے باوجود وہ نہیں رکا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر راج کے سامنے سی سی ٹی وی فوٹیج کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس کا ذہن بے حد اُلجھا ہوا تھا۔

گرونا تھ کے بعد ادت چوپڑا بھی ایسے غائب تھا جیسے اسے زمین نگل گئی ہو۔ انجلی کے بوائے فرینڈ پر وقت لگانا بے سود ثابت ہوا تھا۔ مانک نامی وہ نوجوان اس معاملے میں ملوث نہیں تھا۔

ڈاکٹر منوج کے قتل کا ذمے دار ادت چوپڑا ہی تھا۔ ایک، دو فوٹیج میں وہ انجلی کے اپارٹمنٹ کے دروازے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا بھی پایا گیا تھا۔ سیکیورٹی والوں نے بطور الیکٹریکل ٹیکنیشن اس حرکت پر ذرا بھی غور نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر منوج کے جسم پر بھی اس کی انگلیوں کے نشانات تھے اور سب سے بڑھ کر وہ دورانِ ڈیوٹی غائب تھا۔

شک، یقین کا روپ دھار کر سیدھا ادت چوپڑا کی طرف ہی جاتا مگر انسپکٹر راج کی چھٹی حس یا پیشہ ورانہ تجربہ کسی زبردست گیم کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ کسی کو قتل کرنے کی کوئی بے حد ٹھوس وجہ ہوتی ہے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ ادت چوپڑا کو ڈاکٹر منوج سے کیا پرخاش تھی؟

یہ سب کچھ بھی انسپکٹر راج کے دماغ میں چل رہا تھا اور اس کی نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر بھی تھیں۔ ماہرین نے چند فوٹیج کو ایک ساتھ جوڑ دیا تھا۔

ابتدا گرونا تھ سے ہوتی تھی۔ ڈاکٹر ونود کے قتل والے دن اس کی جم خانہ میں آمد و اخراج کی فوٹیج تھی۔ بارش اور شدید سردی کے سبب اس نے گرم کپڑوں کے اوپر برساتی اوڑھ رکھی تھی اور منہ، سر بھی لپیٹا ہوا تھا۔ بعین اسی طرح ادت چوپڑا نے بھی شدید سردی سے بچنے کے لیے خود کو لپیٹا ہوا تھا۔ دونوں کی جسامت اور قدوقامت ایک جیسا تھا۔

فوٹیج دیکھتے ہوئے انسپکٹر راج حقیقی معنوں میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا تھا۔ سنسنی کی ایک بے حد طاقتور لہر اس کے

وجود میں دوڑی تھی۔ اس نے فوراً فوٹیج کو ریورس کیا۔ اس کا وجود سنسنا اٹھا تھا۔

ادت چوپڑا نے سیکیورٹی کیبن میں غالباً آمد کا اندراج کروایا تھا اور پھر واپس نکلتے ہوئے گردن کو ایک مخصوص انداز میں جھٹکا تھا۔ یہ ایک ایسی عادت تھی جس کا شکار افراد غیر ارادی طور پر یہ حرکت کرتے تھے۔ انسپکٹر راج کے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ مخصوص انداز میں گردن کو جھٹکا دینے کا منظر اس نے چند لمحے پہلے بھی دیکھا ہے۔

فوٹیج ریورس ہو کر دوبارہ پلے ہوگئی تھی۔ انسپکٹر راج کی تمام تر حسیات جیسے آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں جم خانہ کے سیکیورٹی روم سے گرونا تھ باہر نکل رہا تھا، اس نے بھی بالکل ادت چوپڑا کے انداز میں گردن کو جھٹکا دیا تھا۔

انسپکٹر راج کا چہرہ جوش سے تمتما اٹھا۔ اس نے چیخ کر اپنے ایک ماتحت کو بلایا۔ اس کے سامنے آتے ہی وہ جوش سے بیٹھی آواز میں بولا۔

''ڈاکٹر ونود اور ڈاکٹر منوج کی ہلاکت کے وقت جم خانہ اور رتنا اپارٹمنٹ میں جو ملازمین کی آمد و رفت کا اندراج کرنے والا عملہ تھا۔ مجھے تیس منٹ میں اپنے سامنے چاہیے۔''

ماتحت سیلوٹ کر کے واپس مڑ گیا۔

انسپکٹر راج نے فوراً ڈیٹا بیس یونٹ والوں کا نمبر ملایا اور اسسٹنٹ منیجر سے بات کرتے ہوئے خصوصی درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے ان دونوں فنگر پرنٹس کی فرانزک رپورٹ چاہیے جلد سے جلد۔ بہت اہم نوعیت کا معاملہ ہے۔''

منیجر بولا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں...... میں ترجیحی بنیادوں پر کروا دیتا ہوں۔''

انسپکٹر راج نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ بے چینی نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

تھوڑی دیر میں پانچ عدد ڈرے سہمے ملازمین انسپکٹر راج کے سامنے تھے۔ انسپکٹر راج نے رتنا اپارٹمنٹ کے ملازمین کو باہر بھیج دیا۔

انسپکٹر راج پہلے سے ذہنی تیاری کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈرے ہوئے اور ملازمت چھن جانے کے خوف میں مبتلا ملازمین اسے درست معلومات نہیں دے سکیں گے۔ یقین کے مانند جو خدشہ اس کے دماغ میں گڑ گیا تھا، اس کے لیے درست معلومات اسے ان ملازمین کے اندر سے کشید کرنی تھی۔

نرم لہجے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے انسپکٹر راج ان تینوں کو کسی حد تک نارمل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس دوران چائے بھی آگئی تھی۔

چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے انسپکٹر راج نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ لوگوں کی مدد چاہیے تھی۔ اس لیے آپ لوگوں کو تکلیف دی ہے۔''

ایک ادھیڑ عمر اور مضبوط کاٹھی کا ملازم بولا۔ ''حکم کریں سر، ہم ہر مدد اور خدمت کے لیے حاضر ہیں۔''

دوسروں نے بھی گویا سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

ان تینوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر انسپکٹر راج دھیرے

سے ہنسا۔ ’’آپ کی مدد اور خدمت بھی لے لیتے ہیں چائے تو پئیں آپ لوگ۔‘‘

ماحول مزید خوشگوار ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر راج نے کہا۔ ’’ہم جم خانہ میں قتل ہونے والے ڈاکٹر ونود کے قاتل کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ وہ جلد ہی ہماری پکڑ میں ہوگا...... بس! آپ لوگوں کی تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔‘‘

ادھیڑ عمر نے چائے کا کپ ہونٹوں سے دور ہٹاتے ہوئے کہا۔ ’’میں عرض کر چکا ہوں۔ ہم ہر طرح سے حاضر ہیں مگر سر ایک بات کہنا چاہوں گا۔‘‘ آخر میں وہ قدرے ہچکچایا۔

’’جی...... جی کہیں۔‘‘ انسپکٹر راج مطمئن ہو گیا۔ اس کے بنائے ہوئے ماحول کا اثر تھا۔ ملازمین کھل رہے تھے۔

ادھیڑ عمر نے کہا۔ ’’آپ کی تفتیش پر تو کوئی شک نہیں مگر نہ جانے دل گروناتھ کو قاتل ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔ بڑا بھلا مانس بندہ تھا۔ ہر کسی کے دکھ، درد میں ساتھ نبھانے والا۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈا سانس لیا اور مزید کہا۔

’’اگر قاتل گروناتھ ہی ہے تو یہ ہم سب کے لیے بے حد تکلیف دہ بات ہے۔‘‘

انسپکٹر راج نے کہا۔ ’’آپ کے دل کی آواز بالکل درست ہے۔ قاتل گروناتھ نہیں ہے۔‘‘

یہ سن کر ادھیڑ عمر نے شکر کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک اور ملازم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ’’تو پھر قاتل کون ہے؟ اور گروناتھ کیوں غائب ہے؟‘‘

’’ان سوالوں کے جوابات کے لیے میں چند سوال آپ لوگوں سے کروں گا۔ آپ سوچ، سمجھ کر جواب دیجیے گا اور یہ بھی آپ لوگوں کو بتا دوں...... آپ سے حاصل ہونے والی معلومات اس کمرے سے باہر نہیں جائے گی۔‘‘

وہ تینوں پوری توجہ سے انسپکٹر راج کی طرف متوجہ ہو گئے۔

انسپکٹر راج ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ’’قاتل بے حد چالاک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو بھی چکما دیا ہے۔‘‘

ان تینوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑتی محسوس کر کے انسپکٹر راج جلدی سے بولا۔ ’’روٹین ورک کی یکسانیت میں کئی چیزوں پر توجہ نہیں دی جاتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔‘‘

جواب میں تینوں خاموش رہے، ہراس البتہ مدھم ہو گیا تھا۔

انسپکٹر راج بولا۔ ’’جس دن ڈاکٹر ونود کا قتل ہوا...... ڈیوٹی پر آتے اور جاتے ہوئے آپ لوگوں نے گروناتھ کا واضح طور پر چہرہ دیکھا تھا؟‘‘

یہ قطعی غیر متوقع سوال تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

انسپکٹر راج نے مزید کہا۔ ’’مجھے یقین ہے کہ گروناتھ کے بہروپ میں قاتل تھا۔ میں، آپ لوگوں کو الزام نہیں دے رہا۔ اور یہ بات ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گی۔ آپ لوگوں پر حرف نہیں آئے گا۔ بس، اتنا ہے کہ آپ لوگوں کی درست معلومات مجھے قاتل تک لے جائے گی۔‘‘

ان تینوں نے مدھم آواز میں آپس میں گفتگو کی پھر ادھیڑ عمر نے باقی دونوں ساتھیوں کی بھی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

’’سر! ہم اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ آتے، جاتے اس کے دستخط میں نے ہی لیے تھے۔ وہ گروناتھ ہی تھا مگر سردی کے سبب سب لوگوں کی طرح اس نے بھی منہ، سر لپیٹا ہوا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔‘‘

انسپکٹر راج نے جوش کے سبب اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ’’یہ ہوئی نا بات...... اچھا اُس سے بات چیت تو ہوئی ہو گی۔ آواز بھی بندے کی پہچان ہی ہوتی ہے۔‘‘

اس دفعہ دوسرا ملازم بول اٹھا۔ ’’اسے زکام اور گلا خراب ہونے کا مسئلہ تھا۔ آواز بدلی ہوئی تھی مگر تھی گروناتھ کی ہی۔‘‘

انسپکٹر راج کو یقین ہو گیا کہ وہ درست سمت میں چل پڑا ہے۔ اس نے ان تینوں سے ہاتھ ملایا۔

’’آپ لوگوں کے تعاون کا شکریہ۔ اب اتنی تکلیف کریں کہ وہ رجسٹر جلدی سے یہاں لے آئیں جس پر ڈیوٹی...... آن، آف کرتے ہوئے ملازمین دستخط کرتے ہیں۔‘‘

جم خانہ کے اسٹاف کو رخصت کرتے ہی اس نے تحریر شناسی کے ماہر کو فون کر کے فوراً طلب کیا اور رتنا اپارٹمنٹ کے ملازمین کو کمرے میں بلا لیا۔

جم خانہ کے ملازمین کے مانند وہ اُن دونوں کو بھی اعتماد میں لینے میں کامیاب ہو گیا۔ مرد سیکیورٹی اہلکار کے ساتھ دوسری سیکیورٹی سپروائزر تھی۔

یہاں بھی یہی بات علم میں آئی کہ ادت چوپڑا نے سردی سے بچنے کے لیے نقاب کے مانند اونی نقاب اوڑھ

رکھا تھا۔ ایسے نقاب آج کل فیشن میں تھے اور گرو ناتھ کی طرح ادت چوپڑا بھی "زکام اور گلا خراب" ہونے میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔

چہرے اور آواز کی طرح چلنے کا انداز اور جسمانی حرکات وسکنات بھی علیحدہ پہچان رکھتی ہیں۔ حرکات وسکنات سے انہیں ذرا بھی شک نہیں گزرا کہ آنے والا ادت چوپڑا نہیں کوئی اور ہے۔

انسپکٹر راج کا اعتماد پا کر خاتون سپروائزر نے خاص نسوانی حس کو محسوس ہونے والی ایک بات شیئر کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ادت چوپڑا جب قتل والی رات ڈیوٹی پر آیا تھا تو اس کی نگاہوں میں وہ خاص بات نہیں تھی جو روز ہوتی تھی۔ وہ بڑی خاص نظروں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیتا تھا۔ اس رات اس نے قطعی نظرانداز کر دیا۔

خاتون سپروائزر کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی اور اس نے سوچا تھا، ادت چوپڑا شاید سدھر گیا تھا۔ انسپکٹر راج نے قاتل کے شخصی خاکے میں یہ پوائنٹ لکھ لیا کہ اسے عورتوں سے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی۔ رتنا اپارٹمنٹ میں ملازمین کی حاضری کے لیے جدید بائیومیٹرک سسٹم نصب تھا۔ اس سسٹم نے ادت چوپڑا کے فنگر پرنٹ کی شناخت کر لی تھی۔

انہیں رخصت کرنے تک تحریر شناسی کا ماہر اور جم خانہ سے رجسٹر دونوں آ گئے۔

تحریر شناس نے تھوڑی ہی دیر میں یہ انکشاف کر دیا کہ قتل والے دن اور اس سے پہلے والے گرو ناتھ کے دستخطوں میں تمام تر مہارت کے باوجود فرق تھا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ اُس دن گرو ناتھ کے روپ میں کوئی اور جم خانہ آیا تھا۔ فنگر پرنٹس کی فرانزک رپورٹ بھی انسپکٹر راج کا منہ چڑانے لگی۔ فنگر پرنٹس جعلی تھے۔ سیلکون پر اتارے ہوئے فنگر پرنٹس کی مہارت تھی۔

انسپکٹر راج کرسی پر ڈھیر سا ہو گیا۔ اس کے پاس عیار قاتل کے دستخط کا ہی ایک نمونہ تھا۔

تھوڑی دیر میں اس نے سنبھالا لیا ایک نئے عزم کے ساتھ اس نے اپنی ٹیم کو اکٹھا کر کے گفتگو کا آغاز کیا ہی تھا کہ باڈی گارڈز کے جھرمٹ میں ڈاکٹر دیا اور ڈاکٹر جوشی پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہ غیر متوقع آمد تھی۔ اپنی ٹیم کو عارضی طور پر رخصت کر کے انسپکٹر راج نے ان دونوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ان کے باڈی گارڈز کو باہر ہی روک لیا گیا تھا۔

انہیں عزت سے بٹھانے اور رسمی علیک سلیک کے بعد انسپکٹر راج نے ان کی آمد کا سبب پوچھا۔

ڈاکٹر جوشی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "ہمیں اس قاتل سے اپنی جان کا خطرہ ہے جس نے ڈاکٹر ونود اور ڈاکٹر منوج کی جان لی ہے۔ ہم چاہتے ہیں وہ قاتل جلد از جلد قانون کی گرفت میں ہو۔"

انسپکٹر راج سیٹ پر پھیلتے ہوئے بولا۔ "ہماری بھی یہی خواہش اور کوشش ہے۔ ہم سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔"

دونوں ڈاکٹرز کی نگاہوں کا تصادم ہوا پھر ڈاکٹر دیا اپنی مترنم آواز میں بولی۔ "پولیس تفتیش تو نہ جانے کس سمت میں چل رہی ہے مگر ہمارے خیال میں قاتل کوئی اور ہے۔"

انسپکٹر راج سیدھا ہو بیٹھا۔ اُسے بے حد دلچسپی محسوس ہوئی۔ "کون ہے وہ؟"

جواب میں ڈاکٹر دیا نے مانک رائے کے متعلق اپنے خدشات ظاہر کر دیے۔

انسپکٹر راج نے تیزی سے نوٹس لیے۔ صورتِ حال اندازے سے زیادہ گمبھیر ثابت ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر دیا کے بعد ڈاکٹر جوشی نے اجیت اگروال کے متعلق خدشات بیان کیے۔ یہ نئی بات جان کر انسپکٹر راج کو احساس ہوا کہ کینوس وسیع ہو رہا تھا۔ قاتل نے بڑی ذہانت سے ہر طرف بھول بھلیاں بنا دی تھیں اور خود اطمینان سے اپنی کمین گاہ میں بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ شاید اپنے اگلے شکار کی تاک میں تھا۔ یہ ممکنہ شکار ڈاکٹر دیا اور ڈاکٹر جوشی ہو سکتے تھے۔

انسپکٹر راج کا دماغ تیزی سے متحرک تھا۔ اگر کسی نامعلوم وجہ سے قاتل ان چاروں ڈاکٹرز کے درپے تھا تو باقی ماندہ دونوں ڈاکٹرز کے گرد جال بچھا کر اسے پکڑا جا سکتا تھا۔

انسپکٹر راج نے دونوں ڈاکٹرز سے معاملات طے کر کے انہیں تسلیاں دے کر رخصت کر دیا۔

اب انسپکٹر راج کے پاس اپنی ٹیم کے ساتھ شیئر کرنے کے لیے مزید مواد آ چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر راج کے کمرے میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ انسپکٹر راج کی بریفنگ شروع ہوئی اور خاصی طویل ثابت ہوئی۔

بریفنگ کے اختتام پر ٹیم کے پاس دماغ کھپانے اور کرنے کے لیے وافر کام تھا۔

انسپکٹر راج نے ٹیم کو دو حصوں میں تقسیم کر کے انہیں اپنی اپنی تھیوری پیش کرنے کے لیے کہا اور اس کے ساتھ ہی کھانے کا وقفہ بھی ہو گیا۔

ایک ٹیم کی سربراہ نیناتھی اور دوسری ٹیم کا وش سنگھ۔ یہ تفتیش کا نیا طریقہ تھا جو ایک ایڈوانس کورس میں انسپکٹر راج نے سیکھا تھا۔

مقررہ ٹائم کے بعد دونوں ٹیم کے سربراہ اس کے سامنے بیٹھے تھے۔

سب انسپکٹر وش سنگھ نے نینا کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''لیڈیز فرسٹ۔''

انسپکٹر راج نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔ ''تمہاری زبان کچھ زیادہ شہد نہیں ٹپکا رہی۔'' ان لوگوں کے درمیان آفیسر، ماتحت والا روایتی فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

وش سنگھ نے شرارت سے کہا۔ ''نہیں سر! شہد تو بھابی کے لہجے سے ٹپکتا ہے جب وہ، نینا کا نام لیتی ہیں۔''

بے اختیار نینا کا مترنم قہقہہ آزاد ہو گیا۔

انسپکٹر راج نے سر کھجایا اور بولا۔ ''تمہاری زبان زیادہ چلنے لگی ہے اس لیے پہلی باری تمہاری...... میں بھی تو دیکھوں دماغ کتنا چلا لیتے ہو۔''

''او کے سر۔'' وش سنگھ مستعد ہو گیا۔ الفاظ تو وہ پہلے ہی ترتیب دے چکا تھا۔ فوراً ہی شروع ہو گیا۔ ''میری ٹیم کی متفقہ رائے ہے کہ قاتل کوئی بے حد تربیت یافتہ اور منفی ذہانت سے مالا مال شخص ہے۔ ممکن ہے کسی خفیہ ادارے کا منحرف، ریٹائرڈ یا حاضر سروس بندہ ہے۔''

انسپکٹر راج نے انگوٹھے کے اشارے سے اسے سراہا اور یہ پوائنٹ نوٹ کر لیا۔

خوشی سے سرخ چہرے کے ساتھ وش سنگھ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جس طرح وہ ڈاکٹرز کو انتہائی تکلیف دہ انداز میں قتل کر رہا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے قاتل کو ان ڈاکٹرز سے اتنی ہی زیادہ تکلیف پہنچی ہے جس کا وہ بدلہ لے رہا ہے۔''

اس دفعہ انسپکٹر راج نے بے آواز تالی بجاتے ہوئے نوٹ لیا تھا۔

وش سنگھ رواں تھا۔ ''اگر ہم وہ تکلیف ڈھونڈ نکالیں تو قاتل تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔ میری ٹیم کو یقین ہے کہ وہ رام سرائے اسپتال کے دیگر ڈاکٹرز...... جو قاتل کو تکلیف پہنچانے کا سبب بنے ہیں، اس کے نشانے پر ہیں۔ ہمیں قاتل کا پتا اسپتال سے ہی لگے گا۔ ہمیں خاص طور پر ڈاکٹر جوشی اور ڈاکٹر دیا اوبرائے پر دھیان دینا چاہیے۔ قاتل ان دونوں کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ اُن کی جان شدید خطرے میں ہے۔'' سانس لینے کے لحاتی وقفے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''قاتل کے پاس وسائل بھی ہیں۔ وہ کافی عرصے سے اپنے منصوبے پر کام کر رہا ہے۔ اس نے اپنے قدوقامت اور ملتے جلتے حلیے کے افراد کو ٹریس کیا جو اس کے شکار کے قریب تھے۔ ان کو بھی قاتل نے ٹریپ کیا ہے۔ یقینی طور پر گرو ناتھ اور ادت چوپڑا...... قاتل کی تحویل میں ہیں۔ زندہ...... یا مردہ...... اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔''

''آخر میں ایک بار پھر کہوں گا۔ ہمیں قاتل تک پہنچنا ہے تو ہمیں وہ ''تکلیف'' ڈھونڈنی ہو گی جو ڈاکٹرز سے قاتل کو پہنچی ہے۔ باقی ماندہ ڈاکٹرز کو بھی اس کا اندازہ ہے اس لیے وہ، پولیس اسٹیشن آئے تھے۔ جن افراد پر انہوں نے شک کا اظہار کیا ہے، ان لوگوں کو ہمیں ٹریسنگ پر لگانا چاہیے۔ ویسے رام سرائے ٹرسٹ کے ڈاکٹرز کی ہلاکت میں ملوث ہونے کے آثار کم ہیں۔ معاہدے کے بعد انہوں نے اتنا صبر کیا ہے تو دس، پندرہ سال مزید بھی کر سکتے ہیں۔ میری ٹیم ٹرسٹ کو اس معاملے میں ملوث نہیں سمجھتی۔'' اتنا کہہ کر وش سنگھ نے اپنی بات ختم کر دی۔

نینا نے وش سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے آغاز کیا۔ ''وش سر میرے سینئر ہیں۔ انہوں نے بہت اچھے نقطے اٹھائے ہیں جن سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے مگر میری ٹیم کا سارا فوکس قاتل تک پہنچنے میں رہا ہے۔''

انسپکٹر راج بولا۔ ''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔''

نینا شروع ہوئی۔ ''قاتل...... ڈاکٹرز کے معمولات سے بھرپور آگاہی رکھتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بارش اور خراب موسم کے باوجود ڈاکٹر ونود جم خانہ ضرور آئے گا۔''

انسپکٹر راج نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

نینا نے بات آگے بڑھائی۔ ''غور کرنے کی بات ہے ڈاکٹر منوج اور انجلی کے معاملے سے اس کے ساتھی ڈاکٹرز سمیت فیملی میں سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ ان معاملے کے بارے میں جان کر وہ لوگ شاکڈ رہ گئے تھے۔ میرا اندازہ ہے وہ اداکاری نہیں تھی۔''

انسپکٹر راج کے حوصلہ افزا تاثرات کے ساتھ ہی نینا کا لہجہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

''قاتل نہ صرف اس معاملے سے واقف تھا بلکہ اس نے انجلی کے اپارٹمنٹ ہی میں ڈاکٹر منوج کو شکار کرنے کا پروگرام بنا کر کامیابی سے اس پر عمل کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قاتل یا تو کوئی انتہائی قریبی شخص ہے یا پھر اُسے کسی ایسے فرد کی مدد حاصل ہے جو ڈاکٹرز کے انتہائی قریب اور بے حد اعتماد کا حامل ہے۔'' انسپکٹر راج نے فوراً یہ پوائنٹ

نوٹ کرلیا۔

''نہیں...... ڈاکٹرز کے انتہائی قریب کے لوگوں کو چھلنی سے گزارنا ہوگا۔ آج کے دور میں سب سے بڑا رازداں موبائل فون ہے۔ ڈاکٹرز اور ان کے انتہائی قریبی افراد کے موبائلز فونز کا ڈیٹا نکالیں گے تو کوئی نہ کوئی سرا ضرور ہاتھ آئے گا۔'' نینا نے گہری سانس لیتے ہوئے بات مکمل کی۔

انسپکٹر راج نے اشارے سے اس کی پیٹھ تھپکی اور بات جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

''دوسرا ایک اہم نقطہ ہے۔ قاتل نے گروناتھ اور ادت چوپڑا کا روپ دھارا اور کامیابی سے دھارا...... اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ برتر صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مصنوعی فنگر پرنٹس کی مدد سے اس نے ہمیں خوب بہکایا مگر ان دونوں کی چال ڈھال اور اندازِ گفتگو/آواز کو کاپی کرنے کے لیے اس نے ان لوگوں کے ساتھ خاصا وقت گزارا ہوگا۔ یقیناً یہ سب کچھ اس نے یارانہ گانٹھ کر حاصل کیا ہوگا۔ بالکل آخر میں قاتل نے دونوں کو غائب کر کے ہمیں ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا دیا۔''

لحظہ بھر کا وقفہ لے کر وہ دوبارہ بولی۔ ''ادت چوپڑا اور گروناتھ کے گزرے شب و روز کھنگالے جائیں تو ضرور ایسی کوئی ''شخصیت'' سامنے آجائے گی جو کچھ عرصے میں ان کے اچانک ہی ضرورت سے زیادہ قریب آئی ہو۔''

یہ کہہ کر نینا نے لحظہ بھر کا ڈرامائی وقفہ دے کر ان دونوں پر نظر ڈالی۔ دونوں ہی متاثر بھی نظر آرہے تھے اور پوری طرح سے متوجہ بھی تھے۔

نینا بولی۔ ''ایک نقطہ ایسا ہے جو ہمیں سیدھا قاتل تک لے کر جاسکتا ہے۔''

''کون سا؟'' وش سنگھ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

نینا مسکرا کر بولی۔ ''ڈاکٹرز کو شکار کرنے کے لیے وہ ایسے لوگوں کو منتخب کر کے ان کے قریب ہوا جو اس سے قدوقامت اور جسامت میں مشابہ تھے۔ اگلے شکار کے لیے وہ دوبارہ ایسے کسی فرد کے قریب ہو چکا ہوگا جو مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہوگا۔''

اس دفعہ انسپکٹر راج خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

''نینا...... ذرا میرے قریب تو آؤ۔''

نینا چونکی۔ ''کیوں...... کیا ہوا سر؟''

''میں تمہارا منہ چومنا چاہتا ہوں۔''

نینا بُری طرح سے شرما کر جھینپ گئی اور وش سنگھ سرداروں والے مخصوص قہقہے کو روک نہیں پایا۔ پھر بولا۔

''ایک منٹ سر! میں موبائل کا کیمرا آن کرلوں، یہ یادگار لمحہ ہوگا اور بھابی کے لیے تو کچھ زیادہ ہی یادگار رہوگا۔''

اس دفعہ تینوں کے قہقہوں سے کمرا گونج اٹھا۔

چند شگفتہ لمحوں نے انہیں دوبارہ سے تازہ دم کردیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ سنجیدہ ہوئے تو انسپکٹر راج کو یقین تھا کہ شاطر مجرم کی گردن اس کے ہاتھوں سے زیادہ دور نہیں ہے۔

اس نے اپنے ہونہار ماتحتوں کو ذمّے داریاں سونپ دیں اور خود اجیت اگروال اور مانک رائے کو چیک کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے پاس قاتل کی تحریر کا نمونہ تھا۔ اجیت اگروال اور مانک رائے کی تحریروں کا نمونہ حاصل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔

پولیس چیف کے متعدد فون آچکے تھے۔ انسپکٹر راج نے اس کے لیے مختصر سی رپورٹ فیکس کردی۔

کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد وہ لوگ دوبارہ یکجا ہوئے تو نینا اور وش سنگھ خاصی کامیابیاں سمیٹ لائے تھے۔

انسپکٹر راج البتہ اجیت اگروال اور مانک رائے کو مشکوک افراد کی فہرست سے نکال چکا تھا۔ اول تو دونوں کی تحریروں کا نمونہ قاتل سے میچ نہیں ہوا تھا۔ دوم مانک رائے کا قدوقامت قاتل سے بالکل مختلف تھا۔

اجیت اگروال کا قدوقامت تو قاتل سے ملتا جلتا تھا مگر اس کے پاس دونوں ڈاکٹرز کی اموات کے وقت جائے وقوعہ سے خاصا دور ہونے کے ناقابلِ تردید ثبوت موجود تھے۔ خاص طور پر ڈاکٹر ونود کے قتل کے وقت وہ ٹرسٹ میں اپنے آفس میں تھا۔ چشم دید گواہوں کے علاوہ سی سی ٹی وی فوٹیج بھی اسے بے قصور ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔

وش سنگھ نے چند افراد کی فہرست مرتب کی تھی جو رام سرائے اسپتال میں اہم عہدوں پر تھے اور ایسے افراد بھی تھے جو ڈاکٹرز کے انتہائی قریب تھے۔

وش سنگھ نہ صرف ان کے موبائل فون نمبرز حاصل کر آیا تھا بلکہ ڈیٹا کے حصول کا کام بھی شروع کروادیا تھا۔ سب سے اہم کام اس نے یہ کیا تھا کہ دو ایسے افراد کی نشاندہی کرلی تھی جن کا حلیہ اور قدوقامت قاتل سے مطابقت رکھتی تھی۔ ان میں سے ایک تو ڈاکٹر جوشی کا خانساماں تھا اور دوسرا ایک لیبارٹری ٹیکنیشن تھا۔

نینا کی محنت خاصی رنگ لائی تھی۔ گروناتھ اور ادت چوپڑا دونوں کا فارغ وقت اِدھر اُدھر ہی گزرتا تھا۔ گروناتھ

جس چائے خانے میں جا کر بیٹھتا تھا۔ وہاں قاتل سے ملتے جلتے ایک شخص کی تواتر سے آمد ہوئی تھی۔ کئی افراد سے بات چیت کے بعد معلوم ہوا کہ اس شخص کو وہاں ''سرجن'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

سرجن اور گروناتھ میں چند ہی دنوں میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ وہ اکثر ہی ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ نیتا کو یقین تھا کہ یہی سرجن قاتل ہے۔ گروناتھ کے ساتھ ساتھ سرجن بھی غائب تھا۔ چائے خانے پر اس کے بعد وہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔

ادت چوپڑا، عورت باز آدمی تھا۔ اس کا تقریباً روز ہی پرانی دہلی کے بازارِ حسن میں آنا، جانا ہوتا تھا۔ یہاں فوڈ اسٹریٹ کے ساتھ والے گراؤنڈ میں خوش فکروں کی ٹولیاں براجمان رہتی تھیں اور ہر طرف تاش کا دور چلتا تھا۔

ادت چوپڑا کو تاش اور جوئے کی لت بھی تھی۔ وہ اسی گراؤنڈ میں پایا جاتا تھا۔ جس روز جیتتا تھا وہیں سے کسی کوٹھے کا رخ کر لیتا تھا۔

بالکل سرجن جیسے حلیے کا بندہ یہاں بھی دیکھا گیا تھا۔ یہاں بھی اس کا نام ''سرجن'' ہی تھا۔ سرجن بے دریغ ادت چوپڑا پر پیسا لٹاتا دیکھا گیا تھا۔ سرجن کی معیت میں ادت چوپڑا بے حد خوش نظر آتا تھا۔ یہاں سے بھی ادت چوپڑا کے ساتھ ہی سرجن بھی غائب ہو گیا تھا۔

انسپکٹر راج نے جوش کے سبب میز پر ہاتھ مارا۔ ''یہی کم بخت سرجن ہمارا مطلوبہ بندہ ہے۔ نیتا! تمہاری کارکردگی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔''

خوشی سے نیتا کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

انسپکٹر راج نے مزید کہا۔ ''ہمیں تین، چار افراد کو چند گھنٹوں کے لیے خاموشی سے اٹھانا ہوگا۔ جنھوں نے سرجن کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان لوگوں کی مدد سے ہم اس کا ایک کمپیوٹرائزڈ خاکہ بنائیں گے۔ اس کے علاوہ ایسے افراد کو ڈھونڈو...... جن کی دونوں جگہوں پر سرجن سے علیک سلیک بڑھی ہو۔ کسی کے پاس تو اس کے موبائل فون کا نمبر ہوگا۔''

وش سنگھ جلدی سے بولا۔ ''ادت چوپڑا اور گروناتھ سے اس کا تواتر سے رابطہ تھا۔ ان دونوں کی کال ہسٹری چیک کریں تو اس کا نمبر ڈھونڈا جا سکتا ہے۔''

''گڈ! اس پر فوراً کام کرو۔'' انسپکٹر راج بے حد مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ، سرجن کے قریب سے قریب تر ہو رہا تھا۔

وش سنگھ اٹھنے لگا تو نیتا نے اسے روک لیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

انسپکٹر راج نے چونک کر نیتا کی طرف دیکھا جہاں بڑی گمبھیرتا تھی۔

نیتا نے سنسناتی آواز میں کہا۔ ''قاتل، ہمارے اندازوں سے زیادہ عیار ہے۔ موبائل فون نمبر والا نقطہ میرے ذہن میں تھا۔ میں نے نمبر کے حصول کی کوشش کی تھی۔''

وش سنگھ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔ ''پھر نمبر مل گیا؟''

نیتا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سرجن موبائل فون استعمال نہیں کرتا۔ وہ موبائل فون کو دماغ کا کینسر کہتا ہے۔ موبائل فون کے ذریعے اسے ٹریس کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔''

وش سنگھ نے ہتھیلی پر گھونسا مارا۔ ''کم بخت ضرورت سے زیادہ ہوشیار بن رہا ہے۔ ایک دفعہ ہاتھ آ جائے تو اس کی ساری سرجنی نکال دوں گا۔''

انسپکٹر راج پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''سرجن تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ کھلا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے مقامی سی آئی ڈی کے ڈی ایس پی سے مدد مانگی اور اس نے دو گھنٹوں کے اندر ہی ڈاکٹر دیا، ڈاکٹر جوشی اور قاتل سے مطابقت رکھنے والے خانساماں اور لیبارٹری ٹیکنیشن کے گرد سی آئی ڈی کے سادہ پوش اہلکاروں کا نادیدہ جال پھیل گیا۔

اب سرجن کے اس جال میں داخل ہونے کا انتظار تھا۔

انسپکٹر راج کے دماغ میں رہ رہ کر سرجن کا نام گونج رہا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر جوشی بے حد خوف زدہ تھا۔ قاتل سائے اُسے اپنی طرف بڑھتے محسوس ہو رہے تھے۔ راتوں کی نیند اُڑ چکی تھی۔ اس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ ڈاکٹر منوج اور ڈاکٹر ونود کی جان لینے والا اس کی تاک میں ہے۔

ذہنی تناؤ اور خوف کی اس فضا میں اس نے روپوش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جب تک قاتل پکڑا یا مارا نہیں جاتا تھا، اس نے منظر سے غائب ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

کالج کے زمانے کا ایک دوست ہریانہ میں ماڈل فارمنگ کر رہا تھا اور اپنے اس بے حد صحت مندانہ اندازِ زندگی سے بے حد خوش تھا۔

دونوں دوست رابطے میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر جوشی کو بھی یہی زندگی پسند تھی اور اس دفعہ تو دوست کے بار بار اصرار

پر فیملی سمیت دو ہفتے ہریانہ میں گزارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسی منصوبے کو اس نے تھوڑا بدل دیا۔ بیوی کو اعتماد میں لے کر وہ غیر معینہ مدت کے لیے ہریانہ جا رہا تھا۔

ساری تیاری مکمل ہو گئی تھی۔ وقت مقرر پر لالہ جی بہاری اس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ لالہ جی بہت پرانا ملازم تھا۔ اس کے ہاتھ کی چائے ان چاروں پارٹنرز کو بے حد پسند تھی اور چاروں ہی اس صفائی پسند شخص کو بے حد پسند کرتے تھے۔

اسپتال میں ڈیوٹی کے دوران بھی لالہ جی اُن کے قریب ہی رہتا تھا اور انہیں سروس دیتا تھا۔ لالہ جی سیدھا ڈاکٹر جوشی کے کمرے میں گیا تھا۔ یہاں تھیٹر سے وابستہ ایک میک اَپ کا ماہر پہلے سے موجود تھا۔ لالہ جی اور ڈاکٹر جوشی کا قدوقامت تقریباً ایک جیسا ہی تھا۔

لالہ جی اور ڈاکٹر جوشی نے پہلے کپڑے ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل کیے پھر میک اَپ کا ماہر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر جوشی خاصی حد تک لالہ جی سے مشابہ نظر آنے لگا۔ آئینے پر ناقدانہ نظریں خود ڈالتے ہوئے وہ، لالہ جی سے مخاطب ہوا۔

''صبح تک آپ کو کمرے میں ہی رہنا ہے۔ دو، چار، دفعہ بالکونی میں جا کر بیٹھیے گا۔ ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ صبح یہ بہروپ ختم کر دیجیے گا۔''

لالہ جی نے کمر کو خم دیا۔ ''جو حکم مالک۔''

اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر جوشی نے گھر چھوڑ دیا۔

اسپتال کے باہر سے ٹیکسی پکڑ کر اس نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ ایک تیز رفتار ٹرین میں لالہ جی کے ہی نام سے اس کے لیے سیٹ کی ایڈوانس بکنگ ہو چکی تھی۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر بھی ڈاکٹر جوشی اضطراب کا شکار تھا۔ اس کی نگاہ بار بار پیچھے کی طرف جاتی تھی۔ نامعلوم قاتل کے خوف نے اس کے اعصاب کو بُری طرح متاثر کیا تھا۔

اسی اعصابی کشیدگی کے عالم میں وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر روایتی افراتفری نظر آ رہی تھی۔ انسانوں کے سمندر میں گھل مل کر ڈاکٹر جوشی کی اعصابی کشیدگی قدرے کم ہوئی۔ اسے لگا کہ تاک میں لگے قاتل کو وہ چکما دینے میں کامیاب رہا ہے۔

قدرے اطمینان پا کر اب اسے درجہ سوم میں سفر کے خیال سے ہی کوفت ہو رہی تھی۔

☆☆☆

سب انسپکٹر وش سنگھ خصوصی درخواست کر کے سی آئی ڈی والوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ کامیابی اسے خاصی قریب محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

ڈاکٹر جوشی کے خانساماں کا نام بلدیو تھا۔ بیوی کے ساتھ علیحدگی کا کیس کورٹ میں زیرِ سماعت تھا۔ وہ، ڈاکٹر جوشی کے بنگلے میں ہی سرونٹ کوارٹر میں رہائش پذیر تھا۔

بلدیو کو فلم بینی کا چسکا تھا۔ وہ ہفتے میں کم از کم دو دن باقاعدہ سینما جا کر فلم دیکھتا تھا۔ اس دوران اپنے ہی ایک ہم مزاج سے اس کی علیک سلیک بڑھی تھی۔ اس ہم مزاج نے اپنا تعارف ''سرجن'' کے نام سے کروایا تھا۔

بلدیو کو یہ نام عجیب سا لگا تھا مگر جب سرجن نے رات کے پُرتکلف کھانے کا بل زبردستی ادا کیا تو بلدیو کھل سا اٹھا تھا۔

سرجن، اس کی فلم انڈسٹری سے متعلق قابلِ رشک معلومات سے بے حد متاثر تھا۔ سرجن کے سامنے معلومات کا دریا بہاتے ہوئے بلدیو بھی عجیب سے احساسِ تفاخر کا شکار ہو جاتا تھا۔

سرجن کی معیت میں شاندار اور نیم گرم کوپے میں بیٹھ کر فلم دیکھنے کا لطف ہی جدا تھا۔ ظاہر ہے اس کوپے اور کھانے وغیرہ کے اخراجات سرجن ہی برداشت کر رہا تھا۔

یہ سارے معاملات وش سنگھ کے علم میں آ چکے تھے۔ بلدیو کے گرد نادیدہ جال پھیلایا جا چکا تھا۔ اب صرف سرجن کا انتظار تھا۔

اپنے روزمرہ کے معاملات نمٹا کر بلدیو فارغ تھا۔ ترنگ کے عالم میں گنگناتے ہوئے اس نے نیم گرم پانی سے غسل کیا اور اپنا بہترین سوٹ زیب تن کر کے اور خوب خوشبو چھڑک کر پوش علاقے کے جدید ترین اور وسیع وعریض سینما ہال پہنچ گیا۔

سینما کے باہر ایک کیفے میں بیٹھ کر اُس نے چائے منگوالی۔ سرجن، موبائل فون کو دماغ کا کینسر قرار دیتا تھا۔ اس سبب ان کے درمیان رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ سرجن نے اسی کیفے میں ملنے کا وقت طے کیا تھا۔

بلدیو کو عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ اس بے چینی کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ بلدیو کی نظریں بار بار کیفے کی دیوار گیر گھڑی پر جا ٹکتی تھیں۔ سرجن کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر جوشی کی گاڑی کی آمد کا وقت رات نو بج کر پندرہ منٹ کا تھا۔ دوسری منزل کی انتظار گاہ میں نچلے درجے

کے مسافروں کے درمیان وہ بمشکل خود پر جبر کیے بیٹھا تھا۔
وہ جس بینچ پر بیٹھا تھا اس کے عین سامنے نیچے فرش پر چادر بچھا کر پوری ایک فیملی براجمان تھی جن کے چھوٹے بچوں کے رونے کی مسلسل ''ریں، ریں'' جیسی آواز ڈاکٹر کی سماعت پر بے حد گراں گزر رہی تھی۔ سفر کے آغاز سے پہلے ہی اُس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔
آخر کار مطلوبہ گاڑی کی آمد کا اعلان ہوا تو ڈاکٹر نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اٹھ کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس کے پاس کسی بھی قسم کا سامان نہیں تھا۔
گاڑی کی آمد کے اعلان کے ساتھ ہی مسافروں میں ہڑبونگ سی مچ گئی تھی۔ ایک افراتفری کا عالم برپا تھا۔ مسافروں کی دھکم پیل کے دوران ڈاکٹر جوشی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ نصف سیڑھیوں کے بعد ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم تھا جہاں سے سیڑھی دوطرفہ ہو جاتی تھی۔ اس پلیٹ فارم کی ریل کی پٹری کی طرف والی حفاظتی دیوار بمشکل چار فٹ اونچی تھی۔
ڈاکٹر اس پلیٹ فارم سے ایک قدم ہی اوپر تھا کہ عقب سے اُسے بے حد زور کا دھکا لگا۔ دباؤ کسی بندھے ہوئے بستر کے جیسا محسوس ہوا تھا۔
وزنی گولے کے مانند ٹکرانے والے اس بستر کے سبب ڈاکٹر جوشی کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ بُری طرح سے ہاتھ، پاؤں مارتے ہوئے ڈاکٹر حفاظتی دیوار سے ٹکرا کر دوسری طرف گر گیا۔ یہاں پٹریوں کو پھلانگ کر دوسری طرف جانے سے مسافروں کو روکنے کے لیے جنگلا لگایا گیا تھا جس کے اوپری کنارے خنجروں کے مانند تیز دھار تھے۔
ڈاکٹر اسی جنگلے کے اوپر گرا تھا اور یہ خنجر نما کنارے اس کے پورے وجود میں اتر گئے تھے۔ تکلیف کے بے پناہ احساس کے ساتھ ڈاکٹر جوشی کو خیال آیا کہ بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ قاتل اس تک پہنچ ہی گیا تھا۔
اُس کی بے نور ہوتی آنکھوں میں یہ سوال حیرت بن کر چمک رہا تھا کہ قاتل...... اس تک پہنچ کیسے گیا؟ جنگلے پر گر کر ہلاک ہونے والے مسافر کی جنگلے میں پروئی لاش کا دلخراش منظر دیکھ کر کئی عورتوں کی چیخیں نکل گئی تھیں۔
اتفاق سے ایک میڈیا گروپ کی ٹیم اپنے کسی پروگرام کی ریکارڈنگ کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی۔ ٹیم کے ہاتھ ایک سنسنی خیز بریکنگ نیوز آ گئی تھی۔

☆☆☆

بلدیو سخت بھنایا ہوا اور بے مزہ ہو کر واپس آیا تھا۔ آج پہلی دفعہ ہوا تھا کہ سرجن وقت مقررہ پر نہیں پہنچا تھا بلکہ شو کا ٹائم ختم ہونے کے باوجود بلدیو نے مزید اس کا ایک گھنٹا انتظار کیا تھا مگر وہ نہیں آیا تھا۔
بلدیو بنگلے پر واپس آیا تو وہاں قیامت برپا تھی۔ ڈاکٹر جوشی کا بہروپ کھل گیا تھا۔ بظاہر تو یہ حادثہ لگتا تھا مگر مخصوص انداز کی ہلاکت اور پہلے والے دونوں ڈاکٹرز کے قتل کے تناظر میں صاف نظر آتا تھا کہ ڈاکٹر جوشی کو بھی قتل کیا گیا ہے۔
پولیس اور سی آئی ڈی کے جال سے بھیس بدلنے کے سبب ڈاکٹر جوشی نکلنے میں کامیاب رہا تھا اور قاتل کا نشانہ بن گیا تھا۔
سی آئی ڈی والے لالہ جی کو ہی ڈاکٹر جوشی سمجھتے رہے تھے اور ڈاکٹر اپنی بے وقوفی کے سبب قاتل کا نشانہ بن گیا تھا۔
انسپکٹر راج اپنے کمرے میں سر پکڑے بیٹھا تھا۔ نینا اور وش سنگھ اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ چند منٹ پہلے پولیس چیف نے انسپکٹر راج کی سخت سرزنش کی تھی کہ وہ ابھی تک قاتل کو گرفتار کیوں نہیں کر پایا۔ وش سنگھ نے کہا۔ ''اگر ڈاکٹر بے وقوفی نہ کرتا تو نہ صرف آج زندہ ہوتا بلکہ قاتل بھی ہماری گرفت میں ہوتا۔ قاتل کو ڈاکٹر کے فرار کا علم ہوا اور اس نے بلدیو سے ملنے کا پروگرام منسوخ کر کے ڈاکٹر کو شکار کرنے کا پروگرام بنا لیا۔''
نینا نے دخل اندازی کی۔ ''قاتل جلد سے جلد ڈاکٹرز کو ہلاک کرنے کے لیے باؤلا ہو رہا ہے۔ یہاں اس نے سنگین غلطی کر دی ہے۔''
انسپکٹر راج نے سر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی اس غلطی کو پکڑ رہا ہوں۔''
وش سنگھ نے سر کھجایا۔ ''میری پکڑ میں کیوں نہیں آ رہی؟''
''تم...... قاتل کے ہاتھ سے نکل جانے کے سبب افسردہ ہو۔ اس لیے تمہارا ذہن کام نہیں کر رہا۔''
وش سنگھ بولا۔ ''تمہارا اندازہ صحیح ہے مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ ڈاکٹر دیا اور برائے ابھی باقی ہے۔ اس کا شکار یقیناً وہ قاتل بلدیو کے روپ میں کرنے کا خواہش مند ہے...... اب ذرا جلدی سے وہ غلطی بتا دو، جو قاتل نے کی ہے۔''
نینا بولی۔ ''ڈاکٹر جوشی کے بھیس بدل کر فرار ہونے

کے پروگرام سے محض دو افراد واقف تھے۔ میک اَپ کے ماہر کو صرف یہ بتایا گیا تھا کہ ایک شرارت کے سلسلے میں یہ سب ہورہا ہے۔ قاتل کو یہ ساری معلومات کہاں سے حاصل ہوگئی کہ ڈاکٹر کب اور کہاں پایا جائے گا؟'' یہ کہہ کر نینا نے تصدیق طلب نظروں سے انسپکٹر راج کی طرف دیکھا۔

''آپ نے بھی یہی غلطی پکڑی ہے نا سر؟''

انسپکٹر راج نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''شاطر سے شاطر مجرم بھی کوئی نہ کوئی غلطی کرتا ہے۔ جناب ''سرجن'' بھی غلطی کر گئے ہیں۔''

وش سنگھ نے پوچھا۔ ''یہ دو افراد کون ہیں؟''

نینا بولی۔ ''ایک ڈاکٹر جوشی کی بیوی اور دوسرا بے حد وفادار اور پرانا ملازم لالہ جی!''

وش سنگھ نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔ ''اس کا تو صاف مطلب ہے ان دونوں میں سے کسی نے قاتل کو دانستہ یا نادانستہ ڈاکٹر سے متعلق معلومات دی ہیں جو ڈاکٹر کی ہلاکت کا باعث بنی ہے۔''

ایک خیال آنے پر انسپکٹر راج نے وش سنگھ سے پوچھا۔ ''تمہاری فہرست میں لالہ جی نامی ملازم اور ڈاکٹر جوشی کی بیوی کا نام ہے نا؟''

وش سنگھ نے فوراً موبائل فون میں محفوظ فہرست پر نظر ڈالی۔ ''بیوی کا تو نام ہے مگر لالہ جی کا نہیں ہے۔''

اچانک ہی انسپکٹر راج کو ایک خیال نے ہیجان زدہ کر دیا۔ ''جو غلطی ہم نے پکڑی ہے، شاطر مجرم کو بھی اس کا خیال آسکتا ہے۔ اگر اس کا مخبر لالہ جی ہی ہے تو قاتل اپنی غلطی مٹا بھی سکتا ہے۔ لالہ جی کے بارے میں دستیاب معلومات یکجا کرو... اور اسے بھی نظر نہ آنے والے حفاظتی دائرے میں لے لو، لالہ جی کی جان شدید خطرے میں ہے۔'' اس کے ساتھ ہی کمرے میں افراتفری مچ گئی۔

☆☆☆

نینا اور انسپکٹر راج نے رام سرائے اسپتال کا رخ کیا۔ وش سنگھ، سی آئی ڈی والوں کے ساتھ ڈاکٹر جوشی کی بیوی کے قریب تھا۔

نینا اور انسپکٹر راج سادہ لباس میں تھے، انہوں نے حلیہ بھی ممکن حد تک بدل لیا تھا۔ ڈاکٹر دیا کی مدد و اعانت انہیں حاصل تھی۔

وہاں پہنچ کر انکشاف ہوا کہ لالہ جی منظر سے غائب ہے۔ جگہ جگہ سیکیورٹی کیمروں نے لالہ جی کو ریکارڈ کیا تھا۔ یہ فوٹیج دیکھتے ہوئے صاف نظر آرہا تھا کہ لالہ جی شدید اضطرابی کیفیت کا شکار ہے۔ اس نے ریکارڈ روم کے یکے بعد دیگرے تین چکر لگائے تھے۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر راج چونک سا گیا تھا۔ تیسرے چکر کے بعد وہ تیز قدموں کے ساتھ اسپتال سے باہر نکل گیا تھا۔

انسپکٹر راج، نینا سے مخاطب ہوا۔ ''پتا کرو اسپتال سے نکل کر لالہ کہاں گیا ہے؟ باہر جگہ جگہ کیمرے ہیں۔ سیف سٹی اتھارٹی والوں سے مدد لو، ہری اَپ...... وش سنگھ کو بھی ساتھ بلا لو، ہمیں قاتل تک لالہ جی ہی لے جا سکتا ہے۔''

نینا نے مستعدی سے ''یس سر'' کہا اور اپنے موبائل پر مصروف ہوگئی۔

انسپکٹر راج کا دماغ برق کے مانند رواں تھا۔ لفٹ سے وہ سب سے اوپری منزل پر آگیا۔ یہاں انتظامی دفاتر وغیرہ تھے۔

انسپکٹر راج ریکارڈ روم میں داخل ہوا تو چھوٹے سے کمرے میں نفاست سے ریکس میں سجی ہزاروں فائلوں کے درمیان ایک نوجوان لڑکی آنکھوں پر نگاہ کا چشمہ لگائے لیپ ٹاپ پر تیزی کے ساتھ کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔

انسپکٹر راج پر نظر پڑتے ہی اُس کی انگلیاں تھم گئیں۔ اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھتے ہی انسپکٹر راج جلدی سے بولا۔ ''میں انسپکٹر راج ہوں اور ڈاکٹر جوشی وغیرہ کے قتل کی تحقیقات کر رہا ہوں۔''

لڑکی کے تاثرات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی۔ ناگواری ہراس میں تبدیل ہوگئی۔ لحظے بھر میں اُس کا رنگ زرد ہوگیا۔

انسپکٹر راج کی تجربہ کار نگاہیں یہ اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھیں۔ اس نے مزید کہا۔ ''میرے بارے میں چاہو تو ڈاکٹر دیا او برائے سے پوچھ سکتی ہو۔''

اس کے پُراعتماد انداز نے لڑکی کو بتا دیا کہ آنے والا غلط بیانی نہیں کر رہا۔ سنبھالا لے کر لڑکی بولی۔ ''مجھے تصدیق کی ضرورت نہیں...... آپ بتائیں، میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

انسپکٹر راج اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور نظریں لڑکی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

اس کے انداز سے لڑکی گڑبڑا گئی۔ لمحے بھر پہلے کا مصنوعی اعتماد پل بھر میں غائب ہوگیا۔ انگلیاں مروڑتے ہوئے اس نے سر جھکا لیا۔

''تمہارا نام؟'' اسے ڈھب پر دیکھ کر انسپکٹر راج نے دبنگ انداز اپنایا تھا۔

لڑکی کے ہونٹ فوراً خشک ہو گئے۔ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''اروتی شرما۔''

ماہر صداکار کی طرح انسپکٹر راج نے اس دفعہ آواز میں نرمی پیدا کی تھی۔

''اروتی! میرے پاس زبان کھلوانے کے سیکڑوں طریقے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم سب سے نرم طریقے سے ہی زبان کھول دو۔'' ڈرامائی وقفہ دے کر اس نے دوبارہ کہا۔

''لالہ جی، بار بار تمہارے پاس چکر کیوں لگا رہا تھا۔ تم دونوں کے درمیان جو ہے اُگل دو، ورنہ......'' اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اروتی نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور نمی تھی۔

انسپکٹر راج نے اس کے بولنے سے پہلے مزید کہا۔ ''خطرناک قاتل ڈاکٹر جوشی وغیرہ کی جان لینے کے بعد اب ڈاکٹر دیا کے درپے ہے، کچھ چھپاؤ گی یا جھوٹ بولو گی تو دانستگی یا نادانستگی میں قاتل کی مدد کرو گی۔''

اروتی نے جھرجھری سی لی۔ ''مم...... میں کسی قاتل کی مدد نہیں کر رہی۔ لالہ جی کانفرنس روم کی ایک پرانی ریکارڈنگ کے لیے کئی دنوں سے کہہ رہے تھے۔ مجھے ٹائم نہیں مل رہا تھا۔ آج ان کے شدید اصرار پر مجھے وہ ریکارڈنگ نکالنی ہی پڑی تھی۔ انہیں مطلوبہ ریکارڈنگ دینے کے سوا میں نے کچھ نہیں کیا۔'' یہ کہہ کر وہ کمزور اعصاب کی لڑکی ہانپنے لگی تھی۔

انسپکٹر راج کے لیے اپنے ہیجان پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ ''میں وہ ویڈیو دیکھنا چاہوں گا۔''

اروتی نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''ریکارڈ سے میں نے کاپی کی ہے۔ دراصل کانفرنس روم میں ہونے والی ہر ایکٹی ویٹی کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی انگلیاں اپنے لیپ ٹاپ پر متحرک ہو گئیں۔ چند لمحوں میں اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین کا رخ انسپکٹر راج کی طرف کرتے ہوئے ملتجی انداز میں کہا۔

''لالہ جی کو یہ ویڈیو دینے سے زیادہ میرا کوئی کردار نہیں ہے۔ پلیز! مجھے کسی بھی معاملے سے دور رکھیے گا۔ میں بہت غریب فیملی سے ہوں اور...... خاندان کی واحد کفیل ہوں۔'' آخر میں اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔

انسپکٹر راج نے اسے تسلی دی۔ ''بے فکر ہو جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی تمام تر توجہ لیپ ٹاپ کی اسکرین کی طرف ہو گئی۔

اسکرین پر کانفرنس روم کا منظر نمایاں ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر دیا اور برائے کے ساتھ ''سرجن'' نامی قاتل کا نشانہ بننے والے تینوں ڈاکٹرز بھی موجود تھے۔ ویڈیو کے ساتھ ساتھ آڈیو کوالٹی بھی بہت اچھی تھی۔

وہ چاروں آنکھوں کے امراض کے لیے ایک علیحدہ شعبہ بنا رہے تھے۔ امراضِ چشم کے ماہر ڈاکٹرز کی سلیکشن اور ویانا سے مشینری کی درآمد سے متعلق بے حد سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر جوشی اس مشینری کی تفصیل اور اخراجات ایک فائل سے دیکھ کر بتا رہا تھا جو درآمد کی جانی تھی۔ انسپکٹر راج اسکرین پر نظریں جمائے تھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ اس ویڈیو میں ضرور کوئی اہم راز چھپا ہے۔ اچانک کانفرنس روم کا دروازہ کھلا اور سیکیورٹی کی وردی میں ملبوس ایک بھاری جسم کا اونچا لمبا شخص اندر داخل ہوا۔

انسپکٹر راج اس شخص سے مل چکا تھا۔ یہ سیکیورٹی انچارج سنجے بھلانی تھا۔ اس ویڈیو کے مقابلے میں وہ اب اور بھی زیادہ بھاری ہو گیا تھا۔

سنجے کی مداخلت ان چاروں کو گراں گزری تھی۔ خاص طور پر ڈاکٹر جوشی کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی تھی۔

سنجے کو بھی اس مداخلتِ بے جا کا اندازہ تھا۔ اس کی معذرت خواہانہ آواز ابھری۔ ''معافی چاہتا ہوں ایک ایمرجنسی کی وجہ سے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔''

''کیا قیامت آ گئی ہے؟'' ڈاکٹر ونود جیسے پھٹ پڑا تھا۔

سنجے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''جی اسپتال کے سامنے حادثہ ہوا ہے۔ کالج کے لڑکوں کی بس اور اسکریپ کا ڈمپر آپس میں ٹکرائے ہیں۔ لوگ زخمی ہونے والے کچھ لڑکوں کو اٹھا کر اسپتال......''

ڈاکٹر جوشی ہاتھ میں پکڑی فائل پٹختے ہوئے چیخا۔ ''کیا یہ کوئی خیراتی اسپتال ہے...... نکالو ان لوگوں کو باہر۔''

ڈاکٹر ونود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''فوراً حرکت میں آؤ دو منٹ میں لابی کلیئر ہونی چاہیے۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ منسٹر صاحب کی آمد کا بھی وقت ہو گیا ہے۔'' وہ اتنی زور سے چیخا تھا کہ اس کا گلا بیٹھ گیا۔

سنجے کے چہرے پر تذبذب ابھرا۔ اُس نے منمناتی آواز میں کہا۔ ''انسانی زندگی کا معاملہ ہے...... اگر ان لڑکوں کو ابتدائی طبی امداد......''

''دفع ہو جاؤ۔'' اس دفعہ ڈاکٹر منوج اس کی بات کاٹ کر گرجا تھا۔ ''تمہیں جو کہا ہے، وہ کرو۔''

سنجے کا چہرہ مٹی رنگ ہو گیا۔ وہ مردہ قدموں سے واپسی کے لیے پلٹا تو ڈاکٹر دیا او برائے کی آواز سنائی دی۔

''میرے خیال میں یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، زخمیوں کو ابتدائی طبّی امداد دے کر سرکاری اسپتال ریفر کر دیں گے۔''

امید پیدا ہوئی تو سنجے کے قدموں کو بریک لگ گئے۔

ڈاکٹر دیا او برائے کے چہرے پر انسانی ہمدردی چمک بن کر اُبھر آئی تھی اور وہ بے چین نظر آ رہی تھی۔

انسپکٹر راج کا ہیجان عروج پر تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ گتھی سلجھنے والی ہے۔

ڈاکٹر جوشی نے ناراض نظروں سے ڈاکٹر دیا کی طرف دیکھا اور روکھے انداز میں بولا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ! یہ انتظامیہ کا مسئلہ ہے اور انتظامی امور کا انچارج میں ہوں، پلیز! آپ خاموش رہیں۔''

باقی دونوں ڈاکٹرز بھی خشمگیں نظروں سے ڈاکٹر دیا کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

ڈاکٹر دیا سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔ ''انتظامی امور، قواعد و ضابطے اپنی جگہ مگر یہ انسانی زندگیوں کا معاملہ ہے۔ میں ضمیر پر بوجھ محسوس کر رہی ہوں۔ طبّی امداد دینے میں آخر حرج ہی کیا ہے؟'' وہ روہانسی سی ہو گئی۔

اس دوران ڈاکٹر دلو دنے سنجے کو جھڑکا۔ ''تم ابھی تک یہاں ہو، جو کہا ہے، وہ کرو یا پھر چارج اپنے نائب کو دے کر ہمیشہ کے لیے یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

سنجے فوراً ہی کانفرنس روم سے نکل گیا۔

اس کے بعد تینوں ہم خیال ڈاکٹرز یکجا ہو کر ڈاکٹر دیا او برائے کے سر ہو گئے، وہ سادہ مزاج اور نرم دل ڈاکٹر آنکھوں میں آنسو بھر لانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکی۔

ویڈیو کا اختتام ہوا تو انسپکٹر راج کا دماغ ایک خاص سمت میں سفر شروع کر چکا تھا۔ وہ اروتی سے مخاطب ہوا۔

''جس حادثے کا اس ویڈیو میں ذکر ہے...... اس کی فوٹیج مل سکتی ہے۔''

''بالکل! اسپتال کے اندر اور باہر ہر طرف کیمرے ہی کیمرے ہیں اور دو سال کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ یہ ریکارڈ بھی میرے پاس ہوتا ہے، میں نکال دیتی ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' انسپکٹر راج خوش ہو گیا۔

اروتی اٹھ کر ایک الماری کی طرف بڑھ گئی جس میں شفاف ائر ٹائٹ پلاسٹک کی تھیلیوں میں ہارڈ ڈسکس نظر آ رہی تھیں جن پر نفاست سے لگی چٹوں پر تاریخ وغیرہ کا اندراج تھا۔

اس دوران انسپکٹر راج نے نینا کا نمبر ملایا۔

نینا نے فوراً ہی کال اٹینڈ کر کے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''ہم نے لالہ جی کو پا لیا ہے۔ اسپتال کے سامنے سے بس لے کر وہ موبائل مارکیٹ گیا تھا۔ وہاں فرنٹ کی ایک دکان سے اس نے نیا اسمارٹ فون خرید کر دکان دار سے ہی اس میں ایک میموری کارڈ ڈلوایا ہے......''

انسپکٹر راج نے اس کی بات کاٹی۔ ''ایک سیکنڈ رکو۔''

نینا خاموش ہوئی تو وہ اروتی سے مخاطب ہوا۔ ''لالہ جی...... ریکارڈنگ کس چیز میں لے گیا ہے؟ میرا مطلب ہے...... میموری کارڈ یا یو، ایس بی وغیرہ؟''

''میرے پاس میموری کارڈز ہیں، ایک کارڈ میں، میں نے ڈال دی تھی۔''

انسپکٹر راج دوبارہ سے نینا سے مخاطب ہوا۔ ''آگے بولو۔''

نینا نے مزید رپورٹ دی۔ ''موبائل مارکیٹ والے چوراہے سے اس نے اِندر نگر کی بس لی ہے، ہم لوگ اِندر نگر کے مقامی بس اڈے پر ہیں۔ یہ خاصا پسماندہ علاقہ ہے، یہاں کیمرے بھی برائے نام لگے ہیں۔ یہاں سے آگے اس کا سراغ نہیں مل رہا۔''

انسپکٹر راج تیز آواز میں بولا۔ ''اُسے ہر صورت ڈھونڈو، وہی ہمیں قاتل تک پہنچا سکتا ہے اور اگر قاتل نے اپنی غلطی ''مٹا'' دی تو ہم ساری زندگی ٹامک ٹوئیے مارتے رہ جائیں گے۔''

نینا کی اعتماد سے لبریز آواز اُبھری۔ آپ کو جلد ہی اچھی خبر سننے کو ملے گی۔ وِش سنگھ کا دماغ خوب چل رہا ہے۔ موبائل فون سے اس کے دماغ میں آیا ہے کہ لالہ جی کے زیرِ استعمال موبائل فون سے بھی تو اس کی لوکیشن ٹریس کی جا سکتی ہے۔ لالہ جی کا موبائل نمبر حاصل کر کے وہ...... ہوم سیکیورٹی والوں کے سر ہو گیا ہے۔''

انسپکٹر راج کو اطمینان محسوس ہوا۔ اس نے فون بند کر دیا۔

اروتی نے چند ہی منٹس میں دو درجن سے زیادہ فوٹیج بڑی مہارت سے علیحدہ کر کے انسپکٹر راج کے سامنے کر دیں۔

کالج کی بس اور ڈمپر کا حادثہ...... زخمیوں کی چیخ پکار

اور موقع پر موجود لوگوں کا زخمیوں کو اٹھا کر اسپتال لانا...... عملے کے ساتھ تکرار اور پھر زخمیوں سمیت اسپتال کے سیکیورٹی کے عملے کا سب کو زبردستی اسپتال سے باہر نکال دینا، سب کچھ ریکارڈ ہو گیا تھا۔

انسپکٹر راج بار بار ان ویڈیوز کو دیکھ رہا تھا۔ اسپتال کے مالک ڈاکٹرز کی سنگ دلی کے سوا ان ویڈیوز میں کچھ بھی نہیں تھا مگر انسپکٹر راج کا وجدان کہہ رہا تھا کہ ان ویڈیوز کا ڈاکٹرز کے قتل سے ضرور کوئی نہ کوئی تعلق ہے اور یہ سوال بھی اپنی جگہ تھا کہ لالہ جی نے وہ مخصوص ویڈیو کس مقصد کے لیے حاصل کی تھی۔

ویڈیوز پر نگاہیں جمائے انسپکٹر راج اچانک چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ اسکرین پر ایک زخمی لڑکا نظر آ رہا تھا۔ اسکریپ میں موجود لوہے کی کئی سلاخیں اس کے جسم میں اتری ہوئی تھیں اور وہ تیزی سے زندگی سے دور ہوتے ہوئے تڑپ رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے فوری طبّی امداد نہ ملی تو وہ زندگی کی بازی ہار جائے گا۔

اچانک ہی جیسے انسپکٹر راج کے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اس زخمی لڑکے اور قتل ہونے والے تینوں ڈاکٹرز کی فوٹیج جیسے آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔

وہ بے اختیار اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سرا اُس کے ہاتھ آ گیا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ اگلے ایک گھنٹے کی محنت سے وہ بہت کچھ جان گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے ''سرجن'' کو پا لیا ہے۔

کالج سے چھٹی کے بعد گھر جانے والے سدھیر کو زندہ گھر جانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ رام سرائے اسپتال سے سرکاری اسپتال منتقلی کے درمیان ہی اس نے دم توڑ دیا تھا۔

سدھیر والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے غم نے والدین کو جیسے دیوانہ کر دیا تھا۔ سدھیر کی ماں...... اس کے غم میں محض دو مہینے میں ہی گھل گھل کر ختم ہو گئی تھی۔

دیکھنے والی آنکھوں نے اس مظلوم ماں کی آنکھوں سے زندگی پانی کی صورت بہتی دیکھی تھی جس کا نوجوان اور اکلوتا بیٹا چند ڈاکٹرز کی بے حسی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

سدھیر کے باپ کا نام سوریا کمار تھا۔ کہتے ہیں بیٹے کے بعد کسی نے اسے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر وقت سرخ رہتی تھیں اور وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ پھر ایک دن وہ غائب ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کبھی اپنی کالونی میں نہیں دیکھا گیا۔

انسپکٹر راج نے سوریا کمار کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو یہاں انکشافات اُس کے منتظر تھے۔ سوریا کمار ''را'' کا ٹاپ ایجنٹ تھا۔ جس کی ابتر ذہنی حالت کے سبب ''را'' نے اسے ریٹائر کر دیا تھا۔

را کے ایک آفیسر نے انسپکٹر راج کو ذاتی طور پر بتایا کہ سوریا کمار را کی ''قاتل مشین'' تھا۔ اندرون اور بیرونِ ملک وہ ''ملک وقوم'' کے نام پر را کے لیے درجنوں قتل کر چکا تھا۔ سوریا کمار کا کوڈ نیم ''سرجن'' تھا۔

انسپکٹر راج کو جب وشن سنگھ کا فون آیا تو وہ بے حد دل گرفتہ تھا۔ قاتل کی شناخت والی کامیابی کی خوشی اُس سے سیکڑوں میل دور تھی۔

انسپکٹر راج اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پہلی دفعہ ایک قاتل سے نفرت نہیں کر پا رہا تھا۔

وشن سنگھ نے کامیابی سے معمور انداز میں کہا۔ ''لالہ جی کی پن پوائنٹ لوکیشن ٹریس ہو گئی ہے سر۔''

انسپکٹر راج نے جذبات سے عاری آواز میں کہا۔ ''میں آ رہا ہوں۔''

☆☆☆

لالہ جی ایک متروک شمشان گھاٹ میں تھا۔ یہ شمشان گھاٹ ایک پہاڑی پر تھا اور آسیب زدہ مشہور تھا۔ اس طرف لوگوں کا آنا جانا بے حد کم ہوتا تھا۔

شمشان گھاٹ کی بلندی سے دور دور کے مناظر صاف نظر آتے تھے۔ پتھریلے اور ناہموار راستے پھر چلتے ہوئے اسے احساس تھا کہ وہ کسی کی نگاہوں کی زد میں ہے۔

وہ شمشان گھاٹ کے مکین سے بخوبی واقف تھا۔ اسی لیے وہ ایک جلے ہوئے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے عقب سے مطمئن ہو کر شمشان گھاٹ کا مکین آ ہی جائے گا۔

پھر بہت سناٹے میں بیٹھے ہوئے اُسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عقب سے ایک بے تاثر مردانی آواز ابھری۔

''دیا او برائے کی خبر لائے ہو؟''

لالہ جی بے اختیار گھوما۔ استخوانی چہرہ اور دو سرد آنکھیں...... جن میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی، اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں کی چمک توانائیاں چوس لیتی تھی اور ہمیشہ ہی لالہ جی چاہنے کے باوجود اختلاف نہیں کر پاتا تھا۔

لالہ جی نے نفی میں سر ہلایا تو استخوانی چہرے کی پیشانی سلوٹوں سے بھر گئی۔

''تو پھر کیوں آئے ہو؟'' انداز بے حد تیکھا تھا۔ ''بُو گیر ہر طرف مجھے سونگھتے پھر رہے ہیں۔ تم نے بہت بڑی

غلطی کی ہے۔‘‘

لالہ جی بولا۔ ’’اگر میرے پیچھے کوئی لگ کر آجاتا تو تم یہاں نہ ہوتے۔ اس بات کو رہنے دو!‘‘

استخوانی چہرے والے کے جبڑے بھنچ گئے۔ ’’تو پھر کیوں آئے ہو؟‘‘

لالہ جی مضبوط ہو کر آیا تھا۔ ایک مضبوط سہارا اسے بولنے کی طاقت دے رہا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس کا حلق خشک ہو جاتا تھا۔ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

’’ڈاکٹر دیا اوبرائے اسپتال کے اپنے حصے سے دستبردار ہو گئی ہے۔ اپنا حصہ اس نے ٹرسٹ کو سونپ دیا ہے۔‘‘

’’مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے صرف اس کی ’’خبر‘‘ چاہیے۔‘‘ استخوانی چہرے والے کا لہجہ جھلسا دینے والا تھا۔

لالہ جی نے کپکپاتے ہاتھوں سے نیا نکور اسمارٹ فون جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ’’اسے دیکھنے کے بعد تم دیا کو مارنے سے باز آجاؤ گے۔‘‘

استخوانی چہرے والا...... سوریا کمار تھا۔ اس نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ یکلخت ہی اس کی سرد آنکھوں میں الاؤ دہک اٹھے تھے۔

لالہ جی نے روہانسی آواز میں کہا۔ ’’سدھیر میری بھی بہن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے بدلے کی آگ میرے بھی سینے میں جلتی ہے ورنہ تم...... مجھے کاٹ بھی ڈالتے تو ان بے حس ڈاکٹروں کی ’’ضد‘‘ میں دبنے والا نہیں تھا۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے تاسف کے شدید احساس سے جیسے ہاتھ ملے۔

’’کاش اس دن میں بیمار ہو کر بستر پر مدہوش نہ پڑا ہوتا تو ڈاکٹروں کے پاؤں پڑ کر بھی انہیں سدھیر کو بچا لینے پر آمادہ کر لیتا۔‘‘ یہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

سوریا کمار کی دہکتی آنکھوں میں پانی چمکا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

لالہ جی آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔ ’’جب دیگر زخمیوں کے ساتھ سدھیر کو بھی اسپتال لایا گیا تو وہ چاروں کانفرنس روم میں تھے۔ دیا نے بھرپور کوشش کی کہ کم از کم زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد دے کر سرکاری اسپتال روانہ کیا جائے مگر تمہارے بدلے کی آگ میں جل کر خاکستر ہو جانے والے تینوں ڈاکٹروں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔‘‘

یہ کہہ کر لالہ جی گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ ’’میں تم سے ڈاکٹر دیا کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ وہ انسان دوست اور بڑی حساس لڑکی ہے۔ اس کا ناحق خون بہانا ظلم عظیم ہو گا۔ تمہیں یقین دلانے کے لیے میں کانفرنس روم کی ریکارڈنگ لایا ہوں۔ وہاں ہونے والی ہر سرگرمی ریکارڈ ہوتی ہے۔‘‘

سوریا کمار نے اس کے ہاتھ سے موبائل فون لے لیا۔

☆☆☆

انسپکٹر راج، وش سنگھ اور نیا دستیاب نفری کے ساتھ شمشان گھاٹ پہنچ چکے تھے اور اپنا گھیرا تنگ کرنے میں مصروف تھے۔

☆☆☆

سوریا کمار ویڈیو دیکھنے میں محو ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اُس کی آنکھیں سرخ تر ہوئیں اور پھر ان سے آنسو ٹپکنے لگے۔ نہ جانے کہاں سے زمانے بھر کا گداز اس کے چہرے پر سمٹ آیا۔ لالہ جی کے پاس بیٹھ کر اس نے اپنے بازو لالہ جی کے گرد لپیٹ دیے۔

اگلے چند لمحوں میں وہ ویران شمشان گھاٹ دونوں کی مشترکہ آہ و بکا سے گونج رہا تھا۔ ایک نے اکلوتی اولاد اور بیوی کھوئی تھی تو دوسرے نے بہن کے ساتھ بھانجا بھی کھو دیا تھا۔ دونوں کا درد مشترک تھا۔

چند ڈاکٹرز کی بے حسی نے ان کی دنیا اُجاڑ دی تھی۔

اسی وقت سوریا کمار کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ وہ تیزی سے سیدھا ہوا مگر دیر ہو چکی تھی۔ کئی سیاہ منہ والے ہتھیاروں کا رخ اس کی طرف تھا۔

انسپکٹر راج کی آواز ابھری۔ ’’خبردار! حرکت کی تو مارے جاؤ گے۔‘‘

سوریا کمار...... لالہ جی سے مخاطب ہوا جس کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

’’ادت اور گرو ناتھ میرے گاؤں والے ڈیرے پر ہیں۔ رگھو کے ذمے ان کی دیکھ بھال ہے۔‘‘ پھر اس کے لہجے نے الوداعی رنگ پکڑا۔

’’میں جاتا ہوں......لالہ!‘‘

لالہ جی کے ہاتھ اٹھے رہ گئے۔ سوریا کمار ایک پولیس والے پر جھپٹا۔ کئی ہتھیار بیک وقت گرجے اور وہ اپنے ہی خون میں نہا گیا۔

لالہ اس کے مردہ وجود سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

انسپکٹر راج نے سر سے کیپ اتارتے ہوئے آنکھوں میں آئے آنسو مسل ڈالے۔

’’سرجن‘‘ اپنے حصے کی نشتر زنی کر کے رخصت ہو گیا تھا۔

❖❖❖

سلمان سلیم

03067163117

خود فریبی

محمد فاروق انجم

زمانے کی آب و تاب آنکھوں کو چکا چوند کردیتی ہے... بالکل اسی طرح جیسے ایک ناتجربہ کار نوجوان کسی خوش اندام دوشیزہ کی محبت میں اندھا ہو جاتا ہے... بعض لوگ واقعات کو ایسے ہی نوجوان کی نظر سے دیکھتے ہیں... کہ اسے مخالف میں کوئی معمولی نقص بھی نظر نہیں آتا... ایک کہاوت ہے کہ جیسی چھڑی ویسی اس کی پرچھائیں... وہ بھی وقت کی پرچھائیں بن گیا تھا... اسے اپنی آنکھوں... اپنے انداز اور اپنی فہم و فراست پر حد درجے اعتماد تھا... اسے یقین تھا کہ وہ کبھی کسی کے دھوکے... فریب میں نہیں آسکتا... اسے قدرت نے سامنے والے کو پل بھر میں پہچاننے کی صلاحیت دی ہے... لیکن یہ بھی سچ ہے کہ سچائی بڑی کڑوی ہوتی ہے... وہ بھی خودفریبی کے جال میں الجھتا چلا گیا...

ایک بااعتماد آدمی کی خودستائی...... چالبازوں کی قیامت خیز زور آزمائی......

خاور نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتار کر مسکراتے ہوئے اُن تینوں کی طرف دیکھا۔

''کسی کو جیتنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے دل میں اعتماد اور یقین کی ایسی چٹان رکھ دو کہ وہ اس میں دب کر رہ جائے، پھر جو کھیل تم کھیلنا چاہو گے، کامیابی کے پھل کی طرح تمہاری جھولی میں آ گرے گی۔''

اس وقت وہ چاروں شہر کے ایک بہترین ریسٹورنٹ میں براجمان تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور ریسٹورنٹ میں زیادہ رش نہیں تھا۔

چاروں کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ چاروں نوجوان اور خوبصورت تھے۔ ان میں ایک خاور دوسرا عاطف، تیسرا سجاد جبکہ چوتھی علینہ تھی۔ چاروں کی دوستی ایک کلب میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کے درمیان مضبوط دوستی کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ ان چاروں کی جرائم کی دنیا میں آنے کی اپنی اپنی کہانیاں تھیں جو اُن کے دلوں میں ہی دفن تھیں۔

وہ چاروں مختلف جگہوں پر رہتے تھے اور عام لوگوں کے ساتھ عام سی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے ملنے والے یہ نہیں جانتے تھے کہ ان چاروں کے چہروں پر جو شرافت کا ماسک چڑھا ہوا ہے، اس کے پیچھے اُن کے چہرے کیسے ہیں۔ خاور بہت زیرک اور شاطر تھا۔ وہ اکثر کہتا کہ روز مچھلی پکڑنے کے بجائے ایک بار سمندر میں چھلانگ لگادو، سمندر نے اپنے دامن میں بہت کچھ سمیٹ رکھا ہے اور اس میں سے جو حصہ ملے اس سے زندگی کا آغاز کرو۔ وہ اپنی اس زندگی سے غیر مطمئن تھا اس لیے وہ بہت زیادہ دولت کمانے کے چکر میں رہتا تھا۔

اُس کی سمندر والی بات سن کر وہ تینوں ہنستے اور کوئی بھی اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرتا تھا۔ علینہ کہتی تھی کہ اب سمندر کہاں سے ڈھونڈیں اور پھر کیسے اس کی تہ میں اتر کر اپنا حصہ تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ تب ہی خاور کہتا۔

''جس دن مجھے ایسے سمندر کا پتا چلا، ہم چاروں اس میں

اتریں گے اور چاروں اپنا اپنا دامن بھر لیں گے۔''

''جب ایسا ہوگا تب دیکھیں گے کہ سمندر میں اترنا ہے کہ نہیں۔'' سجاد نے مسکرا کر کہا۔

''اُس دن میں تم میں سے کسی کو بھی سوچنے کا موقع نہیں دوں گا بس کام ہوگا اور صرف کام ہوگا۔'' خاور نے کہا۔ وہ لوگ اکثر آپس میں ایسی ہی گپ شپ لگاتے، خوب کھاتے پیتے اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

چند دن گزرے تھے کہ خاور کا اچانک ایک بڑے بزنس مین سلطان احمد سے سامنا ہوگیا۔

سلطان احمد ساٹھ سال کی عمر کا ایک صحت مند شخص تھا۔ وہ بہت اچھی یادداشت اور زبردست سوچ کا حامل تھا۔ جب اُس کی سوچ کے گھوڑے دوڑتے تھے تو پھر وہ بہت دور تک نکل جاتا تھا۔ جب کسی پر اعتبار کرنے پر آتا تو لمحہ بھی ضائع نہیں کرتا تھا اور جب اُس کا کسی پر دل نہیں جمتا تو پھر چاہے وہ سونے کا بن کے آجائے، وہ اپنی سوچ کو نہیں بدلتا تھا۔ اسے یوں کہہ لیں کہ وہ اعتماد کرتا تھا، یا پھر بالکل نہیں کرتا تھا۔

سلطان احمد بالخصوص اپنے کسی ڈرائیور سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ یہ وہم، یا کوئی نفسیاتی گرہ تھی کہ اس کا ڈرائیور گاڑی ٹھیک سے چلانا نہیں جانتا۔ اپنے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا جب وہ کہیں جارہا ہوتا تو اس پر خوف سوار رہتا کہ یہ ڈرائیور گاڑی کسی کے ساتھ ٹکرا دے گا۔ اس نفسیاتی مسئلے کی وجہ سے وہ آئے دن اپنا ڈرائیور بدل دیتا تھا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ اس کے پاس ڈرائیوروں نے نوکری کے لیے آنا ہی چھوڑ دیا۔

اُس دن وہ ڈرائیور کے بغیر خود ہی گاڑی چلا رہا تھا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے اسے اس خوف نے اپنے حصار میں لے لیا کہ اس کی گاڑی کا ایکسیڈینٹ ہوجائے گا۔ اس بات سے اسے اتنی گھبراہٹ ہوئی کہ اس کی رش میں گھری ہوئی گاڑی بند ہوگئی اور اس کے لیے گاڑی چلانا دوبھر ہوگیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور ماتھے پر پسینا چمکنے لگا۔ جس جگہ اس کی گاڑی۔ رکی تھی، وہ گاڑی کو ایک انچ آگے لے جانے میں ناکام رہا اور اس کے پیچھے کھڑی گاڑیوں کے ہارن چیخنے لگے۔

اس دوران رکشے میں بیٹھے خاور نے ڈرائیونگ سیٹ پر گھبرائے اور پسینے سے شرابور شخص کو دیکھا تو اس نے رکشے والے کو کرایہ دیا اور اتر کر تیزی سے سلطان احمد کی کار کے پاس جا کر اپنی انگلی سے شیشہ بجایا۔ سلطان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور شیشہ نیچے کرلیا۔

''سر آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ سر آپ کسی تکلیف میں تو نہیں ہیں؟'' خاور نے شائستہ لہجے میں دریافت کیا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے گاڑیوں کے ہارن چیخ رہے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے خاور نے سمجھا کہ اس شخص کو شاید دل کی تکلیف ہورہی ہے۔ خاور نے دروازہ کھولا اور بولا۔

''اگر کوئی مسئلہ ہے تو سر گاڑی میں چلاؤں......؟''

یہ سنتے ہی سلطان احمد ساتھ والی سیٹ پر ہوگیا اور خاور نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس رش میں خاور پُرسکون انداز میں گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا آگے تک لے گیا اور مناسب رفتار سے گاڑی اس جگہ سے دور نکلی تو خاور نے پوچھا۔

''سر آپ کسی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیں گے؟''

''مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم گاڑی چلاتے رہو۔'' یہ کہتے ہوئے سلطان احمد نے اپنی سوسائٹی کا پتا بتا دیا۔

سلطان احمد نے پانی کی بوتل سے دو گھونٹ بھرے اور خاور کی ڈرائیونگ کا جائزہ لینے لگا۔ کمال بات یہ تھی کہ سلطان احمد کو خاور کی ڈرائیونگ میں کوئی نقص نظر نہیں آیا اور نہ ہی کسی طرح کا خوف محسوس ہوا۔ دراصل خاور نے گاڑی کی رفتار مناسب رکھی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مہنگی کار زندگی میں پہلی بار چلا رہا تھا۔ اس لیے وہ محتاط تھا۔

گاڑی اس سوسائٹی میں داخل ہو گئی جہاں سلطان کی رہائش تھی۔ وہ پوش علاقہ تھا۔ مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے سلطان احمد کے کہنے پر ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے خاور نے کار روک دی۔

وہ بنگلا گلی کے کارنر پر تھا۔ ایک طرف گلی اور دوسری طرف کمرشل سڑک تھی جہاں مختلف کاروباری شاپس دکھائی دے رہی تھیں۔

خاور نے گاڑی کا ہارن دیا تو تھوڑی دیر کے بعد گیٹ کھلا اور کار اندر چلی گئی۔ دونوں گاڑی سے اترے اور خاور نے کہا۔

''سر آپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو مجھے جانے کی اجازت ہے؟''

سلطان نے ایک نظر خاور کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اندر آجاؤ...... چائے پیتے ہیں۔''

خاور نے رسمی طور پر انکار کیا۔ ''سر...... چائے کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل میں رکشے میں بیٹھا تھا اور آپ کی طبیعت دیکھی تو فوراً آپ کی طرف بڑھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید آپ کو دل کی کوئی تکلیف ہے۔''

''میرا دل دماغ اور گردے سب ٹھیک ہیں۔ اندر آجاؤ'' سلطان احمد نے مسکراتے ہوئے کہا اور اندر کی طرف بڑھا۔ خاور ہولے سے مسکرایا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

لاؤنج کافی بڑا تھا اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ سلطان نے صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے ملازم کو آواز دی اور اسے چائے لانے کا کہا۔ خاور نے دائیں بائیں جائزہ لیا۔

''بیٹھ جاؤ...... کیا نام ہے تمہارا؟'' سلطان صوفے پر بیٹھ گیا۔

''میرا نام خاور ہے۔'' نام بتاتے ہوئے وہ بھی سامنے براجمان ہو گیا۔

''کیا کرتے ہو؟''

خاور نے ایک لمحے سوچا کہ وہ کیا جواب دے۔ پھر ایک دم سے کہا۔ ''فی الحال جاب کی تلاش میں ہوں۔''

''تعلیم کتنی ہے؟''

''ایم اے اکنامکس ہوں۔'' خاور نے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

سلطان نے تعریفی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میرے پاس جاب کرو گے؟''

''مجھے تو جاب کرنی ہے۔ آپ کے پاس ہو، یا کسی اور کے پاس۔'' خاور نے جواب دیا۔ اس دوران ملازم چائے لے کر آگیا اور دونوں کے سامنے چائے رکھ کر چلا گیا۔ کچھ دیر تک سلطان چائے کے گھونٹ بھرتا رہا اور پھر بولا۔

''جو نوجوان اپنے کسی کام سے جا رہا تھا اور مجھے تکلیف میں دیکھ کر اپنا کام چھوڑ کر میرے پاس آگیا، میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ نوجوان اس لائق ہے کہ اس پر بھروسا کیا جائے اور میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔''

خاور نے ممنون نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ ''سر یہ آپ کی مہربانی ہے۔ دراصل میں میٹرک کا طالب علم تھا جب میرے والدین دنیا سے چلے گئے تھے۔ اس کے بعد چچا نے پالا اور پڑھایا اور جب چچی نے گھر سے نکال دیا تو ہر جگہ اپنا پن تلاش کرتا رہتا ہوں۔'' خاور نے سلطان کے الفاظ سنے تو اس کے دل میں مزید اپنی ہمدردی پیدا کرنے کے لیے ایک کہانی گھڑ دی۔

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ تم لاوارث ہو۔ خیر تم مجھے اچھے لگے ہو۔ بالخصوص میں تمہاری ڈرائیونگ سے بہت خوش ہوں۔ آج سے تم میرے ساتھ کام کرو گے۔''

''کام کیا ہوگا سر؟''

''جو میں کہوں...... میری گاڑی کی ڈرائیونگ ہو سکتی ہے، میرے آفس کا کام ہو سکتا ہے، اور کوئی کام نہیں بھی ہو سکتا۔ میں تمہیں اچھی تنخواہ دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''مجھے کام اور عزت مل رہی ہے تو سر میں کیوں اعتراض کروں گا۔'' خاور دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ پہلی ملاقات اور وہ بھی اچانک سرِراہ...... کہ سلطان احمد اعتماد کے پھول اس پر نچھاور کرنے لگا۔

''میری بیوی اور بچے دبئی میں رہتے ہیں۔ وہاں ہمارا کاروبار ہے۔ اس کمرشل سڑک پر ایک شاندار اور خوبصورت پراپرٹی کا آفس ہے، پراپرٹی کے اس کاروبار کو میرا بہنوئی

دیکھا کرتا تھا۔ وہ بھی دبئی چلا گیا ہے اور اب وہ آفس بند ہے۔ وہ آفس میں نے اس سے لے لیا تھا۔ چند دنوں میں دبئی جا رہا ہوں۔ میری چھوٹی بیٹی کی سالگرہ ہے۔ سالگرہ منانے کے بعد میں اور میری بیوی واپس آ جائیں گے اور پھر وہ پراپرٹی کا آفس میں کھولوں گا اور کاروبار شروع کردوں گا۔'' سلطان احمد نے بتایا۔

خاور خاموشی سے سن رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد سلطان نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ کام کرو۔''

''مجھے آپ کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی سر۔''

''مجھے دو چیزوں سے نفرت ہے۔ ایک جھوٹ اور دوسری چیز یہ کہ جب کوئی کسی پر اندھا اعتماد کرے تو دوسرا اس اعتماد کو توڑ دے۔ میرے لیے یہ ناقابلِ معافی جرم ہیں، جن کی سزا میری نظر میں بہت کڑی ہے۔'' سلطان کے لہجے میں یکدم سے تغیر آ گیا تھا اور وہ سنجیدگی میں ڈوبے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم ہمدرد دل کے مالک ہو، میرے ساتھ نہ کبھی جھوٹ بولو گے اور نہ میرا اعتماد توڑو گے۔''

''سر، میں تو آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا اور پہلی ہی ملاقات میں روزگار بھی دے دیا۔ میں یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا اور آخری سانس تک آپ کا اعتماد ٹوٹنے نہیں دوں گا۔'' خاور نے نظریں جھکا کر احسان مندی سے کہا تو اس کے لب و لہجے نے سلطان کو اور بھی پُریقین کر دیا کہ اس نے نہ صرف صحیح پہچانا بلکہ اسے خاور کی صورت میں بہترین نوجوان مل گیا ہے۔

سلطان زیرِلب مسکرایا۔ اسے خود پر رشک آنے لگا کہ وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی یہ جانچ لیتا ہے کہ اس کے سامنے کھڑا شخص صحیح ہے، یا غلط...... سلطان احمد کی گردن کچھ اکڑ سی گئی۔ اسے اپنے ماضی میں کیے ہوئے فیصلے یاد آ گئے کہ جب اس نے کسی چیز کو غلط کہا اور دوسروں نے صحیح کہا تو وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ سلطان احمد کی اس بارے میں رائے بالکل درست تھی۔

سلطان کو اپنے ملنے والوں سے یہی چیز ممتاز کرتی تھی کہ وہ ایک نظر میں سامنے والے کو جانچ لیتا تھا۔ اس لمحے سلطان نے سوچا کہ کاش اس وقت اس کے پاس کچھ اس کے ملنے والے موجود ہوتے تو وہ اس کی دانش مندی دیکھ کر اس کی تعریف کرتے۔ وہ یہ دیکھتے کہ سلطان بوڑھا ضرور ہوا ہے لیکن اس کی سوچ اور بندے کے اندر تک دیکھنے کی صلاحیت آج بھی جوان ہے۔ سلطان احمد کو تاسف ہوا کہ اس کے پاس کوئی اور موجود نہیں تھا اور نہ اسے اپنی تعریف میں بہت اچھے الفاظ سننے کو ملتے۔

لیکن سلطان یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا نوجوان سوا سیر ہے جو معصومیت کا ماسک چڑھانے اس کے دل میں اپنی جگہ بنا چکا ہے جبکہ سلطان اپنے آپ پر رشک کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اس ملاقات کے بعد دوسرے دن سلطان کے کہنے پر خاور اس بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں منتقل ہو گیا تھا۔ اب خاور فی الحال اس کے ڈرائیور کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ سلطان اس کی محتاط ڈرائیونگ سے بہت متاثر تھا۔ دراصل خاور اس کی نفسیات سمجھ گیا تھا کہ سلطان محتاط ڈرائیونگ پسند کرتا ہے۔ جب ڈرائیور دوسری گاڑی سے آگے نکلنے کے لیے اسے تیزی سے اوورٹیک کرتا تھا تو سلطان ڈر جاتا تھا اور اسے ڈرائیونگ ناپسند آ جاتی تھی۔ خاور نے ایسی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ مناسب رفتار سے گاڑی چلاتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کسی کار کو اوورٹیک نہ کرے اور یوں سلطان اس کی ڈرائیونگ سے خوش تھا۔

اُس روز بھی سلطان باہر جانے کی تیاری میں تھا۔ اس نے خاور کو بتایا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے بچوں کے پاس جا رہا ہے۔ واپسی پر اس کی بیوی اس کے ساتھ ہوگی اور وہ پراپرٹی کا کاروبار شروع کر دے گا۔

سلطان اسے اپنا آفس دکھانے لے گیا جو بہت خوبصورت تھا۔ سلطان احمد وسیع پیمانے پر پراپرٹی کی خرید و فروخت کا کاروبار کرنا چاہتا تھا۔

باتوں کے دوران ایسے ہی دراز میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ سلطان کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کارڈ کو دیکھتے ہوئے سلطان نے خاور کو بتایا کہ یہ شہر کے کسی بڑے بزنس مین کا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ اس نے کچھ عرصہ قبل ایک ریسٹورنٹ کھولا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کی کامیابی پر وہ اس کی دوسری برانچ اس علاقے میں کھولنا چاہتا ہے اور اس کی کوٹھی کو دیکھ کر اس نے اس کے بہنوئی سے جو پہلے اس جگہ کاروبار کرتا تھا، میری کوٹھی کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''آپ نے اُن سے ملاقات کے بعد انکار کیا تھا؟'' خاور نے پوچھا۔

''مجھے اس کے ساتھ بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں ہیں۔ ایک دوسرے سے ملے بھی نہیں ہیں۔ اس نے میرے بہنوئی سے بات کی تھی اور وہ

پیغام مجھ... تک پہنچا تھا۔ میں نے اپنے بہنوئی کے ذریعے انکار بھیج دیا تھا، حالانکہ میرا بہنوئی کہتا تھا کہ میں وہ کوٹھی بیچ دوں اسے وہ جگہ بہت پسند آئی ہے اور وہ اچھے داموں خرید لے گا، لیکن میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔''
سلطان نے لاپروائی سے جواب دیا اور ہاتھ میں پکڑا وزیٹنگ کارڈ ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔
تھوڑی دیر کے بعد دونوں کمرے سے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ خاور نے جان بوجھ کر کار کی چابی کمرے میں ہی چھوڑ دی تھی۔ باہر نکل کر خاور کو ایک دم سے چابی کا یاد آیا اور وہ چابی لینے اندر چلا گیا۔ پھر خاور نے ڈسٹ بن سے وہ کارڈ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔
اسی دن خاور نے عاطف کو فون کر کے کارڈ واٹس ایپ کر دیا اور کہا کہ وہ نجیب خان کے بارے میں تمام معلومات لے۔ اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ وہ کیسا بزنس مین ہے اور اس کی کمزوری کیا ہے۔
معلومات حاصل کرنے کے لیے عاطف نے جاب کی غرض سے اس کے آفس کا رخ کیا۔ جاب تو ملی نہیں مگر کچھ نہ کچھ اس کے بارے میں کھوج لیا تھا۔ اس کے بعد علینہ گئی تو اس نے اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ اس نے سر سے گردن تک اسکارف لپیٹ رکھا تھا۔ آنکھوں میں نیلے لینسز ڈال لیے تھے۔
نجیب خان کی کمپنی نے جاب کے لیے کوئی اشتہار نہیں دیا تھا۔ جب عاطف نوکری کے لیے گیا تھا تو اسے نجیب خان نے چلتا کر دیا تھا۔ جبکہ علینہ کو اندر بلا لیا تھا۔
پہلے تو اس نے علینہ کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ اپنی حریص نظروں سے علینہ کو ٹٹولا اور بولا۔
''آپ جاب کے لیے آئی ہیں؟''
''جی سر......'' علینہ بولی۔
''میری کمپنی میں کوئی لڑکی اس طرح اسکارف لپیٹ کر نہیں آتی۔'' نجیب خان نے کہا۔
''کیا آپ کو یہ پسند نہیں ہے سر؟''
''مجھے چھپا ہوا حسن پسند نہیں ہے۔'' نجیب خان نے اس کی نظروں میں اپنی نگاہیں پیوست کرتے ہوئے کہا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ وہ کال ایسی تھی کہ نجیب خان کو فوراً جانا پڑا۔ اس نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک بہت ضروری کال آ گئی ہے، اگر میں نہ گیا تو لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔ کیا تم کل بارہ بجے آفس میں آ سکتی ہو؟''
''بالکل آ سکتی ہوں۔'' علینہ نے مسکرا کر جواب دیا۔
''میں کل بارہ بجے تمہارا انتظار کروں گا۔'' نجیب خان نے کہتے ہوئے ایک مسکراہٹ بکھیر دی۔
نجیب خان اسی وقت چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی کے پاس جا کر علینہ پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی اور پھر اسکارف کا ذکر چھیڑ دیا اور اس ذکر میں اس نے جہاں اور باتیں جان لیں وہاں اس کے علم میں یہ بات بھی آ گئی تھی کہ نجیب خان تین شادیاں کر چکا ہے، حسن پرست اور دل پھینک انسان ہے۔
ساری رپورٹ خاور تک پہنچ رہی تھی۔ خاور نے عاطف اور سجاد کو تاکید کی کہ وہ اس وقت شیو نہ کریں جب تک وہ ان سے مل نہیں لیتا۔
سلطان کی ٹکٹ کنفرم ہوئی تو اس نے خاور کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ ''خاور تم میرے ساتھ بارہ دن سے ہو...... ان بارہ دنوں میں، میں نے تم کو انتہائی با اخلاق اور سعادت مند پایا ہے۔ میں نے تم کو اپنے طور پر آزمایا بھی ہے۔ جس میں تم کامیاب رہے ہو، میں تم سے بہت مطمئن اور خوش ہوں۔ میں آج ڈیڑھ بجے کی فلائٹ سے چلا جاؤں گا۔ تم میرے پیچھے سرونٹ کوارٹر کے بجائے یہاں سونا۔ اور اس گھر کی دیکھ بھال کرنا۔''
''جو آپ کا حکم سر۔'' خاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ خاور دل ہی دل مسکرا بھی رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلطان نے اسے کب کس طرح سے آزمایا تھا۔ اور اس نے کس وقت اپنی ایمانداری کا ثبوت دیا تھا۔
''کھانا پکانے کے لیے ملازم ہے۔ گیٹ پر چوکیدار ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''
''سر آپ کھانا پکانے والے کو چھٹی دے دیں۔ چوکیدار گیٹ پر رہے گا۔ کیونکہ میں خود اچھا کھانا بنا لیتا ہوں اور اس کا مجھے شوق بھی ہے۔'' خاور نے کہا۔
''تم نے پہلے نہیں بتایا، میں بھی تمہارے ہاتھ کا پکا کھانا کھا لیتا۔'' سلطان احمد خوش ہو گیا۔
''سر واپسی پر میں ہی کھانا بناؤں گا۔'' خاور مسکرایا۔ یوں گھر کے اندر کے ملازم کو چھٹی مل گئی اور گیٹ پر صرف چوکیدار رہ گیا تھا۔
ڈیڑھ بجے کی فلائٹ سے سلطان احمد ملک سے باہر چلا گیا۔
سلطان کے جانے کے دو روز بعد خاور نے اپنے تینوں دوستوں کو اسی ریسٹورنٹ میں بلا لیا اور ایک بار پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے براجمان تھے۔
خاور نے ان تینوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں نے ایک

دن کہا تھا کہ جس دن مجھے سمندر کا پتا چل گیا میں تم تینوں کو بتاؤں گا اور پھر ہم ایک ساتھ اس سمندر میں اتر کر اپنی قسمت تلاش کریں گے۔''

''ہاں کہا تھا...... مجھے یاد ہے'' عاطف بولا۔

''میں نے یہ بھی کہا تھا کہ دوسرے پر ایسا اعتبار بنالو کہ وہ اس میں دب جائے، میں نے ایسا ہی کیا کہ وہ بے چارہ میرے اعتبار تلے دب گیا۔'' خاور نے زعم سے کہا۔

''تم ایسا کرنے کے ماہر ہو، یہ ماننا پڑے گا۔'' عاطف بولا۔

''اب ہم ایک کھیل کھیلیں گے۔ اس کھیل میں چار کردار ہوں گے۔ ایک کردار سلطان احمد کا، دوسرا پراپرٹی ڈیلر کا تیسرا سلطان احمد کے نوکر اور چوتھا اس کی جوان بیوی کا ہوگا۔'' خاور نے کہا۔

وہ تینوں نظریں جمائے خاور کی طرف دیکھ رہے تھے۔ علینہ نے پوچھا۔ ''اس کھیل کا مقصد کیا ہوگا۔ مطلب یہ کہ تم ہمیں جو کہتے رہے، ہم کرتے رہے۔ نجیب خان کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور چپ ہوگئے کیونکہ تم نے کہا تھا کہ ابھی کوئی سوال نہیں کرنا بس وہ کرنا جو تم کہو گے۔''

خاور مسکرایا۔ ''اس کھیل میں ڈیڑھ سے دو کروڑ روپے ملیں گے۔ قسمت اچھی ہوئی تو زیادہ بھی مل جائیں گے۔ لیکن ڈیڑھ سے دو کروڑ تو کہیں نہیں گئے۔ اس کھیل کا رائٹر اور ڈائریکٹر میں ہوں۔ تم تینوں اپنی جاندار اداکاری سے بزنس مین نجیب خان کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوگئے تو سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔'' خاور کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔

''ہمیں کرنا کیا ہوگا؟'' سجاد نے پوچھا۔

''یہ مت پوچھو کہ ہمیں کرنا کیا ہوگا بلکہ یہ کہو کہ تم سب اس کھیل میں اپنا اپنا کردار نبھانے کو تیار ہو۔'' خاور بولا۔

ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر علینہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، اس کے ہاتھ پر اُن تینوں نے اپنا اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ تینوں تیار تھے۔

خاور نے تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات یاد رکھنا۔ اس کھیل میں اعتماد سے بھرپور اداکاری ہی ہمیں کامیابی کی طرف لے جاسکتی ہے اس لیے کسی بھی موقع پر اپنا اعتماد کھونے مت دینا۔'' خاور کہہ کر چپ ہوا اور کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ ''گیٹ پر کھڑے چوکیدار کا کیا کریں؟''

''اسے ایک ہفتے کی چھٹی پر بھیج دو۔'' عاطف بولا۔

''اس نے اگر سلطان احمد یا کسی اور سے رابطہ کرلیا تو پھر کھیل بگڑ جائے گا۔'' خاور مسلسل سوچ رہا تھا۔

''پھر کیا کریں؟'' علینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ابھی میرے ساتھ چلو۔'' خاور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ چاروں اسی وقت بنگلے پر پہنچے۔ چوکیدار نے جونہی گیٹ بند کیا عقب سے خاور نے اسے قابو کرلیا۔ خاور نے راستے میں ان کو سمجھا دیا تھا کہ کیا کرنا ہے اس لیے ایک دم سے انہوں نے چوکیدار کو اٹھایا اور دبوچ کر اندر لے گئے۔

اندر ایک بیسمنٹ تھی۔ وہ اسے وہاں لے گئے۔ راستے سے انہوں نے ایک زنجیر اور تالا خریدا تھا۔ جو علینہ نے پکڑ رکھا تھا۔ بیسمنٹ میں لے جاکر انہوں نے چوکیدار کی ٹانگ پر زنجیر کے ایک حصے کو لپیٹ کر تالا لگا دیا اور دوسرا حصہ ستون کے گرد لپیٹ کر وہاں بھی تالا لگا دیا۔ اب چوکیدار کمرے کے اتنے حصے میں پھر سکتا تھا کہ وہ دروازے تک نہیں جاسکتا تھا۔ باتھ روم کے قریب تھا اس لیے وہ آسانی سے اندر جاسکتا تھا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' چوکیدار جو مسلسل مزاحمت کر رہا تھا، اس نے پوچھا۔

''بس چپ رہو۔ تم کو تین وقت کا کھانا ملتا رہے گا۔ جلد تمہیں آزاد کردیں گے۔'' خاور نے کہا اور وہ سب باہر نکل گئے۔

خاور نے دروازہ باہر سے مقفل کردیا۔

''جب تک ہم یہ کھیل کھیلیں گے، ہمیں چوکیدار کی طرف سے کوئی ڈر نہیں ہوگا۔'' خاور بولا۔

اب چاروں کھیل کھیلنے کو تیار تھے۔

☆☆☆

عاطف کلین شیو تھا۔ خاور کے کہنے پر اُس نے شیو نہیں کرائی تھی۔ خاور نے اس کی بڑھی ہوئی داڑھی صاف کرادی تھی اور مونچھیں رہنے دی تھیں جنہیں تراش خراش کر چہرے کی خوبصورت زینت بنا دیا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا فریم لیس چشمہ بھی لگالیا تھا۔ اسی طرح سجاد کی شیو بڑھی رہنے دی تھی۔ خاور نے بھی اپنی داڑھی اور مونچھ بڑھائی ہوئی تھی۔ ایسا کرنے سے اُن کے چہرے بدل گئے تھے۔

سلطان کو خاور نے احساس بھی نہیں ہونے دیا تھا اور کچھ ایسی باتیں دریافت کرلی تھیں جو خاور کے لیے بہت سودمند تھیں۔ ان باتوں کی روشنی میں اس نے کھیل تیار کیا تھا۔ اس نے تینوں کو اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ کس کو کیا کرنا ہے۔

نجیب خان اور سلطان احمد زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے اس لیے وہ ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اس چیز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خاور بڑی مہارت سے تینوں کو ان کے کردار سمجھا رہا تھا۔ انہوں نے

ریہرسل تک کرلی تھی۔ اور اب وہ اپنا اپنا کردار ادا کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

خاور نے دو لڑکوں کو کام کے لیے بلایا۔ وہ دونوں لڑکے چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے تھے۔ خاور کو وہ اچھی طرح سے جانتے تھے۔

اس کھیل کا پہلا سین اس وقت شروع ہوا جب عاطف نے نجیب خان کے فون پر کال کی۔

''میرا نام اسد جمال ہے اور میں ایس ایس پراپرٹی ڈیلر کے آفس سے بات کررہا ہوں۔ نجیب خان صاحب سے بات ہوسکتی ہے؟''

''ایک منٹ ہولڈ کریں۔'' سیکرٹری نے کہہ کر نجیب خان سے بات کی اور عاطف کا رابطہ کرادیا۔

''سر میں اسد جمال بول رہا ہوں۔ آپ نے چند دن پہلے اپنے ریسٹورنٹ کے لیے سلطان احمد کا بنگلا خریدنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔'' عاطف کاروباری لہجے میں بولا۔

''کون سلطان احمد اور کون سا بنگلا؟'' نجیب خان نے حیرت سے پوچھا۔

عاطف نے کہا۔ ''مسلم ٹاؤن کا وہ کارنر والا بنگلا جس کے ایک طرف گلی اور دوسری طرف کمرشل سڑک لگتی ہے۔''

''ہاں یاد آیا...... میں نے ایسے ہی گزرتے ہوئے وہ بنگلا دیکھا تھا تو میرے دل میں خیال آیا تھا کہ یہ ریسٹورنٹ کے لیے بہت موزوں جگہ ہے لیکن انہوں نے انکار کردیا تھا۔''

''سر اب وہ بنگلا بیچنا چاہتے ہیں۔'' عاطف نے بتایا۔

''کیا واقعی بیچنا چاہتے ہیں؟'' نجیب خان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی بالکل سر...... میں اسی آفس سے بول رہا ہوں جہاں آپ ایک بار آچکے ہیں۔ اس آفس میں پہلے ایک اور صاحب تھے اب میں نے ان سے آفس خرید لیا ہے اور سلطان احمد نے مجھ سے خود رابطہ کرکے کہا کہ وہ اپنا بنگلا بیچنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے آپ کے بارے میں بتایا تھا، اس لیے پہلے آپ سے بات کررہا ہوں۔ اگر آپ خواہش مند ہیں تو میں بات آگے بڑھاتا ہوں۔''

''خواہش مند تو ہوں لیکن پہلے میں بنگلا اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' نجیب خان نے کہا۔

''کوئی پرابلم نہیں ہے سر...... آپ کب وزٹ کرنا چاہیں گے؟'' عاطف نے جلدی سے کہا۔

نجیب خان نے ایک لمحے سوچا اور پھر بولا۔ ''آج شام سات بجے...... کیا خیال ہے؟''

''بالکل ٹھیک ہے سر...... آپ میرے آفس آجائیں۔'' عاطف نے کہا۔

''میں ٹھیک سات بجے آپ کے آفس میں ہوں گا۔ میں وقت کی قدر کرتا ہوں۔ سات بجے کا مطلب سات بجے ہی ہوگا۔'' نجیب خان نے تاکید کی۔

''سر میں منتظر ہوں گا۔'' عاطف نے کہا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔ وہ تینوں اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ سب نے اس کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھا۔

''تم تو بہت اچھے اداکار ہو۔'' علینہ نے تعریف کی۔

''شکریہ...... شکریہ......'' عاطف نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سر خم کیا۔

خاور نے جلدی سے کہا۔ ''اب اگلے سین کی تیاری کرو۔''

☆☆☆

سات بجے سے قبل بہترین سوٹ میں ملبوس عاطف پراپرٹی کے آفس میں پہنچ گیا۔ وہ اس کمرے میں جاکر بیٹھ گیا جو سلطان احمد نے اپنے لیے آراستہ کیا تھا۔ عاطف نے اپنے سامنے ایک نقشہ پھیلا لیا تھا۔ اس نے وقت دیکھا، سات بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ وہ دونوں ملازم لڑکے باہر اپنی اپنی میز پر بیٹھے ایسے ہی کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔

ٹھیک سات بجے ایک بڑی گاڑی اس آفس کے باہر رکی اور اندر سے ایک خوش پوش شخص باہر نکلا، اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر آدھا سگریٹ ایک طرف پھینکا اور آفس کے اندر چلا گیا۔

''مجھے اسد صاحب سے ملنا ہے۔'' اندر جاتے ہی نجیب خان نے کہا۔

''جی آپ اندر تشریف لے جائیں۔'' لڑکے نے شائستہ لہجے میں اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں عاطف بیٹھا تھا۔

کمرے کی طرف جاتے ہوئے نجیب خان نے ایک نظر خوبصورت آفس کی طرف ڈالی اور دل ہی دل میں متاثر ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے دیکھتے ہی عاطف اپنی جگہ سے اٹھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''آیئے نجیب خان صاحب...... میں آپ کا ہی انتظار کررہا تھا۔'' عاطف نے اس اعتماد سے کہا تھا کہ جیسے وہ پہلے سے ہی نجیب خان کی شکل سے واقف ہو۔

دونوں کچھ رسمی باتوں کے بعد ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر نجیب خان نے پوچھا۔ ''وہ صاحب واقعی اس جگہ کو بیچنا چاہتے ہیں؟''

''انہوں نے جیسے ہی مجھ سے اس بنگلے کو بیچنے کی بات کی، میں نے فوراً آپ سے رابطہ کیا۔'' عاطف بولا۔

''جب میں پہلے اس آفس میں آیا تھا تو اس کرسی پر کوئی اور صاحب بیٹھے تھے۔'' نجیب خان نے کہا۔

''وہ میرے پارٹنر تھے جو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اب یہ سارا کاروبار میرا ہے۔'' عاطف نے بتایا۔

''میں وقت ضائع کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ دراصل میں اس جگہ اپنا دوسرا ریسٹورنٹ کھولنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ جگہ بہت موزوں لگی تھی۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ ہم بجائے اس کے کہ باتوں میں وقت ضائع کریں ابھی وہ جگہ اندر سے دیکھیں اور اس پراپرٹی کے مالک سے بات کریں۔ اگر سودا ہو جائے تو میں ابھی بیعانہ دے دیتا ہوں۔'' نجیب خان نے کہا۔

''میں خود بھی چاہتا ہوں کہ وقت ضائع نہ ہو۔ دراصل اس پراپرٹی کے مالک نے ایک دوسرے پراپرٹی ڈیلر کو بھی کہہ دیا ہے کہ وہ بنگلا بیچنا چاہتے ہیں۔ آج وہ پراپرٹی ڈیلر ایک پارٹی کو وہ بنگلا دکھا کر بھی گیا ہے۔''

''اگر اس نے آپ سے بات کی تھی تو پھر اسے کسی دوسرے پراپرٹی ڈیلر سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''اس پراپرٹی کا مالک اپنی ہی سوچ اور ضد کا مالک ہے۔ آئیے چلتے ہیں۔'' عاطف نے کہہ کر نقشہ سمیٹا اور اسے لے کر باہر چلا گیا۔

اس جگہ سے وہ بنگلا زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے پیدل ہی وہاں تک چلے گئے۔ عاطف نے بیل دی تو ملازم کے روپ میں سجاد نے آکر گیٹ کھولا۔

سجاد کی ویسے ہی شیو بڑھی ہوئی تھی، اوپر سے اسے کچھ سفید بھی کر دیا تھا۔ سر پر ایک میلی سی ٹوپی بھی جمالی تھی اور کپڑے بھی عام سے پہن لیے تھے۔

وہ ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ انہیں بٹھا کر وہ اندر چلا گیا اور جب تھوڑی دیر کے بعد وہ کمرے میں آیا تو وہ ایک وہیل چیئر دھکیل رہا تھا۔ اس وہیل چیئر پر خاور بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی داڑھی میں سفید بال جھلک رہے تھے، اس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اپنے بال اس نے پیچھے کی طرف کر کے بنائے تھے۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر چادر تھی۔ خاور بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش بھی تھی۔

سجاد نے وہیل چیئر نجیب خان سے کچھ فاصلے پر روک دی اور مؤدب ہو کر پیچھے کھڑا ہو گیا۔

خاور نے اپنا ہاتھ نجیب خان کی طرف بڑھایا جو نجیب خان نے فوراً اٹھ کر تھام لیا اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''یہ نجیب خان صاحب ہیں، شہر کے بڑے بزنس مین ہیں اور یہ اس بنگلے کے مالک سلطان احمد ہیں۔'' عاطف نے جلدی سے دونوں کا تعارف کرایا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' نجیب خان نے کہا۔

''چند دن پہلے میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہوں۔'' خاور نے اپنے بدلے ہوئے لہجے کے ساتھ بتایا۔

''بہت دکھ ہوا۔'' نجیب خان نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

''مجھے یہ بنگلا فروخت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر معذور ہونے کی وجہ سے میں شہر کے ہنگاموں سے دور چلے جانا چاہتا ہوں۔ میرے آبائی گاؤں میں ہماری ایک بہت بڑی حویلی ہے۔ زمین ہے اور دیکھنے کو فطرت کے رنگ ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں اب میرے لیے کچھ نہیں رہا۔'' خاور نے تاسف سے کہا۔

نجیب خان خالص کاروباری تھا۔ اسے خاور کی ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اصل بات کی طرف آنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ زندگی کی رنگینیاں صحت سے مشروط ہیں۔''

''مجھے آپ کی بات سے مکمل اتفاق ہے۔'' خاور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کیا پینا چاہیں گے، چائے، کافی یا پھر جوس......؟''

''بہت شکریہ، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا ہم وہ بات کریں جس کے لیے ہم یہاں بیٹھے ہیں؟'' نجیب خان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں سلطان احمد پھر اپنا دکھ بیان نہ کرنا شروع کر دے۔

''بالکل...... ہمیں اصل بات کی طرف آنا چاہیے۔''

''میں اس بنگلے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آپ دیکھ سکتے ہیں۔'' خاور بولا۔ ''میرا ملازم آپ کے ساتھ جائے گا۔ میں اسی جگہ بیٹھا ہوں۔''

ابھی نجیب خان اور سجاد اپنی جگہ سے اٹھے ہی تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور علینہ اندر آگئی۔ اس نے خوبصورت ساڑی زیب تن کی تھی اور ہلکے میک اپ کے ساتھ اس نے ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ علینہ کی خوبصورتی غضب ڈھا رہی تھی۔ نجیب خان کی نظر علینہ پر پڑی تو وہ ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھنے لگا جبکہ علینہ کی نگاہیں بھی

جونہی نجیب خان کی نگاہوں سے چار ہوئیں تو وہ ایک لمحے کے لیے چونکی اور پھر خاور کے پاس آ کر نرم لہجے میں بولی۔
''آپ نے دوا نہیں کھائی اور اسی طرح اندر آ گئے۔''
خاور نے ایک نظر علینہ اور دوسری نظر نجیب خان کی طرف دیکھ کر نگاہیں پھر علینہ پر مرکوز کر دیں۔ خاور کے چہرے سے عیاں تھا کہ علینہ کا اندر آنا خاور کو پسند نہیں آیا ہے۔
''آپ مجھے یہی بتانے کے لیے آئی ہیں؟''
''جی ہاں۔ کیونکہ ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ دوا وقت پر لینی ہے۔'' علینہ نے کہا۔
''آپ نے بتا دیا ہے، اب آپ اپنے کمرے میں جائیں۔'' خاور بولا اور علینہ نے ایک نظر نجیب خان پر ڈال کر باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ نجیب خان تو جیسے علینہ کے حسن میں کھو گیا تھا۔
''چلیں سر......؟'' اچانک عاطف کے پوچھنے پر نجیب خان چونکا اور اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''اپنی سے آدھی عمر کی لڑکی سے شادی کر کے بیٹھا ہوا ہے۔'' عاطف نے نجیب خان کے قریب سے گزرتے بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ نجیب خان نے اس کے الفاظ صاف سن لیے تھے۔
ملازم سجاد کے ساتھ دونوں نے پورا بنگلا دیکھ لیا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے سجاد نے جانے کی اجازت لی اور وہاں سے چلا گیا۔
''کیوں سر پسند آیا بنگلا؟'' عاطف نے پوچھا۔
''پسند تو ہے، ڈیمانڈ کیا ہے؟''
''مانگنے کو وہ کچھ بھی مانگے...... ہم تو اپنا ریٹ لگائیں گے۔'' عاطف نے کہا۔
''وہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن پتا بھی تو چلے کہ اس کی ڈیمانڈ کیا ہے۔'' نجیب نے پوچھا۔
''ریسٹورنٹ کے لیے یہ بہترین جگہ ہے۔ اس پوری کمرشل روڈ پر کوئی ریسٹورنٹ نہیں ہے......''
نجیب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ مجھے بتائیں کہ ڈیمانڈ کیا ہے؟''
''وہ تو پانچ کروڑ مانگ رہے ہیں۔'' عاطف نے کہہ کر سامنے ٹوائلٹ کے دروازے کی طرف دیکھ کر معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''سر اگر آپ اجازت دیں تو میں دو منٹ کے بعد آتا ہوں۔''
''او کے۔'' نجیب خان نے کہا اور عاطف جلدی سے ٹوائلٹ کی جانب چلا گیا۔
ٹھیک اسی وقت علینہ ایک طرف سے نکل کر سامنے آ گئی۔ نجیب خان نے اس کی طرف دیکھا اور زیرِلب مسکرایا۔
''میں نے آپ کو اندر دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ میں چھ ماہ قبل آپ کے آفس جاب کے لیے آئی تھی۔ آپ نے اس وقت بھی مجھے متاثر کیا تھا۔ آپ بہت خوش لباس ہیں۔'' علینہ نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ ''مجھے آپ کے آفس میں نوکری نہیں ملی اور میں سلطان احمد کے آفس میں چلی گئی۔ وہاں بھی مجھے جاب نہیں ملی لیکن میں اس کی بیوی بن گئی۔'' یہ کہنے کے بعد علینہ کے چہرے پر اداسی...... چھا گئی۔
''آپ کا چہرہ اداس کیوں ہو گیا ہے؟'' نجیب خان نے پوچھا۔
علینہ نے ایک نظر ٹوائلٹ کی طرف دیکھا اور بولی۔
''آپ سلطان سے اس بنگلے کے بارے میں بات کریں اور کل تک سوچنے کا وقت لے لیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کل آپ کے آفس آ جاؤں؟''
''مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں دس بجے تک آ جاتا ہوں۔'' نجیب نے جلدی سے کہا۔
''میں گیارہ بجے آ جاؤں۔''
''میں انتظار کروں گا۔'' نجیب نے اُس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ علینہ جانے لگی تو نجیب نے پوچھا۔ ''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟''
''میرا نام بینش ہے۔'' علینہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی اور اسی اثنا میں عاطف آ گیا۔
''ایم سوری...... چلیں سر۔''
''چلیں۔'' نجیب نے کہا۔ دونوں وہاں سے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ خاور اسی انداز میں اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔
''دیکھ لیا بنگلا آپ نے؟''
''جی ہاں دیکھ لیا ہے۔ مجھے بتائیں گے کہ آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے؟'' اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے نجیب نے پوچھا۔
''ایک ہی قیمت ہے...... پانچ کروڑ۔'' سلطان نے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اس کے سامنے پھیلا دیں۔
نجیب کو... بنگلا پسند آیا تھا اور اس کی دانست میں اس جگہ بہترین ریسٹورنٹ بن سکتا تھا۔ وہ اسی وقت اس کی قیمت لگا سکتا تھا لیکن بینش نے کل اس سے ملاقات کا کہا تھا۔ نجیب جاننا چاہتا تھا کہ بینش اس سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ اور پھر حُسن پرست نجیب تو علینہ کو دیکھتے ہی اس کے حُسن کا دیوانہ ہو گیا

تھا۔

''میں سوچ لوں پھر کل ملاقات کروں گا۔'' نجیب اپنی جگہ سے اٹھا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن یاد رکھیے گا، پانچ کروڑ مانگے ہیں اتنے ہی لوں گا۔'' خاور کا لہجہ دوٹوک تھا۔ ''اگر یہ سودا ہوگیا تو میں زیادہ وقت نہیں دوں گا۔ تین، چار دن میں آپ کو ساری پے منٹ کرنی ہوگی۔ میں کاغذات آپ کے نام منتقل کردوں گا۔''

''میں اس بارے میں بھی سوچ لیتا ہوں۔'' نجیب نے متانت سے کہا۔

''شریف...... مجھے لے چلو۔'' خاور نے سجاد سے کہا جو ملازم کے روپ میں پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے فوراً حکم مانا اور وہیل چیئر کو جانے کے لیے دوسری طرف گھما دیا۔

نجیب کھڑا دیکھتا رہا اور پھر خود بھی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے عاطف لپکا اور جاتے ہوئے سرگوشی کرنے لگا۔

''بوڑھا سنکی ہے۔ اس کی آپ پروا نہ کریں۔ آپ کا اس جگہ ریسٹورنٹ بنے گا تو آپ چند مہینوں میں بہت اچھا منافع کما لیں گے۔''

''او کے، کل بات کرتے ہیں۔'' نجیب نے چلتے ہوئے کہا۔ اس کا دماغ بینش میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کی خوبصورت شکل اس کی آنکھوں میں تھی۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ چھ ماہ قبل جب وہ جاب کے لیے اس کے آفس میں آئی تھی تو اس نے اتنی خوبصورت لڑکی کی طرف توجہ کیوں نہیں دی تھی؟ نجیب نے ابھی پانچ ماہ قبل ہی دوسری شادی کی تھی۔ اس کی دوسری بیوی کی عمر بینش سے زیادہ تھی لیکن اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے سلطان کی طرح کم عمر لڑکی سے شادی کیوں نہیں کی؟

''او کے...... میں انتظار کروں گا۔'' عاطف نے کہا۔

نجیب اپنی گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہوگیا۔ عاطف نے اندر جاتے ہی فون کیا اور رابطہ ہوتے ہی بولا۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''تھوڑی دیر کے بعد آفس بند کر کے میرے پاس آجاؤ۔'' دوسری طرف سے خاور کی آواز آئی۔

☆☆☆

ٹھیک گیارہ بجے علینہ بہترین لباس اور متاثر کن میک اَپ میں نجیب کے آفس پہنچ گئی۔ جونہی نجیب خان نے اس کی طرف دیکھا، وہ کچھ دیر تک اس پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ علینہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ نجیب نے اسے بیٹھنے کے لیے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''چھ ماہ قبل میں اسی آفس میں آئی تھی، انٹرویو کے لیے۔ شاید میں اس لیے ناکام ہوگئی تھی کہ میں سوالوں کے جواب کی طرف کم اور آپ کی شخصیت کی طرف زیادہ توجہ دیتی رہی تھی۔'' علینہ نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کے پورے آفس میں نظر گھماتے ہوئے کہا تو نجیب خان بھی اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوگیا۔

''میری شخصیت میں آپ کو ایسا کیا نظر آگیا تھا کہ آپ میری طرف ہی دیکھتی رہی تھیں؟'' مرد جب خوبصورت لڑکی کے منہ سے اپنی تعریف سنتا ہے تو اس کی حالت بالکل اس کوّے جیسی ہوجاتی ہے جس نے لومڑی کے کہنے پر گانا شروع کر دیا تھا۔ کچھ ایسی ہی حالت نجیب کی بھی تھی۔ کوّے نے تو پنیر کا ٹکڑا کھو دیا تھا، نجیب خان جانے کیا کھونے والا تھا۔

علینہ نے ایک نظر نجیب پر ڈالی اور مسکرا کر کہا۔ ''اب کیا بتاؤں، وہ سب ماضی کا حصہ بن چکا ہے اور میں ایک بوڑھے کھوسٹ کی بیوی بن چکی ہوں، جو اب معذور بھی ہو چکا ہے۔''

''کیا آپ خوش نہیں ہیں؟''

''خوش تھی...... بلکہ بہت خوش تھی کہ ایک دولت مند کی بیوی بن رہی ہوں، جس کی دو بیویاں اسے چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ پاگل سنکی ہے۔ وہ اپنی ضد کا پکا ہے۔'' علینہ نے کہا۔

''آپ کے لیے میں کافی منگواتا ہوں۔'' نجیب نے اس کا اداس چہرہ دیکھا تو بولا۔

''مجھے کافی نہیں پینی، میں پہلے ہی بہانہ کر کے گھر سے نکلی ہوں۔ میں دراصل آپ کے پاس ایک مقصد سے ... آئی تھی...... پلیز پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو وہ بنگلا کیسا لگا۔'' علینہ اپنے اصل مقصد کی طرف بڑھی۔

''کاروباری نقطۂ نظر سے وہ بہت زبردست ہے۔'' نجیب ابھی تک اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''آپ اسے خریدنا چاہتے ہیں؟''

''بالکل خریدنا چاہوں گا۔''

''سلطان اسے... پانچ کروڑ سے کم پر نہیں بیچے گا۔ تین گاہک پہلے بھی اس کی ضد کے آگے ہار کر جا چکے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ وہ بنگلا جلدی بک جائے۔''

''آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟''

''یہ بتا نہیں سکتی لیکن چاہتی ہوں کہ وہ بنگلا جلد فروخت ہو

جائے۔'' علینہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اگر آپ وہ بنگلا خریدنا چاہتے ہیں تو میں آپ کا ساتھ دے سکتی ہوں۔''

''کیسا ساتھ......؟؟'' نجیب نے پوچھا۔

''سلطان احمد کا جب حادثہ ہوا تھا تو اس کی آنکھوں کی بینائی پر بھی گہرا اثر پڑا تھا۔ اب اسے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا لیکن وہ ایسا ظاہر کرتا ہے جیسے وہ سب کچھ ٹھیک دیکھ رہا ہو۔ اگر اسے ملازم دھکیل کر کہیں لے کر نہ جائے تو وہ ایک انچ آگے پیچھے نہیں ہو سکتا ہے۔'' علینہ نے بتایا۔

''اچھا......'' اس انکشاف پر نجیب نے کہا۔

''سلطان احمد پانچ کروڑ سے ایک پیسہ کم نہیں لے گا۔ آپ سودا پانچ کروڑ روپے میں ڈن کر دیں۔ جو تحریری معاہدہ طے ہوگا وہ وہی ہوگا جس قیمت پر آپ وہ خریدنا چاہیں گے۔''

نجیب نے سنا تو اس کی رال ٹپکنے لگی۔ علینہ نے پوچھا۔

''آپ وہ کتنے میں خریدنا چاہتے ہیں؟''

''ڈھائی کروڑ میں۔'' نجیب نے بلا تامل جواب دیا۔

''اب ایسا تو نہ کریں۔ اب وہ بنگلا ڈھائی کروڑ کا بھی نہیں ہے۔'' علینہ نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے کہا کہ نجیب کو اپنے بدن پر چونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ''صحیح قیمت لگائیں۔''

''مارکیٹ ویلیو کے حساب سے تو وہ بنگلا چار کروڑ کا ہے۔'' نجیب نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''میں آپ کے ساتھ ساڑھے تین کروڑ کا معاہدہ لکھنے کی بات ڈن کرتی ہوں۔'' علینہ بولی۔

نجیب کی ایک بار پھر رال ٹپکی۔ وہ مسکرایا۔ ''میں جاننا چاہوں گا کہ آپ میرا فائدہ کیوں سوچ رہی ہیں؟''

''میں آپ کا نہیں، اپنا فائدہ سوچ رہی ہوں۔ بنگلا فروخت کے بعد سارا پیسہ میرے پاس آئے گا۔ کیونکہ سلطان کی نظر ٹھیک سے کام نہیں کرتی۔ وہ مجھے ہی رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرنے کے لیے کہے گا، میں وہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں گی اور مناسب وقت پر اس سے طلاق لے کر آزاد ہو جاؤں گی۔ اب میں نے آپ کو حقیقت بتا دی ہے۔ آپ چاہیں تو سلطان کو بتا دیں، مجھے ذلیل کر کے اپنے آفس سے نکال دیں، جو آپ کی مرضی لیکن میں اس زندگی سے زچ ہو چکی ہوں۔'' علینہ نے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

نجیب جلدی سے اٹھا اور ٹشو پیپر نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور اس کے قریب جا کر جھکتے ہوئے بولا۔

''آپ کے قیمتی آنسو فضول بات پر بہہ رہے ہیں۔ انہیں اس ٹشو سے سمیٹ لیں۔''

''آپ کو لگتا ہے کہ میں فضول بات کر رہی ہوں؟''

''یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں آپ کی بات سن کر آپ کو آفس سے نکال دوں گا، آپ کے شوہر کو بتا دوں گا؟''

''ممکن ہے کہ آپ کو میری بات پسند نہ آئی ہو، لیکن ایک ناچار اور بے بس عورت کیا کر سکتی ہے؟''

''بہت کچھ کر سکتی ہے۔ یہ ہی دیکھ لیں ایک بے بس اور ناچار خوبصورت لڑکی میرے لیے اس پراپرٹی کو خریدنے کے لیے کیا نہیں کر رہی ہے۔'' نجیب نے کہا۔

''اس میں میرا اپنا مفاد ہے۔''

''اور اس مفاد کے ساتھ مجھے بھی فائدہ ہو جائے گا۔ میں وہ سودا پانچ کروڑ میں ڈن کر دوں گا، اور آپ تحریری معاہدے پر ساڑھے تین کروڑ لکھیں گی۔'' نجیب خان بولا۔

''ایسا ہی ہوگا۔'' علینہ مسکرا دی۔

نجیب خان نے جلدی سے اُس کی تعریف کی۔ ''آپ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔''

''اور آپ کی شخصیت میں جادو ہے۔'' علینہ نے بھی تعریف کا تیر برسایا۔

نجیب کے لیے یہ الفاظ جیسے امرت کے مانند تھے۔ ''اس بات پر ایک ایک کپ چائے کا ہو جائے؟''

''چائے نہیں......فریش جوس۔'' علینہ نے کہتے ہی اپنے دونوں ہاتھوں سے نجیب خان کی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کی اور ہولے سے مسکرا دی۔ اس ادا نے جیسے نجیب کو گھائل کر دیا۔ وہ مسکراتا ہوا سیدھا ہوا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے عجیب نگاہوں سے اور مسکراتے ہوئے علینہ کی طرف دیکھتے ہوئے فریش جوس بھیجنے کا حکم دیا۔

''کیا اچھا ہوتا اگر اُس دن جب آپ انٹرویو دینے کے لیے آئی تھیں، میں آپ کو ایک توجہ کی نظر سے دیکھ لیتا۔ شاید میں مصروف ہوں گا، یا اُس دن میری طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی۔''

''مجھے لگتا ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی ورنہ حُسن مرد کی نظر سے ٹکرائے اور چنگاری نہ نکلے، یہ کیسے ممکن ہے۔'' علینہ کہہ کر ہنس پڑی۔ نجیب بھی بے اختیار ہنسنے لگا۔

☆☆☆

ایک بار پھر نجیب خان اپنے ایک آدمی کے ساتھ خاور کے سامنے بیٹھا تھا۔ خاور نے سلطان احمد کا روپ اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ وہیل چیئر پر براجمان تھا جبکہ اس کا ملازم سجاد اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ عاطف دونوں کے درمیان موجود تھا۔

''ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ خاور ٹھیک کہہ رہا ہے۔ رقم محفوظ جگہ رکھ کر ہم الگ الگ چند دن گزاریں گے تو کسی کی نظر میں نہیں آئیں گے۔'' عاطف نے لقمہ دیا۔

''جب ہم شہر ہی چھوڑ دیں گے تو کسی کی نظر میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' سجاد نے پھر مخالفت کی۔

''تمہیں مسئلہ کیا ہے۔ تم ٹھنڈا کر کے نہیں کھا سکتے۔ رقم محفوظ ہوگی، چند دن آزادی سے ریلیکس کریں گے۔ اور پھر آپس میں بانٹ لیں گے۔'' علینہ نے بھی مداخلت کی۔

''اوکے جو چاہو کرو۔'' سجاد نے خاموشی اختیار کر لی لیکن اس کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ ان تینوں کے فیصلے سے خوش نہیں......

''علینہ تم نجیب کے ساتھ جا کر گپ شپ لگاؤ۔ جعلی معاہدہ تیار ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد تم اندر چلے جانا اور اسے بقایا ایک کروڑ روپیہ لانے کا کہہ کر اسے معاہدہ پڑھوا دینا۔'' خاور نے علینہ اور عاطف سے کہا۔ دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔

خاور نے وہ بریف کیس الماری میں رکھا اور خود ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ایک نمبر ملایا اور دوسری طرف سے آواز آنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

نجیب خان کمرے میں براجمان اس انتظار میں تھا کہ کسی طرح سے بینش اندر آجائے۔ اور جب علینہ کمرے میں آئی تو نجیب کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''مجھے بار بار آپ کا خیال آرہا تھا کہ آپ کمرے میں اکیلے بور ہو رہے ہوں گے۔''

''شکر ہے کہ آپ کو میرا خیال آرہا تھا۔'' نجیب نے لگاوٹ سے کہا۔

''آج بھی آپ کی شخصیت بہت زبردست لگ رہی ہے۔ آپ شروع دن سے ہی خوش لباس لگے تھے۔'' علینہ نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے تعریف کی۔

نجیب پھر مسکرایا۔ ''یہ آپ کی نظر کا کمال ہے ورنہ میں عام سا لباس پہنتا ہوں۔''

''آپ عاجزی سے کام لے رہے ہیں۔'' علینہ نے ایک ادا سے کہا۔ ''آپ کو مبارک ہو کہ آپ نے یہ بنگلا خرید لیا ہے۔''

''شکریہ...... آپ نے کہا تھا کہ یہ بنگلا فروخت ہو جائے تو آپ سلطان احمد سے آزادی حاصل کر لیں گی۔''

''میرا یہی ارادہ ہے۔ اسی لیے آپ کا ساتھ دے رہی ہوں۔'' علینہ نے کہا۔

''سلطان احمد سے آزاد ہو کر آپ کیا کریں گی؟''

''پھر شادی کروں گی۔'' علینہ نے جھٹ سے جواب دیا۔

''کس سے؟''

''اس سے جو آپ جیسا خوش لباس اور گریس فل شخصیت کا مالک ہوگا۔'' علینہ نے ایک بار نجیب پر نظر دوڑائی۔

نجیب نے اس بار چہرے سے مسکراہٹ عیاں نہیں کی اور اپنے دل میں پھوٹتے لڈوؤں کو دباتے ہوئے کہا۔

''میں ہر سال تعطیلات پر کسی نہ کسی خوبصورت ملک کی سیر کے لیے نکل جاتا ہوں۔ اس بنگلے کا قبضہ لے کر اس پر کام شروع کرا دوں گا اور اگلے ماہ سیاحت کے لیے یورپ کے کسی ملک کی طرف ایک ماہ کے لیے نکل جاؤں گا...... سیاحت کا شوق ہے آپ کو؟''

''سلطان احمد سے شادی کے بعد ہر شوق سولی پر چڑھ چکا ہے۔'' علینہ نے جواب دیا۔

''اگر آپ چاہیں تو اس سولی کو کاٹ کر پھینک دوں؟''

''کیسے کاٹ کر پھینکیں گے؟''

''آپ میرے ساتھ چلنے کے لیے ہامی بھریں، ہر سولی ختم ہو جائے گی۔'' نجیب خان نے کہا۔ یہ سن کر علینہ نے اپنے چہرے سے خوشی کا ایسا اظہار کیا کہ جیسے اسے کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔ علینہ کی خوشی دیکھ کر نجیب کا دل بھی دھڑکا۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی تو علینہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

عاطف ایک فائل اٹھائے اندر آرہا تھا۔ اُس کے پیچھے وہیل چیئر پر خاور کو سجاد دھکیلتا ہوا اندر لا رہا تھا۔

''لیجیے اس خریداری کا معاہدہ تیار ہے۔'' عاطف اسی جگہ بیٹھ گیا جہاں وہ پہلے بیٹھا تھا۔ نجیب خان اور خاور آمنے سامنے بیٹھے تھے جبکہ علینہ وہیل چیئر کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔

''آپ نے باقی رقم منگوا لی ہے؟'' عاطف نے نجیب خان سے پوچھا۔

نجیب نے اسی وقت کال کی اور پھر بولا۔ ''میں معاہدہ پڑھ لوں۔''

''بینش ذرا اونچی آواز میں معاہدہ پڑھنا۔'' خاور نے کہا اور عاطف نے فائل علینہ کی طرف بڑھا دی۔ اس نے معاہدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ سلطان احمد اور نجیب خان کے درمیان معاہدہ طے پایا تھا جس میں اس کی قیمت پانچ کروڑ روپے لکھی تھی اور ڈیڑھ کروڑ بطور بیعانہ اور باقی رقم چار دن کے بعد ادا

کر کے اس بنگلے کے کاغذات اپنے نام منتقل کرانے کی تحریر لکھی ہوئی تھی۔

جب علینہ نے پڑھ لیا تو نجیب نے وہ فائل لے لی۔ اس نے فائل پڑھنا شروع کی تو وہاں بنگلے کی قیمت پانچ کروڑ کے بجائے ساڑھے تین کروڑ روپے لکھی تھی جو علینہ نے پانچ کروڑ پڑھی تھی۔

انہی باتوں کے دوران نجیب خان کا آدمی ایک اور بریف کیس لے آیا۔ اس میں ایک کروڑ کی رقم تھی۔ خاور نے وہ بریف کیس بھی علینہ کے حوالے کردیا۔ دونوں طرف سے کاغذات پر دستخط ہوئے، اور ایک کاپی نجیب خان کے حوالے کردی گئی۔ اس کے بعد خوشگوار انداز میں چائے اور ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان آگیا۔ اس سے فارغ ہوکر نجیب اجازت لے کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے نجیب نے ایک نظر علینہ کی طرف دیکھا تو علینہ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ اُسے کال کرے گی۔

تھوڑی دیر کے بعد اس بنگلے میں وہ چاروں جمع تھے اور ان کے کھلے ہوئے چہرے تھے۔ ان کے سامنے ڈیڑھ کروڑ کی رقم رکھی تھی۔ اتنی بڑی رقم وہ پہلی بار ایک ساتھ دیکھ رہے تھے۔ وہ چاروں خوش تھے۔ انہوں نے اپنا اپنا میک اپ اتارا اور اپنی اصل شکلوں میں آگئے۔

”سلطان احمد یہاں تین چار دن کے بعد آئے گا۔ کیا خیال ہے۔ دو دن اسی جگہ رہ کر آرام کیا جائے، کھایا پیا جائے اور پھر یہاں سے نکل جائیں گے۔“ خاور نے تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔

”ہاں دو دن یہاں رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ عاطف اور علینہ نے جواب دیا جبکہ سجاد چپ رہا۔

”اس چوکیدار کا کیا کرنا ہے؟“ علینہ نے پوچھا۔

”جاتے ہوئے اسے بے ہوش کریں گے، اس کی زنجیر کھول دیں گے۔ پھر جب اسے ہوش آئے گا وہ خود ہی بیسمنٹ سے باہر نکل آئے گا۔“ خاور نے کہا۔

سب سے پہلے ضروری تھا کہ وہ ان نوٹوں کو اچھی طرح سے سنبھال لیتے۔ چنانچہ خاور کی ہدایت پر ان سب نے مل کر نوٹوں کو پلاسٹک کی تھیلیوں میں ڈالا، جس کا انہوں نے پہلے انتظام کر رکھا تھا۔ پھر چند گڈیوں کے بنڈل بنائے اور انہیں اخبار میں اچھی طرح سے لپیٹ کر ہر بنڈل کو پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالا اور پھر ان بنڈلوں کو انہوں نے دو بیگ میں رکھا۔ نوٹ کیونکہ پانچ پانچ ہزار والے تھے اس لیے اتنی بڑی رقم کا زیادہ پھیلاؤ نہیں ہوا تھا۔ پھر اس پر سیاہ شاپر چڑھایا اس کے بعد وہ پھر ان سے بڑے بیگز میں رکھے اور ان کی زپ بند کر کے اس پر لاک لگا دیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ تینوں صوفوں پر ڈھیر ہوگئے جبکہ سجاد اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ اس نے ایک گلاس پانی پیا اور کچھ سوچنے کے بعد پھر ان کے پاس آگیا۔

خاور نے ٹیلی فون پر پیزا آرڈر کیا، ابھی اس نے فون بند کیا ہی تھا کہ اس کا فون بجنے لگا۔ اسکرین پر سلطان احمد کا نام تھا۔ اس نے سلطان احمد کا نام لے کر سب کو چپ رہنے کی تاکید کی اور فون کان سے لگالیا۔

”کیا حال ہے خاور بیٹا؟“ دوسری طرف سے سلطان احمد کی آواز آئی۔

”جی بالکل ٹھیک ہوں۔“

”کہاں ہو۔“

”گھر میں ہوں۔“

”تمہارے لیے سرپرائز ہے۔“

”وہ کیا سر......؟“

”میں واپس آگیا ہوں۔“ سلطان احمد نے جونہی بتایا، خاور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اتنی جلدی اور اچانک سر۔ آپ تو تین چار دن کے بعد آنے والے تھے؟“ خاور نے کہا۔

”بس اچانک پروگرام بنا اور ٹکٹ لے کر ہم دونوں آگئے۔ اس وقت ہم ٹیکسی میں بیٹھے ہیں اور بس دس، سے پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔“ سلطان احمد نے یہ بتا کر اسے مزید حیرت میں ڈال دیا تھا۔

”بہت اچھی بات ہے سر، آجائیں۔“

”باقی باتیں آکر ہوتی ہیں۔“ فون بند ہوگیا۔

”وہ بوڑھا آگیا ہے، دس سے پندرہ، منٹ میں یہاں پہنچ رہا ہے۔ جلدی سے سب کچھ سمیٹو اور نکلو یہاں سے۔“ خاور نے جلدی سے کہا۔

اس کے بعد وہاں ایک ہلچل برپا ہوگئی تھی۔ سب نے عجلت میں اپنا اپنا سامان سمیٹا اور دونوں بیگز میں سے ایک خاور نے اور دوسرا عاطف نے اپنے کندھے پر لٹکایا اور گھر سے باہر نکل گئے۔ وہ تیزی سے ایک طرف چلنے لگے۔ خاور کو اب یہ معلوم نہیں تھا کہ سلطان احمد کی ٹیکسی کس طرف سے آئے گی۔ کچھ آگے جا کر جونہی وہ دائیں طرف مڑے، بائیں جانب سے سلطان احمد کی ٹیکسی نکلی اور اس کا رخ اپنے بنگلے کی طرف ہوگیا۔

☆☆☆

ٹیکسی بنگلے کے سامنے رکی تو ٹیکسی ڈرائیور نے ہارن دیا۔
اس دوران سلطان احمد اپنی بیوی کے ساتھ باہر نکلا اور ڈرائیور نے ڈکی کھول کر ان کے دونوں بیگ باہر نکال کر رکھ دیے۔ سلطان احمد نے کرایہ ادا کیا اور دونوں ایک ایک بیگ اٹھا کر گیٹ کی طرف بڑھے تو گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ سلطان احمد نے گیٹ دھکیلا اور دونوں اندر چلے گئے۔ گیٹ پر چوکیدار نہیں تھا۔ سلطان احمد نے متحیر نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور گیٹ بند کر دیا۔

''چوکیدار کہاں چلا گیا ہے۔'' سلطان احمد خود کلامی کے انداز میں بولا اور دونوں اندر چلے آئے۔ لاؤنج میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

''خاور...... خاور کہاں ہو؟'' سلطان احمد نے پکارا۔
سلطان احمد کی بیگم نے لاؤنج کا جائزہ لیتے ہوئے محسوس کیا جیسے ابھی کوئی یہاں موجود تھا۔ اس کے بعد سلطان احمد نے ایک ایک کمرا دیکھ لیا اسے کہیں خاور دکھائی نہیں دیا۔ البتہ وہ یہ دیکھ کر چونک گیا کہ ایک کمرے میں ایک طرف وہیل چیئر رکھی ہوئی تھی۔
پیچھے ہی سلطان احمد کی بیگم بھی آگئیں، انہوں نے وہیل چیئر دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ کس کی ہے؟''
''یہی میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ کس کی ہے؟''
دونوں کے لیے اس سوال کا جواب تلاش کرنا مشکل تھا۔
وہ اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ سلطان اپنے موبائل فون سے خاور کو کال کرنے لگا لیکن اس کا نمبر بند تھا۔ اسی اثنا میں بیل ہوئی تو سلطان احمد گیٹ کی طرف بڑھا۔
گیٹ کھولا تو سامنے پیزا بوائے کھڑا تھا۔ اس نے سلطان احمد کو دیکھتے ہی شائستہ لہجے میں پوچھا۔
''سر بنگلا نمبر چالیس مسٹر خاور یہیں ہوتے ہیں۔''
''جی......''
''سر یہ اُن کا آرڈر......''
''کب دیا تھا؟''
''ابھی سر آدھا گھنٹا پہلے...... سوری مجھے کچھ دیر ہوگئی، راستے میں ایک جگہ ٹریفک جام تھا۔''
سلطان احمد نے بل ادا کرنے کے بعد پیزا لیا اور اندر چلا گیا۔
سلطان احمد کی بیوی ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی تھیں۔
''کون تھا؟''
''پیزا آرڈر کیا تھا، وہ لے کر آیا تھا۔'' سلطان احمد نے پیزا ایک طرف رکھ دیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آدھا گھنٹا پہلے خاور یہاں تھا جس نے پیزا آرڈر کیا تھا۔ لیکن اب کہاں چلا گیا ہے اور چوکیدار بھی غائب ہے۔''
''یہ دیکھیں...... کس طرح سے ڈریسنگ ٹیبل کا سامان استعمال کیا ہے۔ اور ڈسٹ بن میں کتنے ٹشو پڑے ہیں۔'' سلطان کی بیگم نے توجہ دلائی۔
سلطان نے دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہاں ہوتا کیا رہا ہے؟ اور یہ چوکیدار کہاں چلا گیا ہے؟''
''آپ ایک بار بیسمنٹ بھی دیکھ لیں۔'' سلطان احمد کی بیوی نے کہا تو وہ بیسمنٹ کی طرف چلا گیا۔
جونہی سلطان احمد سیڑھیاں اترا وہ چونک گیا۔ سامنے چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس کے پیر میں زنجیر تھی۔
''یہ کیا......؟ تم کو کس نے باندھا ہے یہاں؟''
''صاحب جی آپ آگئے...... مجھے خاور صاحب نے اپنے آدمیوں کی مدد سے اٹھایا اور یہاں لاکر زنجیر سے باندھ دیا۔'' سلطان کو دیکھتے ہی چوکیدار چونک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
''ایسا کیوں کیا اُس نے؟'' یہ سن کر سلطان کو حیرت نے آلیا۔
''مجھے معلوم نہیں ہے صاحب جی۔ اس زنجیر کی وہ سامنے چابی لٹک رہی ہے۔'' چوکیدار نے سامنے اشارہ کیا۔ سلطان نے چابی اٹھا کر قفل کھولا اور اسے لے کر باہر آگیا۔
چوکیدار کو کیونکہ کچھ علم نہیں تھا کہ خاور اور اس کے ساتھیوں نے اچانک اسے پکڑ کر بیسمنٹ میں کیوں باندھ دیا تھا۔ اس لیے وہ سلطان کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دے سکا تھا۔ سلطان احمد نے اسے گیٹ کے پاس بھیج دیا۔
سلطان احمد لاؤنج میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ خاور نے ایسا کیوں کیا۔ گھر کا سارا سامان چیک کرلیا تھا، کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ ویسے بھی گھر میں کیش اور زیورات نہیں تھے۔ اس کے علاوہ قیمتی سامان موجود تھا جو اپنی جگہ جوں کا توں تھا۔
سلطان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک سلطان کی نظر ایک طرف چلی گئی اور اس کی آنکھوں کی چمک عیاں ہوگئی۔

☆☆☆

وہ چاروں سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ وہاں سے ٹرین کی ٹکٹیں لیں اور چاروں الگ الگ ڈبوں میں سوار ہوگئے۔ رقم کا ایک بیگ خاور اور دوسرا عاطف کے پاس تھا۔
بیس منٹ بعد ٹرین چل پڑی اور رفتہ رفتہ ٹرین کی رفتار بڑھتی گئی اور وہ چاروں شہر سے دور ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنے

کامیاب کھیل پر خوش تھے لیکن سجاد کا دل اور دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

پانچ گھنٹے کا طویل سفر کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے شہر میں پہنچ گئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل کر وہ چاروں اکٹھے ہوئے۔ خاور نے اسے کچھ کہا اور عاطف نے اپنا بیگ بھی خاور کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد وہ سب ایک بار پھر الگ الگ ہو گئے۔ اس سے قبل بھی ایک واردات کے بعد وہ چاروں اس شہر میں آ کر ایک ہفتہ کے لیے قیام کر چکے تھے۔ اس قیام کے دوران چاروں نے اپنی اپنی دوستی بھی بنالی تھی۔ ان چاروں میں ایک سجاد ہی ایسا تھا جو دل سے ناخوش تھا۔ باقی کسی کو کوئی پروا نہیں تھی۔

خاور ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور اسے جس جگہ جانا تھا، اس کا بتا کر اس نے اپنا موبائل فون نکالا، اس کی سم تبدیل کی اور اس سم میں محفوظ ایک نمبر نکال کر کال کے لیے بٹن کو پش کر دیا۔ جو نہی اس کا رابطہ ہوا اس نے مسکرا کر کہا۔

''ہیلو...... میں نے تمہارا شہر چھوڑ دیا ہے......''

☆☆☆

نجیب خان کو حیرت تھی کہ کئی گھنٹے گزر گئے اور بینش نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا حالانکہ اس نے خود اشارہ کیا تھا کہ وہ اس سے فون پر بات کرے گی۔ نجیب سے ایک غلطی یہ ہوئی تھی کہ وہ بینش سے اس کا موبائل فون نمبر نہیں لے سکا تھا ورنہ وہ خود کال کر لیتا۔

رات ہو گئی تھی۔ نجیب ابھی تک اس سوچ میں غرق تھا کہ وہ بینش سے کیسے اور کس بہانے بات کرے۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔

نجیب نے اس بنگلے میں جانے کا ایک بہانہ سوچ لیا۔ اور رات آٹھ بجے وہ اس بنگلے کے باہر پہنچ گیا۔ وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا لے گیا تھا۔ اس نے گاڑی سے باہر نکل کر بیل دی اور چوکیدار نے چھوٹی سی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔

''جی فرمایئے......''

''سلطان احمد ہیں؟''

''جی ہیں۔''

''انہیں بتاؤ کہ نجیب خان آیا ہے۔'' نجیب نے کہا اور چوکیدار نے چھوٹی سی کھڑکی بند کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد چوکیدار نے پھر وہی کھڑکی کھولی اور پوچھا۔

''جی وہ پوچھ رہے ہیں کہاں سے آئے ہیں آپ؟''

چوکیدار کے اس سوال نے نجیب کو چونکا دیا۔ پہلے تو اس نے چوکیدار کو گھورا اور پھر بولا۔ ''انہیں بتاؤ کہ وہ نجیب خان آیا ہے جس نے آج ہی اس بنگلے کو خریدا ہے۔''

چوکیدار نے مشکوک نظروں سے نجیب کو دیکھا اور کھڑکی بند کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد چھوٹا گیٹ کھلا اور چوکیدار نے اسے اندر آنے کو کہا۔ وہ اندر گیا تو سامنے سلطان احمد کھڑا تھا۔ اس کے ذہن میں بھی نجیب خان کا نام آ چکا تھا اور اسے یاد بھی آ گیا تھا کہ اس نے ایک بار اس بنگلے کو خریدنے کی بات کی تھی۔

''جی فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' سلطان نے اسی جگہ کھڑے کھڑے خشک لہجے میں پوچھا۔

''مجھے سلطان احمد سے ملنا ہے۔'' نجیب خان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سیدھا یہ کہہ دے کہ وہ بینش سے ملنا چاہتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا۔

''میں ہی سلطان احمد ہوں...... فرمایئے۔'' سلطان اس کا جائزہ لیتا ہوا بولا۔

نجیب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ سلطان احمد ہیں......؟ سلطان احمد سے کل میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ آج بھی میں نے ان کے ساتھ وقت گزارا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں سلطان احمد ہوں۔''

''آپ کہاں ملے تھے اُن سے؟''

''میں اسی بنگلے میں ملا تھا...... آج ہی اُن سے یہ بنگلا خریدا ہے۔'' نجیب بولا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کس سلطان احمد سے آپ نے یہ بنگلا خریدا ہے؟'' سلطان کو حیرت کا دھچکا لگا۔

''ایس ایس پراپرٹی ڈیلر کے اونر مسٹر اسد نے یہ سودا کرایا ہے۔'' نجیب بولا۔

''ایس ایس پراپرٹی ڈیلر کا آفس تو میرا ہے لیکن وہ ابھی بند ہے۔'' سلطان نے فوراً کہا۔

''وہ کھلا ہے، وہاں اسٹاف بیٹھا ہے، وہ آدمی موجود ہوتا ہے جس نے یہ سودا کرایا ہے۔'' نجیب کے چہرے پر بھی حیرت برس رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' سلطان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''مجھے کیسے غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ اس بنگلے کا لکھا ہوا معاہدہ میرے پاس ہے۔ سلطان کی بیوی بھی وہاں موجود تھیں بینش نام ہے ان کا۔ آپ ان کو بلائیں۔''

''یہاں کوئی بینش نام کی عورت نہیں رہتی۔ یہ بنگلا میرا ہے، یہاں میں اور میری بیوی ہے بس۔ سلطان احمد میں ہوں۔ اس بات کا ثبوت جو چاہیں میں دے سکتا ہوں۔''

’’اگر آپ سلطان احمد ہیں تو وہ کون تھا جو وہیل چیئر پر بیٹھا تھا، جس کی نوجوان بیوی بینش تھی۔‘‘ نجیب کے لہجے سے تشویش تھی۔

وہیل چیئر کا سن کر سلطان چونکا۔ اس نے یہاں ایک کمرے میں وہیل چیئر دیکھی تھی۔ سلطان کو یہ معاملہ پیچیدہ لگ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک دم سے گھنٹی سی بجی تھی کہ یہاں کوئی ایسا کھیل کھیلا گیا ہے جس کی زد میں نجیب خان آ چکا ہے۔

’’آپ اندر تشریف لے آئیں ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔‘‘ سلطان نے کہا اور نجیب اندر جانے کے لیے بڑھا۔

سلطان اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ وہاں بیٹھ کر سلطان نے اپنے بارے میں بتایا اور یہ بھی آگاہ کیا کہ وہ آج ہی واپس لوٹا ہے۔ نجیب نے ساری بات سننے کے بعد اپنے ساتھ ہونے والا معاملہ بھی تفصیل سے بتا دیا۔ جب دونوں اپنی اپنی بات کہہ چکے تو کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

سلطان سوچ رہا تھا کہ جس نوجوان پر اس نے اندھا اعتماد کیا اس نے ہی دھوکا دیا اور فرار ہو گیا۔ اس کی دانست میں تو خاور ایک اچھا اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ لیکن وہ اتنا زیرک تھا کہ جو باتیں وہ اس سے کر رہا تھا، وہ ان باتوں سے اپنی واردات کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ سلطان کو وہ لمحہ بھی یاد آ گیا جب اس نے خود پر رشک کیا تھا۔ شاید یہ اس کے تکبر کی سزا تھی۔

نجیب نے اسے ساری کتھا سنا ڈالی تھی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی پھر نجیب نے پوچھا۔ ’’آپ نے پولیس کو اطلاع دی؟‘‘

’’میں نے پولیس کو اطلاع نہیں دی۔‘‘

’’آپ کو چاہیے تھا کہ آپ پولیس کو اطلاع کرتے۔‘‘

’’یہ کام آپ کا ہے، دھوکا آپ کے ساتھ ہوا ہے۔ آپ پولیس کے پاس جائیں، میں وہ سب بیان کرنے کو تیار ہوں جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔‘‘ سلطان نے کہا۔

’’میں اپنے ڈیڑھ کروڑ حلق سے اترنے نہیں دوں گا۔ میں ان کے لیے زمین تنگ کر دوں گا۔‘‘ نجیب کو غصہ آ گیا۔

’’آپ جو کرنا چاہیں کریں...... میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوں۔‘‘ سلطان کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ نجیب بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور غصے میں تلملاتا ہوا اپنی گاڑی تک چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد سلطان نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور اس پر جو لکھا تھا، اسے پڑھا اور سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا ہے؟

غصے میں کھولتا نجیب اس پراپرٹی آفس کے سامنے پہنچا جس آفس کو اسد نے اپنا ظاہر کیا تھا۔ اس نے گاڑی روک دی اور اس کے بند شٹر کو گھورنے لگا۔ اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔

اسے خیال آیا کہ کہیں یہ سب اس سلطان کے کہنے پر ہی نہ ہوا ہو؟ وہ سب اس کے آدمی ہوں اور اس سے ڈیڑھ کروڑ وصول کر کے وہ سب منظر سے ہٹ گئے اور کھیل میں اصل کردار سامنے آ گیا ہو؟ یہ سوچتے ہوئے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

دوسرے دن پولیس سلطان احمد کے گھر میں موجود تھی۔ نجیب خان نے جو ایف آئی آر درج کرائی تھی، اس میں اس نے سلطان احمد کا نام بھی لکھوایا تھا۔ سلطان کی ایک اچھی پہچان تھی۔ پولیس انسپکٹر بھی اسے جانتا تھا، اس لیے کسی بھی کارروائی سے قبل وہ سب ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔

’’مجھے اندیشہ تھا کہ نجیب خان ایسا کریں گے کہ وہ میرے خلاف بھی شک کا اظہار کریں۔ لیکن سچ وہی ہے جو میں نے آپ لوگوں کو بتایا ہے۔‘‘ سلطان احمد نے ساری بات بتانے کے بعد کہا۔ اس کے بعد سلطان نے سفر کے ثبوت بھی ان کے سامنے رکھ دیے۔

’’آپ کے پاس اس کی کوئی تصویر ہے؟‘‘ انسپکٹر نے پوچھا۔

’’کوئی تصویر نہیں اور کوئی اتا پتا نہیں۔‘‘ سلطان احمد نے جواب دیا۔

’’اتنا اندھا اعتبار؟‘‘ انسپکٹر کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی حیرت ہوئی۔

سلطان احمد ایسے مسکرایا جیسے وہ اپنے آپ پر ہنس رہا ہو۔ ’’تیراک کو اس کا اندھا اعتبار ہی ڈبو دیتا ہے ورنہ وہ کبھی گہرائی میں جانے کی غلطی نہ کرے۔ میں نے اس نوجوان کی شرافت دیکھی اور اس پر اعتبار کر لیا۔‘‘

’’انسپکٹر صاحب انہیں تفتیش میں شامل کریں۔‘‘ نجیب نے سلطان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’ہم اپنا کام کرنا جانتے ہیں، آپ بے فکر رہیں۔‘‘ انسپکٹر نے نرمی سے کہا۔ ’’ہمیں پتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔‘‘

’’میں کیسے بے فکر رہ سکتا ہوں۔ میرا ڈیڑھ کروڑ گیا ہے۔ انہیں تلاش کریں۔‘‘ نجیب خان مضطرب ہو کر بولا۔

’’ہم کوشش کریں گے کہ ان لوگوں کو جلد تلاش کر لیں۔‘‘ انسپکٹر نے محض تسلی کے لیے کہہ دیا تھا ورنہ وہ خود بھی سوچ رہا تھا کہ جس کی تصویر ہے اور نہ کوئی سراغ ہے کہ جس کے سرے کو پکڑ کر وہ ان تک پہنچ سکیں۔ اس لیے وہ ان کو محض

تسلی ہی دے سکتے تھے۔

انہوں نے پورا بنگلا چھان مارا، کوئی ایسی چیز بھی نہیں ملی جس سے ان کو کوئی مدد مل سکتی۔ نجیب کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ سلطان احمد کی سوچوں کو اس حصار نے گھیر رکھا تھا کہ خاور نے اسے دھوکا دیا تھا، اس سے جھوٹ بولا تھا اور اس کی نظر میں دھوکے اور جھوٹ کی سزا بہت کڑی ہے۔ وہ اس کو سزا اسی صورت میں دے سکتا تھا اگر وہ پکڑے جائیں۔ ورنہ وہ محض اُن کے بارے میں سوچ ہی سکتا تھا۔

نجیب کو لگ رہا تھا، اس کی ایف آئی آر پولیس کی تسلیوں کی گرد میں دب کر رہ جائے گی اور ان کا سراغ لگ نہیں پائے گا۔ اسے اپنے ڈیڑھ کروڑ کی رقم پر صبر کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

اس واقعے کو بارہ روز گزر گئے تھے۔

جس شہر میں وہ چاروں الگ الگ مقیم تھے، انہوں نے ایک بار بھی آپس میں رابطہ نہیں کیا تھا۔ بارھویں روز کی شام کو خاور نے باری باری سب سے رابطہ کر کے ان کی خیریت دریافت کی تھی اور کہا تھا کہ وہ اس شہر میں آزادنہ گھوم رہا ہے اسے کسی طرح کا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ ایسی ہی رائے ان تینوں کی بھی تھی لیکن سجاد نے کہہ دیا تھا۔

''اب آپس میں اپنا اپنا حصہ اگر تقسیم ہو جائے تو بہتر ہے۔''

''تجھے اپنے حصے کی جلدی کیوں ہے؟'' خاور کو غصہ آ گیا۔

''مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔'' سجاد نے کہا۔

''پیسوں کی سب کو ضرورت ہوتی ہے۔ کل سب کو فون کر کے بلالوں گا اور حصہ تقسیم کر دوں گا۔'' خاور نے کہا اور فون بند کر دیا۔

خاور چار پانچ دن تو زیادہ باہر نہیں نکلا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ پیدل ہی گھومنے پھرنے لگا تھا۔ اس کے بعد اس نے اسنوکر کلب بھی جانا شروع کر دیا۔ وہ ٹہلتا ہوا اس جگہ کے سب سے بڑے اور خوبصورت پارک میں بھی چلا جاتا تھا۔ کبھی وہ جنگلے کے ساتھ کھڑا ہو کر اندر دیکھتا اور کبھی وہ اندر جا کر بینچ پر بیٹھ جاتا اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ وہاں سے گزر جاتا تھا۔

اسی روز و شب میں وہ نئی واردات کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ وہ اس تاک میں بھی تھا کہ کوئی اسے ایسا مل جائے کہ وہ اسے بھی چالبازیوں سے لوٹنے میں کامیاب ہو سکے۔

جس شام کو اس نے اپنے ساتھیوں کو فون کیا تھا، وہ اسنوکر کلب چلا گیا تھا، اور بہت دیر تک وہ اسنوکر کھیلتا رہا تھا۔ وہاں اس کی اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ وہ اسنوکر کا اچھا کھلاڑی تھا اس لیے اس کے کھیل نے سب کو متاثر کیا تھا۔

رات نو بجے کا وقت تھا۔ وہ کلب سے نکل کر پیدل ہی اپنی رہائش کی طرف چل پڑا تھا۔ چلتے چلتے وہ پارک کے جنگلے کے ساتھ چلنے لگا۔ اس کی نظریں اندر تھیں۔ اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ اچانک ایک قیمتی کار اس سے کچھ فاصلے پر رکی اور اندر سے ایک خوبصورت لڑکی چہرے پر غصے کی آگ سجائے باہر نکلی اور چلا کر بولی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم...... تم نے میری زندگی زچ کر دی ہے......'' یہ کہتے ہی وہ لڑکی آگ بگولا سی پارک کے جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ وہ نفرت بھری نگاہوں سے کار کی دوسری سیٹ پر بیٹھے نوجوان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ نوجوان بھی کار سے باہر نکلا اور اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''زندگی تو تم نے میری تباہ کر دی ہے۔ جہاں دفع ہونا ہے ہو جاؤ...... مجھے اپنی شکل نہ دکھانا......'' نوجوان نے ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھتے ہی اس نے کار بیک کی اور پھر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں...... کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کچھ راہ گیروں نے ان پر توجہ دی تھی۔ جب کار وہاں سے چلی گئی تو وہ لوگ بھی وہاں سے ہٹ گئے تھے، ایک خاور ہی اپنی جگہ کھڑا متحیر نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کا چہرہ ابھی بھی غصے سے دہک رہا تھا۔ خاور اپنے تئیں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ دونوں دوست ہیں کہ میاں بیوی......؟

لڑکی نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ میں پکڑا موبائل فون آن کرنے کے بعد ایک نمبر پش کیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے جھنجلا کر فون بند کر دیا اور روتے ہوئے بولی۔

''آپ کا فون کیوں بند ہے...... او خدایا...... میں کس جہنم میں پھنس گئی ہوں۔''

لڑکی نے کہا اور خاور کے سامنے سے گزر کر پارک کے گیٹ کی طرف گئی اور اندر جا کر بینچ پر بیٹھ گئی۔ خاور دیکھ رہا تھا کہ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور چہرہ ابھی تک غصے سے سرخ تھا۔

خاور بھی خراماں خراماں اندر چلا گیا اور اس بینچ سے کچھ ہی فاصلے پر ٹہلنے لگا۔ یکدم خاور نے دیکھا کہ لڑکی خوفزدہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھی اور پارک کے باہر دیکھنے لگی۔ خاور نے بھی گردن گھما کر اس طرف دیکھا تو وہ بھی چونک گیا۔ کیونکہ

دونوجوان باہر اپنی کار سے نکل کر متلاشی نگاہوں سے شاید اسی لڑکی کو تلاش کررہا تھا۔ اس کے ساتھ دونوجوان ایسے بھی تھے جو صورت سے ہی خطرناک نظر آرہے تھے۔ وہ بھی دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔

اچانک اس لڑکی نے خوف میں مبتلا اپنے قدم خاور کی طرف بڑھائے اور اس کے پاس جاکر رونے کے انداز میں بولی۔ ''پلیز میری مدد کریں...... مجھے یہاں سے لے جائیں وہ لوگ مجھے جان سے ماردیں گے......''

''یہ کون لوگ ہیں؟'' خاور کو پوچھنے کا موقع مل گیا۔

''میں سب بتاتی ہوں۔ پلیز مجھے یہاں سے لے جائیں۔'' لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور خوف سے اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس کی صراحی نما گردن دائیں بائیں حرکت کررہی تھی۔ خاور نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں بھی لرزش تھی۔

''میرے ساتھ آجائیں۔'' خاور نے کہا۔ ابھی وہ کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ اُن کے عقب سے ایک تیز آواز سنائی دی۔

''امبر......''

اس لڑکی نے چلتے ہوئے پیچھے دیکھا اور مضطرب بولی۔

''اس نے مجھے دیکھ لیا ہے......''

خاور نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک نوجوان پھرتی سے جنگلا پھلانگ رہا تھا جبکہ وہ دونوں پارک کے گیٹ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ خاور بھانپ گیا تھا کہ وہ خالی ہاتھ نہیں ہیں، ان کے پاس اسلحہ موجود ہوگا۔

خاور نے کہا۔ ''بھاگو......''

وہ دونوں بھاگنے لگے۔ جو لڑکا جنگلا پھلانگ رہا تھا، وہ بھی پارک میں اتر چکا تھا اور وہ ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ خاور اور امبر بھاگتے ہوئے پارک کے دوسرے گیٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ جونہی وہ اس گیٹ کے پاس پہنچے، پیچھے آنے والے نوجوان نے جست لگائی اور سیدھا خاور کے اوپر اور اسے لیتا ہوا وہ نیچے جاپڑا۔ خاور نے بھی پھرتی سے اسے ایک طرف دھکیلا اور کھڑا ہوتے ہی اس نے پاؤں کی ایک ٹھوکر اس کے منہ پر ماری اور وہ تکلیف دہ آواز نکالتا ہوا دور جاپڑا۔

وہ دونوں بھی بھاگتے ہوئے قریب پہنچ رہے تھے اس لیے خاور نے بھی دوڑ لگادی اور اس لڑکی کے ساتھ بھاگنے لگا۔ وہاں سے وہ سیدھے ایک گلی میں پہنچے اور گلی پار کرتے ہوئے دوسری سڑک پر آگئے۔ وہاں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔

خاور اس لڑکی کو ٹیکسی کی طرف لے گیا اور دروازہ کھول کر پہلے اسے بٹھایا اور پھر خود بیٹھتے ہوئے اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو چلنے کے لیے کہا۔ جونہی وہ ٹیکسی اس جگہ سے گئی وہ تینوں بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے اور اب متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ شہر کا پرانا محلہ تھا۔ اس محلے میں زیادہ تر کباڑ کی دکانیں تھیں۔ ایک بڑے کباڑ کی دکان خاور کے دوست کی تھی۔ جو چوری کا مال خریدتا اور بیچتا تھا۔ اس دکان کے اوپر بہت اچھی اور صاف ستھری رہائش تھی۔ اس رہائش کی سیڑھیاں گلی کی دوسری طرف تھیں۔ خاور اس لڑکی کو لے کر وہاں آگیا تھا۔ خاور نے اسے بٹھایا اور پانی پلایا اور خود بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

لڑکی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ خوف اُس کی آنکھوں اور چہرے سے مترشح تھا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''آپ بالکل محفوظ ہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ہر طرح کا خوف دل سے نکال دیں۔'' خاور نے اسے تسلی دی۔

''آپ نہیں جانتے کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔ میری شادی کو چھ ماہ ہوگئے ہیں۔ شادی کے پہلے دو ماہ ایسے تھے جیسے مجھے جنت مل گئی ہو اور پھر...... پھر وہی زندگی اس شخص نے جہنم سے بھی بدتر بنادی......'' لڑکی کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

''میں آپ کو آپ کے والدین کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' خاور نے ہمدردی سے کہا۔

''میرے والدین انگلینڈ میں ہوتے ہیں لیکن میری مسلسل کوشش کے باوجود کال نہیں مل رہی۔ دراصل وہ انگلینڈ کے ایک دور دراز قصبے میں رہتے ہیں۔ وہاں اُن کا بہت اچھا بزنس ہے، شاید کوئی سگنل پرابلم ہے۔'' لڑکی بتاتے ہوئے مضطرب تھی۔ اس نے ایک بار پھر نمبر ملایا اور فون کان سے لگالیا۔ جب اس کا رابطہ نہ ہوا وہ جھنجلا گئی۔

''یہاں کوئی اور رشتے دار جس کے پاس آپ جانا چاہیں؟'' خاور نے پوچھا۔

''رشتے دار تو ہیں لیکن وہ ان گھروں پر نظر رکھے گا۔ جونہی میں کسی کی طرف گئی تو وہ مجھے پکڑ لے گا۔'' وہ لڑکی اور بھی خوفزدہ ہوگئی۔ ''وہ مجھے ماردے گا۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔''

پھر ایک دم سے اس نے مشکوک نظروں سے خاور کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے یہ بات عیاں تھی کہ جیسے اسے اس ابہام نے گھیر لیا ہو کہ اس نے ایک اجنبی سے مدد مانگی اور اس کی مدد کرنے سے اب وہ اپنی ذاتی باتیں اس کے ساتھ کرنے لگی ہے۔ وہ تو اسے جانتی بھی نہیں ہے کہ وہ کون ہے؟ وہ اس کے ساتھ اس کے گھر میں... بیٹھی تھی۔

لڑکی یکدم کھڑی ہوگئی۔ ''میں چلتی ہوں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری مدد کی اور مجھے ان لوگوں سے بچایا۔''

خاور زیرک اور شاطر آدمی تھا۔ وہ فوراً بھانپ گیا کہ لڑکی کے دماغ میں کون سی سوچ نے آکر اسے جانے پر مجبور کیا ہے۔ اس نے فوراً کہا۔

''میرا نام خاور ہے۔ میں اخبار میں کرائم رپورٹر کے فرائض انجام دیتا ہوں۔'' خاور نے بتاتے ہوئے ایک مشہور اور بڑے اخبار کا پریس کارڈ اپنے پرس سے نکال کر لڑکی کے سامنے کر دیا۔ ایسے کئی جعلی کارڈ اس کے پرس میں تھے جو وہ ضرورت کے وقت چھپے ہوئے تاش کے پتّوں کی طرح استعمال کرتا تھا۔

پریس کارڈ پر بہت بڑے اخبار کا نام تھا۔ محض اس نام کو دیکھ لینا ہی کسی بھی سادہ لوح کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ ایسے لوگ ایسے کارڈز کے بھروسے میں بہت جلدی آجاتے ہیں جو اخباری معاملات کو جانتے نہیں ہیں..... کچھ ایسا ہی اس لڑکی پر بھی ہوا تھا۔ معروف اخبار کا نام دیکھا تو اس کے چہرے پر ابہام کے سائے ایک دم سے دور ہوگئے۔

''اس کا مطلب ہے کہ میں بالکل ٹھیک جگہ پر پہنچ گئی ہوں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔''

''میں بالکل آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ میرا اخبار آپ کے ساتھ ہے۔ چاہیں تو آپ ابھی میرے ساتھ اخبار کے دفتر میں چلیں، ایک دھماکا خیز پریس کانفرس کراتا ہوں اس کے لیے زمین تنگ ہو جائے گی۔ بڑے بڑے ادارے حرکت میں آجائیں گے۔'' خاور نے ایسے پُراعتماد لہجے میں کہا گویا اس کے لیے ایسا کرنا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

لڑکی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بولی۔ ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرے لیے پریس کانفرس کرنا صحیح رہے گی، کیونکہ اس کے تعلقات بھی بہت اوپر تک ہیں۔ وہ مافیا ہے۔ جانے اس کے آدمی کہاں اور کس روپ میں موجود ہیں۔ میرا سامنے آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میرے لیے ضروری ہے کہ مجھے پولیس کی حفاظت میسر ہو، لیکن مجھے... یہ بھی ڈر ہے کہ اس کے آدمی تو پولیس میں بھی موجود ہو سکتے ہیں۔''

خاور یہی چاہتا تھا کہ کہیں وہ پریس کانفرنس کرنے کی ہامی نہ بھر لے۔ ''پھر میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''بہتر ہے کہ میں چھپ کر رہوں۔ کم از کم آپ کے بارے میں جان کر مجھے تسلی ہوئی ہے۔ میں آپ کو کچھ تفصیل بتاتی ہوں۔ میرے شوہر کا نام امتیاز ہے۔ اس نے میرے سامنے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ بہت بڑا بزنس مین ہے لیکن وہ جرائم کی دنیا کا بڑا کام ہے۔ وہ پیسے کے لیے کچھ بھی کرتا ہے۔ یہ بات شادی کے دو ماہ بعد جب مجھ پر کھلی تو میں ڈر گئی اور سوچنے لگی کہ کسی طرح ملک سے فرار ہو کر اپنے والدین کے پاس چلی جاؤں لیکن وہ مجھ سے بے خبر نہیں تھا.....

..... ہماری یہاں ایک بند فیکٹری تھی جو والدین نے میرے نام کی تھی، وہ میں نے اس کے زور دینے پر بیچ دی۔ اس کا پیسہ فی الحال میرے اکاؤنٹ میں چلا گیا۔ امتیاز کو بے چینی ہے کہ وہ کروڑوں اب اس کے پاس آجائیں۔ اسی پر لڑائی ہوئی اور پھر لڑائی بڑھتی ہی گئی۔ ہم کھانا کھانے باہر نکلے تھے لیکن اس نے گاڑی میں بھی بحث شروع کر دی اور مجھے دھمکی دے دی..... میں گاڑی روک کر باہر نکل آئی۔ اور اب یہاں ہوں۔''

خاور اس کی کہانی سنتے ہوئے تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس کے سامنے سونے کی چڑیا بیٹھی ہے، اس کے گھونسلے سے اب سونے کے انڈے کیسے چُرانے ہیں۔ خاور کی یہی بات تھی کہ وہ ساتھ ہی منصوبہ بندی شروع کر دیتا تھا۔ نجیب خان کے معاملے میں بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

کچھ دیر توقف کے بعد لڑکی نے بتایا۔ ''میرا نام امبر ہے۔ کیا میں آپ پر مکمل بھروسا کر سکتی ہوں؟''

''آپ مجھ پر مکمل بھروسا کر سکتی ہیں۔ میں ہر طرح سے آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوں۔ آپ جو چاہیں میں کرنے کو تیار ہوں۔ پولیس کے پاس جانا چاہیں تو میں وہاں لے جاتا ہوں، کسی چینل میں جانا چاہیں تو اس کے لیے بھی میں مدد کر سکتا ہوں، اور میرا اخبار تو موجود ہی ہے۔'' خاور نے چاہا کہ وہ چاروں طرف سے اس کے اعتبار کے جال میں آجائے۔

اچانک امبر کا فون بجنے لگا۔ اس نے گھبرائے اور ڈرے ہوئے انداز میں موبائل فون کی طرف دیکھا اور اس کا جسم خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے ایک نظر خاور کی طرف دیکھا۔ خاور کی سوالیہ نگاہیں امبر پر تھیں۔ امبر نے فون کا اسپیکر کھول دیا۔ دوسری طرف سے اس کے شوہر کی تیز اور

غصے میں بھری آواز آئی۔
''تم چھپ کر یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں تلاش نہیں کرسکوں گا۔ تم جہاں بھی ہوگی، ڈھونڈلوں گا اور تمہاری سانسوں سے ایک ایک پائی وصول کر کے ماردوں گا...... بھاگ لو جتنا بھاگ سکتی ہو بھاگ لو.... مجھ سے چھپ نہیں سکتیں تم......''
''تم ظالم ہو، تم انسان نہیں ہو۔'' امبر نے روتے ہوئے کہا۔
''ہاں میں انسان نہیں ہوں۔ میں نے چاہا تھا کہ تمہیں کچھ نہ کہوں۔ اب بھی وقت ہے سوچ لو اور اپنے اکاؤنٹ سے وہ ساری رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردو۔''
''ایک پائی نہیں دوں گی۔''
''پھر اپنے انجام کے لیے بھی تیار رہنا۔''
امبر نے روتے ہوئے فون آف کردیا۔ اُس کا پورا جسم کانپنے لگا تھا۔ وہ اس قدر ڈرگئی تھی کہ خاور کو اندیشہ ہوا وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ خاور نے اسے پانی پلایا اور حوصلہ دیا۔ اسی طرح کچھ وقت گزر گیا اور رفتہ رفتہ امبر کی حالت بہتر ہوئی۔
جب امبر بولنے کے قابل ہوئی تو اس نے کہا۔ ''کیا آپ میرے لیے یہ کرسکتے ہیں کہ میرے گھر سے ایک خفیہ جگہ پر جہاں میں نے بیگ چھپایا ہے، اس میں میرا پاسپورٹ، ضروری کاغذات اور چیک بکس ہیں، وہ کسی طرح سے اٹھالائیں۔ میری ایک چیک بک کے درمیانی چیک پر میرے دستخط بھی موجود ہیں۔ اگر وہ بیگ امتیاز کے ہاتھ لگ گیا تو وہ رقم میرے اکاؤنٹ سے نکال لے گا۔'' امبر کو پریشانی ہونے لگی۔
''آپ نے چیک سائن کیوں کیا تھا؟'' خاور نے جلدی سے اپنے مطلب کی بات پوچھی۔
''جب میں کسی طرح سے بھاگنے کی تیاری میں تھی تو میں نے چیک سائن کیا تھا، کیونکہ اس وقت امتیاز گھر پر موجود نہیں تھا، میرے لیے راستہ صاف تھا۔ میں سیدھی بینک جانا چاہتی تھی۔ لیکن ابھی میں نے چیک پر دستخط کیے ہی تھے کہ امتیاز گھر آگیا۔ میں نے اسی طرح بیگ اس خفیہ جگہ پر رکھا اور وہاں سے نکل آئی تھی۔'' امبر نے بتایا تو خاور کی آنکھوں کی چمک دوچند ہوگئی تھی۔
اس نے سوچا کہ دستخط شدہ چیک موجود ہے۔ اس جگہ تک رسائی حاصل کرنے کے بعد وہ بیگ لے کر بینک سے چیک کیش کراسکتا ہے۔ خاور جاننا چاہتا تھا کہ اس اکاؤنٹ میں اس کی کتنی رقم موجود ہے۔
''آپ کو چاہیے تھا کہ آپ چیک پھاڑ دیتیں۔ آپ کے اکاؤنٹ میں تین، چار کروڑ ہوا تو وہ سارا کیش کراسکتا ہے۔''
''فیکٹری کی قیمت کا کچھ حصہ یعنی نو کروڑ میں نے اس اکاؤنٹ میں جمع کرایا تھا۔'' امبر نے جلدی سے بتایا۔
نو کروڑ روپے کا سن کر خاور کو لگا کہ ایک بڑی رقم اس کے انتظار میں ہے۔
''اس گھر میں جانا، جہاں چوکیدار ہوں گے۔ بہت سے حفاظتی انتظامات ہوں گے، وہ بیگ لانا میرا خیال ہے کہ بہت مشکل ہے۔'' خاور نے جھجکتے ہوئے بات کی۔
''کوئی مشکل نہیں ہے۔'' امبر بولی۔ ''میرے گھر کے ساتھ والا گھر خالی ہے۔ اس گھر کی پچھلی طرف کی باؤنڈری وال کا ایک حصہ گرا ہوا ہے جہاں سے اندر جا کر چھت پر جایا جاسکتا ہے۔ چھت سے نیچے گیارہ فٹ کے فاصلے پر بالکونی ہے۔ اوپر سے بالکونی میں جائیں تو وہاں ایک دروازہ ہے جس پر براؤن شیشہ لگا ہوا ہے۔ اس شیشے کو کاٹ کر اندر جائیں اور دروازہ کھولیں گے تو سامنے لاؤنج ہوگا۔ دائیں اور بائیں دو کمروں کے دروازے دکھائی دیں گے اور بالکل سامنے ایک چھوٹی سی راہداری دکھائی دے گی اس راہداری کے اختتام پر ایک دروازہ ہے جو اسٹور کا ہے۔ اس اسٹور میں بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا ہے۔ وہاں ایک پرانا صوفہ بھی ہے جس پر پرانا سامان میں نے رکھا تھا۔ اس صوفے کے اندر روئی ہے اور اس روئی میں میں نے وہ بیگ رکھا ہوا ہے۔ اس بڑے گھر میں امتیاز ہوتا ہے اور گیٹ کے پاس اس کے چار گارڈز ہوتے ہیں۔ جس خفیہ کمرے کی خفیہ جگہ میں نے بیگ رکھا ہے، وہ کمرا اوپر ہی ہے۔ یعنی نیچے نہیں آنا پڑے گا۔ وہاں سے بیگ لے کر اسی راستے واپس آیا جاسکتا ہے۔''
خاور سوچتے ہوئے اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جیسا امبر بتا رہی ہے اس طرح تو اس گھر میں داخل ہو کر باہر نکلنا مشکل نہیں ہے۔
''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''
''میں سوچ رہا ہوں کہ ایسا کام کبھی کیا نہیں ہے۔ کسی خبر کو حاصل کرنے کے لیے تو بہت سی مشکلات کا سامنا کیا ہے، کسی جاسوس کی طرح بھی کام کیا ہے، لیکن اس طرح بھی کہیں سے بیگ لانے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔'' خاور کہہ کر خود ہی مسکرایا۔
''اگر آپ نہیں کرسکتے تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں رات آپ کی اجازت سے یہاں رک کر صبح کہیں نکل جاؤں گی۔''

امبر مایوس ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

خاور ایسے سوچتا رہا جیسے اس کے لیے وہ سب کرنا بہت مشکل ہے۔ دراصل وہ اس جگہ جانے سے لے کر نکلنے تک کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ دستخط شدہ چیک سے وہ بہت سا روپیہ بینک سے نکلوا سکتا تھا۔

خاور نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔ ”علینہ جانے کیوں نہیں ابھی تک آئی؟“

”علینہ کون؟“ امبر نے پوچھا۔

”میری بیوی علینہ...... وہ بھی اخبار میں ہی جاب کرتی ہے۔ اس کی ڈیوٹی کا تو وقت ختم ہو گیا ہے، شاید آ رہی ہو۔“ خاور بولا۔

”یہ تو اچھا ہے کہ آپ کی بیوی بھی ہے۔ میں اور بھی ریلیکس ہو جاؤں گی۔“ امبر نے کہا۔

”بس وہ آنے ہی والی ہو گی، بعض اوقات ویگن لیٹ ہو جاتی ہے۔“ خاور نے کہا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ ”تب تک میں سوچتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”سوچتے ہوئے آپ رات ہی نہ گزار دیں کیونکہ یہ کام آج رات ہی ہو سکتا ہے، یا پھر کل رات...... دن کو وہاں جانا مشکل ہے۔“ امبر نے کہا۔ اس کا خوف بہت حد تک کم ہو چکا تھا۔

”میں سوچ رہا ہوں۔“ خاور بولا۔ ”آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنے کیمرا مین کو بلاتا ہوں۔ ہم ایک ساتھ وہاں جا کر آپ کا بیگ لے آئیں گے۔ اپنے اخبار کے لیے ہم نے بہت سے خطرناک کام کیے ہیں۔“

امبر اس بات سے بے خبر تھی کہ اس نے امبر سے بات شروع کرتے ہی علینہ کو کال ملا دی تھی اور دوسری طرف علینہ ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ جونہی اس نے یہ کہا تھا کہ علینہ اس کی بیوی ہے تو وہ اسی وقت اٹھی، اس نے ہلکا میک اپ کیا اور بیگ پکڑ کر باہر نکل گئی۔

علینہ کا خاور سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ علینہ نے جاتے ہوئے عاطف کو فون کیا اور اسے ساری بات سمجھا دی۔ خاور نے امبر سے کہا تھا کہ وہ اپنے کیمرا مین... کو بلاتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ اس جگہ جائے گا۔ علینہ اشارہ سمجھ گئی تھی اور اس نے عاطف کو ساری بات تیزی سے سمجھائی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر خاور کی طرف چلی گئی۔

خاور اور اس کے ساتھیوں کی یہ خصوصیات تھی کہ وہ ایک دوسرے کی کہی ہوئی اشاروں میں بات فوراً سمجھ جاتے تھے۔ عاطف نے اسی وقت سجاد کو فون کیا۔

☆☆☆

علینہ نے گھر پہنچتے ہی سلام کیا اور خاور سے مسکرا کر ایسے بولی جیسے وہ واقعی اس کی بیوی ہو۔ اور پھر جونہی اس کی نظر امبر پر پڑی تو اس نے امبر کو سلام کیا اور سوالیہ نگاہوں سے خاور کی طرف دیکھا۔

”یہ امبر ہیں۔ اپنے شوہر کی سختیوں کا شکار رہیں۔ میں ٹیکسی کی طرف جا رہا تھا کہ یہ مجھے مل گئیں۔ ان کی زندگی خطرے میں تھی اور میں انہیں یہاں لے آیا۔“ یہ بتانے کے بعد خاور نے امبر سے کہا۔ ”یہ علینہ ہے میری بیوی۔“

”آپ سے مل کے اچھا لگا۔“ امبر نے اٹھ کر علینہ سے ہاتھ ملایا۔ ”آپ کے شوہر اگر وہاں نہ ہوتے تو شاید میری لاش وہاں سڑک پر پڑی ہوتی۔“ امبر کہہ کر دکھی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ علینہ کو ایک دم سے اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی اور اس نے امبر کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

”آپ فکر نہ کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کھانا تیار کرتی ہوں۔“ علینہ بولی۔

”تم کھانا تیار کرنے کے بجائے امبر کے پاس بیٹھو، میں کھانا لے آتا ہوں۔“ خاور نے کہا کیونکہ اس کے موبائل فون پر عاطف کا میسج آ گیا تھا۔ وہ اس کی رہائش سے کچھ دور کھڑا تھا۔

”آپ میری مدد کر رہے ہیں؟“ امبر نے جلدی سے پوچھا۔

”میں نے آپ کی مدد کے لیے اپنے کیمرا مین ... کو بلایا ہے۔“ خاور نے کہا اور تاکید کی کہ دروازہ اچھی طرح سے بند کر لیں۔

خاور نیچے اترا اور سیدھا چوک کی طرف چلا گیا۔ وہاں ایک طرف عاطف اور سجاد کھڑے تھے۔ وہ دونوں کو ایک طرف لے جاتا ہوا اختصار سے سب کچھ بتانے لگا۔ سب گوش گزار کرنے کے بعد خاور نے کہا۔

”ابھی ہم وہاں جائیں گے۔ اس بند مکان سے امبر کے گھر کی چھت پر جائیں گے وہاں سے میں بالکونی میں اتروں گا۔ اس جگہ سے وہ بیگ لوں گا اور واپس آ جاؤں گا۔ سجاد بند مکان کی چھت پر رک جائے گا، تم میرے ساتھ اس مکان کی چھت تک چلو گے اور میں اکیلا نیچے بالکونی میں اتروں گا۔ واپسی پر ہم ایک ساتھ اس جگہ سے نکلیں گے۔“

”بیگ لا کر امبر کو دیں گے۔“ عاطف نے پوچھا۔

”جیسے ہی بیگ میرے پاس آ جائے گا۔ ہم اس جگہ سے نکلتے ہی علینہ کو میسج کر دیں گے۔ علینہ اسی وقت امبر کو قابو

کر کے باندھ دے گی۔ ہم واپس جائیں گے۔ وہ چیک جس بینک برانچ کا ہوگا اسی بینک برانچ میں، میں اکاؤنٹ کھلواؤں گا اور وہ چیک جمع کرادوں گا۔ رقم اسی وقت میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوجائے گی اور ہم امبر کو بے ہوش کر کے کل رات کہیں چھوڑ کر اس شہر کو خدا حافظ کہہ دیں گے۔'' خاور نے منصوبہ بندی بتائی۔

''پیسہ تقسیم کب ہوگا؟'' سجاد نے خشک لہجے میں پوچھا۔

اس کا سوال سن کر دونوں نے اس کی طرف دیکھا اور خاور نے کہا۔ ''اس شہر کو چھوڑتے ہی ہم رقم آپس میں تقسیم کرلیں گے۔''

''وہ ڈیڑھ کروڑ بھی کیا بینک میں ہیں؟'' سجاد نے پوچھا۔

''وہ میرے پاس محفوظ جگہ پر ہے۔'' خاور نے جواب دیا۔ ''میں نے بینک میں جمع نہیں کرایا۔''

''آئندہ جب بھی ہم اپنا کام ختم کریں گے، مجھے آپ لوگ میرا حصہ اسی وقت دے دیا کریں۔'' سجاد بولا۔

''ایسا ہی کیا کروں گا۔'' خاور نے جبر کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ہمارا اسی چوک میں انتظار کرو گے، میں عاطف کو اپنے ساتھ لے کر جارہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' سجاد نے کہا۔ تینوں پھر گھومتے ہوئے اسی جگہ پہنچ گئے جہاں وہ ملے تھے۔

☆☆☆

امبر سہمی ہوئی اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ علینہ اس کے پاس ہی تھی۔ امبر اپنے شوہر کے بارے میں بتاتی رہی تھی کہ وہ کیسی اچھی عادات کا مالک تھا کہ اچانک اس نے اپنا روپ دکھا دیا۔ ان باتوں کے دوران امبر کئی بار روئی تھی۔ اس کی مظلومیت پر علینہ کو حقیقت میں اس کے ساتھ ہمدردی ہوگئی تھی۔

خاور نے اپنی ساری پلاننگ میسیج کے ذریعے علینہ کو بتادی تھی۔ علینہ نے وہ میسیج پڑھ کر ڈیلیٹ کردیا تھا۔ امبر کو معلوم بھی نہیں ہورہا تھا کہ وہ اس وقت کن لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی ہے اس کے اردگرد موجود وہ لوگ اسے لوٹنے کے لیے کیسی پلاننگ کرچکے ہیں۔

''وہ مکان خالی کیوں ہے؟'' اچانک علینہ نے پوچھا کیونکہ امبر نے خود ہی بات شروع کی تھی کہ اگر خاور اس کی مدد کے لیے اس مکان سے اس کے گھر میں داخل ہوجائے تو وہ بیگ ان کے پاس آسکتا ہے اور وہ ملک سے فرار ہوکر اپنے والدین کے پاس پہنچ سکتی ہے۔

''وہ مکان بک چکا ہے۔ جن لوگوں نے خریدا ہے، انہوں نے ابھی اس مکان میں رہائش نہیں رکھی۔'' امبر نے بتایا۔

اسی اثنا میں بیل ہوئی۔ امبر ایک دم ڈر کر دروازے کی طرف متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگی اور علینہ نے پہلے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔ باہر سے خاور کی آواز آئی تو اس نے دروازہ کھولا۔

خاور اور عاطف اندر آگئے۔ خاور نے بتایا۔ ''یہ میرے ساتھ ہی اخبار میں کام کرتا ہے۔ میرا کیمرا مین ہے۔ میں نے اس سے بات کرلی ہے اور یہ میرے ساتھ جانے کے لیے رضامند ہوگیا ہے۔'' خاور کے ہاتھ میں ایک شاپر بھی تھا جس میں کھانا تھا، وہ اس نے علینہ کو دے دیا۔

یہ سن کر امبر کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی۔ ''میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ پلیز آپ میرا وہ کام کردیں۔ مجھ سے آپ پیسے بھی لینا چاہیں تو لے لیں۔''

''ہمیں پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری وجہ سے آپ کی جان بچ جائے اور حفاظت سے اپنے والدین کے پاس پہنچ جائیں ہمارے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہوگی۔'' عاطف عاجزی سے بولا۔

اس کے بعد انہوں نے امبر سے گھر کے ایک ایک کونے کی تفصیل لی، سب کچھ جانا اور پھر وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔

وہ تینوں اس خوبصورت بنگلے کے پاس کھڑے تھے جو امبر کا تھا۔ امبر نے بتایا تھا کہ بنگلے کے گیٹ کے ساتھ ہی موٹے الفاظ میں اس کا نمبر بی ایک سو پچیس لکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ جو اس نے نشانیاں بتائی تھیں وہ اسی بنگلے کی تھیں۔

وہ تینوں ان گھروں کے عقب کی طرف چلے گئے۔ اس خالی گھر کی باؤنڈری وال ایک طرف سے گری ہوئی تھی۔ جس سے وہ آسانی سے اندر چلے گئے۔ سجاد کے کندھے پر بیگ لٹکا ہوا تھا۔

وہ اندھیرے میں ڈوبے مکان میں راستہ تلاش کرتے ہوئے دروازے تک پہنچے اور دروازہ کھولا تو وہ کھل گیا۔ اندر جاتے ہی خاور نے اپنے موبائل فون کی لائٹ آن کی، وہ لاؤنج تھا۔ بالکل خالی اور فرش پر گرد کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ سامنے سیڑھیاں دکھائی دیں۔ وہ تینوں اوپر چلے گئے اور وہاں سے چھت پر پہنچ گئے۔ خاور نے اپنے موبائل فون کی لائٹ بند کردی تھی۔

''تم اسی جگہ رکو گے۔'' خاور نے کہتے ہوئے اس سے بیگ لے لیا۔

خاور اور عاطف دیوار کے پاس گئے اور باری باری جست لگا کر دیوار پر چڑھ گئے۔ اور دوسری طرف کود گئے۔

سجاد کا منہ بنا ہوا تھا اور اسے ان پر غصہ تھا کہ انہوں نے حصہ تقسیم کرنے کے بجائے رقم کو سینے سے لگا کر رکھا ہوا ہے، اس لیے وہ بے دلی سے کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔

خاور نے اشارے سے عاطف کو اسی جگہ رکنے کو کہا اور خود جھکا ہوا سامنے کی طرف گیا اور تھوڑا سا سر نکال کر اس نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ گیٹ کے ساتھ چار چوکیدار بیٹھے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا اور وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے پاس کُتے بھی ٹہل رہے تھے۔

خاور پھر عاطف کے پاس آ گیا اور اسے اس طرف کی صورتِ حال سے آگاہ کر کے عقب کی دیوار کی طرف بڑھا۔ اس نے تھوڑا سا سر نکال کر اس جانب دیکھا اس طرف کوئی بھی نہیں تھا۔ خاور نے نیچے دیکھا، اسے بالکونی دکھائی دی۔

خاور نے بیگ سے رسّا نکالا۔ اور اس کا ایک سرا بالکونی کی طرف لٹکا دیا۔ دوسرا عاطف نے اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر مضبوطی سے پکڑ لیا اور مستعد کھڑا ہو گیا۔

خاور نے اشارے سے بتایا کہ وہ واپسی پر سیڑھیوں کا دروازہ کھول کر اوپر آ جائے گا اور اسے اسی جگہ رک کر اس کا انتظار کرنے کا کہہ کر وہ دیوار کے اوپر چڑھا اور پھر رسّے کی مدد سے وہ بالکونی کی طرف اترنے لگا۔ عاطف نے بڑی مضبوطی سے رسّا پکڑا ہوا تھا۔

جونہی خاور بالکونی میں اترا اس نے رسّا چھوڑ دیا۔ عاطف نے رسّا اوپر کھینچا اور دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

خاور نے بیگ سے ایک بلیڈ نکالا اور اس نے شیشے پر پھیرا اور اس کا ٹکڑا نکال کر احتیاط سے ایک طرف رکھا، ہاتھ بڑھا کر اس نے دروازے کی چٹخنی کھولی اور اندر چلا گیا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ احتیاط سے دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا، لاؤنج میں زیرو پاور کے بلب کی روشنی تھی۔ وہ سیدھا سامنے چلا گیا اور چھوٹی سی راہداری عبور کر کے وہ اسٹور کے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اسٹور میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند کیا تو اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے ایک بار پھر موبائل فون سے روشنی کی۔ اندر بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ ایک طرف پرانا صوفہ بھی پڑا تھا جس کے اوپر بہت سا سامان رکھا ہوا تھا۔ خاور نے موبائل فون ایک طرف رکھا اور صوفے کے اوپر سے سامان اٹھا کر ایک طرف رکھنے لگا۔

جب صوفہ خالی ہو گیا تو اس نے پھٹے ہوئے صوفے کے اندر ہاتھ ڈال کر روئی وغیرہ باہر نکالی تو اس کے ہاتھ میں مطلوبہ بیگ آ گیا۔

خاور نے موبائل فون اٹھا کر اس کی روشنی میں بیگ کی زپ کھول کر اندر جھانکا۔ اندر چیک بکس، کریڈٹ کارڈز، پاسپورٹ کی کاپی کے علاوہ کچھ اور کاغذات بھی دکھائی دیے۔

اس نے زپ بند کی اور وہ بیگ اپنے کندھے سے لٹکایا، دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے اوپر جا کر دروازہ کھولا اور وہ ایک بار پھر چھت پر تھا۔

خاور نے اندھیرے میں دائیں بائیں متلاشی نگاہوں سے دیکھا، اسے عاطف کہیں دکھائی نہیں دیا۔

خاور اس جگہ اپنے موبائل فون کی روشنی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے چھت کی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے پورا چکر لگایا کہ شاید وہ کہیں اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہو، لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ خاور نے سوچا ہو سکتا ہے کہ وہ دیوار کود کر سجاد کے پاس چلا گیا ہو۔

خاور کود کر دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں اُسے ایک اور حیرت کا جھٹکا لگا کہ اس چھت پر وہ دونوں ہی نہیں تھے۔

خاور نے تسلی کرنے کے بعد اپنے موبائل فون سے پہلے عاطف کا اور پھر سجاد کا نمبر ملایا، دونوں نمبرز بند تھے۔

''کہاں چلے گئے......؟''

خاور کی تشویش دوچند ہو گئی اور وہ دل ہی دل میں بولا۔ وہ ان کے لیے اس جگہ رک کر کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ وہ نیچے اترا اور باہر گلی میں سناٹا دیکھ کر باہر نکلا اور ایک طرف چل پڑا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ جتنا اندھیرے میں رہ کر گزرے اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔

وہ چلتا ہوا سڑک تک آ گیا۔ وہاں ایک ہی رکشا کھڑا تھا۔ وہ اس میں بیٹھ گیا اور جگہ کا بتایا۔ رکشا جونہی اسٹارٹ ہوا سناٹے میں جیسے طوفان آ گیا ہو۔ رکشا اس جگہ سے آگے بڑھ گیا۔

اپنی رہائش کے پاس پہنچ کر اس نے رکشے والے کو کرایہ دیا اور چلتا ہوا اس جگہ پہنچا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ اس کی رہائش کا تھوڑا سا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر روشنی بھی پوری تھی۔

خاور نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اپنا ریوالور نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

اس نے دونوں کمرے، کچن اور باتھ روم دیکھ لیا، اندر کوئی بھی نہیں تھا۔

خاور کے لیے یہ حیران کن بات تھی کہ سبھی کہاں غائب ہوگئے ہیں۔ اچانک وہ چونکا۔ لاؤنج میں پڑی میز پر کھانے کے برتن پڑے تھے۔ میز پر چار پلیٹیں، چار پانی کے گلاس پڑے تھے جس سے صاف ظاہر تھا کہ اس جگہ چار افراد نے بیٹھ کر کھانا کھایا ہے۔

''چار افراد......؟ کہیں مجھے وہاں چھوڑ کر عاطف، سجاد، علینہ اور امبر نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا تو نہیں کھایا...... مگر کھانا کھانے کے بعد وہ کہاں چلے گئے......؟''

خاور کے دماغ میں مختلف سوال گردش کرنے لگے۔ پھر اس نے دو گلاسوں کو غور سے دیکھا۔ ان گلاسوں پر لپ اسٹک کے نشان موجود تھے۔ اس سے یہ بات تو صاف ہوگئی تھی کہ دو مردوں کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں اور وہ دونوں لڑکیاں علینہ اور امبر ہی ہوسکتی ہیں۔

اب سوال یہ تھا کہ ان چاروں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ کہیں امبر ان کے ساتھ تو نہیں ملی ہوئی...... انہوں نے یہ سب اس سے ڈیڑھ کروڑ حاصل کرنے کے لیے کیا ہو؟ لیکن وہ رقم تو ایسی جگہ محفوظ ہے کہ وہ اس تک پہنچ بھی نہیں سکتے۔ خاور کے دماغ میں دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ سجاد کا چہرہ خوش نہیں تھا، کہیں اس نے تو کوئی کھیل نہیں رچا دیا؟

پھر خاور نے جلدی سے اپنے ساتھ لائے ہوئے بیگ کی زپ کھولی اور اندر سے چیک بکس نکال کر اس کے صفحے پلٹنے لگا۔ ایک کے بعد اس نے دوسری چیک بکس دیکھنی شروع کی تو درمیان والے چیک پر امبر کے دستخط موجود تھے۔

''امبر کی کہی ہوئی باتیں تو سچ ہیں...... چیک بکس اور پاسپورٹ اس بیگ میں موجود ہیں...... پھر یہ سب کیا ہے؟'' خاور سوچ رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی مسئلے میں اُلجھا تھا اور اسے اس کا کوئی حل نظر نہیں آرہا تھا۔

خاور نے جلدی سے بیگ کی زپ بند کی، دراز سے ایک چابی نکالی اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا تیسری گلی میں چلا گیا۔

وہاں ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچ کر اس نے چابی قفل میں لگائی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ ایک کمرے اور باتھ روم پر مشتمل مکان تھا جو اس کے ایک دوست نے اپنے لیے رکھا ہوا تھا جہاں وہ کبھی کبھار آتا تھا۔

خاور نے باقی رات اسی مکان کے بستر پر سوچتے ہوئے گزار دی۔ عاطف، سجاد اور علینہ کے فون نمبر مسلسل بند جارہے تھے۔

☆☆☆

جانے کب خاور کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اُس کے موبائل فون پر مسلسل بیل ہورہی تھی۔ اسکرین پر جو نمبر تھا، اسے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ وہ نمبر روزی کا تھا۔

''ہیلو......''

''کہاں ہو تم...... میں تمہاری رہائش کے پاس کھڑی ہوں۔'' دوسری طرف روزی کی آواز آئی۔

''تم کب آئیں۔''

''یہ سوال تم مجھ سے مل کر پوچھ لینا۔ میں پریشان ہوں جلدی سے آجاؤ۔'' روزی نے کہا۔

''میں ابھی آرہا ہوں۔'' خاور نے کہا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ روزی دروازے کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

روزی کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت خوبصورت اور پُرکشش تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے مسکرا کر ملے اور خاور اسے اس مکان میں لے آیا۔

''تم اچانک کیسے......؟''

''بھاگ کر آئی ہوں۔ وہ عورت مجھے بیچ رہی تھی۔ لیکن میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے یہاں آگئی۔''

''تمہارے بغیر تو میں بھی نہیں جی سکتا۔''

''خاور اس عورت نے میرے پیچھے اپنے آدمی چھوڑ دیے ہوں گے۔ یہاں سے نکلو اور کہیں دوسرے شہر چلتے ہیں۔''

''مجھے بھی کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے ساتھی ہی مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ میں اس شہر کو چھوڑنے کا پہلے ہی فیصلہ کرچکا ہوں۔'' خاور نے کہا۔

''پھر دیر کس بات کی...... چلتے ہیں۔''

''یقین کرو تمہیں اپنے سامنے پا کر مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس شہر سے نکل کر تمہیں بھی اپنے پاس بلالوں گا۔ لیکن تم خود ہی آگئیں۔'' خاور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اب جلدی کرو۔''

''تم یہاں میرا صرف دس منٹ انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' خاور نے کہا۔

''کہاں جارہے ہو؟''

''بس ابھی آیا۔'' خاور نے کہا اور باہر نکل گیا۔

خاور جہاں اپنے ساتھیوں کے اچانک غائب ہو جانے پر پریشان تھا وہاں اُسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ روزی اس کے پاس آ گئی ہے۔

روزی سے خاور کی دو سال قبل ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں میں اتنی محبت ہو گئی کہ دونوں نے زندگی ایک ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ روزی کی یاں جو جانے کون عورت تھی، اس کے پاس اور بھی کئی لڑکیاں تھیں لیکن ابھی تک اس نے روزی کی کسی کو جھلک نہیں دکھائی تھی۔ خاور کے ساتھ اس عورت کے اچھے مراسم تھے اس لیے خاور نے ایک دن روزی کو دیکھ لیا تھا اور خاور نے اس عورت پر پیسہ بھی پانی کی طرح بہا دیا تھا کہ وہ اسے روزی سے ملنے کی اجازت دے دیتی تھی۔

روزی وہ واحد لڑکی تھی جس کو خاور کا پتا ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ جب بھی خاور کہیں جاتا تھا تو سب سے پہلے روزی کو اطلاع کرتا تھا کہ وہ اس شہر میں فلاں جگہ ہے۔ اس شہر میں ....آتے ہی ٹیکسی میں بیٹھتے کر خاور نے سم بدل کر سب سے پہلا فون روزی کو ہی کیا تھا۔

خاور چلتا ہوا اپنی رہائش کے نیچے کباڑ کی دکان پر پہنچا۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے خاور کو سیلوٹ مارا اور خاور نے پاس جا کر کہا۔

''اپنی امانت لینے آیا ہوں۔''

''جہاں رکھی ہے، لے لو۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

خاور دکان کے پچھلے حصے میں چلا گیا۔ ڈھیر سارے سامان کے بیچوں بیچ اس نے وہ دونوں بیگ نکالے جن میں ڈیڑھ کروڑ تھے اور اس آدمی کے پاس آ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ پیسے نکال کر اس کی مٹھی میں رکھ دیے اور اس نے خوش ہو کر وہ پیسے اپنی جیب میں ڈال لیے۔

''جا رہے ہو......''

''ہاں۔''

''دوست کو یاد رکھنا۔''

''تم کو کبھی بھول نہیں سکتا۔''

''خدا حافظ۔''

خاور بھی مسکرایا اور جلدی سے اُس طرف چل پڑا جہاں وہ روزی کو چھوڑ کر آیا تھا۔

جونہی خاور دروازہ کھول کر اندر گیا، وہ چونک گیا۔ اس کے قدم جس جگہ تھے اسی جگہ منجمد ہو گئے۔ اس کی خیرہ نگاہیں سامنے مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اس کے سامنے منظر ہی بدل گیا تھا۔ چھوٹے سے صحن میں کرسی پر سلطان احمد بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دائیں جانب روزی کھڑی تھی، اس کے چہرے پر گھبراہٹ مترشح تھی۔

''کیسے ہو خاور......'' سلطان احمد نے پوچھا۔

''آپ......؟'' خاور کے منہ سے محض اتنا ہی نکلا۔

''مجھے یہاں دیکھ کے حیرت ہوئی ہے؟ تم کیا سمجھتے تھے کہ تم بھاگ جاؤ گے؟ مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟ سلطان احمد بن کے جو تم نے کھیل کھیلا، اس کی کامیابی پر اپنی محبوبہ کے ساتھ جشن مناؤ گے؟ سلطان احمد سے جیتنا آسان نہیں ہے۔ میری عقل اور سوچ آج بھی کام کرتی ہے۔'' سلطان احمد نے کہتے ہوئے ایک بار پھر اپنی گردن کو کچھ اونچا کر لیا تھا۔

خاور نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اُسے محسوس ہوا کہ اس کے عقب میں دروازے پر کوئی ہے۔ خاور نے دونوں بیگ فرش پر رکھ دیے۔

''تم نے سوچا تھا کہ میں ایک دن تم تک پہنچ جاؤں گا؟'' سلطان احمد مسکرایا۔

''کیسے پہنچے آپ مجھ تک......اور وہ بھی سیدھے میرے گھر تک۔'' خاور کو شدید حیرت تھی۔

پانچ دن قبل تمہارا پیچھا شروع ہو گیا تھا۔ اسی شہر میں تم کو تلاش کر لیا تھا۔ پانچ دن سے تم پر کڑی نظر تھی، تم کہاں جاتے ہو، کیا کرتے ہو اور تمہارے ساتھی کہاں ہیں۔ تم تو مل گئے تھے لیکن تمہارے کسی ساتھی کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ کیونکہ تم لوگ آپس میں ملتے ہی نہیں تھے۔'' سلطان نے بتایا۔

کچھ توقف کے بعد سلطان نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔

''میں نے نجیب خان سے کہا تھا کہ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ جو کھیل تمہارے ساتھ کھیلا گیا ہے، میں اس سے بھی جاندار کھیل کھیل کر اسے چت کر دوں گا۔ اور میں نے ایسا کر دیا۔''

''میں اس شہر میں بڑی احتیاط سے رہ رہا تھا۔ پھر آپ میرے پاس کیسے پہنچے؟'' خاور کو حیرت تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ اب اس کا فرار ہونا ممکن نہیں ہے یقیناً اس مکان کے باہر پولیس والے موجود ہوں گے۔

سلطان مسکرایا۔ ''میں نے ابھی بتایا کہ پچھلے پانچ دن سے تم پر کڑی نظر تھی۔ اور پھر کل رات مظلوم بیوی کے کردار میں امبر اور ظالم شوہر کے روپ میں امتیاز نے انٹری دی۔ امبر نے ایسی کہانی سنائی اور رونے کی لاجواب اداکاری کی کہ اس نے جھوٹ کو سچ ثابت کر دیا۔ اور تم اس کا وہ بیگ اُس گھر سے چوری کرنے کے لیے رضامند ہو گئے جس کے

بارے میں امبر نے بتایا تھا۔"

"تو وہ ایک ڈراما تھا؟" خاور نے دل ہی دل میں کہا۔

"میں جانتا تھا کہ تم اس کی مدد بغیر کسی لالچ کے نہیں کرو گے۔ اس لیے ایک چیک سائن کرنا پڑا اور بتانا پڑا کہ چیک بک میں ایک چیک سائن شدہ ہے۔" سلطان احمد کہہ کر ہنسا۔

خاور کو تاسف ہونے لگا کہ اسے امبر پر ذرا بھی شک نہیں ہوا۔

سلطان نے مزید بتایا۔ "تم نے اپنے ان کرداروں کو بھی باہر نکالا جو چھپے ہوئے تھے۔ پھر تم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اس گھر میں چلے گئے۔ علینہ اور امبر اس مکان میں موجود رہیں۔ جب تم نیچے بیگ لینے کے لیے گئے اس دوران میرے آدمیوں نے تمہارے دونوں آدمیوں کو خاموشی سے پکڑا اور نامعلوم مقام کی طرف لے گئے۔ پھر جب تک تم اس کام میں مصروف رہے، میں، امبر اور علینہ کے پاس پہنچ گیا۔ میرے ساتھ امتیاز بھی تھا۔ ہم چاروں نے مل کر وہاں کھانا کھایا۔ حالانکہ علینہ کھانا نہیں چاہتی تھی۔ میرے مجبور کرنے پر اس نے چند لقمے لے لیے، بے چاری گرفتاری سے گھبرا گئی تھی۔"

سلطان احمد کہہ کر چپ ہوگیا۔ خاور ناچار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا ہورہا تھا، اسے ذرا بھی پتا نہیں چلا تھا۔ وہ کس خاموشی سے گرفتار ہوگئے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" سلطان احمد نے پوچھا۔

"یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ مجھ تک پہنچے کیسے؟" خاور کو جس سوال کی سب سے زیادہ بے چینی تھی، اس نے وہ سوال کیا۔

ایک بار پھر سلطان ہنسا۔ "ہم نے روزی کو تلاش کیا، اور روزی کو سارا پتا ہوتا تھا کہ تم کہاں ہو...... کس جگہ رہتے ہو......"

"لیکن روزی کا تو میرے ساتھیوں کو بھی نہیں پتا تھا۔ آپ کو کیسے پتا چل گیا؟" خاور کو حیرت ہوئی۔

"سوچو، مجھے کیسے پتا چل گیا۔" سلطان نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔" خاور نے کہا۔

"روزی کو تمہارے سامنے اس لیے لانا پڑا تاکہ تم وہ ڈیڑھ کروڑ روپے اگر تم نے کہیں چھپائے تھے تو وہ نکال کر سامنے لے آؤ۔ ہم نے روزی کو بہت کچھ سمجھا کر بھیجا تھا کہ کیسے بات کرنی ہے۔ لیکن ہماری ان باتوں کی نوبت ہی نہیں آئی اور تم خود ہی فرار ہونے کے لیے وہ رقم نکال لائے۔ روزی بے چاری مجبور تھی کیونکہ ہم نے اسے بہت ڈرا دیا تھا۔ اس لیے وہ ایسا کرنے پر راضی ہوگئی تھی جیسا ہم چاہتے تھے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے، آپ لوگ روزی تک کیسے پہنچے؟" خاور کو ایک عرصہ ہوگیا تھا دوسروں کو دھوکا دیتے ہوئے۔ وہ جب بھی کوئی واردات کرتے تھے تو ایک ڈرامے کی صورت میں کردار بن کر کرتے تھے، اس لیے اسے اس حقیقت کے بارے میں جاننے کی بے چینی تھی۔

سلطان نے کچھ توقف کیا اور پھر انکشاف کیا۔ "جب میں چوکیدار کو تہ خانے سے نکال کر باہر لایا تو اچانک میری نظر میرے گھر کے ٹیلی فون پر پڑی۔ میں نے چیک کیا تو دو نمبر غیر مانوس تھے اور ان تاریخوں میں ہوئے تھے جن تاریخوں میں میں اس گھر میں موجود نہیں تھا۔ ایک نمبر پیزا والوں کا تھا اور دوسرا روزی کے موبائل فون کا تھا۔ روزی کے اس موبائل فون نمبر کی مدد سے ہم اس تک پہنچے اور اس نے ہمیں تم تک پہنچا دیا اور ہم نے پہلے ایک ڈراما کیا تاکہ تمہارے سارے کردار بل سے نکل کر باہر آجائیں اور آخر میں تم کو رقم سمیت دھرلیا۔"

اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور پولیس اندر آگئی۔ انہوں نے خاور کو اپنی گرفت میں کرلیا۔ اسی اثنا میں کمرے سے امبر اور امتیاز بھی مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔ خاور کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ اس نے جب... اس فون سے روزی کے ساتھ بات کی تو اس نے وہ کال ڈیلیٹ کیوں نہیں کردی تھی؟

سلطان نے مزید بتایا۔ "امتیاز احمد اسی شہر میں پولیس انسپکٹر ہے اور امبر اس کی حقیقی بیوی ہے جو اسی اخبار میں کام کرتی ہے جس اخبار کا تم نے اسے پریس کارڈ دکھایا تھا۔ تمہارے ہاتھ میں وہ پریس کارڈ دیکھ کر محض اپنی نیچرل اداکاری کی وجہ سے یہ ہنسنا چاہتی تھی لیکن ہنس نہیں سکی۔" سلطان نے کہا تو اس کے ساتھ امتیاز اور امبر کے قہقہے پھوٹ پڑے۔

سلطان اپنی جگہ سے اٹھا اور خاور کے قریب آکر متانت سے بولا۔ "اگر تم چالبازی کھیل سکتے ہو تو پوری گرفت سے اس چالبازی کو لوٹانا میں بھی جانتا ہوں۔"

خاور ناچار اور چپ سلطان احمد کو دیکھتا رہ گیا۔

❖❖❖